لسانی مقالات

(حصہ سوم)

ڈاکٹر سہیل بخاری

مقتدرہ قومی زبان ○ اسلام آباد

لسانی مقالات

(حصہ سوم)

ڈاکٹر سہیل بخاری

مقتدرہ قومی زبان ○ اسلام آباد

۱۹۹۱ء

سلسلۂ مطبوعات : ۲۵۶

○

طبع اول : فروری ۱۹۹۱ء

تعداد : ایک ہزار

قیمت : مجلد [redacted]

پیپر بیک : [redacted]

فنی تدوین : ڈاکٹر انعام الحق جاوید

طابع : ایس - ایم - اظہر رضوی

مطبع : اظہر سنز پرنٹرز ، ۱۰۸ - لٹن روڈ ، لاہور

ناشر : ڈاکٹر جمیل جالبی

(صدر نشین)

مقتدرہ قومی زبان ، ۱۶ ڈی (غربی)

بلیو ایریا ، ایف - ۶/۱ ، اسلام آباد ۔

○

پیش لفظ

زبان کے فروغ و نفاذ کے سلسلے میں لسانی پہلو کو جو اہمیت حاصل ہے - وہ صاحبانِ علم سے پوشیدہ نہیں کیونکہ یہی وہ علم ہے جو الفاظ سازی اور وضع اصطلاحات کے لیے بنیادی معلومات فراہم کرتا ہے اور جس کے ذریعے زبان کی اصلیت و ماہیت کے مطالعے کے علاوہ اس کے دائرہ کار اور ارتقائی مراحل کا تعین کیا جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ قومی زبان کے نفاذ کی مختلف جہتوں کو سامنے رکھتے ہوئے مقتدرہ کی طرف سے جہاں دیگر سمتوں میں کام ہو رہا ہے وہیں لسانیاتی سطح پر تحقیقی کام بھی جاری ہے - زیر نظر کتاب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جس میں نامور محقق ڈاکٹر سہیل بخاری نے مختلف ذیلی عنوانات کے تحت قومی زبان کے لسانی مسائل پر بحث کی ہے اور مدلل انداز میں مفید معلومات بہم پہنچائی ہیں - لسانیات ، ڈاکٹر سہیل بخاری کا خاص موضوع ہے اور وہ اس سے قبل بھی اس سلسلے میں گراں قدر خدمات انجام دے چکے ہیں - ان کی یہ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے - پہلا حصہ زبان شناسی سے متعلق عمومی مقدمات پر مبنی ہے جس میں زبان ، لپّی ، تلفظ ، بولی اور اسی نوعیت کے دیگر بنیادی مسائل پر نظری بحث کی گئی ہے اور زبانوں کی ابتدائی افادیت اور پس منظر پر روشنی ڈالی گئی ہے جب کہ دوسرے حصے میں قومی زبان سے متعلق لسانی اُمور کے تحقیقی جائزے کے ساتھ ساتھ گرامر ، املا کے مسائل ، علاقائی زبانوں کے ساتھ روابط اور ارتقائی مراحل کا احاطہ کیا گیا ہے اور واضح نقطۂ نظر اختیار کرکے قومی زبان کی اہمیت و افادیت کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے -

اُمید ہے کہ لسانیات سے دلچسپی رکھنے والے اصحاب اور طلبہ اس سے کماحقہٗ استفادہ کر سکیں گے -

—— ڈاکٹر جمیل جالبی

دیباچہ

پیش نظر کتاب میرے ان لسانی مقالات کا مجموعہ ہے جو مختلف موضوعات پر وقتاً فوقتاً میرے قلم سے نکلتے رہے ہیں اور اردو کے مقتدر اور وقیع رسائل و جرائد میں چھپ چکے ہیں۔ موضوعات کے لحاظ سے انھیں دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے:

پہلا حصہ ان مقالات پر مشتمل ہے جو زبان کے کسی نہ کسی عمومی پہلو مثلاً تلفظ، اشتقاق، معنی اور زبان کی تبدیلی وغیرہ سے متعلق ہیں۔ البتہ ان کے شواہد و امثال فطری طور پر بیشتر اردو زبان سے ہی فراہم کیے گئے ہیں۔

دوسرے حصے میں صرف اردو زبان کے متعلق مقالات جمع کیے گئے ہیں جن میں اردو کی اصوات، الفاظ نظامیات (گرامر)، تاریخ اور املا وغیرہ کے مختلف مسائل کا جائزہ لیا گیا ہے۔

میں نے ان مقالات میں جس موضوع پر قلم اٹھایا ہے اس پر نہ صرف دوسروں کے خیالات کا بغور مطالعہ کرکے ان سے اتفاق یا اختلاف کرنے کے وجوہ و دلائل ہی پیش کیے ہیں۔ بلکہ ان کے بارے میں اپنی پُر خلوص اور دیانت دارانہ رائے بھی دے دی ہے اور اپنا نقطۂ نظر بھی بے جھجھک بیان کر دیا ہے۔

یہ مقالات میرے ذہنی سفر کی داستان سناتے، میرے سوچ بچار کے تمام گوشے یعنی تمام پیچ و خم اور نشیب و فراز دکھاتے اور میرے نقطۂ نظر کی مختلف تعمیری منزلیں پیش کرتے ہیں۔ اگرچہ اپنی راہ آپ بنانے میں مجھے بڑی کٹھن گھاٹیوں سے گزرنا پڑا ہے۔ گھری تاریکیوں میں بڑی ٹھوکریں کھانا پڑی ہیں۔ اجلی صبحیں ملگجی شاموں میں تبدیل کرنا پڑی ہیں، روشن دنوں کو سیاہ راتوں سے بدلنا

پڑا ہے اور طویل راتیں کالی کرنا پڑی ہیں - لیکن اپنی تحقیق کے دوران میں بخل پرستی یا سخن پروری سے میں نے کبھی اور کہیں بھی کام نہیں لیا ہے - بلکہ جس وقت بھی جو بات حق سمجھی ہے - بلا تکلف کہہ دی ہے چاہے اس سے پہلے اس نکتے کے متعلق میرا خیال مختلف ہی کیوں نہ رہا ہو - مؤقف میں اگر کہیں ایسی تبدیلی آئی ہے تو وہ اس بات کا ثبوت ہے کہ مجھے حق سے پیار ہے اور میری تحقیق کا ارتقائی سفر جاری ہے -

ان مقالات کے ساتھ ان کی اشاعت کی تاریخیں بھی درج کر دی گئی ہیں جس سے قارئین کو یہ معلوم ہو سکے گا کہ کسی مخصوص نکتے یا موضوع کے بارے میں میرا تازہ ترین موقف کیا ہے تا کہ وہ اسی کو میرا قول آخریں سمجھیں -

مقالات میں زبان شناسی اور اردو شناسی کے بارے میں بہت سی نئی باتیں نظر آئیں گی اور ذہن انسانی نئی بات کو ماننے کے لیے یکا یک اور آسانی سے آمادہ نہیں ہوتا کیونکہ پچھلے خیالات ذہن سے رفتہ رفتہ ہی نکل پاتے ہیں اس لیے میری کہی ہوئی ان نئی باتوں کو قبول کرنے میں بھی لوگوں کو کچھ وقت لگے گا - البتہ مجھے خوشی اس بات کی ہے کہ میں نے اپنے ہم وطنوں میں لسانی مسائل سے دلچسپی ضرور پیدا کر دی ہے اور ان کے ذہنوں کو لسانیات کی تنگ و تاریک کوٹھڑیوں اور بند گلیوں سے نکال کر کھلے میدان اور روشن شاہراہ پر لگا دیا ہے -

ڈاکٹر سہیل بخاری

فہرست مقالات

حصہ اول (زبان شناسی)

	صفحہ
لسانیات	۱۱
بولی کیا ہے ؟	۳۶
زبان متبادلات کا نظام	۴۳
تلفظ اور اشتقاق	۵۲
زبان کی تبدیلی اور لپی	۶۹
لپی اور تلفظ	۸۳
سکون اول کا مسئلہ	۹۶
حروف کا تبادل	۱۰۵
بول اور معنی	۱۲۳
بول کے معنی	۱۵۲

حصہ دوم (اردو شناسی)

آوازیں

اردو زبان کی بنیادی آوازیں	۱۶۵
قدیم سہارن اردو میں	۱۹۰
اردو زبان کا صوتی آہنگ	۱۹۸

الفاظ

الفاظ کا مطالعہ	۲۰۳
اردو کے کچھ بولوں کی تشریح	۲۲۳

صفحہ

کوڑی ... ۲۳۷

لفظ "کر" کی حقیقت ... ۲۴۷

اردو زبان کے چند محاورے ... ۲۵۱

اشخاص و مقامات کے نام ... ۲۶۳

لسانیات (گرامر)

اردو گرامر کا اسم ... ۲۷۳

اردو زبان کا عامل ... ۲۸۵

اسم فعل "کرنا" ... ۲۹۷

تاریخ

مسئلہ آغاز اردو ... ۳۲۷

اردو کی زبان کا آغاز ... ۳۵۳

اردو زبان کا سفر ... ۳۹۱

اردو اور مسلمان ... ۴۰۵

اردو بولی کا دیس ... ۴۲۱

اردوئے قدیم ... ۴۳۱

ہماری قومی زبان ... ۴۴۳

اردو اور علاقائی زبانوں کا تعاون ... ۴۵۰

ہماری قومی اور علاقائی زبانیں ... ۴۵۵

املا

اردو املا کے مسائل ... ۴۶۱

اردو میں و، ی اور ہ کی حقیقت ... ۴۷۵

ہمزہ ... ۵۱۸

و اور ی کے حروف ... ۵۲۷

حصه اول

زبان شناسی

لسانیات

لسانیات کی تعریف

عربی میں "لسان" اس پارۂ گوشت کو کہتے ہیں جو ہمارے بتیس دانتوں کے درمیان رہتا اور غذا کے مختلف ذائقوں میں تمیز کرتا ہے فارسی میں اسے "زبان"، انگریزی میں "ٹنگ" اور اُردو میں "جیب" کہتے ہیں لیکن عربی، فارسی اور انگریزی کے ان ہی الفاظ سے وہ آوازیں بھی مراد لی جاتی ہیں جو انسان اپنے منہ سے نکالتا ہے اور جو اس کی سماجی زندگی کو مستحکم اور پائدار بناتی ہیں۔ اردو میں ان کے مجموعے کو "بولی" کہتے ہیں۔ لفظ "لسانیات" اس عربی "لسان" (بولی) سے بنا ہے جس کے معنی "زبان کا علم" ہیں۔ چنانچہ "لسانیات" علم کی وہ قسم ہے جو زبان کی اصلیت اور ماہیت کا مطالعہ کرتی اور اس کی پیدائش، فروغ، دائرۂ کار اور تغیرات جیسے مسائل پر غور کرتی ہے۔ فارسی میں اسے "زبان شناسی"، انگریزی میں فلالوجی اور لنگوئسٹکس اور اردو میں "بولی گیان" کہتے ہیں۔

لسانیات اور دوسرے علوم

انسان ایک سماجی جاندار ہے جو مہد سے لحد تک اپنے ابنائے جنس کے ساتھ مل جل کر رہنا چاہتا ہے اور اس سماجی زندگی کے تقاضے پورے کرنے کے لیے وہ اپنی آوازوں سے کام لیتا ہے۔ دوسروں سے اپنے دل کی بات کہنے، حکم دینے، سمجھنے اور سمجھانے، ان سے اپنی ہمدردی کا اظہار کرنے اور ان کی ہمدردی حاصل کرنے کے لیے اسے زبان کا سہارا لینا پڑتا ہے اور چونکہ زبان کی تاریخ انسانی سماج کی تاریخ کے ساتھ ساتھ چلتی ہے، اس کے اتار چڑھاؤ، سماجی انقلابات اور سماجی روایات سے وابستہ ہیں، اس لیے زبان کے طالب علم کو دوسرے سماجی علوم نسلیات اور عمرانیات وغیرہ سے بھی مدد لینا ضروری ہوتا ہے۔

سماجی پہلو سے قطع نظر آوازوں کا ایک خالص انفرادی پہلو بھی ہے ۔ انسانی آوازیں جسم کے چند مخصوص اعضا مثلاً سینہ ، کنٹھ ، حلق، ناک ، زبان، تالو اور پھیپھڑوں کی مدد سے پیدا ہوتی ہیں ۔ ان کی مقدار، نوعیت اور رفتار ان اعضا کی صحت اور صلاحیت سے متعین ہوتی ہے اور ان کی خوبی اور خامی مخارج کی فطری استعداد پر منحصر رہتی ہے اور اعضائے جسانی پر مختلف مادی عوامل مثلاً درجہ حرارت ، تھکن اور استعمال ادویہ وغیرہ بھی اثر انداز ہوتے ہیں جن کے باعث مکان و زمان کے ساتھ ساتھ ان کی حالت متواتر بدلتی رہتی ہے اس لیے مطالعۂ زبان کا علم تشریح الابدان سے بھی گہرا تعلق رکھتا ہے جس سے اسے بہت سے لسانی مسائل کے حل میں مدد ملتی ہے ۔

یہ درست ہے کہ وہ مفرد آوازیں جنھیں ہم حروف سے ظاہر کرتے ہیں ، صوتی علامات ہی نہیں صوتی اکائیاں بھی ہیں لیکن یہ آوازیں بے معنی ہوتی ہیں ۔ آوازوں میں معنویت پہلی بار اس وقت داخل ہوتی ہے جب چند مفرد آوازیں مل کر ایک لفظ بن جاتی ہیں ۔ صحیح معنوں میں زبان کا اطلاق لفظ پر ہی ہوتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ اردو میں آوازوں کی اس معنوی اکائی "بول" اور بولوں کے نظام کو "بولی" (بولی کی یا بولی سے متعلق یعنی زبان) کہتے ہیں ۔ اس کے علاوہ انسان نہ صرف لفظوں کو سوچتا ہے بلکہ لفظوں کی مدد سے بھی سوچتا ہے ۔ اس لیے لفظ ایک طرف تو سوچ سے وابستہ ہوتا ہے اور دوسری طرف معنی سے اور ان دونوں رشتوں کا تعین نفسیات کا کام ہے ۔ مزید براں مطالعہ زبان میں کچھ ایسے سوالات بھی اٹھتے ہیں جن کا تعلق ہماری جذباتی کیفیت ، وقتی دلچسپی اور خیالات کی رو سے ہوتا ہے اور ان کے جوابات بھی نفسیات ہی دے سکتی ہے ۔ اس لیے زبان اور نفسیات کا بھی گہرا تعلق ہے ۔

آواز اس بنیاد کی پہلی اینٹ ہے جس پر لسانیات کی عمارت قائم ہوتی ہے ۔ یہ ہوا اور مخارج کے تصادم سے پیدا ہوتی ہے اور ہوا اور پردۂ گوش کے تصادم سے سنی جاتی ہے اور اس پیدا ہونے اور سننے کے درمیان میں بھی کتنی ہی منزلیں آتی ہیں جیسے ہوا کی لطافت اور کثافت،

موسمی حالات ، پستی اور بلندی ، مکان و زمان کے فاصلے وغیرہ جن کا تعلق علم طبیعیات سے ہے - چونکہ متکلم اور سامع دونوں کے لحاظ سے آوازوں کا مطالعہ لسانیات کا اہم موضوع ہے ، اس لیے اس کا طبیعیات کی طرف رجوع کرنا بھی نا گزیر ہے -

زبان کیا ہے ؟

قوت گویائی انسان کی وہ واحد ملکیت ہے جس میں کوئی دوسرا ذی روح شریک نہیں ہے اور اب تک ماضی یا حال کا کوئی انسانی سماج اتنی سادہ اور ابتدائی حالت میں نہیں مل سکا ہے جس میں زبان بھی بالکل سادہ اور ابتدائی مراحل میں پائی جاتی ہو - گفتگو ایک جسمانی عادت اور ایک اجتماعی تقلیدی عمل ہے - یہ ایک انسان کا نہیں بلکہ دو انسانوں کا باہمی معاملہ ہے چنانچہ زبان انسانی آوازوں کا وہ بامعنی نظام ہے جس کے ذریعے افراد جماعت میں رابطہ استوار ہوتا ہے - انسان اپنے ساتھیوں کو متاثر کرنے کے لیے بولتا ہے اور زبان کے وسیلے سے ان کی امداد طلب کرتا ہے تاکہ سب کے ساتھ مل جل کر اپنے ماحول پر قابو پا سکے -

آج دنیا کی کسی زبان کو لے لیجیے - وہ اس قدر مکمل نظر آتی ہے کہ اس کی تکمیل اور تدوین کے لیے تاریخ یا قبل تاریخ کا کوئی نہ کوئی عہد ضرور مختص کرنا ہوگا اور اس سے قبل ایک ایسا دور بھی ضرور ماننا پڑے گا جس میں وہ تشکیل پا رہی تھی لیکن وہ دور انسانیت کا کوئی اتنا قدیم دور ہوگا جس کا اس وقت تصور بھی ناممکن ہے - مثال کے طور پر آج اس برصغیر میں جتنی زبانیں بولی جا رہی ہیں وہ آریاؤں کے ہند میں داخلے کے وقت بھی اتنی ہی مکمل اور منضبط تھیں کیونکہ ویدک کال سے اس وقت تک ان میں ذرا سا بھی فرق نہیں آیا ہے - اس وقت تک ان زبانوں کو مکمل ہونے کتنا عرصہ گزر چکا ہوگا یہ نہیں کہا جا سکتا - اس سے پہلے یہ سب کی سب کتنی مدت تک تشکیل پاتی رہی ہوں گی اس کا اندازہ بھی نہیں ہو سکتا اور اس سے قبل وقت کا وہ پہلا نقطہ جب اس خطۂ ارضی میں انسان کے منہ سے پہلی بار کوئی بول

نکلا ہوگا آج ہمارے تخیل کی پرواز سے بھی بہت دور جا چکا ہے کیونکہ زبان انسانیت کی معاصر اور اس کی پیدائش انسانی پیدائش سے وابستہ ہے۔

مختصر طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ دنیا کے جس خطے میں انسانیت نے آنکھ کھولی زبان ہلا کر اپنی بولی بھی سنائی۔ اس کے بعد ایک مدت ایسی گزری جس میں وہ بولی کٹتی چھنٹتی آگے بڑھتی اور بے اصولی سے اصول کی طرف قدم بڑھاتی رہی۔ یہاں تک کہ ایک وقت ایسا آیا جب وہ بالکل مکمل، منضبط اور مدون ہوگئی اور اس وقت سے آج تک یہ اسی طرح مکمل اور منضبط چلی آ رہی ہے۔ آج جب کہ یہ اندازہ لگانا ہی ناممکن ہے کہ اس نے کتنے لاکھ سال قبل اپنا موجودہ روپ اختیار کر لیا تھا، اس سے قبل کے تشکیلی دور پر کون قیاس آرائی کر سکتا ہے۔ اس سلسلے میں صرف وہی لوگ رائے زنی کی جرأت کر سکتے ہیں جن کو زبان کی عمر کا صحیح اندازہ نہیں ہے۔ کیونکہ وہ زبانوں کو کم سن سمجھ کر ان کی عمروں کو محض صدیوں سے ناپتے ہیں۔ جب کہ کہ ہزاروں سال بھی کسی زبان کی عمر میں کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔

ابتدائی آوازیں

زبان کی ابتدائی آوازیں یک رکنی مادے تھے جن پر بعد میں دوسرے الفاظ، لاحقے اور سابقے وغیرہ جوڑ کر زبان کی ثروت میں اضافہ کیا گیا۔ یہ مادے فعلی بھی تھے اور اسمی بھی جیسے ہماری (ہندوستانی) زبانوں کے مادے لے، جا، دھو، دے، کہہ، چھپ، پی، چل، کر، دام وغیرہ یا سامی مادے جیسے قتل، ظلم، رحم وغیرہ یا ہند یورپی مادے ستا (کھڑا ہونا)، اُخ (کہنا)، ترف (سیر کرنا) وغیرہ آگے چل کر ان بنیادی مادوں سے دوسرے ثانوی مادے بھی تیار ہوئے۔ اس طرح اسماء اور افعال کی تعداد یکساں طور پر بڑھتی رہی اور زبانیں برابر پھلتی پھولتی چلی گئیں۔

ابتدائی صوتی شکل

یہ قدیم مادے اس س، اس ا، اِس آ س، آ س آ س س، اَس اَش ا اور اس اس اس کے گروہوں سے تعلق رکھتے تھے جن میں الف سے ا سر

(صوت صحیح) اور سُ سے سُر (یعنی صوت علت) مراد ہے۔ دنیا کی مختلف زبانوں میں ان کی یہی چھ صورتیں تھیں۔ چنانچہ ہندوستانی مادے پہلے دو گروہوں سے تعلق رکھتے تھے جیسے کھا، چل وغیرہ۔ ہند یورپی مادوں کا تعلق بیشتر اس اس، اس اس س، اس اس ا کے گروہوں سے ہے جیسے کدّ (کدہ، گھر)، فتا (فتادن، گرنا، پڑنا) اور کمر وغیرہ اور سامی زبانوں میں عبرانی مادے اس اس ا (جیسے قتل) کے اور عربی کے مادے اس اس اس (جیسے قتّل) کے ذیل میں آتے ہیں۔ یہ تمام مادے اسر (صوت صحیح) سے شروع ہوتے تھے اور ان میں اسر (یعنی صوت صحیح) اور سُر (صوت علت) باری باری سے آتے تھے لیکن دو اسر (اصوات صحیحہ) ایک جگہ برابر برابر جمع نہیں ہوتے تھے[۱] چنانچہ رومن لپی میں لکھے ہوئے بعض الفاظ مثلاً سکول اور سپین (ایک یورپی ملک) وغیرہ کی مکتوبی شکلیں صوتی اعتبار سے غلط ہیں۔

معنی

زبان کے معنی کا تعلق بولنے والے کی بہ نسبت سننے والے کے ذہن سے زیادہ ہے۔ بولنے والا چاہے جتنا سوچ سمجھ کر لفظوں کا انتخاب کرے زبان کے بنیادی مقصد یعنی امداد طلبی کا واضح تاثر اس حقیقت پر منحصر ہے کہ سننے والے نے اس کا کیا مفہوم سمجھا۔ اس کے ثبوت میں وہ کثیر تعداد مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ جنھیں عرف عام میں ہم غلط فہمیاں کہتے ہیں اور جو بولنے والے اور سننے والے کے درمیان پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ چنانچہ بولنے والے کا مفہوم کچھ تو ان الفاظ سے سمجھا جاتا ہے جو وہ استعمال کرتا ہے، کچھ اس ماحول سے بھی نکالا جاتا ہے جس میں وہ پہلے بھی کبھی کسی کی زبان سے نکلے تھے اور کچھ اس ماحول سے بھی اخذ کیا جاتا ہے جس میں وہ الفاظ اس وقت ادا کیے جا رہے ہیں اور یہ ماحول ذہنی اور طبیعی دونوں قسم کا ہوتا ہے جس کا ایک سرا سننے والے کی داخلی دنیا کو اور دوسرا سرا خارجی دنیا کو چھوتا ہے۔ جب الفاظ خاص خاص موقعوں پر بار بار استعمال ہوتے رہتے

۱۔ ہسٹری اینڈ اوریجن آف لینگویج مصنفہ آر۔ ایس۔ ڈائمنڈ، ص ۱۸۱۔

ہیں تو ان کے معنی کا ابہام کم ہوتا جاتا ہے اور ان کے معنوی حدود و خطوط واضح اور قطعی ہو جاتے ہیں -

تعین مفہوم کے ساتھ ساتھ توسیع مفہوم بھی زبان کا ایک داخلی عمل ہے جو تسلسل کے ساتھ جاری رہتا ہے اور اس کے دو طریقے ہیں - چونکہ معنی کے تعین میں ماحول کا بھی ہاتھ ہوتا ہے، اس لیے انسان کا ماحول بدلتے ہی الفاظ کے معنی بھی بدل جاتے ہیں اور وہ لفظ جو پیشتر ایک مخصوص معنی کے لیے استعمال ہوتا تھا نئے پس منظر میں دوسرے معنی استعمال کرنے لگتا ہے - یہی وہ طریقہ ہے جس سے صفات و افعال اسما بن جاتے ہیں - اس طریقے کو ہم تبادل معنی کہہ سکتے ہیں - توسیع معنی کے دوسرے طریقے کو اصطلاحاً مجاز اور بدلے ہوئے معنی کو لغوی کے مقابلے میں مجازی معنی کہا جاتا ہے - استعارہ، مجاز مرسل اور کنایہ وغیرہ کی اصطلاحیں اسی معنوی توسیع کے لیے وضع ہوئی ہیں -

مادی اور مجرد اسما

اس سلسلے میں بعض لوگوں کا خیال ہے کہ زبان میں سب سے پہلے ان جسمانی افعال اور صفات کے لیے لفظ وضع ہوئے جن کا وقوف حواس خمسہ کی مدد سے حاصل ہو سکتا ہے کیونکہ انسان کی اولین ضروریات مادی تھیں اور اسے مادی اشیا اور افعال ہی کی اہمیت سب سے پہلے محسوس ہوئی تھی - یوں زبان کے مادی روپ پہلے وجود میں آئے تھے - آگے چل کر جب انسان اشیا کے تجزیے کے بعد تقابل اور موازنے کی مدد سے مشابہت اور اختلاف کی منزلیں طے کرکے تعمیم اور کلیات تک پہنچا اور اس کا تفکر تجریدی رنگ اختیار کر گیا تو مجرد خیالات کے لیے بھی اس نے صوتی علامات اختیار کر لیں[1] لیکن میرے نزدیک قدما کے متعلق ہمارے دوسرے التباسات کی طرح یہ بھی ایک التباس ہے کیونکہ انسانی ذہن میں جہاں تحلیل و ترکیب اور تخصیص و تعمیم کی صفات و خصوصیات بیک وقت ملتی ہیں وہاں اس کے تفکر میں مادیت اور تجرد بھی پہلو بہ پہلو نظر آتے ہیں یعنی یہ اس کے تفکر کے

---

۱ - ہسٹری اینڈ اوریجن آف لینگویج مصنفہ آر - ایس - ڈائمنڈ، ص ۱۲۶-

دو پہلو ہیں جو روز ازل سے آسے ودیعت ہو چکے ہیں - چنانچہ نہ تاریخ انسانیت کے کسی دور سے ایسی مثالیں مل سکتی ہیں جن میں انسانی تفکر کا ایک پہلو موجود اور دوسرا غائب رہا ہو اور نہ نفسیات ہی ہمیں کوئی ایسا اصول بتاتی ہے جس کی رو سے انسانی ذہن کے کسی فطری خاصے کی پیدائش انسان کی کسی خاص عمر یا انسانیت کے کسی درمیانی عہد یعنی وقت کی کسی درمیانی منزل سے وابستہ ہو - اس لیے ہم کو یہ تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں ہے کہ زبان انسانیت کے جس دور میں بھی پیدا ہوئی ہو اس میں مادی اور مجرد اشیا اور خیالات کا تسمیہ ساتھ ساتھ عمل میں آیا ہے اور زندگی اور مادے کے مختلف مظاہر ، ان کی گونا گوں کیفیتوں اور باہمی رشتوں کے لیے مختلف الفاظ ساتھ ساتھ ہی وضع ہوئے ہیں -

تلفظ

جس طرح ابتدا میں لفظ کے معنی متعین کیے گئے ہیں اسی طرح ہر لفظ کا تلفظ بھی طے کر دیا گیا ہے - چنانچہ معنی کی طرح تلفظ بھی ایک ایسا اجتماعی عمل ہے جو افراد معاشرہ کی باہمی رضامندی سے رواج پاتا ہے - یہ درست ہے کہ ابتدا میں مختلف الفاظ کا تلفظ کسی فرد واحد نے ہی طے کیا ہوگا لیکن جب ایک بار اسے سب نے قبول کر لیا تو اس کے بعد کسی کو اس کے تبدیل کرنے کا اختیار نہیں رہا - یہ بات بالکل واضح ہے کہ اگر عام لوگوں کو یہ اختیار دے دیا جاتا تو زبان کے پورے نظام میں ابتری پیدا ہو جاتی -

لپی

اس کی ایجاد کا مقصد آوازوں کو محفوظ کرنا تھا - اس کی اس بنیادی غایت میں ابتدا سے آج تک کوئی فرق نہیں آیا ہے- زبانوں کی طرح دنیا کی موجودہ لپیوں کی تعداد بھی کافی ہے لیکن جس طرح الفاظ، ان کے معنی اور ان کے تلفظ کا تعین کسی اتنے پرانے زمانے میں ہوا ہے جس سے متعلق ہمیں مطلق علم نہیں ہو سکتا ، اسی طرح لپیاں بھی کسی ایسے ہی زمانے میں ایجاد ہوئی ہیں اور اسی لیے آج پورے اعتماد اور یقین کے ساتھ یہ بات نہیں کہی جا سکتی کہ ایک لپی میں کسی صوتی علامت (آواز) کے لیے

وہی تحریری علامت (حرف) کیوں مقرر کی گئی جو آج استعمال ہو رہی ہے - اس بارے میں اب تک جو کچھ کہا گیا ہے یا کہا جا رہا ہے اس کا تعلق محض قیاسات سے ہے -

تلفظ کا بگاڑ

اس کی پہلی وجہ دو زبانوں کا تصادم ہے - بولنے والے دوسری زبان کی ان آوازوں کو جو ان کی اپنی (مادری) زبان میں نہیں ملتیں اپنی زبان کی کچھ ملتی جلتی آوازوں سے ادا کرنے لگتے ہیں - مثلاً آریہ اور مسلمان جو فارسی بولتے ہوئے ہندوستان میں داخل ہوئے تھے ہند و پاک کی مخی (ٹ ، ٹھ ، ڈ ، ڈھ ، ڑ ، ڑھ) اور بھاری آوازوں (کھ ، گھ ، بھ ، پھ وغیرہ) کو ادا کرنے پر قادر نہیں تھے کیونکہ یہ آوازیں ایرانی زبان میں نہیں ملتیں - چنانچہ وہ یہاں کی مخی آوازوں کو دندانی (ت، تھ ، د ، دھ) اور بھاری آوازوں کو ہلکی آوازوں (ک ، گ ، ب ، پ) سے ادا کرنے لگے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آج ہماری زبانوں کے کثیر تعداد الفاظ میں ابتدائی مخی کی جگہ دندانی اور سہاہران کی جگہ الپ ہر ان آوازیں سننے میں آ رہی ہیں - ان کے علاوہ ہمارے دوسرے الفاظ میں بھی عربی اور ایرانی آوازیں داخل ہوگئی ہیں جیسے موجودہ تسائی (قدیم کسائی) ، موجودہ چیخنا (قدیم چیکنا) ، موجودہ غٹا غٹ (قدیم گٹا گٹ) ، موجودہ شراٹا (قدیم سراٹا) ، موجودہ علیحدہ (قدیم دکنی الادھا)، موجودہ خصم (قدیم کھسم ، شوہر) ، موجودہ واسطے (قدیم دکنی واستے ، بغرض، بوجہ) وغیرہ اور یوں ہماری زبانوں کا قدیم تلفظ ایرانی زبان کے میل جول سے کافی بدل گیا ہے -

تلفظ کے بگاڑ کی دوسری اور اہم تر وجہ لپی ہے جو اگرچہ آوازوں کو محفوظ کرنے کے لیے ایجاد ہوئی ہے لیکن جو کبھی بھی اتنی صحت و دیانت کے ساتھ محفوظ نہیں کر پاتی ہے کہ ہر خطے اور ہر دور میں مستند اور معیاری سمجھی جا سکے - آج دنیا میں جتنی لپیاں نظر آ رہی ہیں ان میں سے کوئی ایک بھی صوتیات کے نقطۂ نظر سے مکمل نہیں ہے - یہی وجہ ہے کہ ہر ملک اور ہر عہد میں تلفظ اور لپی کا تعلق محض روایتی رہا ہے اور بولنے والے تلفظ کی روایت کے سہارے تحریروں کو صحیح

پڑھتے چلے آ رہے ہیں ۔ البتہ جب وہ تلفظ کا سہارا چھوڑ کر صرف لپی پر بھروسا کرکے پڑھتے ہیں تو مصنوعی آوازیں نکالنے لگتے ہیں ۔ مثلاً اردو لپی ہی کی مثال لے لیجیے جس میں اردو کے ایک لفظ کو جس کا تلفظ ہر جگہ ایک ہی سننے میں آتا ہے میں نے پہنچ، پہونچ ، پھونچ ہونچ اور ہونچ کی پانچ شکلوں میں لکھا دیکھا ہے ۔ اب جو لوگ ان مکتوبی روپوں کو اساسی اہمیت دے کر اس لفظ کا تلفظ کریں گے وہ یقیناً غلط آوازیں نکالیں گے چنانچہ بعض لوگ اس بدلے ہوئے نقطہ نظر کے باعث اردو الفاظ بھڑوا ، کڑوا کو بھڑ—وا ، کڑ—وا اور گھا گھمی کو گہا گہمی بولتے سنائی دیتے ہیں ۔

بالکل یہی بات ان قدیم تحریروں کے متعلق بھی حرف بحرف صحیح ہے جنھیں لوگ لپی کی اسی بنیادی خامی کے سبب سے قدیم زبانیں کہہ رہے ہیں ۔ ہمارے پڑھے لکھوں نے قدیم تحریری شکلوں کو لپی پر مکمل اعتماد کرکے بولنا شروع کر دیا ہے جس کے باعث الفاظ کا تلفظ اس تلفظ سے بالکل مختلف ہوگیا ہے جو عہد قدیم سے انسانوں کی زبانوں پر منتقل ہوتا چلا آ رہا ہے ۔ مثلاً عربی زبان کے یعقوب اور یوسف ان زبانوں میں جو رومن لپی استعمال کرتی ہیں جیکب اور جوزف بولے جا رہے ہیں اور لوگ اس بات سے بے خبر ہو چکے ہیں کہ وہ حرف جے (J) جسے آج رومن لپی میں "ج" بولا جاتا ہے عہد قدیم میں "ی" کی آواز کے لیے استعمال ہوتا تھا ۔ قدیم یونانی زبان کا حرف تھیٹا (θ) "د" کی آواز کے لیے کام میں لایا جاتا تھا ۔ اس لیے یونانی "تھغیتر" کا صحیح اور ابتدائی تلفظ "دختر" ، یونانی ، تھیو (Theo) کا تلفظ "دیو" ، "تھیو لوجی" کا تلفظ "دیو لغت" اور "تھیٹر" (Theatre) کا اصلی تلفظ "دیدار"[1] ہے ۔ یونانی "کرک" (Kirk) ، لاطینی سڑک (Circ) اور ویدک "سرک" کا صحیح تلفظ "چرخ" اور لاطینی " سرکس " کا ابتدائی تلفظ " چرخہ " (گول ،

---

۱ ۔ اس حقیقت سے بے خبر خود ایرانیوں نے انگریزی تھیٹر کو فارسی میں "تیاتر" کے روپ میں داخل کر لیا ہے ۔

دائرہ نما) ہے ۔ سنسکرت ''کشمیر'' کا تلفظ ''کمیر'' اور ''کامیر''[۱]، ویدک ''سکمبھ'' کا ابتدائی تلفظ ''کھم'' (کھا)، ویدک ''ستمبھ'' کا تلفظ ''تھم''، ''تھا''، ویدک ''یمنا'' کا تلفظ ''جمنا'' ہے ۔ اس طرح لپیوں کی بدولت دنیا کی مختلف زبانوں کا ابتدائی تلفظ اب آ کر کچھ کا کچھ ہو گیا ہے ۔

زبان اور ادب

عام مشاہدہ ہے کہ تقریر اور تحریر میں دو مختلف زبانیں استعمال ہوتی ہیں یعنی بھاشا اور ادب ۔ ہر بولی جانے والی زبان (بھاشا) ہر زمانے میں اپنی تحریری شکل (ادب) سے کسی نہ کسی حد تک ضرور مختلف رہی ہے، وجہ یہ ہے کہ ہم جو کچھ بولتے ہیں اسے تحریر میں من و عن منتقل نہیں کرتے ۔ ادب میں بھاشا سے زیادہ قطعیت اور کاری گری دکھائی جاتی ہے ۔ اس میں ہم اپنی بول چال کے بہت سے نامکمل فقرے، عوامی محاورے، بازاری الفاظ، جہلا کے گرامری روپ اور معنوی ترکیبیں ترک کر دیتے ہیں اور زبان کو ''چھٹی ''چھٹائی، ''ترشی ''ترشائی شکل میں پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں ۔ اس کے علاوہ ادب میں جمالیات اور اخلاقیات کی بھی بہت سی قیود عائد کر لی جاتی ہیں اور الفاظ کی ثقالت اور سبکی، گنور پن اور شرافت، دیدہ زیبی اور کراہت، فصاحت اور سوقیانہ پن وغیرہ مختلف صفات پر بحث ہونے لگتی ہے اس لیے بھاشا کی سادگی کی جگہ رنگینی اور پیچیدگی اور فطری معصومیت کی جگہ بناوٹ اور تصنع ادب کا طرۂ امتیاز بن جاتا ہے اور یوں کسی زبان کے ادب سے اس کے حدود کا صحیح تعین ناممکن ہے ۔

ادب سے بھاشا کی اصلی آوازوں تک پہنچنا بھی سخت دشوار ہوتا ہے ۔ کیونکہ آواز کا سننے والے کے کان سے براہ راست تعلق باقی نہیں رہتا بلکہ لپی کا قدم درمیان میں آ جاتا ہے اور لپیاں سب کی سب اتنی ناقص ہیں کہ آوازوں کو پوری دیانت داری کے ساتھ محفوظ نہیں کر پاتیں

---

۱ ۔ اس سے مشابہ اسی علاقے کا ایک اور لفظ ''ہامیر'' موجود ہے جو رگ وید میں ''ہادیر'' لکھا ہوا ملتا ہے ۔

اور ان میں کوئی ایسی آفاقی روایت بھی نہیں ملتی جس کی مدد سے وہ ہر ملک اور ہر عہد میں یکساں طور پر آوازیں ادا کر سکیں۔ ایک زمانے یا ایک علاقے میں بھاشا کی آوازوں کے لیے جو علامات (حروف) مخصوص اور متعین کی جاتی ہیں وہ مکان و زمان کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ بدلتی چلی جاتی ہیں۔ مثلاً اردو کی تحریر میں الف ابتدائی اور ہمزہ درمیانی ہوتی ہے لیکن دکنی ادب میں ہمزہ بھی ابتدائی نظر آتی ہے۔ دیوناگری کے مخطوطات میں ایک ہی آواز کے لیے حرف کی سات سات آٹھ آٹھ شکلیں ملتی ہیں۔ رگ وید کی دیوناگری تحریر میں ایک آواز کے لیے کتنے ہی حروف سامنے آتے ہیں اور ایک حرف کتنی ہی آوازوں کی نیابت کرتا ہے۔ یہی حال اوستا کا ہے اور یہی کیفیت قدیم یونانی اور لاطینی میں بھی پائی جاتی ہے۔ یہی حال رومن لپی کی ناہمواری کا ہے بلکہ اس کی ناہمواری تو سب لپیوں پر فوق لے گئی ہے۔

ہندوستانی کے برعکس قدیم ہند یورپی زبان میں لفظ کا آخری حرف متحرک بھی ہوتا تھا لیکن لپیوں کی بدولت آج فارسی کے کسی لفظ کے آخر میں حرکت نظر نہیں آتی۔ ممکن ہے پہلوی کا آخری کاف جو فارسی میں ہائے ہوز بن گیا ہے وہی آخری زیر ہو جو آج فارسی میں ڈھونڈے نہیں ملتا۔ یا وہ فارسی کی ہائے ہوز ہو جو لفظ کے آخر میں قالتو نظر آتی ہے جیسے کدہ (کد) میں۔ آج کی فرانسیسی اور دوسری زبانوں کی طرح سمیرین زبان کی یہ ایک اہم خصوصیت تھی کہ اس میں آخری اسر (حرف صحیح) ساقط ہو جاتا تھا لیکن جب بعد میں آنے والا لفظ حرف علت سے شروع ہوتا تھا تو یہ اپنی جگہ باقی رہ جاتا تھا۔ یہ خصوصیت اتنی عام تھی کہ آخری اسر (حرف صحیح) اگرچہ بولا نہیں جاتا تھا پھر بھی ایک جداگانہ صوتی علامت سے ظاہر کیا جاتا تھا[1]۔ ہند یورپی زبانوں میں بھی آخری اسر (حرف صحیح) کا سقوط عام ہے اس لیے قیاس کہتا ہے کہ فارسی بندہ کی ہائے ہوز اور پہلوی بندک کا آخری کاف زبر کے نمائندے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب اس لفظ پر علامت جمع "آں"

۱۔ ہسٹری اینڈ اوریجن آف لینگویج، ص ۸۲۔

بڑھاتے ہیں جو حرف علت (سر) سے شروع ہوتی ہے تو کاف پہلوی کو برقرار رکھ کر "بندگاں" بنا لیتے ہیں۔ غرض لپی کا قدم درمیان میں آ جانے کے باعث قدیم ہند یورپی زبانوں کی بہت سی خصوصیات سے ہم ابھی تک بے خبر ہیں۔

زبان کی تبدیلیاں

زبان میں جو تبدیلیاں پیدا ہوتی ہیں ان کی دو قسمیں ہیں۔ ایک خارجی اور دوسری داخلی۔ خارجی تبدیلی اس وقت عمل میں آتی ہے جب دو زبانیں ایک دوسرے کے قریب آتی ہیں اور ان میں نہ صرف الفاظ کا بلکہ آوازوں کا بھی لین دین ہونے لگتا ہے۔ اس برصغیر کی زبانیں اس تبدیلی کے کثیر تعداد ثبوت فراہم کرسکتی ہیں جب آریا قوم اپنی مادری زبان ایرانی کے ساتھ ہندوستان میں داخل ہوئی اور پھر یہیں رہ بس گئی تو فارسی کے بہت سے الفاظ دیسی زبانوں نے اپنالیے اور جب ان کے ہزاروں سال بعد دوبارہ مسلمان ایران سے وہی فارسی بولتےہوئے آئے تو دیسی یعنی ہندوستانی زبانوں میں مستعار الفاظ کی تعداد اور بڑھ گئی بلکہ اس مرتبہ اردو نے خ، ز، ش، غ، ف اور ق کی مفرد آوازیں بھی اپنی قدیم آوازوں کی جگہ اپنے الفاظ میں داخل کر لیں جیسا کہ تلفظ کے بگاڑ میں بیشتر بیان کیا جا چکا ہے۔ زبانوں کا یہ میل سیاسی حملوں، تجارتی سفروں، تیرتھ یا تراؤں اور نقل وطن کی صورت میں ہوتا ہے۔ چنانچہ آریاؤں اور مسلمانوں کے ہندوستان پر سیاسی حملوں کے اثرات کا ذکر میں کر چکا ہوں۔ گجرات کے ناگر برہمنوں میں برج بھاشا کے اثرات تیرتھ یا تراؤں کی بدولت پہنچے اور اب پاکستان میں اردو پر پنجابی ور پشتو وغیرہ کے اثرات نقل وطن کے نتیجے کے طور پر آئندہ رونما ہوں گے۔

زبان کی داخلی تبدیلی تقلیدی نمونوں کے پیش نظر پیدا ہوتی ہے۔ جب مروجہ الفاظ کی مثالیں سامنے رکھ کر دوسرے الفاظ تیار کر لیے جاتے ہیں۔ مثلاً اردو میں لفظوں پر "اکڑ" کا لاحقہ اضافہ کرکے اسماء بنانے کا قاعدہ ہمیشہ سے چلا آ رہا ہے جس کے ثبوت میں "بھلکڑ" (بھول سے)، سدھکڑ (سادھو سے)، "گدکڑ (گود سے)" وغیرہ الفاظ

ہمارے سامنے ہیں ۔ ان مثالوں کی روشنی میں مزید اسما "پہکڑ" (پی یعنی پینا سے) چلکڑ (چل سے) وغیرہ بھی تیار کیے جا سکتے ہیں اور یہ نئے روپ زبان اردو کے تغیر کا باعث بن سکتے ہیں ۔

ہم ان دونوں قسم کی تبدیلیوں کو زبان کی توسیع اور فروغ سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں کہ اس طرح اس کے ذخیرۂ الفاظ میں اضافہ ہوتا ہے اور ایک خیال کو ظاہر کرنے کے لیے وسیلے یا لفظ ہاتھ آ جاتے ہیں ۔ انگریزی زبان کی مثال ہمارے سامنے موجود ہے جس میں بہت سی زبانوں کے الفاظ مستعار لیے گئے ہیں اور اس لیے آج وہ دنیا کی نہایت باثروت زبان سمجھی جاتی ہے جس میں خیال کے نازک سے نازک فرق کو بھی ظاہر کرنے کی پوری صلاحیت موجود ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہمیں یہ بھی نہیں بھولنا چاہیے کہ ذخیرہ اندوزی اور استحصال دولت کی یہ ہوس بعض اوقات مستعار الفاظ کے لیے ترجیحی رجحان بھی پیدا کر دیتی ہے ۔ لوگوں کو دوسری زبانوں کے زیادہ سے زیادہ الفاظ کے استعمال کا اس قدر چسکا پڑ جاتا ہے کہ وہ اپنی زبان کے ان الفاظ کو بھی جو مستعار الفاظ کے مفاہیم کو بڑی اچھی طرح ادا کر لیتے ہیں ، پس پشت ڈال دیتے ہیں ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کچھ عرصے کے بعد وہ طاق نسیاں کی زینت بن کر زبان سے خارج ہو جاتے ہیں ۔ جس سے زبان کی مقدار وہی رہتی ہے اور نتیجے میں لوگ صرف ایک آدھ کچری اور مصنوعی زبان بولنے سنائی دینے لگتے ہیں ۔ آج پاکستان میں لوگ اردو کو جس طرح عربی فارسی الفاظ سے بوجھل بنا بنا کر غیر شعوری طور پر عوام سے دور کر رہے ہیں ۔

زبان کی قسمیں

اس وقت دنیا میں جتنی زبانیں بولی جا رہی ہیں بناوٹ کے اعتبار سے ان کو چار گروہوں میں بانٹا جا سکتا ہے[1] ۔

---

۱ ۔ ہندوستانی لسانیات کا خاکہ ، ص ۸۵ ، مصنفہ جان بیمز ، مترجم پروفیسر احتشام حسین ۔

(۱) افتراقی

اس زبان کے تمام الفاظ الگ الگ ہوتے ہیں ۔ بناوٹ کے لحاظ سے ان میں سے ہر ایک مکمل اکائی ہے جس کا دوسرے سے کوئی تعلق نہیں ہوتا ۔ یعنی اس کا ایک لفظ دوسرے سے نہیں بنتا ، نہ اسے سابقے ، لاحقے اور خاتمے ہی لگائے جاتے ہیں ۔ چینی زبان اس کی مثال ہے جس کے ہزاروں الفاظ ایک دوسرے سے الگ تھلگ اپنا اپنا جداگانہ اور آزاد وجود رکھتے ہیں ۔

(۲) ترکیبی

اس زبان میں حسب ضرورت ایک لفظ پر دوسرے لفظ لاحقے ، سابقے اور خاتمے لگاتے چلے جاتے ہیں ۔ اس کے باوجود مرکب لفظ کا ہر جزو اپنی اپنی جگہ بدستور قائم رہتا ہے کہ جب چاہیں اُسے آسانی سے الگ کر لیں ۔ ترکی زبان اسی قسم سے تعلق رکھتی ہے ۔

(۳) اشتقاقی

اس زبان میں ایک لفظ سے بیشتر سُر (اصواتِ علت) بدل بدل کر کتنے ہی لفظ بنائے جا سکتے ہیں لیکن ان سب میں ایسے تین یا چار حروف صحیحہ (یعنی اسر) مشترک رہتے ہیں جنھیں مادہ کہتے ہیں ۔ چنانچہ لفظ کو اس طرح بدلا جا سکتا ہے کہ اس کے مادے میں کمی نہیں آنے پاتی ۔ مثلاً عربی کے مادے س ، ک ، ن سے سکون ، ساکن ، مسکن ، مسکین ، مسکونہ اور ان کی جمعیں وغیرہ کتنے ہی الفاظ تیار ہوتے ہیں لیکن ان سب میں تینوں حروف یعنی س ، ک ، ن برابر موجود ہیں ۔ عبرانی ، عربی ، آرامی وغیرہ تمام سامی زبانیں اسی گروہ میں شمار ہوتی ہیں ۔

(۴) تحلیلی

اس زبان میں مادہ بھی ہوتا ہے اور اس پر لاحقے ، سابقے وغیرہ بھی جوڑے جاتے ہیں لیکن مرکب لفظ میں کچھ ایسی داخلی تبدیلی ہوتی ہے جس سے وہ مختصر ہو جاتا ہے اور اس کے اجزا کی ابتدائی شکل باقی نہیں رہتی ۔ پھر بھی اس کا مادہ قابل شناخت رہتا ہے ۔ مثلاً بھاٹی

(آگرے میں پھول والوں کا ایک بازار) = پھول + اٹی (موجودہ ہٹی بمعنی بازار) ، کٹھ پھوڑا = کاٹھ + پھوڑ + آ وغیرہ ۔ برصغیر پاک بھارت کی تمام زبانیں اور مغربی یورپ کی زبانیں اسی ذیل میں آتی ہیں ۔

آغاز زبان کے نظریات

زبان کی پیدائش کے متعلق مغربی محققین نے کوئی آٹھ نو نظریات پیش کیے ہیں لیکن یہ سب کے سب کمزور اور ناقابل قبول ہیں ، دراصل زبانوں کی پیدائش کسی ایسے زمانہ قدیم میں ہوئی ہے کہ الفاظ کے سوا اس تک رسائی حاصل کرنے کا ہمارے پاس اور کوئی ذریعہ ہی نہیں رہا ۔ پھر یہ مسئلہ کسی ایک ہی زبان کے مطالعہ کرنے سے بھی حل نہیں ہو سکتا ۔ بلکہ اس کے لیے مختلف زبانوں کے بنیادی مادوں کی مشترک خصوصیات پر غور کرنا ضروری ہے ۔ ان مشکلات کے باعث اب مغربی محققین نے آغاز زبان کی بات کرنا ہی ترک کر دیا ہے کیونکہ یہ مسئلہ لاینحل ہے اور اس کے حل میں تخیل کی پرواز کو بہت دخل ہے ۔

لسانیات کی شاخیں

ماہرین لسانیات نے اس علم کو تین شاخوں میں تقسیم کیا ہے ۔

(۱) تشریحی لسانیات ۔

(۲) تاریخی لسانیات ۔

(۳) تقابلی لسانیات ۔

(۱) تشریحی لسانیات زبان کی زندگی کے کسی مقررہ عہد میں اور مخصوص وقت پر اس کی بناوٹ کا مطالعہ کرتی ہے اور اسے مختلف اجزا میں تقسیم کرکے ان کی تشریح کرتی اور ان کے وظائف بیان کرتی ہے ۔

(۲) تاریخی لسانیات زبان کی ابتدا سے آج تک اس کی زندگی کی جملہ منزلوں کا موازنہ کرتی اور اس کی عہد بہ عہد تبدیلیوں کا سراغ لگاتی ہے لیکن زبان کی بوقلمونی اور رنگا رنگی کو جو اس کی ایک عالمگیر اور ہمہ وقتی خصوصیت ہے ۔ لوگ غلطی سے اس کی عہد بہ عہد تبدیلیاں سمجھ بیٹھے ہیں ۔

(۳) تقابلی لسانیات ۔ لسانیات کی وہ شاخ ہے جو متحد الاصل زبانوں کے باہمی تعلق اور رشتے کا سراغ لگا کر دنیا کی زبانوں کو مختلف خاندانوں میں تقسیم کرتی ہے لیکن یہ خیال کہ ابتدائے آفرینش میں پوری دنیا پر کوئی ایک زبان چھائی ہوئی تھی جو آگے چل کر نسل انسانی کے مختلف گروہوں، قبیلوں اور قوموں میں تقسیم ہو جانے کے باعث مختلف اور ممیز شاخوں میں بٹ گئی اور یوں وحدت سے کثرت کا ظہور ہو گیا فی الحال ایک افسانے سے زیادہ نہیں - دراصل وحدت لسانی کی بات حقیقت کے مقابلے میں انسانی تخیل کی پرواز ہی معلوم ہوتی ہے - زبان کے طالب علم کے پاس کم از کم اس وقت ایسی کوئی شہادت موجود نہیں ہے جس سے کسی قدیم زمانے میں وحدت لسانی ثابت کی جا سکے - اس سلسلے میں بعض لوگوں کا یہ بھی خیال ہے کہ ذیلی بولیوں کا فرق آبادی کی نقل و حرکت سے پیدا ہو گیا ہے لیکن اس کا بھی ابھی تک کوئی واضح اور مستحکم ثبوت سامنے نہیں آیا ہے -

زبانوں کے خاندان

محققین کی کوششوں سے مختلف زبانوں کے تقابلی مطالعے کے نتیجے میں دنیا کی زبانوں کو تیرہ خاندانوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے لیکن یہ تقسیم قطعی اور حتمی نہیں ہے - اس میں مزید تحقیقات سے آئندہ بھی ترمیم کے بہت کچھ امکانات ہیں - ان میں سب سے بڑا خاندان ہند یورپی یا ہند جرمنی کا ہے جس میں یونانی ، لاطینی ، فارسی ، اوستائی ، ویدک سنسکرت، یورپ کی دوسری زبانیں اور شمالی برصغیر کی تمام زبانیں شامل کرکے اسے بھاری بھر کم بنا دیا گیا ہے تا کہ وہ خاندان جس میں یورپ والوں بالخصوص جرمنوں کی زبانیں شامل ہیں دنیا بھر میں سب سے عظیم اور بزرگ نظر آئے - حالانکہ شمالی برصغیر کی زبانیں ایک علیحدہ ہی ہندوستانی یا ہندوی خاندان سے تعلق رکھتی ہیں - مغربی محققین کی یہ کوشش ایک سیاسی پہلو رکھتی ہے ۔

تقابلی لسانیات کی تاریخ

دنیا میں بالخصوص ہند یورپی خاندان السنہ میں تقابلی لسانیات کی ابتدا سراج الدین علی خان آرزو (۱۶۸۹ء تا ۱۷۵۶ء)[۱] سے ہوتی ہے جنھوں نے اپنی کتاب "نوادر الالفاظ" میں پہلی بار سنسکرت اور فارسی کا تقابل کرکے ان کی مشابہت کو "توافق لسانین" کے نام سے ظاہر کیا لیکن مغرب والوں کو سنسکرت کا علم پہلی بار ۱۷۸۶ء میں سرولیم جونس (۱۷۴۶ء تا ۱۷۹۴ء)[۲] کے ذریعے ہوا جس نے سنسکرت، لاطینی، یونانی، گاتھک اور کیلٹک کے متحدالاصل ہونے کی طرف واضح اشارہ کیا ہے۔ ہندوستان میں آرزو کی نشان دہی سے کسی نے بھی فائدہ نہیں اٹھایا، البتہ مغرب والوں نے جونس کی تحریر پر تقابلی لسانیات کی بنیاد رکھ کر باضابطہ تحقیق کا آغاز کر دیا۔ چنانچہ بوپ اور گرم کی تحقیقی کتابیں تین سال کے آگے پیچھے سے ۱۸۱۶ء اور ۱۸۱۹ء میں شائع ہوئیں۔ ان کے بعد دوسرے محققین میں شیگل، فان ہمبل، بینفے اور شلیکر کے نام خاص طور پر نمایاں ہیں۔

صوتی تبادل

ان لوگوں نے یورپ اور ایشیا کی کتنی ہی زبانوں کا تقابلی مطالعہ کرکے یہ نتیجہ نکالا کہ سنسکرت، ارمنی، یونانی، لاطینی، کیلٹک، جرمن، انگریزی، اسکینڈے نیویا کی زبان اور بالٹو سلاوی زبانیں ایک نہایت قدیم زبان سے پیدا ہوئی ہیں جو کسی عہد میں اسکینڈے نیویا اور ہمالیہ کے درمیان غالباً خلیج فن لینڈ کے قریب بولی جاتی تھی۔ اس زبان کو محققین نے کبھی ہند جنوبی، ہند جرمانی اور کبھی ہند یورپی کے نام سے یاد کیا ہے۔ اس تقابلی مطالعے میں انھوں نے یہ دیکھا کہ بعض زبانوں کی بعض آوازیں دوسری زبانوں میں نہایت باقاعدگی کے ساتھ دوسری آوازوں سے بدل جاتی ہیں۔ گرم نے اس تبدیلی کو ایک اصول کی شکل دے کر بتایا کہ قدیم ہند یورپی زبان کے مختلف شاخوں میں تقسیم

۱۔ تاریخ ادب اردو مرتبہ رام بابو سکسینہ۔

۲۔ لٹریری ہسٹری آف پرشیا، ص ۴۹۔

ہو جانے سے قبل اس میں مندرجہ ذیل تبدیلیاں پیدا ہو چکی تھیں ۔

(۱) ک ، ت ، پ = کھ ، تھ ، پھ یا خ ، ث ، ف

(۲) گ ، د ، ب = ک ، ت ، پ

(۳) گھ ، دھ ، بھ = گ ، د ، ب

لیکن ان زبانوں کے کچھ متبادل ایسے بھی تھے جن پر یہ اصول منطبق نہیں ہوتا ۔ ایسی متعدد بے ضابطگیوں کو کال ورنر اور کال برگ مین نے مخصوص لہجوں وغیرہ کی مدد سے دور کرنے کی کوشش کی ، پھر بھی بہت کچھ باقی رہ گئیں جو آج تک دور نہیں ہو سکیں[1] ۔

صوتی تبادل کے مفروضہ وجوہ

۱۸۷۵ء تک محققین نے ان باقی ماندہ صوتی تبدیلیوں کے اسباب تلاش کرنے کی بھی کوشش کی اور کہا کہ انسان جن آوازوں کے ادا کرنے میں دقت محسوس کرتا ہے انہیں بالقصد ترک کرکے ایسی آوازیں اختیار کر لیتا ہے جو نسبتاً آسانی سے ادا ہو سکیں ۔ کبھی انسان ناخوشگوار آوازوں کو خوشگوار آوازوں سے بدل لیتا ہے اور کبھی متکلم کی لاپرواہی اور سستی سے بھی آوازیں بدل جاتی ہیں ۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ آوازیں ادا کرتے وقت یا اس سے قبل بولنے والا انہیں بدلنے کا کوئی قصد نہیں کرتا، نہ اس میں ایسا کوئی فطری رجحان ہی نظر آتا ہے اور نہ آوازوں کے ادا کرنے میں اسے کسی دقت یا سہولت کا احساس ہی ہوتا ہے ۔ مثلاً اردو بولنے والوں کو مخفی نون (ں) کے تلفظ میں چاہے جتنی دقت ہوتی ہو راجستھانی، ہریانی، پنجابی، گجراتی، سندھی اور مغربی سرحدی والوں کو آج تک نہ کبھی اس نون سے یہ شکائت پیدا ہوئی اور نہ وہ اسے دندانی نون سے بدلنے پر آمادہ یا مجبور نظر آئے ۔ یہی بات آوازوں کی خوشگواری اور ناخوشگواری کے متعلق بھی کہی جا سکتی ہے دراصل اس قسم کے خیالات ادبی نقطۂ نظر سے ظاہر کیے جاتے ہیں ۔ زبان کی

---

۱ ۔ تفصیلات کے لیے دیکھیے میری زیر طبع کتاب "صوتی تبادل" ۔

فضا ادب کے مقابلے میں کہیں آزاد اور فطری ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زبان کا طالب علم شہری کی بہ نسبت دیہاتی، پڑھے لکھے کی بہ نسبت ان پڑھ اور دفتر کے بابو کی نسبت کھیت کے ہلواہے کی زبان کی طرف زیادہ رجوع کرتا ہے۔ اب رہی متکلم کی سستی اور لاپروائی تو یہ ایک فرد واحد کا ذاتی عمل ہے۔ جس کا سبب اس کی غیر معیاری صحت جسمانی میں تلاش کیا جا سکتا ہے لیکن یہ خود کسی زبان کے صوتی تبادل کا سبب نہیں بن سکتا۔

غرض محققین نے صوتی تبادل کے جو وجوہ تلاش کیے ہیں وہ درست نہیں ہیں۔ حقیقت میری نظر میں صرف اتنی ہے کہ ہر زبان میں واضعین زبان نے صوتی تبادل کے کچھ اصول رکھے ہیں۔ جن کی بدولت زبان پھلتی پھولتی اور فروغ و نشوونما پاتی ہے۔ صوتی تبادل کوئی حادثہ نہیں ہے جس کا سبب زبان سے باہر تلاش کیا جائے۔ یہ اصول زبان کے ضمیر میں شامل ہے۔[۱] میرا مشاہدہ بتاتا ہے کہ مغربی محققین جب کسی لسانی مسئلے کا حل زبان سے باہر تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو انھیں اپنے مقصد میں ناکامی ہوتی ہے۔

انہی ناکامیوں کے پیش نظر ان لوگوں کا خیال ہے کہ ہند یورپی زبانوں میں صوتی تبادل کو سمجھنے کے لیے ہمارے پاس قطعی اور حتمی شہادت نہیں ہے اور نہ اس کی نوعیت کو سمجھنے ہی کے لیے ہمیں کوئی ذرائع حاصل ہیں۔ ایسی صورت میں جب کہ ان زبانوں کے تقابلی مطالعے سے ابھی تک بہت کم مفید مطلب مواد حاصل ہو سکا ہے۔ لسانی مسائل کے حل کی تلاش فی الحال ملتوی کر دی جائے اور ان زندہ زبانوں کے مطالعے پر توجہ مرکوز کی جائے جو ہمارے گرد و پیش بولی جا رہی ہیں کیوں کہ انھیں کی آوازیں ہمارے قابو میں ہیں اور انھیں کے مطالعے سے ہم تقابلی مطالعے کے طریقے متعین کر سکتے ہیں۔

تجرباتی صوتیات

انہی خیالات کے باعث عصر حاضر میں لسانیات کی ایک نئی

۱۔ تفصیلات کے لیے دیکھیے میری زیر طبع کتاب "صوتی تبادل"۔

شاخ تجرباتی صوتیات بھی پیدا ہوگئی ہے جس میں مخارج کے ساتھ ساتھ آوازوں پر تحقیق ہو رہی ہے اور اس مقصد کے لیے نہایت اعلیٰ قسم کے حساس آلات ایجاد کیے گئے ہیں جن سے معلوم ہوا ہے کہ ایک شخص دو مختلف اوقات میں ایک آواز کو سخت کوشش کے باوجود یکساں طور پر ادا نہیں کر سکتا اور نہ دو اشخاص ایک آواز کو ایک ہی طرح ادا کر سکتے ہیں اور یہ دوسری بات تو اس قدر واضح ہے کہ ہم لوگ کسی آلے کے بغیر بھی دو مختلف آدمیوں کو محض ان کی آوازوں ہی سے پہچان لیتے ہیں۔ اس کے باوجود زبانوں کے اس صوتی تبادل کی تشریح جو تقابلی لسانیات کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ بنی ہوئی ہے ابھی تک تجرباتی صوتیات سے بھی نہیں ہو سکی ہے۔ اس تجرباتی صوتیات کی مدد سے محض بچے پڑھائے جا سکتے ہیں اور غیر زبان والوں کو انگریزی آوازوں کی صحیح صحیح ادائیگی ہی سکھائی جا سکتی ہے۔ اس سے اتنے وسیع پیمانے پر آوازوں کے اس قدر شدید نوعی اختلافات کی تشریح نہیں ہو سکتی۔ میرے نزدیک اس الجھن کو دور کرنے کے لیے تقابلی لسانیات دو خاص پہلوؤں پر توجہ مرکوز کرنے کا تقاضا کرتی ہے۔

(۱) تلفظ اور لپی کے قدیم باہمی تعلقات کی بازیابی

(۲) مقامی اثرات کی نشاندہی

تلفظ اور لپی

تلفظ اور لپی کا مخصوص تعلق مکان و زمان کے فاصلے کے باعث نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے اور جب ملفوظی اور مکتوبی روپوں میں سے صرف مکتوبی روپ ہمارے سامنے رہ جاتے ہیں تو تلفظ بھی بگڑ جاتا ہے۔ لہٰذا صحیح طریقہ یہ ہے کہ موجودہ آوازوں کو جو ہمارے گرد و پیش بولی جا رہی ہیں مستند مان کر قدیم تحریروں کا مطالعہ کیا جائے اور یوں ان مختلف تحریروں اور لپیوں کے اصولِ کتابت معلوم کیے جائیں اور حرف و صوت کا ابتدائی تعلق تلاش کیا جائے۔ مثلاً جب عربی کے یعقوب، یوسف، یوحنا جیسے ناموں کو رومن لپی کے جیکب جوزف اور جون کے روپ میں دیکھا جائے تو یقین کر لیا جائے کہ یہ

بعض لپیوں کا اختلاف ہے جن میں سے ایک لپی نے قدیم آواز کو ی سے اور دوسری نے "جیم" سے قلم بند کیا ہے اور پھر دوسری شہادتوں کو دیکھنے کے بعد یہ فیصلہ کیا جائے کہ جس لپی سے دوسرے روپ حاصل ہوئے ہیں اس میں "ی" کی آواز کے لیے جے (J) کا حرف مقرر تھا اور جب ایک آواز کے لیے کتنے ہی متبادل حروف نظر آئیں یا کئی آوازوں کے لیے ایک ہی حرف نظر آئے تو یہ سمجھ لیا جائے کہ یہ آواز مختلف لپیوں میں تقسیم ہو کر ہم تک پہنچی ہے۔ مثلاً اردو کا لفظ چاندی "رگ وید میں" سانس لکھا ہوا ملتا ہے جس میں ایک ہی حرف "س" اُردو کے "چ" اور "د" دونوں کی نمائندگی کر رہا ہے یا رگ وید کا مہاپران "ڈھ" جو "ڈھ" سے بھی بدل جاتا ہے فارسی کے مختلف مرکبات "شت"، "خت" وغیرہ کے لیے آتا ہے مثلاً رگ وید "گولھ"، "گوڈھ" = سنسکرت "گوڑھ" = فارسی "گوشت" (چھپا ہوا)، رگ وید "درلھ"، "درڈھ" = سنسکرت درڑھ = فارسی "درشت" (مضبوط)۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ رگ وید کا متن کئی لپیوں سے گزر کر ہم تک پہنچا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی عین ممکن ہے کہ بول چال کا لفظ اتنی مدت میں مختلف اسباب کے تحت اپنا ابتدائی تلفظ بدل چکا ہو۔ ایسی صورت میں جب مختلف زبانوں کے روپوں سے اس کا موازنہ کیا جاتا ہے تو اس کا تلفظ سامنے آ جاتا ہے اور ان اسباب کا بھی پتا لگ جاتا ہے جنھوں نے اس کا صحیح تلفظ بگاڑ دیا ہے لیکن ایسے الفاظ کی تعداد بہت کم ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آوازیں کاغذات کی بہ نسبت انسانوں کی زبانوں پر نہایت صحت کے ساتھ منتقل ہوتی آئی ہیں۔ چنانچہ اب جو تلفظ قدیم کے مقابلے میں بدلا ہوا ملتا ہے اس کے پیچھے بھی کسی لپی کا ہاتھ نظر آتا ہے مثلاً ویدک و سنسکرت اہم (ضمیر واحد متکلم۔ میں) = اوستا ازم = فارسی قدیم ادم = یونانی ایگو، ایگون = لاطینی ایگو۔ اس تقابل سے معلوم ہوتا ہے کہ اس لفظ کا صحیح تلفظ ازم یا ازو تھا جسے لاطینی لپی کے باعث آج کل انگریزی میں "ایگو" لکھا بولا جا رہا ہے۔ اس کا مزید ثبوت یہ ہے کہ یونانی کا گاما اور لاطینی "جی" جابجا فارسی "ز" کی نمائندگی کرتا ہے مثلاً فارسی زانو = لاطینی جینو =

یونانی گونو = سنسکرت جانو۔ فارسی زن (عورت) = یونانی گنے = روسی ژینا = سنسکرت گنا ۔ فارسی مرز ۔ (بوم) = لاطینی مرگو وغیرہ ۔

تحقیق کے اس پہلو سے زبانوں کی موت اور زندگی کا سوال بھی وابستہ ہے ۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ کچھ زبانیں جو کسی قدیم زمانے میں بولی جاتی تھیں اب مردہ ہو چکی ہیں ۔ یعنی وہ اب کہیں بولی نہیں جاتیں ۔ ان زبانوں میں لاطینی اور ویدک و سنسکرت کا شمار ہوتا ہے جو قدیم ہند یورپی زبان کی شاخیں تھیں ۔ اس کے علاوہ قدیم یونانی ، لاطینی ، سنسکرت اور اوستائی کے موازنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم ہند یورپی کی ان شاخوں میں بھی بہت سی تبدیلیاں ہوئی ہیں حالانکہ سامیؔ زبانیں چار ہزار سال سے اسی طرح چلی آ رہی ہیں[۱]۔ نہ ان میں سے کوئی زبان مری اور نہ آج تک ان میں کوئی تبدیلی ہوئی ۔ اس لیے یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر زبان میں فنا ہونے یا بالکل بدل جانے کے رجحانات بھی ہوتے ہیں تو سامی زبانیں اب تک ثبات و دوام کی راہ پر کیوں گامزن ہیں ؟ اس کے جواب کے لیے ہمیں اپنی تحقیق کا رخ دوسری طرف موڑنا ہوگا ۔

قدیم ہند یورپی زبان کی مختلف شاخوں میں تلفظ اور لپی یعنی حرف و صوت کے قدیم باہمی تعلق کی بازیابی سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قدیم زبانیں نہیں قدیم تحریریں ہیں ۔ جن میں وہی زبانیں جو آج کل بھی بولی جا رہی ہیں کتابت کے خاص اصولوں کے تحت قلم بند کر دی گئی ہیں ۔ اس سلسلے میں ایک اہم نکتہ یہ ہے کہ سیاسی ، معاشرتی یا مذہبی وجوہ کی بنا پر تاریخ کے کسی ایک مخصوص عہد میں کسی ایک علاقے کی زبان ابھر کر اوپر آ جاتی ہے اور پھر پورے ملک پر چھا جاتی ہے مثلاً اوستائی جو شمالی باختر کی زبان بتائی جاتی ہے زرتشتی مذہب کی بدولت فروغ پا گئی ۔ اب اس کی تحریریں تو اوستا وغیرہ کی شکل میں ہم تک آ پہنچی ہیں لیکن ہمیں ان دوسری زبانوں کا اتنا علم نہیں ہے جو ایران کے دوسرے علاقوں میں اس وقت بولی جا رہی تھیں اور اب بھی بولی

---

۱ ۔ ہسٹری اینڈ اوریجن آف لینگوئج ، ص ۷۶ ، ۲۲۰ ۔

جا رہی ہیں - مثلاً ویدک کے حالیہ تمام کا ابتدائی الف سمرقند کے نزدیک وادیٔ یغناب کی جدید سغدی بولی میں آج بھی استعمال ہوتا ہے[1]۔ جیسے ویدک ابھوت (وہ ہوگیا) اور سغدی از بیم (میں نے پکارا) وغیرہ اسی طرح ویدک اہم (ضمیر واحد متکلم میں)، اوستائی ازم، یونانی ایگون، لاطینی ایگو، انگریزی ایگو ایرانی کی تالش بولی میں آج بھی "از" سنائی دیتا ہے[2]۔ اردو ہی کی مثال لے لیجیے کہ ہمیں اس اردو کا علم بھی ہوتا ہے جو دہلی میں ہریانی سے متاثر ہوئی تھی اور اس کا بھی پورا پورا علم ہے جو لکھنؤ میں اودھی کے زیر اثر آئی لیکن اس اردو کی خصوصیات اور ذخیرۂ الفاظ کا پورا علم نہیں رہا جو دہلی پہنچنے سے قبل آگرے میں اور نواح آگرہ میں بولی جاتی تھی اور آج بھی بولی جارہی ہے کیونکہ اس کا ادب اتنی مقدار میں ہمیں دستیاب نہیں ہوسکا جتنا دہلوی اور لکھنوی اردو کا۔

مقامی اثرات

مغربی محققین نے بعض زبانوں کی مشابہت پر انھیں ایک خاندان میں شمار کر لیا ہے۔ مثلاً ویدک، سنسکرت، فارسی، یونانی اور لاطینی وغیرہ بہت سی زبانوں کا ایک خاندان ہند یورپی قرار دے دیا اور ان کے اختلافات کا جواز پیدا کرنے کے لیے ان کے مشترک فرضی روپ گھڑ گھڑ کر ایک نام نہاد قدیم ہند یورپی زبان کا ڈھانچا کھڑا کر لیا۔ اس کوشش میں ان کے پیش نظر یہی بات رہی کہ آریا وسطِ ایشیا سے اٹھ اٹھ کر جہاں جہاں بھی پہنچے اپنی قدیم آبائی زبان ساتھ لے گئے جو آگے چل کر مختلف زبانوں میں تقسیم ہو گئی لیکن ان مختلف گروہوں کی زبان میں جو مختلف ممالک میں پہنچے یہ اختلافات کیسے پیدا ہو گئے؟ اس طرف انھوں نے مطلق توجہ نہیں دی۔ ان اختلافات کی تشریح کے لیے ان ملکوں کے مختلف طبعی حالات (میدان، پہاڑ،

۱۔ لیگے سی آف پرشیا، ص ۱۸۰۔

۲۔ لٹریری ہسٹری آف پرشیا جلد اول، ص ۲۷۔

جنگل ، دریا وغیرہ) یا موسمی تغیرات (گرمی ، سردی ، طوفان ، بارش وغیرہ) جیسے غیر اہم عناصر کا سہارا کبھی بھی کافی نہیں ہو سکتا ۔

انہوں نے اس باب میں جس اہم عنصر سے چشم پوشی کی ہے وہ دراصل ان ممالک کی قدیم زبانیں ہیں جو آریوں کے وہاں پہنچنے سے پیشتر رائج تھیں ۔ جس طرح ایک زبان اپنی سرزبوم سے نکل کر دوسرے مقام کی زبان کو متاثر کرتی ہے اسی طرح وہاں کی مقامی زبان سے خود بھی اثر قبول کرتی ہے ۔ چنانچہ آریا جو اپنی زبان لے کر یونان ، ایران اور ہندوستان پہنچے اور آخر میں وہیں رہ بس گئے کسی طرح بھی ان ممالک کی رائج الوقت زبانوں سے الگ تھلگ نہیں رہ سکتے تھے ۔ اس لیے میرے نزدیک ہند یورپی زبان کی بازیابی کا طریقہ یہ ہونا چاہیے کہ ایک طرف تو ان زبانوں کی قدر مشترک کو الگ کر لیا جائے کیونکہ وہ یقینی طور پر آریوں کی آبائی زبان کا اثاثہ ہے ۔ دوسری طرف ان کے باقی ماندہ حصوں کو کھنگال کر مقامی اثرات نکال دیے جائیں اور پھر جو کچھ بچ رہے اس سے قدیم ہند یورپی کی رہی سہی کمی پوری کر لی جائے کیونکہ یہ عین ممکن ہے کہ قدیم ہند یورپی کی بعض خصوصیات ایک ملک میں متروک ہوگئی ہوں اور ان کی جگہ مقامی خصوصیات نے لے لی ہو لیکن جو دوسرے مقام پر اب بھی باقی ہوں ۔

اس وقت تک ان لوگوں نے قدیم ہند یورپی زبان کا جو ڈھانچا تیار کیا ہے اس میں سنسکرت کے واسطے سے بہت سی ہندوستانی یعنی ہندوی خصوصیات بھی پہنچ گئی ہیں کیونکہ آریاؤں کی ویدک زبان میں کم اور کلاسیک سنسکرت میں دیسی زبانوں کے بے شمار صوتی ، حرفی اور نحوی روپ جابجا جھلک رہے ہیں ۔ مثلاً ہمارے نحی حروف اور سہاپران جو نہ فارسی میں ملتے ہیں اور نہ یونانی میں یقینی طور پر قدیم ہند یورپی کی آوازیں نہیں ہیں ۔ یہ لوگ جن کو اس قدیم زبان کے سہاپران کہتے ہیں وہ خ ، غ اور ف ہیں جو ہماری کھ ، گھ اور پھ کی آوازوں سے قطعی مختلف ہیں ۔ اسی طرح وہ ٹ ، ڈ ، ڑ کی آوازیں جو سرزمین پاک و ہند کی ملکیت ہیں اور فارسی اور یونانی میں نہیں ملتیں، قدیم ہند یورپی زبان کا مال نہیں ہو سکتیں ۔ البتہ لاطینی میں ان

کا وجود بتاتا ہے کہ یہ وہاں کی بھی کسی مقامی زبان کی دین ہیں ۔

غرض دو لسانی نمونوں میں مشترک قدروں کو دیکھ کر انھیں رشتے دار تو کہا جا سکتا ہے لیکن ان کے بنیادی اختلافات کی موجودگی میں انھیں ایک نہیں کہا جا سکتا ۔ ایسی صورت میں ہم ویدک اور سنسکرت کو فارسی کی رشتے دار تو کہہ سکتے ہیں لیکن دونوں کو مماثل نہیں کہہ سکتے ، اس لیے کہ ویدوں میں پاک و ہند کی قریب قریب اُن تمام زبانوں کے روپ ملتے ہیں جو آج اس برصغیر کے شمالی حصے میں بولی جا رہی ہیں ۔ ان میں سے میں نے خاص طور پر پنجابی ،گجراتی، راجستھانی ، مرہٹی ، اردو اور بنگالی کے روپ دیکھے ہیں ۔ یوں ویدک اور سنسکرت دونوں زبانیں ایرانی اور ہندوستانی (ہندوی) زبانوں کا آمیزہ ہیں ۔ اس لیے قدیم ہند یورپی زبان کا جو مفروضہ ڈھانچا مغربی محققین نے تیار کیا ہے وہ حد درجہ ناقص اور مصنوعی ہے ۔

(مطبوعہ : "سیپ" کراچی
مارچ، اپریل ۱۹۸۷ء)

بولی کیا ہے

بولی معنی دار آوازوں کی وہ ڈوری ہے جو لوگوں کو آپس میں باندھے رکھتی ہے ۔ اسے اکیلے پن سے بیر اور دکیلے پن سے پیار ہوتا ہے اور سبھا سجانے کو کم سے کم دو آدمی چاہتی ہے ۔ ایک بولنے والا دوسرا سننے والا ۔ آدمی اکیلا ہو تو اسے بولی سے کوئی کام نہیں ہوتا اور وہ اپنی چپ میں مگن رہتا ہے ہر دوسرے کو دیکھتے ہی اسے بولی کی سدھ آ جاتی ہے جو کوئی دس پانچ کے بیچ میں بیٹھ کر تھوڑی دیر کے لیے بھی چپ ہو جائے تو اسے یوں لگتا ہے جیسے دوسروں سے اس کا بندھن ٹوٹ گیا ہے اور وہ ان سب سے کٹ کر الگ جا پڑا ہے اس لیے وہ جھٹ پٹ پھر سے بول اٹھنے کو بے چین ہو جاتا ہے اور جو سب کے سب ہی اچانک چپ ہو جائیں تو ایک بھیانک سناٹا سا چھا جاتا ہے اور ہر ایک چاہ اٹھتا ہے کہ کوئی آواز ابھرے اور اس سناٹے کو چیر ڈالے جو اس کی چھاتی پر پہاڑ بن کر آ پڑا ہے کیونکہ بولی میں ہی ساتھ سنگت کا مزہ ہے اور بن بولے دسرات اکارت ہے ۔

بولی کا کام کیا ہے ؟ اس کے بارے میں لوگوں نے بہت سی باتیں کہی ہیں جنھیں آسانی سے چار بھانتوں میں بانٹا جا سکتا ہے :

(۱) بولی خبر دینے کی ایک کل ہے جس سے ساتھیوں کو اپنی پرائی باتیں بتائی جاتی ہیں ۔ سارے علم پڑھائے جاتے ہیں اور ان کے اصول دوسروں تک پہنچائے جاتے ہیں ۔ یہ کام بولی کے دوسرے سب کاموں سے بڑھا ہوا ہے ۔

(۲) بولی دوسروں میں اپنے ہی جیسے سوچ بچار جگانے کے بھی کام آتی ہے ۔ سیاسی پارٹیوں کے پروگرام ۔ ہر طرح کے پروپیگنڈے

اور اشتہار بازی اور لیڈروں کی تقریروں میں اسی سے کام لیا جاتا ہے ۔

(۳) بولی دوسروں کو گرمانے ، آکسانے اور ان کے بھاؤ جگانے کے بھی کام آتی ہے ۔ سڑک کے کنارے مجمع لگانے والے اسی کے سہارے لوگوں کی جیبوں سے پیسے نکلوا لیتے ہیں ۔ اس سے دوسرا آدمی ہمارا میت یا بیری بن جاتا ہے ۔

(۴) بولی کا ایک کام جمالیاتی بھی ہے ۔ اس میں ادب پیدا کیا جاتا ہے ۔ لوگ شعر کہتے ہیں یا شاعروں کے سے سوچ اور بھاؤ ظاہر کرتے ہیں ۔

یہ سب باتیں ٹھیک ہیں کہ بولی سے کبھی کسی کو خبر سنائی جاتی ہے اور سندیسے دیے جاتے ہیں ۔ کبھی کسی کو اپنا سوچ ساتھی بنایا جاتا ہے ۔ کبھی ڈر ، پیار ، بیر کے بھاؤ ابھارے جاتے ہیں اور کبھی حسن کو نکھارنے اور پچھوانے کا کام لیا جاتا ہے پر کبھی کبھی آدمی اپنے ساتھی سے ایسی باتیں بھی کر اٹھتا ہے جو بس کرنے کے لیے ہی کی جاتی ہیں اور جن کے کرنے سے کسی کو کوئی ٹوٹا نفع نہیں ہوتا ۔ ساتھیوں میں بیٹھ کر ادھر اُدھر کی گپیں ہانکی جاتی ہیں اور جو چٹکلے سنائے جاتے ہیں یا ریل کے ڈبے میں انجان لوگوں سے جو باتیں کی جاتی ہیں ان سے آدمی کا مطلب اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا کہ دوسرے کو دیکھ کر اس کا جی باتیں کرنے کو چاہنے لگتا ہے ۔ وہ انسان ہونے کے ناتے سے دسرات میں بولنے کے لیے بے بس ہو جاتا ہے اور اس لیے بولتا ہے کہ کھانا کھانے اور جوڑا کھانے کی طرح بولنا بھی اس کی ایک بڑی جبلت ہے اور جبلت کو کسی گھاٹے باڑھے کے حساب سے جانچنا ٹھیک نہیں اس لیے جو لوگ بولی کو ہمارے اور کاموں کے برابر جان کر اپنے آپ سے باہر اس کا کھوج لگانا چاہتے ہیں ۔ وہ میری سمجھ سے تو بھٹک رہے ہیں ۔

انیسویں صدی عیسوی میں پھھم والوں کا یہ مت تھا کہ بولی بھی جاندار ہوتی ہے اور آج بھی کچھ لوگ اس مت کو سینے سے لگائے چلے

آ رہے ہیں جب کہ یورپ پچھم کے عالموں کی بہت بڑی گنتی اب اس بات کو نہیں مانتی - آج جو لوگ بولیوں کی ماؤں اور بہنوں اور سوتی جیتی بولیوں کی بات کرتے ہیں وہ نری شاعری کرتے ہیں کیونکہ بولیاں نہ بیاہ رچاتی ہیں نہ بچے جنتی ہیں اور نہ آدمیوں کے سے گھرانے ہی رکھتی ہیں - گھرانے کے بول کے ساتھ ساتھ ایک پرکھے کا دھیان بھی چپکا ہوتا ہے جس سے سب گھرانے والے جنم لیتے ہیں اس لیے جب بولیوں کے گھرانوں کی بات کی جائے گی تو یہی سمجھا جائے گا کہ آج کی سب بولیاں کسی بہت پرانے زمانے میں ایک ہی بولی سے نکلی ہیں پر یہ بات غلط ہے اس لیے ملتی جلتی بولیوں کے جتھے کو مجازی معنوں میں ہی گھرانا کہا جا سکتا ہے - بولیوں کے گھرانے کی بات کو کچھ سہارا ڈارون کے مت سے بھی ملا تھا جو جانداروں کے ارتقا کی بات کرتا ہے اور یورپ میں جس کی انیسویں صدی کے بیچ میں بڑی دھوم تھی - انہیں دنوں ایک بڑے عالم اگست شلیکر نے بھی جو لسانیات اور نباتیات دونوں سے پیار رکھتا تھا اس سوچ کو بہت اچھالا اور لوگوں کو بہت بھٹکایا -

بولی جاندار نہیں جانداروں کا کام ہے ، پر یہ بے جان مشین بھی ہے جیسا کہ آج کل کے کچھ جانکاروں کا مت ہے - یہ کہتے ہیں کہ بولی ایک مشینی عمل اور جوابی عمل کے سوا اور کچھ نہیں ہے - یہ لوگ بولی کی جانچ پرکھ کے لیے سائنسی ڈھنگ چاہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس کے لیے بولنے والوں کو بولتے ہوئے سنا اور دیکھا جائے پر ہوتا یہ ہے کہ وہ آپ ہر بھانت کی لکھاوٹ سے کام لیتے ہیں - پھر وہ اس بات پر بھی دھیان نہیں دیتے کہ بولیوں کے معنی بھی ہوتے ہیں جنہیں سمجھنے اور سمجھانے کے لیے سوجھ بوجھ چاہیے جب کہ مشینی کام میں سوجھ بوجھ کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی -

الگ الگ بولیوں کے الگ الگ گن چاہے کچھ بھی ہوں پر سب بولیوں میں دو گن ایسے ملتے ہیں جن کے کارن انہیں بولی کہا جاتا ہے - ان میں سے پہلا ریت ہے جس سے بولی پھیلتی ہے اور اس کی عمر کی لکیر لمبی ہوتی چلی جاتی ہے پھر بھی ڈھانچا اپنی جگہ جوں کا توں رہتا ہے - اس کی آوازیں ، بول ، معنی ، لہجہ ، جملے اور ان سب کے آپس کے

بندھن اور ناتے سب ریت سے ہی چل رہے ہیں - ان میں سے جو بات پہلے دن جیسے طے کر دی گئی تھی ویسے ہی آج تک چلی آ رہی ہے اور ریت کے سہارے آگے بھی چلتی چلی جائے گی - دوسرے ہر بولی کا اپنا ایک سانچا ہوتا ہے - ایک کنبہ یا گھرانے کے لوگوں کی طرح بولی کے بول بھی آپس میں کوئی نہ کوئی ناتا رکھتے ہیں اور جو یوں ہی ادھر اُدھر سے بول لے کر اکٹھا کر دیا جائے تو اسے بولی نہیں بکواس کہیں گے - بولی کے سانچے میں تار یا ترتیب اور سڈول پن رکھنے کے لیے کچھ اصول کام کرتے ہیں جیسے اردو میں "چھیل" ایک بول ہے پر "لیچھ" کوئی بول نہیں ہے ، آگے پیچھے کی آوازوں اور بولوں کا بھی آپس میں ناتا ہوتا ہے جیسے "لڑکی" کے بعد "اِیں یا آں یا اوں" کا بول تو آسکتا ہے پر "لی" یا "تا" یا "نا" نہیں آ سکتا - ہم یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ "سورج چمکتا ہے" پر اسے "ہے چمکتا سورج" نہیں بول سکتے -

بولی ایک ایسا سماجی کام ہے جو دوسروں کی دیکھا دیکھی سیکھا جاتا ہے - ماں باپ بولی کے پہلے گرو اور گھر اس کا پہلا مدرسہ ہوتا ہے جہاں بچہ بڑوں کو بولتے دیکھتا اور سنتا ہے تو آپ بھی ویسی ہی آوازیں نکالنے اور ہونٹ ہلانے لگتا ہے - جو بچے جنم کے بہرے ہوتے ہیں وہ گونگے بھی رہ جاتے ہیں کیونکہ نہ بولی کی آوازیں ان کے کان میں پڑتی ہیں نہ وہ ویسی آوازیں ہی نکال سکتے ہیں - کتابوں میں کچھ ایسے بچوں کا حال بھی لکھا ہوا ملتا ہے جنھیں بہت چھوٹی سی عمر میں بھیڑیا اٹھا کر جنگل میں لے گیا اور وہاں وہ چودہ پندرہ برس کی عمر تک اس کے بھٹ میں پلتے رہے اور جب کسی شکاری کے ہاتھ پڑ کر انسانی سماج میں ہلائے تو چیخیں نکالتے سنے گئے کیونکہ انہوں نے اپنے کانوں سے کبھی کوئی بولی سنی ہی نہیں تھی -

بولی کی چھٹائی بڑائی بھی ایک کہانی ہے آج دھرتی پر جتنے سماج بستے ہیں چاہے وہ تہذیب کی دوڑ میں آگے ہوں چاہے پیچھے سب کے سب اپنی اپنی الگ الگ بولیاں بول رہے ہیں جن میں سے ہر بولی اپنی جگہ پوری اور ریت بہاؤ سے بنی ہوئی ہے اور اپنے بولنےوالوں کے سبھی کام کر رہی ہے اس لیے ہر بولی ڈیل ڈول اور ناپ تول میں دوسری بولی

کے برابر ہے کیونکہ ہر سماج میں زندگی کی مانگیں برابر اور کام ایک سے ہوتے ہیں۔ ہر بولی ہر سوچ بتانے کی سکت رکھتی ہے ہر بولی کی ریت یہ ہے کہ کسی سوچ کو ایک بول سے اور کسی سوچ کو کئی کئی بولوں کی ملاوٹ سے ظاہر کرتی ہے اس لیے یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ ایک بولی کے ایک بول کے لیے کبھی دوسری بولی میں کئی کئی بول بولنے پڑتے ہیں اور کبھی دوسری بولی کے ایک بول کے معنی اس میں ایک پورے کے پورے جملے سے بتائے جاتے ہیں۔ یوں دنیا کی بولیوں کے بولوں کی گنتی میں کچھ ایسا بل نہیں دکھائی دیتا اور پھر کسی بولی کے پورے بول آج تک کسی ایک بول مالا میں اکٹھے بھی تو نہیں کیے جا سکے ہیں اس لیے کسی بولی کی چھٹائی بڑائی بولنے والوں کی گنتی سے سمجھی جائے تو سمجھی جائے بولوں کی گنتی سے نہیں سمجھی جا سکتی۔

بولی تاریخ کے گھیرے سے بھی باہر ہے۔ جیسے تاریخ میں دنیا جہان کی اور باتیں مل جاتی ہیں ایسے ہی لوگ بولی کا حال بھی اس میں ڈھونڈنا چاہتے ہیں اور جب کوئی بولی کی بات چھیڑتا ہے تو جھٹ اس سے تاریخ کی گواہی مانگنے لگتے ہیں پر تاریخ میں تو وہی لکھا گیا ہے جو پرکھوں نے آنے والوں کے لیے لکڑی، پتھر اور دھات کے روپ میں چھوڑا ہے جیسے حویلیاں، مورتیں، تصویریں، لکھاوٹیں اور دوسری چیزیں اور یہ سب کی سب کوئی آج کوئی کل ایک ایک کر کے مٹ جاتی ہیں اور جو مٹ چکا ہے اور ایسا مٹا ہے کہ اب دھرتی کی کھدائی سے بھی ہاتھ نہیں آتا اس کا حال تاریخ میں کیسے لکھا جا سکتا ہے اسی لیے دنیا کی تاریخ کچھ ہزار برس پہلے تک پہنچ کر رک جاتی ہے۔ اس سے آگے وہ بولی تو کسی کا بھی حال نہیں بتا پاتی اب جن دنوں کی لکھاوٹیں بھی مٹ چکی ہیں یا ہم تک کسی وجہ سے نہیں پہنچ سکی ہیں ان دنوں کا حال ہم بھی نہیں جان سکتے اور جو لکھاوٹ ہم کو مل بھی گئی ہے اس سے بھی ہم یہ نہیں سمجھ سکتے کہ یہ اپنے جگ کی بولی کا پورا پورا اور ٹھیک ٹھیک روپ دکھا رہی ہے پھر ہمیں تاریخ سے بولی کے سمجھنے میں کیا سہارا مل سکتا ہے۔ تاریخ سے ہم بہت سے بہت بس اتنا جان سکتے ہیں کہ یہ ہمیں جہاں تک پیچھے لے جاتی ہے تب سے اب تک کسی نئی بولی

نے جنم نہیں لیا ہے کیونکہ کسی دیس کی تاریخ میں کسی ایک بولی کے بھی جنم کا آنکھوں دیکھا حال لکھا ہوا نہیں ملتا۔

لکھاوٹ بولی کی اور بولی ہمارے سوچ بچار کی علامت ہے اس لیے لکھاوٹ میں پہنچ کر ہمارے سوچ پر دوہرا پردہ پڑ جاتا ہے اب جو لوگ آواز کو چھوڑ کر اچھر (حرف) پر بھروسا کرتے ہیں وہ اکہرے پردے کی جگہ دوہرے پردے میں سے انسانی سوچ کا روپ دیکھنا چاہتے ہیں، سوچنے کی بات بس یہ ہے کہ بولی کی جیتی جاگتی آوازوں پر دھیان دینے کی جگہ نئی پرانی لکھاوٹوں پر دھیان اگر جو کچھ سمجھا اور تاریخ میں لکھا جائے گا وہ کہاں تک ٹھیک ہوگا۔ لکھاوٹ تو آج ہمارے سامنے بھی آوازوں کو اچھی طرح نہیں جکڑ پاتی اور جگہ جگہ دھوکے دیتی ہے پھر بیتے دنوں کی لکھاوٹوں سے جن کے لکھنے کی ریت اور جن کی آواز اور اچھر کا ناتا بھی آج ہم نہیں جانتے بولی کا پورا اور سجیل روپ کیسے دیکھ سکتے ہیں۔

لکھاوٹ سمیت دنیا کی سب چیزیں مٹ جاتی ہیں پر بولی جو اپنے علامتی روپ میں انسانی سماج کے سوچ بچار کا پورا بوجھ اٹھائے پیڑھی پیڑھی ہو کر جانے کب سے چلی آ رہی ہے ان سب سے الگ تھلگ ایک ایسی چیز ہے جو انسانی سماج کے ساتھ ساتھ ہی سدا چلتی رہے گی۔ بولی کا ناتا سانس سے جڑا ہوا ہے اور جب تک یہ سنسار (سانس آریا آل بمعنی گھر) سانس کا گھر ہے اور اس میں جتنے بندے سانس لیتے رہیں گے بولی کی گونجیں بھی سنائی دیتی رہیں گی جیسے سدا سے ایک سانس لینے والا دوسرے سانس لینے والے کی جگہ اور ایک پیڑھی دوسری پیڑھی کی جگہ لیتی چلی آ رہی ہے اور لیتی چلی جائے گی ایسے ہی بول کی جگہ بول ابھرتے رہیں گے اور یوں اس سنسار میں بولی کا جو تانا بندھا ہوا ہے وہ نہ کبھی ٹوٹا ہے نہ کبھی ٹوٹے گا۔ یہاں کوئی کہنے والا یہ کہہ سکتا ہے کہ اس سنسار میں جیسے ہی ایک سانس رکتی ہے تو اس کی آواز بھی ساتھ ہی ساتھ ڈوب جاتی ہے اور یہ کچا دھاگا سدا کے لیے ٹوٹ جاتا ہے پر اس کہنے والے کو یہ جان لینا چاہیے کہ آواز اور بولی میں بہت بل ہے۔ آواز ہوا کی لہروں سے بنتی ہے اور جب ان لہروں کو معنی پہنائے جاتے ہیں تو

یہی آوازیں بولی بن جاتی ہیں ۔ انسان کی آوازیں اس کے ساتھ ہی ساتھ مٹ جاتی ہیں پر ان سے بنی ہوئی بولی کے معنی آنے والوں تک پہنچ جاتے ہیں اس لیے ایک پیڑھی سے دوسری پیڑھی کا اور پرکھوں سے ہمارا پکا ناتا ہاڑ مانس کا نہیں سوچ بچار کا ہے ۔ ہم ان کے ساتھ آوازوں کے سہارے نہیں آوازوں کے معنی کی ڈور سے بندھے ہوئے ہیں ۔

کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اگلے پچھلوں کے بیچ میں اور سب بندھن تو ٹوٹ چکے ہیں پر ایک بولی کا ناتا ابھی تک چلا آ رہا ہے ۔ اس کے دھاگے میں انسانی سماج کی سب پیڑھیاں گندھی ہوئی ہیں اس لیے اب یہی ایک ایسا سہارا رہ گیا ہے جس سے ہم ان پرکھوں کا حال بھی جان سکتے ہیں جن کے چرچے تاریخ میں نہیں ملتے اور اپنے بولوں پر دھیان دے کر ایسی اور بھی بہت سی باتوں کا کھوج لگا سکتے ہیں جن سے ابھی تک ہماری تاریخ خالی ہے کیونکہ ان چھوٹے چھوٹے ستاروں (یعنی بولوں) میں بھی انسانی سوچ بچار کے دیپ جل رہے ہیں ۔ جو لوگ بولی کے لیے تاریخ کی گواہی مانگتے ہیں وہ یہ تو سوچیں کہ جب تاریخ آپ اپنے ہاڑ مانس کے لیے بولی کا آسرا تکتی ہے تو وہ بولی کا ڈیل ڈول اور روپ سروپ کیا بتا سکے گی اور جس بولی کے پیٹ سے تاریخ جنم لے سکتی ہے اس کا اور چھور کس نے دیکھا ہے ۔

(مطبوعہ "ضیا بار" گورنمنٹ کالج
سرگودھا ، مئی ۱۹۶۸ء)

زبان متبادلات کا نظام

دنیا کے دوسرے نظاموں کی طرح زبان کا بھی ایک نظام ہے اور نظام اس کل کو کہتے ہیں جس کے مختلف اجزا میں بعض مخصوص اصولوں کی رو سے مکمل تنظیم پائی جاتی ہے ۔ زبان کو مواصلاتی نظام بھی کہا جاتا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ اس کے ذریعے سے ایک شخص دوسرے شخص کو پیغام دیتا ہے ۔ پھر اسے آوازوں کا نظام بھی کہتے ہیں کیونکہ اس میں آوازوں سے اسی طرح کام لیا جاتا ہے جس طرح اشاراتی نظام میں عضوی اشاروں سے کام لیتے ہیں لیکن جب میں یہ کہتا ہوں کہ زبان متبادلات کا نظام ہے تو اس سے میرا مطلب یہ ہوتا ہے کہ زبان کے وہ اجزا جن میں آوازوں کو بنیادی اہمیت اور حیثیت حاصل ہے اور جن کے ذریعے سے پیغام بھیجے جاتے ہیں آپس میں ایک دوسرے سے بدل جاتے ہیں ۔ یعنی ایک کی جگہ دوسرا استعمال ہو جاتا ہے ۔ ان بدلنے والے اجزا کو متبادل کہتے ہیں جس کی جمع متبادلات ہے ۔

زبان کا بنیادی جزو وہ سادہ اور مفرد آواز ہے جس کے الگ سے کوئی معنی نہیں ہوتے ۔ البتہ جب ایک سے زیادہ آوازیں باہم مل کر لفظ بن جاتی ہیں تو اس میں معنی پیدا ہو جاتے ہیں ۔ یعنی مفرد آواز بے معنی اور آوازوں کا مجموعہ (لفظ) بامعنی ہوتا ہے لیکن مفرد آوازیں بھی بے معنی ہونے کے باوجود آپس میں بدلتی رہتی ہیں ۔ البتہ لفظ سے باہر ان کے باہمی تبادل کا علم نہیں ہو سکتا کیونکہ لفظ کے برعکس انفرادی طور پر ان کے کوئی معنی نہیں ہوتے ۔ چنانچہ صوتی تبادل کو بھی سمجھنے کے لیے ہمیں الفاظ ہی کا مطالعہ کرنا پڑتا ہے ۔

ذیل میں اس تبادل (صوتی) کی کچھ مثالیں اردو زبان سے پیش کی جاتی ہیں :

متبادل آوازیں	ایک لفظ کی دہری شکلیں	معنی
آ = اے	اکھاڑنا اور اکھیڑنا	جمانا کی ضد
آ = اے	اچالنا اور اچیلنا	چھال اتارنا
اُوں = آو	ٹھونکنا اور ٹھوکنا	ہتھوڑے کی ضرب لگانا
اُوں = آو	سوجھنا اور سوچنا	خیال کرنا
آیں = اے	کینکڑا اور کیکڑا	ایک آبی جالدار
ایں = اے	سینکنا اور سیکنا	گرم کرنا
ب = پھ	بانٹ اور پھانٹ	تقسیم
ب = گ	سابو دانہ اور ساگو دانہ	ایک دانہ دار غذا
ب = م	بور اور مور	آم کا پھل
ب = م	بنتی اور منتی	عرض ، درخواست
پ = بھ	پار اور بھار (باہر)	بیرون ، خارج
ت = ٹ	ہتینڈا اور ہٹینڈا	چکی چلانے کا ڈنڈا
ت = ٹ	جتنا اور جٹنا	مشغول ہونا ، لگنا
ت = ٹ	کتارا اور کٹارا	املی کا پھل
ت = ڈھ	ٹلنا اور ڈھلنا	ہٹنا ، چلنا
ج = چھ	جل اور چھل	پانی
ج = س	کھجٹ اور کھسٹ	خراش ، کھونتا ، رگڑ
جھ = غ	جھجھک اور جھجک	ہچکچاہٹ ، تامل
جھ = ٹ	سلجھنا اور سلٹنا	الجھن یا اختلاف دور کرنا
دھ = ت	دھاگا اور تاگا	کچا ڈورا
ر = ڑ	کرور ، کروڑ اور کڑوڑ	سو لاکھ

ر = ڑ	سروڑ اور مڑوڑ	پیچش
کھ = چھ	پنکھی اور پنچھی	پرندہ
ک = پ	ڈھانکنا اور ڈھانپنا	چھپانا
ک = پ	ڈھکنی اور ڈھپنی	سرپوش
ل = ن	لون اور نون	نمک
س = ڑ	مسوسنا اور مڑوڑنا	بل دینا
ہ = و	چاہ اور چاو	شوق ، اشتیاق
ہ = و	ساہ اور ساو	سیٹھ ، معزز شخص

زبان کا دوسرا اہم جزو خود لفظ ہے جو کم سے کم دو مفرد آوازوں کے ملنے سے بنتا ہے اور اس مقصد کو پورا کرتا ہے - جس کے لیے زبان بنائی گئی ہے - دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لیجیے کہ زبان کا آغاز بامعنی لفظ سے ہوتا ہے یا بامعنی لفظ ہی اصل زبان ہے - زبان کا یہ مہتمم بالشان جزو دوسرے مہتمم بالشان جزو سے بدل جاتا ہے لیکن ان اجزا کے اس باہمی تبادل سے معنی نہیں بدلتےبلکہ جوں کے توں قائم رہتے ہیں - کیونکہ معنی بدل جائیں تو گھر مینار بابل بن جائے اور پھر وہ مقصد ہی فوت ہو جائے جس کے لیے زبان بنائی گئی ہے -

ہم معنی الفاظ کو مترادف بھی کہتے ہیں اور مترادفات کی بحث طویل ہے - کیونکہ بعض علمائے زبان و ادب کا یہ خیال ہے کہ کسی ایک زبان میں دو مترادف الفاظ دستیاب نہیں ہیں - ان کے نزدیک دو مختلف زبانوں میں تو مترادفات کے جوڑے ہاتھ آ جاتے ہیں - البتہ ایک ہی زبان کے اندر ان کا ملنا ناممکن ہے لیکن یہ بات عام مشاہدے کے خلاف ہے اس لیے اس پر بحث بے سود ہے - کیونکہ بقول حکماء امکان کی سب سے قوی دلیل وقوع ہے -

صوتی تبادل دکھانے کے لیے میں نے اوپر کچھ مثالیں پیش کی ہیں اور ہر تبادل کی مثال میں دو دو الفاظ دیے ہیں جو باہم ہم معنی یعنی مترادف ہیں - اس کے باوجود چونکہ یہ دونوں الفاظ ایک ہی لفظ کے

دہرے روپ تصور کرکے درج کیے گئے ہیں اس لیے اب میں نیچے اردو زبان سے ایسے الفاظ کی مثالیں دے رہا ہوں جو ہم معنی ہیں یعنی مترادف ہیں اور جو اردو میں لفظ سازی کے مختلف اصولوں کی مدد سے وضع ہوتے ہیں ۔ یعنی متبادل بھی ہیں ۔ چونکہ یہ عمل ان اصولوں کے بیان اور تشریح کا نہیں صرف مثالیں پیش کرنے کا متقاضی تھا ۔ اس لیے میں نے مثالوں پر ہی اکتفا کیا ہے ۔ البتہ چند الفاظ کو ایک جداگانہ نمبر کے تحت درج کرکے لفظ سازی کے مختلف اصولوں کی طرف صرف اشارہ کر دیا ہے ۔

نمبر	لفظ	مترادف اور متبادل	معنی
(۱)	ناج	اناج	غلّہ
	کال	اکال	قحط
	لوپ	الوپ	غائب
	دھیلا	ادھیلا	نصف پیسے کی قیمت کا ایک قدیم سکّہ
	رنگ	راگ	عیش
	جھلنگ	جھلنگا	بُنی ہوئی چارپائی کے ڈھیلے بان
	مندا	مندا	سستا
	ہلکورا	ہلورا	چھوٹی لہر
	چھوکرا	چھورا	لڑکا
	چھوکری	چھوری	لڑکی
	نمکولی	نمولی (نبولی)	نیم کے درخت کا پھل
	کرکروندا	کروندا	ایک کھٹّا پھل
(۲)	تھاپنا	پتھپنا	گوبر سے اپلے بنانا ، پتلا کرنے کے لیے دبا دبا کر پھیلانا ۔
	دونکنا	کوندنا	مرتعش ہونا

نمبر	لفظ	مترادف اور متبادل	معنی
	کھانپ	پھانک	قاش
	گھڑنا	گڑھنا	بنانا
	لگنا	گلنا	تحلیل ہونا ، خراب ہونا
(۳)	ماتا	متھرا	ماں
	پٹ ، پاٹ	پتھر	سنگ
	کُٹی	کوٹھری	چھوٹا کوٹھا
	لت پت	لدر پدر ، تیھڑ پتھیڑ	لتا ہوا
	میانی	ملانی	پاجامے کی رومالی
	تھالی	تسلی (تشلی)	چھوٹا طباق
	(منہ) پھاڑنا	(منہ پسارنا)	کھولنا
	گھسنا	گھسنا	رگڑنا
	لسنا	لپنا	لپیا جانا
	گھلنا	گلنا	تحلیل ہونا
	دھاڑیں	دہاڑیں	نالے
	بھار	باہر	خارج ، بیرون
	چنری	چندری	چھپی ہوئی اوڑھنی
	چرانا	چند رانا	فریب دینا
	ساجھا	ساڑا	شرکت
(۴)	چھند	چھل	فریب
	ڈھنگ	ڈھب	طریقہ ، انداز
	سنگ	ساتھی	ہمراہی

نمبر	لفظ	مترادف اور متبادل	معنی
	ٹیکرا	ٹیلا	اونچی زمین
	جنتری	جالی	تار نکالنے کے لیے سناروں کا ایک اوزار
(۵)	کنّی	کرنی	راجوں کا ایک اوزار
	جھنّا	جھاڑنا	جھاڑنے کا کپڑا ، جھاڑن
	چھنّی	چھلنی	چھاننے کا آلہ
	پتّی	پتری	لوہے وغیرہ کی لمبی پٹّی
	سچّا	سانچا	اصلی
	پلاّ	پلپلا	کتّے کا بچہ
	جھلّی	جھلجھلی (جھرّ جھری)	نہایت پتلا اور لچکدار گوشت
	تلّی	تلتلی	پانی کی دھار
	کرّا	کرکرا	سخت
	کھلّو	کھلکھلو	کھل کھل کرنے یا ہنسنے والی عورت
	جھکّی	جھونکی	جھک جھک کرنے والا
	بکّی	بونکی	بک بک کرنے والا
	منّا	منمنا	چھوٹا سا بچہ

اب میں کچھ ایسے الفاظ کے مجموعے پیش کرتا ہوں جو ہم معنی بھی ہیں اور آپس میں متبادل بھی ہیں اور جنھیں میں بہروپ کہتا ہوں ۔ ہر مجموعے میں ان کی تعداد دو سے زیادہ ہے ۔ ان کے وہ معنی جن میں یہ استعمال ہوتے ہیں ۔ پہلے دے دیے گئے ہیں :

ہروپ	معنی	نمبر شمار
کھوٹ ، کسر ، کور ، کان (کا نا حصہ ، کانا پردہ)	کمی ، نقص	(۱)
پھیر ، پسار ، پیٹ ، پاٹ (ندی کا)	چوڑان ، چوڑائی	(۲)
گھلنا ، گھٹنا ، گلنا ، گرنا	کم ہونا	(۳)
ڈر ، داب ، دھونس ، دھاک	خوف ، رعب ، دباؤ	(۴)
گُلّی ، گُرّی (گُربا ،ریڑھ کی ہڈی) ، گولی، گُٹّی	چھوٹا سا گول ٹکڑا	(۵)
بات ، بول (بولی) ، باج (بجن) ، بھاس (بھاشا) ، بانگ ، بان (بانی)	کلمہ ، لفظ ، آواز	(۶)
ڈھلنا ، ڈُلنا ، (ڈولنا) ، ڈھّینا ، ڈھلکنا	لڑھکنا ، قائم نہ رہنا	(۷)
کُٹی ، کوٹھری، کُٹھولی، کٹولی	چھوٹا کوٹھا	(۸)
جال ، جُھول ، جھوٹ ، جُوٹ	دروغ ، دھوکا	(۹)
کَنگڑا ، کٹھّا ، کڑا ، کَرّا	مضبوط ، قوی	(۱۰)
چھیلنا ، اُچیلنا ، چھوڑنا ، چھانڈنا ، چھیکنا	ترک کرنا ، الگ کرنا ، ہٹانا	(۱۱)
ٹیلا ، ٹیکرا ، ٹھیڑا	اونچی زمین	(۱۲)
ہونگڑا ، ہٹھّا ، ہٹّدا ، ہٹرا	پلا ہوا ، تنو مند	(۱۳)
چال (چالاک) ، چُوٹ (چوٹا) ، چرک (چرکا) ،	دھوکا ، فریب	(۱۴)

میری گفتگو کے اس آخری حصے میں زبان کے ایک اور اہم جزو کا بیان باقی ہے ۔ یہ جزو گرامر سے متعلق ہے جس میں صرفی اور نحوی دونوں روپ یعنی صفات ، عوامل ، متعلقات فعل ، حالیے اور افعال

وغیرہ شامل ہیں ۔ زبان کے یہ روپ بھی باہم متبادل اور ہم معنی ہوتے ہیں ۔ ان کی ظاہری ہئیت یعنی الفاظ کی کمی بیشی اور ان کی ترتیب میں فرق کے باوجود متکلم کا مفہوم ایک روپ کی جگہ دوسرا روپ بول کر بھی ادا ہو جاتا ہے ۔

نیچے ان کی چند مثالیں درج کی جاتی ہیں :

(۱) (الف) بولتی مینا ، بولتی ہوئی مینا ، بولنے والی مینا ۔

(ب) کہی ہوئی کہانی ، کہی گئی کہانی ۔

(ج) دھلی ہوئی ماش کی دال، دھوئی ہوئی ماش کی دال ۔

ہم جھاڑی زمین پر بیٹھے ہیں، ہم جھڑی زمین پر بیٹھے ہیں، درخت سے باندھی گائے ، درخت سے بندھی گائے ۔

(۲) (الف) احمد نے شیر مارا ، احمد نے شیر کو مارا ۔

(ب) ہم نمائش دیکھنے کے لیے گئے تھے ، ہم نمائش دیکھنے کو گئے تھے ، ہم نمائش دیکھنے گئے تھے ۔

(ج) مرے پر کیا ہوگا ، مرنے پر کیا ہوگا ، مر گئے پر کیا ہوگا[1] ۔

(د) وہ رو کے نہیں رکتا ، وہ روکے سے نہیں رکتا، وہ روکنے سے نہیں رکتا ۔

(ہ) شام ہونے آئی ہے ، شام ہونے کو آئی ہے ، شام ہونے پر آئی ہے ۔

---

۱ - زندگی میں تو وہ محفل سے اٹھا دیتے تھے
دیکھوں اب مر گئے پر کون اٹھاتا ہے مجھے

(غالب)

صبح گزری شام ہونے آئی میر
تو نہ چیتا اور بہت دن کم رہا

(میر)

(۳) (الف) چار ہوا چاہتے ہیں ، چار بجا چاہتے ہیں ، چار بجنے والے ہیں ، چار بجنے کو ہیں -

(ب) احمد جایا چاہتا ہے ، احمد جانے والا ہے ، احمد جانے کو ہے -

(ج) دوڑ کر مت چلو ، دوڑتے ہوئے مت چلو ، دیکھ کر چلو ، دیکھتے ہوئے چلو ، ہنس کر بات کرو ، ہنستے ہوئے بات کرو ، گھر جاؤ تو میرے پاس ہو کر جانا ، گھر جاؤ تو میرے پاس ہوتے جانا -

(۴) (الف) وہ ابھی آ جاتے ہیں ، وہ ابھی آئے جاتے ہیں - میں لکھ کر دکھا دیتا ہوں ، میں لکھ کر دکھائے دیتا ہوں -

(ب) شیروانی رس گئی ، شیروانی رسل گئی -

(ج) اتنا سنتے ہی وہ برہم ہوگئے ، اتنا سن کر ہی وہ برہم ہوگئے ، اتنا سننا تھا کہ وہ برہم ہو گئے ، جیسے ہی انھوں نے اتنا سنا برہم ہوگئے -

زبان کے یہ متبادل روپ بتاتے ہیں کہ یہ سب کے سب کسی ایک شخص نے ایک جگہ بیٹھ کر نہیں گھڑے ہیں بلکہ ان گنت انسانی نسلوں کے ان گنت افراد نے ایجاد زبان میں حصہ لیا ہے - یعنی زبان کسی ایک واضع زبان کی نہیں واضعین زبان کی مرہون منت ہے - اسی لیے نہ صرف اس کے روپوں میں اضافہ ہوا ہے بلکہ روپوں کی ہیئت میں بھی فرق آ گیا ہے - البتہ قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ ان کے ہیئتی اختلافات جن اصولوں کے تحت پیدا ہوئے ہیں انھیں کے باعث یہ بنیادی اور اندرونی طور پر باہم مربوط اور متحد بھی ہیں -

مطبوعہ ، قومی زبان ، کراچی دسمبر ۱۹۸۴ء

تلفظ اور اشتقاق

زبان آوازوں کا وہ بامعنی نظام ہے جس سے ہم اپنا مافی الضمیر ظاہر کرنے میں مدد لیتے ہیں لیکن بطون تک رسائی حاصل کرنے کے لیے آوازوں کا براہ راست پردۂ گوش سے ٹکرانا ضروری ہے ، یہ صحیح ہے کہ بعض اوقات انسان کا منشائے دلی اس کے حقیقی سامع سے بھی مخفی رہ جاتا ہے جس کی وجہ کبھی متکلم کا لب و لہجہ اور تلفظ کی خامیاں ہوتی ہیں اور کبھی خود سامع کے ذہنی پس منظر کا عدم توافق بھی افہام و تفہیم میں سدِ راہ ہو جاتا ہے لیکن اس صورت میں جب کہ اس قسم کے کوئی مزاحم حائل نہیں ہوتے ، متکلم کی آواز کانوں میں گونجتے ہی سامع کو اس کے خیالات و جذبات پر مکمل وقوف و آگہی حاصل ہو جاتی ہے -

اس سے انکار ممکن نہیں کہ آواز ہر جاندار کی باطنی کیفیات کو کسی نہ کسی حد تک ظاہر کرتی ہے لیکن قدرت نے آوازوں کی تفریق و تقسیم کے لیے انسانی حلقوم کے تاروں کو جو کمال بخشا ہے اور ذہن انسانی کو معنی آفرینی کی جو بے مثال صلاحیت ودیعت فرمائی ہے اس سے دنیا کے تمام ذی روح محروم ہیں - یہی وجہ ہے کہ انسان نے آوازوں کا ایک ایسا ضابطہ مدون کیا ہے جس کے ذریعے اس کے خیالات کا ذرا ذرا سا فرق بھی سامع پر نہایت قطعیت و وضاحت کے ساتھ منکشف ہو جاتا ہے - آوازوں کے زیر و بم اور طول و اختصار وغیرہ کے علاوہ مخارج کے اعتبار سے ان کی درجہ بندی جہاں صوتی عضلات و اعصاب کی قابل تعریف ہم آہنگی پر دال ہے وہاں ذہن کی موشگافی فہم کی دقیقہ سنجی اور پردۂ گوش کی ذکاوتِ حس کا بھی ایک محکم ثبوت ہے -

جس طرح آج یہ بتانا ناممکن ہے کہ فلاں زبان فلاں وقت پیدا ہوئی اسی طرح رائج الوقت لپیوں کی پیدائش کا پتہ لگانا اور ان کے آغاز پرمکمل

آگہی حاصل کر لینا بھی آسانی سے ممکن نہیں ۔ محققین اس وقت تک اس سلسلے میں صرف افسانے کی ٹوٹی ہوئی کڑیاں جوڑنے ہی میں مشغول ہیں کیونکہ ان میں مختلف زبانوں کی جو آوازیں قلم بند ہوئی ہیں ابھی ان پر ہی پورے طور سے دسترس حاصل نہیں ہو پائی ۔ سچ پوچھیے تو حروف کے ذریعے آوازوں تک پہنچنا اور پھر کسی تحریر کے مطالب سے واقفیت حاصل کرنا گویا دو مشکلات کا بیک وقت سامنا کرنے کے مترادف ہے ۔ میں اپنے ذاتی تجربے کی بنا پر کہتا ہوں کہ قدیم تحریروں میں جو حرف استعمال ہوئے ہیں ان سے قدیم زمانے میں وہی آوازیں مراد نہیں لی جاتی تھیں جو آج ہم لوگ عام طور پر سمجھ رہے ہیں ۔ ان حالات میں کسی ایک لفظ کے صحیح تلفظ کا سراغ لگا لینا بھی جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہے ۔

میں اوپر کہہ آیا ہوں کہ آوازوں کو سمجھنے کے لیے ان کا پردۂ گوش سے ٹکرانا از بس ضروری ہے لیکن جب ان کو حروف کے پردوں میں ملفوف کر دیا جاتا ہے تو صورت حال بالکل بدل جاتی ہے ۔ میرے نزدیک جب تک آوازیں سنی نہیں جاتیں ۔ یعنی سننے کا عمل واقع نہیں ہوتا یا کم از کم اس عمل کی نقل نہیں کی جاتی ذہن ان کو سمجھنے سے قاصر رہتا ہے ۔ چنانچہ بعض اصحاب ایسے بھی مل جاتے ہیں جو تحریروں کو سمجھنے کے لیے انہیں باواز بلند پڑھتے ہیں ۔ تہذیب و تمدن کے علمبردار ان پر ذہن کی ناپختگی اور تربیت کی ناشائستگی کا کتنا ہی الزام کیوں نہ لگائیں حقیقت یہ ہے کہ آواز کی فطرت کا تقاضا اسے سمجھنے سے پہلے سننے پر مجبور کرتا ہے چنانچہ یہ لوگ بھی کسی تحریر کو سمجھنے سے پیشتر اپنے آپ کو پڑھ کر سناتے ہیں ۔

ایسے لوگوں سے قطع نظر جن کے یہاں سنانے کا عمل بالکل ظاہر اور واضح ہوتا ہے پڑھے لکھوں کی بہت بڑی تعداد خاموشی سے پڑھ کر سمجھنے کی کوشش کرتی ہے ۔ ان کو پڑھتے دیکھ کر کم از کم ناظرین کو یہی خیال ہوتا ہے کہ یہ لوگ سننے سنانے کے عمل سے بے نیاز تحریر سے اخذ مطالب پر پوری طرح قادر ہیں اور ان کے یہاں حروف کے دیکھنے اور معانی کے سمجھنے میں براہ راست تعلق قائم ہو چکا ہے ،

لیکن ان کے نفسیاتی تجزیے سے معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ پیہم مشق و مزاولت کے ذریعے وہ سخن فہمی کے لیے حروف کو باآواز بلند پڑھ کر آوازوں میں تبدیل کرنے سے بڑی حد تک آزاد ہو چکے ہیں تاہم وہ اس عمل کے ذہنی مادے سے ابھی تک چھٹکارا حاصل نہیں کرسکے ہیں۔ یعنی وہ تلفظ جو وہ کبھی اپنی زبان سے ادا کیا کرتے تھے اور پڑھتے وقت جن مقامات پر زور دیتے تھے اب اپنے ذہنوں میں ان کی صدائے بازگشت سنتے اور اپنے حافظے کی مدد سے وہی عضلاتی اور اعصابی تحرک اور جذباتی مد و جزر محسوس کرتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لیجیے کہ ان کے یہاں داخلی عمل نے خارجی عمل کی جگہ لے لی ہے اور اب انہیں آواز دی کو جو کبھی انھوں نے اپنے کانوں سے سنی تھیں گوش دل سے سن کر سخن فہمی کی کوشش کرتے ہیں۔

یہ حقیقت کہ تلفظ کے بغیر الفاظ کا مطلب نہیں سمجھا جا سکتا۔ تلفظ کی اہمیت کو اچھی طرح واضح کر دیتی ہے اور یہ ثابت کر دیتی ہے کہ حرف پر آواز کو اور لپی پر تلفظ کو تقدم و ترجیح حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لسانیات میں تلفظ کا مقصود بالذات اور لپی حصول مقصد کا محض ایک وسیلہ ہوتی ہے جو بانئ حق لپی پر صرف اسی حد تک بھروسا کرتا ہے جہاں تک وہ تلفظ کا ساتھ دیتی ہے لیکن جیسے ہی اسے یہ محسوس ہوتا ہے کہ لپی زبان کا مسلمہ اصولوں سے انحراف کر کے تلفظ کو مسخ کرنے والی ہے وہ اس کا کڑا محاسبہ کر کے اس کی خامیاں اور کوتاہیاں سامنے لے آتا ہے۔ کیونکہ وہ خوب سمجھتا ہے کہ آوازیں خطا نہیں کرتیں۔ بلکہ خطا کار صرف حروف ہوتے ہیں جو آنے والے زمانے میں کثیر تعداد غلط فہمیوں کو جنم دے کر ابتدائی تلفظ کو بدلتے بلکہ بعض اوقات ایک بالکل ہی نیا لفظ وضع کر دیتے ہیں۔

یہاں اس خیال کی تشریح کے لیے میں سامنے کے چند الفاظ پیش کرتا ہوں جن کی کتابت نے ان کے ابتدائی تلفظ کو بدل دیا ہے اور اب ہمیں بھول کر بھی یہ خیال نہیں آتا کہ گل خپ کی اصل گل کھپ، آخروٹ کی اصل اکھروٹ۔ چیخنا کی اصل چیکنا۔ خلیل کی اصل کھیل۔

غلا کی اصل گلا ۔ بغدا کی اصل بگدا ۔ غٹا غٹ کی اصل گٹا گٹ ۔ زہانا کی اصل جھپاٹا ۔ زق زق بق بق کی اصل جھک جھک بک بک ۔ تالاب کی اصل تلاؤ ۔ شرّاٹا کی اصل سرّاٹا ۔ فٹا فٹ کی اصل پھٹا پھٹ ۔ قصائی کی اصل کسائی ۔ قتلا کی اصل کتلا (کترا ۔ کترن) قلا (قلا بازی) کی اصل کلا و فن ۔ پھرا ۔ قلابہ کی اصل کلاوا ۔ (کول بمعنی پانی کی نالی سے) اور اہالی موالی کی اصل ہالی مالی ہے ۔

جب آریہ ہندوستان میں آئے اور انہوں نے یہاں کی مقامی زبانوں کو اپنایا تو ان کے الفاظ کو بھی ضبط تحریر میں لانے لگے اور یوں ان کی تحریروں میں ان کی آبائی زبان ایرانی کے پہلو بہ پہلو ہندوستانی زبانیں بھی جابرائیاں ہوئیں ۔ اس ابتدائی مخلوط زبان کو ویدک کہتے ہیں جس میں رفتہ رفتہ ہندوستانی الفاظ کی تعداد زیادہ ہوتی گئی ۔ یہاں تک کہ ایک زمانہ ایسا آ گیا کہ یہ زبان ہندوستانی الفاظ کی کثرت کے باعث اپنی ابتدائی شکل سے بہت کچھ مختلف نظر آنے لگی اور یہ اختلاف کچھ اس قدر واضح ہو گیا کہ اس نئی شکل کو سنسکرت کا نام دے دیا گیا ۔

ان دونوں زبانوں یعنی ویدک اور سنسکرت میں نہ صرف ایرانی بلکہ ہندوستانی الفاظ بھی حروف بدل بدل کر تحریر کیے گئے ہیں چنانچہ جب لفظ اُبج اپجنا (اُگنا) کو جو ہماری زبان میں قبل دور آریہ سے رائج چلا آ رہا ہے سنسکرت زبان میں داخل کیا گیا تو اس کے ابتدائی پیش کو ات سے اور "بج" کے جیم کو دال سے بدل کر "اتپاد" بنا لیا گیا ۔ میں نے اردو کے ابتدائی پیش کو سنسکرت اور ویدک میں اُد "یا اُت" اور "اُد" وغیرہ کئی سابقوں سے لکھا ہوا دیکھا ہے مثلاً اردو اُگال سنسکرت اوگار ۔ اردو اُگھاڑنا کھولنا ، سنسکرت اُوگھاٹن ۔ اردو اُترنا سنسکرت اُوّترن ۔ اردو اُبھرنا سنسکرت و ویدک اُدبھرن ۔ اردو اُٹھا سنسکرت اُتتھا وغیرہ ۔

غرض سنسکرت میں لفظ "اُبج" اپنی اصلی صورت میں بھی قائم رہا اور "اُت پاد" کی شکل میں بھی رائج ہوا. آگے چل کر سنسکرت والوں نے اردو "اُبج" کے حالیہ آغاز "اُبج" (پیدا کیا جانے والا ۔ پیداوار) کو

سنسکرت کا جامہ پہنایا تو اس کے ابتدائی پیش کو "اُت" سے بدل کر "اوبہج" کو "ہدیہ" بنا کر اُت "ہدیہ" پیش کر دیا - کیونکہ پراکرت گرامر نویسوں کے اصول کے مطابق سنسکرت دال اور یے کا مرکب پراکرت کے جیم مشدد کا بدل ہوتا ہے جیسے پراکرت بجن (بجنی) سنسکرت ودیت وغیرہ - غرض اصول کتابت کی بدولت اردو کے لفظ "اہج" سے سنسکرت کا ایک اور لفظ "ات ہدیہ" وجود میں آ گیا - آج بعض محققین یہ تو کہتے ہیں کہ سنسکرت "ات ہدیہ" سے اردو "اہج" بنایا گیا ہے لیکن وہ اس بات کی تشریح سے قاصر ہیں کہ سنسکرت میں، اردو کا لفظ "اہج" اپنی اصلی حالت میں کیونکر رائج ہوا - یعنی وہ سنسکرت سے اردو کو مشتشنوا ثابت کرنے کی کوشش میں الٹی گنگا تو بہا رہے ہیں لیکن اسے گنگوتری کے لگیشر تک پہنچانے سے پہلے درمیان میں ہی چھوڑ دیتے ہیں کیونکہ انھیں یہ علم نہیں ہے کہ اردو کا لفظ "اہج" خود مادہ "ہج" بمعنی گرنا اور لاحقہ "الف مضموم بمعنی "ضد یا برعکس" سے بنا ہے جس کے معنی گرنے کے ہوتے ہیں -

جس طرح ہماری زبان کے بہت سے الفاظ کا ابتدائی تلفظ آج ہمارے خیطۂ علم سے خارج ہو چکا ہے - اسی طرح محض لپی کی بدولت اردو کی دوسری معاصر زبانوں کے کثیر تعداد الفاظ کا تلفظ بھی بدل گیا ہے - لیکن محققین سب کے سب ان کے ابتدائی تلفظ کا سراغ لگانے کے بجائے الٹے ان کے مکتوبی ودیوں سے جو سنسکرت کی قدیم و جدید تحریروں میں ملتے ہیں - ان کا تلفظ متعین کرتے ہیں - مثلاً پاکستان کے شمال میں جو ملک واقع ہے اسے ہر شخص کشمیر کہتا ہے حالانکہ اس کا ابتدائی اور اصلی نام "کمتیر یا کامیر" تھا ، پراکرت کے مشہور گرامر نویس لکشمی دھر نے اپنی کتاب " شٹ بھاشا چندرکا" کے سوئر نمبری ۲۱-۹۷ میں سنسکرت لفظ کشمیر کے مقابل پراکرت کے وہ الفاظ کمھارو اور کمبھارو لکھے ہیں جو محض فرضی ہیں اس لیے کہ ہندوستانی (دراوڑی) زبانوں کے مشدد میم کو سنسکرت میں "سم" کے مرکب حرف سے بھی تحریر کیا گیا ہے - چنانچہ کیر یا کامیر - کشمیر - اس تلفظ کی تائید میں اسی علاقے کے دوسرے ناموں کو بھی پیش کیا جا سکتا ہے -

جن میں سے ایک بامیر آج بھی زبان زد خلائق ہے -

رگ وید میں ایک لفظ "سم" اور "سمسیہ" دو روپوں میں نظر آتا ہے (دیکھیے سوتر نمبری ۶-۱-۲-۳ اور ۲-۳-۱-۳-۱ اور ۹-۵-۲۵-۳م وغیرہ جہاں یہ کل یا تمام کے معنی دے رہا ہے - کلاسیکی سنسکرت میں اس کا ایک اور مکتوبی روپ "سمستو" بھی نظر آتا ہے اور اس قدر فروغ پا چکا ہے کہ برج کے علاقے میں "سپتو" کے تلفظ کے ساتھ آج جا بجا سنا جا سکتا ہے - لکشمی دھر نے سوتر نمبر ۱۵-۴-۳م میں اس کا ایک فرضی پراکرت روپ "سمتو" دیا ہے جو اس نے یقینی طور پر سنسکرت روپ "سمستو" سے اپنے گھر میں بیٹھ کر تراشا ہے اور اس حقیقت کا ثبوت فراہم کر دیا ہے کہ ہندوستانی لسانیات کے محققین قدیم زمانے سے آج تک علی التواتر سنسکرت کے مکتوبی روپوں سے ہماری بھاشاؤں کے بول وضع کرتے اور لفظ کے ابتدائی تلفظ کا پتہ لگانے کے بجائے لمبی ہر زور دیتے چلے آ رہے ہیں - پانچ سو قبل مسیح کا یاسک منی بھی اگرچہ ویدک لفظ "سم" کے وہی معنی دے رہا ہے جو اوپر بیان کیے گئے لیکن وہ اس حقیقت سے قطعی بے خبر ہے کہ یہ ہماری بھاشا کا لفظ "سبھ" (سب) ہے (ویدک میں بھاشا کے بھ اور ب کو میم سے بھی تحریر کیا گیا ہے) اس کا دوسرا ویدک روپ "سمسیہ" جو کلاسیکی سنسکرت میں "سمست" ہو گیا ہے (کیونکہ ویدک میں ی اور ت بھی باہم متبادل ہوتے ہیں اور اس بھاشا ہی کا دوسرا روپ "سبھن" ہے اور مہاراشٹری بولی کے حشوی لاحقے ان کو ظاہر کر رہا ہے -

اس سلسلے میں محققین کا ایک مشہور اشتقاق رو ہے جس میں انہوں نے سنسکرت کے ایک ہی لفظ "ستمبھ" سے ہماری بھاشا (بول چال) کے دو فرضی الفاظ کھمبو اور تھمبو تراشنے کی کوشش کی ہے (دیکھیے لکشمی دھر سوتر ۱-۴-۱۱ اور ۱-۴-۱۲ اور چنڈ سوتر ۲-۱ وغیرہ) اور یہ صورت حال نہ صرف پر لطف بلکہ مضحکہ خیز بھی ہے - علاوہ ازیں بھاشا کا مزاج یہ بتاتا ہے کہ اس کے الفاظ میں ب یا بھ سے پہلے میم - نون بالاعلان اور نون غنہ نہیں آ سکتے اور اس کے ثبوت میں کافی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں مثلاً سنبھل کا ابتدائی تلفظ سبھل تھا -

ویدک امبھو (پانی) کا اصل روپ ام (آم) تھا جس سے راجستھان کے ایک مقام کا نام آمیر (موجودہ مکتوبی روپ آنبیر) بنا ہے کہ وہ ایک جھیل کے کنارے آباد ہے۔ سنسکرت کا لفظ امب (فارسی البہ) ام۔ آم کا اور سنسکرت امبا (ماں) دراصل اماں کا مکتوبی روپ ہے اور اردو کے لمبا یا لانبا کی اصل پنجابی تلفظ لمّا (ن) ہے۔ میں ان تمام شواہد کی روشنی میں یہ نتیجہ نکالنے پر مجبور ہوں کہ پراکرت کے گرامر نویسوں کے دیے ہوئے دونوں روپ کھمھو اور تھمبھو جو آج ہماری زبانوں میں بھی کھمبا اور تھمبا کی آوازوں سے ادا ہو رہے ہیں ابتدا میں کھمّم، کھمّا اور تھمّم تھمّا (تھمنا۔ تھامنا) بولے جاتے تھے میں نے ان کو رگ وید میں سکمبھ اور شمبھ لکھا ہوا دیکھا ہے۔ جس میں بھاشا کا کھ سک کے مرکب سے تھ ست کے مرکب سے تحریر ہوا ہے اور میم مشدد مبھ کے مرکب سے لکھا گیا ہے۔ لیکن گرامر نویس ان میں سے صرف ایک ہی لفظ ستمبھ سے واقف ہیں اس لیے اسی ایک لفظ سے پراکرت کے دو لفظ مشتق کر کے ایک پتھر سے دو چڑیاں مار رہے ہیں۔

دیشی لفظوں کے بیان میں لفظ سنسکرت کا حال بھی سن لیجیے جس سے آج کل عام طور پر مخض زبان مراد لی جاتی ہے۔ اس لفظ کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ یہ زبان کے معنوں میں پہلی بار بالمیک کی رامائن میں استعمال کیا گیا ہے اور اس کے معنی "شستہ درفتہ" منظم و مربوط اور "نوک پلک سے درست" وغیرہ بیان کیے جاتے ہیں لیکن اس کا ابتدائی تلفظ کیا تھا۔ یعنی یہ کس لفظ کا بدل ہے یہ آج تک نہیں بتایا گیا البتہ لکشمی دھر نے سوتر نمبری ۱-۴-۹ میں اس کا فرضی پراکرت روپ "سکدم" دیا ہے جو مجھے یقین ہے کہ ہندوستان میں کبھی نہیں بولا گیا لیکن لفظ "سنسکرت" رگ وید سوتر نمبری ۱-۸-۳ میں ملتا ہے اور زنجیر کے معنی دیتا ہے۔ ملاحظہ کیجیے۔ "اشواس ابشام سو سنسکرتا ابھی شو" (تمھارے رتھوں کے دھرے پائدار ہو جائیں اور ان (رتھوں) کے گھوڑے اچھی "سنسکرت" والے ہو جائیں) اس سے صاف نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ لفظ (سنسکرت) بھاشا کے لفظ "سانکل" کا بدل

ہے ، جس کی روی حسب دستور حشوی ہے اور کاف سے قبل کاس بھی ایزادی ہے - جیسا کہ سنسکرت کے اکثر مرکبات میں نظر آتا ہے اور جس کے ایزادی ہونے کا پاسک منی بھی قائل ہے مثلاً سرسوتی - سر دور (مثلاً مان سردور جھیل وغیرہ) اس کے علاوہ آخری ت بھی ل کا بدل ہوتا ہے - جیسے کرتانی - کلانی (کلاؤن یعنی فنون کا) وغیرہ - لفظ سانکل ہی سے ایک اور لفظ "شرنکھل" بھی 'سنسکرت" کے آگے پیچھے بنایا گیا ہے اور لکشمی دھر صرف اسی سے واقف ہے کیونکہ وہ سوتر نمبری ۱-۳-۳ ء میں شرنکھل کو سانکل کا ماخذ قرار دیتا ہے -

جس زمانے میں لفظ "سنسکرت" (سانکل بمعنی مربوط) کو مکتوبی زبان کے لیے استعمال کیا گیا اسی زمانے میں اس کے مقابلے پر ہندوستان کی بھاشاؤں کو پراکرت (پھانکل بمعنی پھانک پھانکہ - غیرمربوط) کا نام عطا کیا گیا لیکن لکشمی دھر سوتر نمبری ۱-۲-۳۶ میں اس کے مقابل پراکرت کے دو متبادل روپ ہم اور مائم اور ہیم چندریتیم اور ہایم دیتا ہے جو سب کے سب فرضی ہیں اور جو ہندوستان کی کسی بھاشا میں اور کسی عہد میں بھی نہیں بولے گئے -

یہ بیان ان چند دیسی الفاظ کا ہے جنھیں ویدک و سنسکرت میں محض اصول کتابت کی رو سے حروف بدل بدل کر تحریر کیا گیا جس سے ان کا تلفظ بالکل بدل گیا اور جب محققین نے ان کے سنسکرت روپوں سے انھیں دوبارہ بھاشا کے روپوں میں ڈھالا تو یہ اپنے ابتدائی تلفظ سے اتنی دور جا پڑے کہ اب ان کی دونوں شکلوں میں کوئی نسبت ہی نہیں رہی - مختصر طور پر ان کے اشتقاق کی تاریخ یوں مرتب ہوتی ہے -

(۱) بھاشا اپج - سنسکرت اپج اور ات پدیہ -

(۲) بھاشا کمیٹریا کامیر - ویدک و سنسکرت کشمیر - پراکرت کمھارو اور کمبھارو -

(۳) بھاشا سبھل - ویدک سمسیہ - سنسکرت سمست - کتابی پراکرت سمتو -

(۴) بھاشا کھم - کھمّا - تھم - تھمّا - ویدک سکمبھ - ستمبھ - سنسکرت ستمبھ - کتابی پراکرت کھمبھو - تھمبھو -

(۵) بھاشا سانکل - ویدک سنسکرت - سنسکرت - شرلکھل - کتابی پراکرت سکنّم -

(۶) بھاشا بھانکل - سنسکرت پراکرت - کتابی پراکرت ہنٹم ، ہائٹم ، ہیٹیمر ، ہایم -

اب میں دیسی الفاظ کا بیان ختم کرکے چند ایرانی الاصل الفاظ پیش کرتا ہوں - جن کے اشتقاق میں محققین کی کوششوں نے عجیب و غریب گل کھلائے ہیں - یعنی ان سے انھوں نے ہماری بھاشاؤں کے الفاظ تو مستخرج کر ڈالے - لیکن دونوں کے تلفظ میں جو فرق ملتا ہے اس پر مطلق دھیان نہیں دیا نتیجے میں ایسے اصل بے جوڑ الفاظ کے جوڑے ہمارے سامنے آ گئے ہیں کہ ان میں کسی سنجیدہ انسان کو کوئی مادرانہ یا پدرانہ رشتہ نظر نہیں آتا - ان روپوں پر غور کرنے سے پیشتر یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ لاطینی اور ویدک یا سنسکرت زبانوں کی کوئی زندہ روایت ہم تک نہیں پہنچی ہے یعنی یہ زبانیں آج دنیا کے کسی علاقے میں نہیں بولی جاتیں جب کہ زبان ایرانی (فارسی جدید) ہمارے سامنے زبان کی ایک زندہ روایت کے طور پر آج بھی موجود ہے - لامحالہ ان کے مشترک الفاظ کا صرف وہی تلفظ جو ایرانی میں پایا جاتا ہے ان کا حقیقی اور ابتدائی تلفظ تسلیم کرنا ہوگا -

محققین کا خیال ہے کہ اردو زبان کا لفظ "ہم" سنسکرت کے لفظ "اہم" سے نکلا ہے لیکن یہ بات قابل قبول نہیں ہے - کیونکہ سنسکرت کی ابتدائی ہمزہ اردو کے لفظ سے غائب ہے - اس کے لیے ان کا کہنا ہے کہ کثرت استعمال سے گھس گھسا کر جھڑ گئی ہے - جب دوسرا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ سنسکرت "اہم" واحد متکلم کے لیے استعمال ہوتا ہے اور اردو "ہم" جمع کے لیے تو جواب ملتا ہے کہ مرور ایام کے ساتھ ساتھ یہ گڑ بڑ بھی ہوگئی ہے - لیکن اس بات کا ان کے پاس کیا جواب ہے کہ اوستا میں اس لفظ کا تلفظ "ازم" نظر آتا ہے - یعنی سنسکرت

کی "ہ" قدیم ایرانی کے "ز" کی نمائندگی کر رہی ہے ۔ اس کے علاوہ یہ لفظ یونانی میں اور لاطینی میں "اگو" لکھا ہوا ہے یعنی اوستائی "ز" یونانی لفظ کے گاما اور لاطینی کے "جی" سے ظاہر کیا گیا ہے ۔ اس بات کے ثبوت میں کہ یونانی گاما ایرانی "ز" کی آواز دیتا ہے ۔ چند مزید مثالیں ملاحظہ کیجیے ۔ سنسکرت جن (زن ۔ نسل) لاطینی جنس (زنس) یونانی گنس (زنس) ۔ ویدک گنا (زنا) ۔ فارسی جدید زن ۔ یونانی گنے (زنے) وغیرہ ۔ چنانچہ تلفظ کے اعتبار سے مختلف ہند یورپی زبانوں میں اس لفظ کے روپ یوں ہوں گے اوستا ازم (میں) ۔ سعدی بولی ازو ۔ یونانی ازو ۔ لاطینی ازو ۔ سنسکرت و ویدک ازم ۔ ایسی صورت میں اس لفظ کو اردو "ہم" کا ماخذ کیوں کر قرار دیا جا سکتا ہے ۔

عام طور پر پراکرت کے تمام گرامر نویس اور موجودہ زبانوں کے محققین اردو "ہاتھ" (پراکرت ہتھ) کو سنسکرت کے "ہست" سے مشتق دکھاتے ہیں (دیکھیے لکشمی دھر سوتر ۱ - ۴ - ۰ - ۴ اور کیلاگ ص ۴۴ اور سبز واری ص ۱۴۴) حالانکہ اوستا میں سنسکرت "ہست" کا تلفظ "زست" ملتا ہے (دیکھیے اوستا پرائمر جیکسن قاعدہ نمبری ۱۶۹) یعنی سنسکرت کی ہائے ہوز ایرانی "ز" کی بدستود نمائندگی کر رہی ہے ۔ فارسی قدیم میں اسے "دست" لکھتے تھے ۔ جہاں سے یہ فارسی جدید میں منتقل ہوا ہے ۔ اتھرب وید میں بھی اسے "دہست" لکھا گیا ہے لیکن اس لفظ کے صحیح تلفظ کی چھان بین کیے بغیر گرامر نویسوں اور محققوں نے سنسکرت کے مکتوبی روپ کو سامنے رکھ کر اس سے اردو کے لفظ کا اشتقاق دکھا ڈالا ۔ لیکن اس کی اصلیت چاہے زست ہو چاہے "دست" اسے اردو ہاتھ یا پنجابی ہتھ کا ماخذ نہیں مانا جا سکتا ۔

لکشمی دھر پراکرت "سوم" کو سنسکرت "سرد" سے مشتق بتاتا ہے (سوتر ۱ - ۸ - ۸۶) اور اردو "سب" کو کیلاگ (ص ۱۲۷) اور سبزواری (ص ۱۴۴ - ۲۶۵) بھی "سرد" سے ہی ماخوذ دکھاتے ہیں ۔ لیکن یہ لفظ اوستا میں "ہئر دم" اور یونانی میں "ہولس" لکھا ہوا ملتا ہے ۔ ان تمام روپوں میں سین یا ہائے ہوز کے بعد رہا اس کا بدل ل بنیادی آواز ہے ۔ لیکن یہ آواز اردو لفظ "سب" سے یکسر مفقود ہے ۔

اس کی جگہ اردو لفظ میں سین کے بعد ب بنیادی آواز کی حیثیت رکھتا ہے ۔ اب اس لفظ کا صحیح اور ابتدائی تلفظ سرد ۔ ہر دم ۔ ہولس میں سے کسی کو مان لیا جائے اردو "سب" کا اس سے اشتقاق بالکل بے معنی سی بات ہے ۔ خصوصاً اس صورت میں کہ اردو "سب" رگ وید میں جا بجا "سم" کے روپ میں ملتا ہے جس کا ذکر اوپر گذر چکا ہے ۔

سونے کے معنوں میں "سوپ" اور اس کا حالیہ تمام "سوپن" (خواب) سنسکرت و ویدک کے کثیر الاستعمال الفاظ ہیں ۔ "سوپن" سے درروچی سوتر ۱ - ۲ میں پراکرت کے الفاظ "سیویے" ۔ لکشمی دھر سوتر ۱-۴-۲۰-۱ میں "سیویے" اور "سیمینے" ۔ ہیم چندر سوتر ۲-۱۰۰ تا ۱۱۵ میں "سیونو" اورچنڈ سوترم میں "سیوے" اور سمنے مشتق دکھاتا ہے اور ڈاکٹر شوکت سبزواری اپنی کتاب کے ص ۲۸۹ پر "سوپ" سے اردو "سو" اور ص ۱۲۷ پر "سوپن" سے اردو "سونا" کو اخذ کرتے ہیں ۔ لیکن "سوپن" کا ایرانی تلفظ اوستا میں "خوفن" اور "ہوفن" لکھا ہوا ہے ۔ جو آج بھی فارسی جدید میں خواب ۔ خوابیدن اور خفتن کے روپوں میں دکھائی سنائی دے رہا ہے ۔ ایسی صورت میں "خوف" سے "سو" اور "خوفن" سے "سونا" کا اشتقاق کیونکر درست مانا جا سکتا ہے ۔

اسی طرح سنسکرت لفظ "ششک" جس کا صحیح تلفظ فارسی جدید میں "خشک" بنائی دیتا ہے اردو کے لفظ "سوکھا" کا ماخذ نہیں ہو سکتا ۔ لیکن لکشمی دھر سنسکرت "ششک" سے سوتر ۱-۴-۸۶ میں پراکرت "سُکھ" اور سوتر ۱-۴-۱۱ میں "سُوکو" اور "سُوکھو" کا اشتقاق دکھاتا ہے اور ڈاکٹر شوکت سبزواری ص ۱۳۲ پر "سوکھا" اور ص ۲۸۹ پر "سوکھ" کو اس سے ماخوذ بتاتے ہیں بلکہ ایک وہی کیا سنسکرت کا ہر ڈراما نگار پراکرت "سوکھ" یا "سکھ" کو سنسکرت "ششک" ہی سے نکالتا چلا آ رہا ہے ۔ حالانکہ سنسکرت میں اس کا فعل بھی کثیرالاستعمال ہے مثلاً "شوشیتی" (وہ خشک کرتا ہے) اور فارسی جدید میں بھی مادہ "خش" یا "خوش" سے کچھ الفاظ مثلاً "خوشہ"

وغیرہ بنتے ہیں چنانچہ "خش یا خوش" سے اردو "سوکھ" یا "سوکھا" کا اشتقاق قطعاً نا درست ہے۔

ویدک و سنسکرت "بھر اتر" یونانی میں "پھر اتر"۔ لاطینی میں "فراٹر"۔ ویلش میں "بروڈ"۔ انگریزی میں "برودر" اور فارسی جدید میں "برادر" بولا جاتا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس لفظ کا مادہ "بر" اور اس کا لازمی و بنیادی حرف "ر" ہے جو کسی زبان میں بھی ساقط نہیں ہوتا۔ لیکن درروچی سوتر ۵ - ۳۴ میں سنسکرت "بھراتر" سے پراکرت کا ایک فرضی روپ "بھاٹر" تراش رہا ہے جو ہندوستان کی کسی زبان میں نہیں بولا جاتا بلکہ ڈاکٹر شوکت سبزواری ص ۱۱۵ پر اسی سے اردو کا "بھائی" بھی براہ راست مشتق بتا رہے ہیں اور اس حقیقت کو نظر انداز کر رہے ہیں کہ لفظ "بھائی" اردو کے ایک آزاد مادہ "بھا" سے مشتق ہے جس سے اردو کے اور بھی بہت سے الفاظ مثلاً بھانا۔ بھائن۔ بھین (بہن) بھلا (بھلا - بھالا) وغیرہ نکلے ہیں اور جس کا سنسکرت مادہ "بھر" یا فارسی مادہ "بر" سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

اردو کے لفظ "دودھ" کو (پراکرت ددھ) کو سنسکرت کے تمام ڈراما نگار اور پراکرت کے تمام گراس نویس سنسکرت کے لفظ "دگدھ" سے نکالتے ہیں (دیکھیے لکشمی دھر سوتر ۱-۳-۸۶) انھیں کی بات ڈاکٹر شوکت سبزواری نے بھی ص ۱۵۹ پر دہرائی ہے لیکن "دودھ" کا "دگدھ" سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ کیونکہ "دگدھ" ہند یورپی زبان کا حالیہ تمام ہے۔ جس کا مادہ "دوغ" فارسی جدید میں عام طور پر مستعمل ہے۔ اس اعتبار سے سنسکرت "دگدھ" کا حقیقی تلفظ "دغد" اور سنسکرت "مگدھ" (مادہ مغ بمعنی مخمور ہونا سے) کا تلفظ "مغد" ہے لیکن اس "مغد" سے ڈاکٹر سبزواری ص ۱۱۵ پر اردو لفظ "بھوندو" کا اشتقاق دکھا رہے ہیں۔ بلکہ وہ ص ۲۷۹ پر اردو "جوڑا" کی اصل سنسکرت "یکت" بتاتے ہیں۔ جس کا حقیقی تلفظ "یغد یا یغت" ہے اور جو ایرانی زبان کے مادہ "یوغ" (ہل کا جوا) کا حالیہ تمام ہے اور یہ "یوغ" وہی ہے جسے یونانی میں "زگن"۔ لاطینی میں "جگم"۔ کاتھک میں "جوک" اور انگریزی میں "یوک" لکھتے ہیں چنانچہ "یغد" یا "یغت" سے اردو

"جھُوڑا" کا اشتقاق دکھانا مشرق و مغرب کے دو سروں کو ملانے کے مترادف ہے۔

ہماری زبان کے لفظ "گھی" کو تمام گرامر نویس سنسکرت کے لفظ "گھرت" سے ماخوذ بتاتے ہیں۔ چنانچہ لکشمی دھر سوتر نمبری ۱-۲-۸۳ میں "گھرت" کا پراکرت روپ "گھیم" اور چنڈ نے سوتر نمبری ۲-۳ میں "گھتم" لکھا ہے اور یہ دونوں روپ فرضی ہیں۔ جو کبھی بولے نہیں جاتے۔ ڈاکٹر سبزواری نے ص ۱۱۵ پر سنسکرت "گھرت" سے اردو "گھی" کا براہ راست اشتقاق دکھایا ہے حالانکہ سنسکرت لفظ "گھرت" کا صحیح تلفظ ایرانی زبان میں "عزت" ہے اور عزت اور "گھی" کے تلفظ میں کوئی ایک آواز بھی مشترک نہیں ہے۔ سنسکرت کے ہر ڈرامے میں ایک ایسے ہی لفظ "گرت" کا پراکرت متبادل "گد" (گاڑی) ملتا ہے۔ جب کہ سنسکرت لفظ کا صحیح ایرانی تلفظ "غردہ" ہے۔ ادھر "گھی" سے مشابہ بھاشا کا ایک لفظ "دھی" (بیٹی) ہمارے یہاں عام طور پر رائج ہے جیسے ڈاکٹر سبزواری ص ۱۲۲ پر سنسکرت "دھتر" سے مشتق گردان رہے ہیں جب کہ سنسکرت کے لفظ کا صحیح تلفظ فارسی "دختر" میں ملتا ہے جیسے یونانی میں "تھغتیر"۔ گاتھک میں "دوھترا" اور انگریزی میں "دوغتر" لکھتے ہیں۔ پھر یہ تضاد اشتقاق بھی قابل غور ہے کہ اردو "گھی" کا ماخذ تو سنسکرت "گھرت" بتایا جاتا ہے اور اردو "دھی" کی اصل سنسکرت "دھتر" بیان کی جاتی ہے یعنی اردو الفاظ ہم قافیہ ہیں۔ لیکن ان کے نام نہاد ماخذات میں ایسا کوئی اشتراک نہیں ملتا۔

اردو "آٹھ" کی اصل پراکرت "اٹھ" ہے۔ جیسے پراکرت کے تمام گرامر نویس اور سنسکرت کے جملہ ڈراما نویس بلا استثنا سنسکرت "اشٹ" سے ماخوذ ہے کہتے ہیں لیکن سنسکرت "اشٹ" کو اوستا میں "اشت" اور فارسی جدید میں "ھشت" بولتے ہیں۔ اس کے علاوہ یونانی میں اسے "اوکتو"۔ لاطینی میں "اوسٹو"۔ آئرش میں "اوچٹ"۔ جرمن میں "اچٹ" گاتھک میں "اھتن" اور انگریزی میں "ایٹ" لکھا جاتا ہے اور ان سب کے تقابل سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ ہند یورپی زبان کا حالیہ

تمام ہے جس کا مادہ فارسی "ھش" ہے ۔ ادھر پراکرت "اٹھ" کو بھی اگر حالیہ تمام مان لیا جائے تو اس کا مادہ "اٹھ" رہ جاتا ہے لیکن "ھش" اور "اٹھ" میں کوئی نسبت نہیں ۔

لوگ عام طور سے سنسکرت "تاپ" (گرمی) کو اردو "تاؤ" کا ماخذ بتاتے ہیں (دیکھیے اردو زبان کا ارتقاء ص ۱۲۷) لیکن یہ نظر انداز کر دیتے ہیں کہ یہ دونوں دو الگ الگ اور آزاد مادوں سے بنے ہوئے لفظ ہیں ۔ اردو "تاؤ" اردو ہی کے مادہ "تا" (تانا یعنی گرم کرنا) سے مشتق ہے اور سنسکرت "تاپ" (فارسی تاب ۔ تاف) کا مادہ ایرانی تلفظ کے مطابق "تپ" یا "تف" ہے اور یوں "تا" اور "تپ" ۔ "تف" میں دور کا علاقہ بھی نہیں ہے ۔

مشہور پراکرت گرامر نویس وردوچی نے سنسکرت "جامات" سے پراکرت کے دو الفاظ "جامائرم" (سوتر ۵-۳۴) اور "جاما آ" (۵ - ۳۵) تراشے ہیں اور دونوں کے دونوں آج کی زبانوں میں غیر مستعمل ہیں البتہ ہمارے یہاں "جنوائی" کا لفظ عام طور پر رائج ہے جس کے ابتدائی جیم پر پیش بولا جاتا ہے ۔ اس لیے "جامات" سے جنوائی کا اشتقاق درست نہیں مانا جا سکتا ۔ اس کے علاوہ اس اشتقاق میں بھی حسب معمول تلفظ کی بہت بڑی رکاوٹ آ پڑی ہے ۔ یعنی سنسکرت "جامات" کا صحیح تلفظ ایرانی "داماد" ہے جسے اوستائی لہجے کے مطابق زیادہ سے زیادہ "زامات" کہہ لیا جائے لیکن "زامات" اور "جنوائی" میں پھر بھی بعد المشرقین رہے گا اور یہ اشتقاق نا درست ہی مانا جائے گا ۔

اب میں ذیل میں مندرجہ بالا ایرانی الفاظ کے اشتقاق کو مختصر طور پر ترتیب وار پیش کرتا ہوں ۔

(۱) ویدک اہم ۔ اوستا ازم ۔ فارسی قدیم اوم ۔ یونانی ازو ۔ (جیسے آج کل اردو میں ایگویا ایغو بولتے ہیں) صغدی ازو ۔ اردو ہم ۔

(۲) رگ وید ہست ۔ اتھرب وید دہست ۔ اوستا زست ۔ فارسی قدیم دست = اردو ہاتھ ۔

(۳) ویدگ سرو = اوستا ھَرُدم - فارسی جدید سروین = اردو سپ -

(۴) ویدگ سوپ - سوپن = اوستا خوف - خوفن = اردو سو - سوتا -

(۵) ویدک ششک = فارسی جدید خشک = اردو سوکھا -

(۶) ویدک بھراتر = فارسی جدید برادر = اردو بھائی -

(۷) ویدک دگدھ = ایرانی دغد (دوغ سے) = اردو دودھ (لفظ دودھ رگ وید میں 'ددھ لکھا ہوا ملتا ہے) -

(۸) ویدک مگدھ - ایرانی مغد (مغ سے) = اردو بھونڈو -

(۹) ویدک گھرت = ایرانی عزت = اردو گھی -

(۱۰) ویدک گرت = ایرانی غردہ = اردو گاڑی -

(۱۱) ویدک دھتر = ایرانی دختر = اردو دھی

(۱۲) ویدک اشٹ = اوستا اشت - فارسی جدید ھشت = اردو آٹھ -

(۱۳) ویدک تاپ = فارسی جدید تاب - تاف = اردو تاؤ -

(۱۴) ویدک جامات = اوستا زامات - فارسی جدید داماد = اردو جنوائی -

ان اشتقاق کوششوں کو دیکھ کر جن کے مآخذات و مشتقات کے تلفظ میں زمین آسمان کا فرق نظر آ رہا ہے کون ذی ہوش ایسا ہوگا جو بھونچکا نہیں رہ جائے گا لیکن کیا کیا جائے کہ ہندوستانی لسانیات کے محققین نے ازمنہ قدیم سے آج تک ویدک و سنسکرت الفاظ کے مکتوبی روپوں ہی کو پیش نظر رکھا اور ان کے حروف سے وہی آوازیں مراد لیں جو آج علی العموم متصور ہوتی ہیں - یعنی انھوں نے ان کے حقیقی تلفظ کو نظر انداز کر دیا اور سنسکرت الفاظ سے ملتے جُلتے بھاشا کے الفاظ تلاش کر کر کے لکھتے چلے گئے اور اسے اشتقاق کا نام دے دیا - اس سلسلے میں پراکرت کے گرامر نویسوں کو ایک حد تک معذور سمجھنا چاہیے۔کیونکہ نہ انھیں زبانوں کے اس بڑے خاندان کا علم تھا جسے آج ہند یورپی کہا جاتا ہے اور نہ تقابلی لسانیات کی امداد ہی حاصل تھی البتہ حیرت

دور حاضرہ کے محققین پر ہوتی ہے جنھیں قدما کی بہ نسبت بہت زیادہ سہولتیں حاصل ہیں اور پھر بھی وہ تحقیق کے اسی طرز فکر کو اپنائے ہوئے ہیں جو محدود وسائل رکھنے والے متقدمین نے مجبوراً اختیار کر لیا تھا۔

آج کا محقق اپنے پیشروؤں کی طرح زبان کے صرف مکتوبی روپوں کو مقدم جان کر ان کی اصل کا سراغ لگائے گا۔ وہ انھیں کی طرح ناکام رہے گا۔ کیونکہ آج لسانیات میں تلفظ کو جو مقام حاصل ہے کل تک وہ اس سے محروم تھا اور زبان کا مطالعہ جسے لسانیات کہا جاتا ہے۔ صرف صوتیات اور تلفظ کے اصول دریافت کرنے اور سمجھنے ہی کا دوسرا نام ہے۔ یہ صحیح ہے کہ قدیم تحریروں اور قدیم زبانوں کو سمجھنے کے لیے ہمیں لیپوں کا بھی سہارا لینا پڑتا ہے لیکن جیسا کہ میں ابتدا میں کہہ آیا ہوں ہمیں لیپوں کی صحت و عصمت پر سو فی صدی ایمان نہیں رکھنا چاہیے کہ لیپاں خطا کار و فریب کار بھی ہوتی ہیں۔ بلکہ کم از کم ہندوستانی زبانوں کی قدیم تحریروں کے سلسلے میں تو یہاں تک کہہ دینے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے کہ ان کی فریب کاری ہی مطالعہ زبان میں ہمیشہ سے سد راہ رہی ہے۔

اس مقالے میں جن کتب کے حوالے دیے گئے ہیں ان کی تفصیل یہ ہے۔

(۱) لکشمی دھر۔ شڈ بھاشا چندر کا مطبوعہ نرنے ساگر پریس بمبئی ۱۹۱۶ء۔

(۲) در روچی۔ پراکرت پرکاش۔ مرتبہ پی۔ ایل۔ ویدیہ شائع کردہ اوریئنٹل بک ایجنسی پونا ۱۹۳۱ء۔

(۳) چنڈ۔ پراکرت لکشن۔ مرتبہ ہورنلے مطبوعہ بپٹسٹ مشن پریس کلکتہ ۱۸۸۰ء۔

(۴) ہیم چندر۔ پراکرت گرامر مرتبہ پی۔ ایل۔ ویدیہ مطبوعہ ۱۹۲۸ء۔

(۵) پلٹیس - گرامر آف دی ہندوستانی مطبوعہ آکسفورڈ یونیورسٹی
پریس لندن ۱۹۳۱ء -

(۶) کیلاگ - گرامر آف دی ہندی لینگویج مطبوعہ اس پکن پریس
بٹیرین پریس الہ آباد ۱۸۷۶ء -

(۷) ڈاکٹر شوکت سبزواری - اردو زبان کا ارتقا مطبوعہ دی سٹی
پریس ڈھاکا ۱۹۵۶ء -

مزید جن کتابوں سے مدد لی گئی ان کی تفصیل یہ ہے :

(۸) ولیم جیکسن - اوستا گرامر مطبوعہ اسٹٹ گارڈ ۱۸۹۲ء -

(۹) جوزف رائٹ - یونانی زبان کی تقابلی گرامر مطبوعہ آکسفورڈ
یونیورسٹی پریس ۱۹۱۲ء -

(۱۰) ہلسن ولمیس - تقابلی گرامر کے مطالعے کا مختصر تعارف مطبوعہ
یونیورسٹی آف ویلس پریس کارڈف ۱۹۳۵ء -

(مطبوعہ سیپ ، کراچی)

زبان کی تبدیلی اور لپی

یہ جو کہتے ہیں کہ زبان دس دس کوس پر بدل جاتی ہے اس لیے صحیح ہے کہ ہم اس بدلتی ہوئی زبان کو خود اپنے کانوں سے سن لیتے ہیں یعنی مکانی اعتبار سے زبان کے اختلاف اور تنوع کے بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے اس کی بنیاد ذاتی تجربے پر قائم ہے اور اس لیے کسی ایک ہی ملک میں مختلف زبانوں کا وجود ایک ایسی کھلی ہوئی حقیقت ہے جس کی کسی وقت بھی تصدیق کی جا سکتی ہے۔ یہ ایک ایسا دعویٰ ہے جس کے ثبوت کے لیے ہمیں اپنے کانوں کے سوا کسی دوسرے کی احتیاج نہیں۔ آج پاکستان کے طول و عرض میں کشمیری، پشتو، پوٹھوہاری، لہندا، پنجابی، ملتانی، سندھی، بلوچی، مکرانی، بنگالی وغیرہ جو زبانیں بولی جا رہی ہیں وہ عوام و خواص سبھی کے کانوں میں پڑ رہی ہیں۔ ان کے وجود کو ثابت کرنے یا تسلیم کرانے کے لیے کسی خاص اہتمام کی ضرورت نہیں ہے نہ اس حقیقت کو سمجھنے سمجھانے کے لیے کسی خاص معیار کی تعلیم یا خاص قسم کی ذہنی صلاحیتیں ہی درکار ہیں۔ بچہ، بوڑھا، مرد، عورت، عام، خاص جو چاہے ملک کے اس سرے سے اس سرے تک چلا جائے اور خود اپنے کانوں سے یہ مختلف بولیاں سن کر سمجھ لے کہ ہمارے یہاں تھوڑے تھوڑے فاصلے کے بعد لوگوں کی زبان بدل جاتی ہے یا نہیں۔ زبانوں کے اختلاف کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ وہی عوام جو زبانوں کے امین ہوتے ہیں مختلف النوع زبانوں کے وجود کی تصدیق بھی کر سکتے ہیں۔ اسے ہم نطق انسانی کی مکانی یا تحتانی تقسیم کہہ سکتے ہیں۔

اس سلسلے میں بعض لوگ جن میں مشرق و مغربی دونوں مکتبۂ خیال کے پڑھے لکھے شامل ہیں غالباً مغربی مفکر ڈاروِن کے نظریۂ ارتقائے حیات سے متاثر ہو کر یہ دعویٰ بھی پیش کرتے ہیں کہ ایک ہی زبان

اپنے مخصوص علاقے میں بھی سرور ایام کے ساتھ بدلتی رہتی ہے اور اس خصوصیت میں وہ زبان کی سطحی تبدیلی سے لے کر بنیادی تبدیلی تک کے قایل و مدعی نظر آتے ہیں - ایک طرف وہ یہ کہتے ہیں کہ زبان سانپ کی سی کینچلی جھاڑتی رہتی ہے - مختلف وجوہ کے تحت اس کے کچھ الفاظ استعمال سے خارج اور ان کی جگہ نئے نئے الفاظ اس میں داخل ہوتے رہتے ہیں - اس طرح وقت کے ساتھ ساتھ متروک الفاظ کی تعداد بڑھتی چلی جاتی ہے اور اسی نسبت سے دخیل یعنی دوسری زبانوں کے الفاظ کی کثرت بھی ہوتی چلی جاتی ہے - دوسری طرف ان کا یہ بھی خیال ہے کہ اس ہمہ گیر تبدیلی کے نتیجے میں ایک دن اس کی اساس بھی بدل جاتی ہے اور وہ خصوصیات اور وہ روپ جن سے ہم کسی زبان کو تمیز کرتے ہیں تبدیل ہو جاتے ہیں - اس مخصوص عمل میں زبان موسم بہار کے اس درخت سے مشابہ ہے جس کی پرانی پتیاں جھڑ جانے کے بعد یکسر نئی کونپلیں پھوٹ آتی ہیں -

زبان کے سطحی تغیرات چھوٹے پیمانے پر تو ہم بھی اپنے گرد و پیش دیکھتے رہتے ہیں کہ بعض اوقات کوئی لفظ ترک کر دیا جاتا ہے یا ایک نیا لفظ اختیار کر لیا جاتا ہے لیکن یہ تغیرات بہت سست رو ہوتے ہیں - جو لوگ ہم کو ان کی تیز گامی جتانا چاہتے ہیں وہ ادیبوں کی شعوری کوششوں کو سامنے رکھتے ہیں - یہ صحیح ہے کہ ادب میں ترک و اختیار کا عمل کسی فرد واحد سے شروع ہو کر اس کے متبعین تک پھیل جاتا ہے لیکن زبان کے معاشرے کے مقابلے میں ان لوگوں کی تعداد قابل اعتنا نہیں ہوتی - پھر یہ کہ ایک ادیب ایک لفظ کو ترک کر دیتا ہے لیکن دوسرا اس کا استعمال جائز رکھتا ہے بلکہ کبھی کبھی تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ ادیبوں کی ایک معقول تعداد کسی لفظ کو ٹکسال باہر قرار دے دیتی ہے لیکن کچھ مدت کے بعد اس کا استعمال پھر سے ادب میں شروع ہو جاتا ہے - کہنے کا مقصد یہ ہے ترک و اختیار کے باب میں ادب اور ادیب جس آمریت کا مظاہرہ کرتے ہیں وہ زبان کے لیے اجنبی ہے - یہاں بعض لوگ حسن و اخلاق کے عجیب و غریب مسائل بھی کھڑے کر دیتے ہیں کہ وہ لفظ جس کا تلفظ زبان پر بار اور کانوں کو

ناگوار ہوتا ہے ترک کر دیا جاتا ہے یا جس زبان میں گالی کے لیے کوئی لفظ نہیں ملتا اس کے بولنے والوں کا اخلاق معیار بہت بلند ہوتا ہے - یہ لوگ بھی زبانوں کے ادب سے متاثر ہو کر ہی ایسی باتیں کرتے ہیں - زبان میں حسن و اخلاق کے یہ اصول استعمال نہیں ہوتے - فصیح و غیر فصیح اور بہتر و بدتر کی اصطلاحیں صرف ادیب ہی کام میں لاتے ہیں - عوام ثقل و تنافر کی کسوٹیوں پر زبان کی صفائی نہیں کیا کرتے بلکہ وہ زبان کو صرف اس لیے استعمال کرتے ہیں کہ ان کی زندگی کی ضروریات پوری ہو جائیں - انہیں اس سے کوئی سروکار نہیں کہ کوئی لفظ فصیح ہے یا گنوار - وہ صرف یہ دیکھتے ہیں کہ وہ ان کے مافی الضمیر کی ترجمانی کر دیتا ہے یا نہیں اور بس - ان کے نزدیک لفظوں کا انتخاب اور استعمال ضرورت کے تابع ہوتا ہے - ترک و اختیار کا مسئلہ خواص اور ادبا نے جتنا اہم اور ہمہ گیر بنا رکھا ہے عوام کے نزدیک اتنا ہی ناقابل توجہ ہے یہی وجہ ہے کہ ادبا نے جن الفاظ کو مدت سے مردود و متروک قرار دے رکھا ہے عوام انہیں اب تک بیدھڑک استعمال کرتے چلے آ رہے ہیں - اردو کے بہت سے الفاظ مثلاً مت (نہ)، پر (لیکن)، دکھلانا (دکھانا)، تلک (تک) وغیرہ اس دعویٰ کی روشن دلیلیں ہیں -

اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ زبان میں تغیرات نہیں ہوتے - زبان کی تبدیلیاں دو قسم کی ہوتی ہیں - ایک داخلی دوسری خارجی - زمانے کے ساتھ ساتھ جہاں انسان کے خیالات بدلتے ہیں وہاں ان کے اظہار کے لیے زبان میں نئے نئے الفاظ اور نئے نئے اسلوب بھی جنم لیتے ہیں لیکن ان الفاظ اور اسالیب کی اساس زبان کے انہیں اصول و قواعد پر استوار ہوتی ہے جو قدیم سے چلے آ رہے ہیں - مثلاً برق سے برقانا (کسی دھات میں بجلی کی رو پیدا کرنا) اور قلم سے قلمانا (درخت میں پیوند لگانا یا شورے وغیرہ کی سی قلمیں تیار کرنا) وغیرہ کہ اردو میں متعدی مصادر مادے پر "آنا" کے اضافے سے بنائے جاتے ہیں یا چل سے چلکڑ (بہت چلنے والا)، جل سے جلکڑ (بہت جلنے والا) وغیرہ کہ اردو میں مادے پر "اکڑ" کے اضافے سے صفت کی زیادتی ظاہر کرنے کے لیے اسما بنانے کا قاعدہ شروع سے چلا آ رہا ہے جیسے بھول سے بھلکڑ، پی سے پیکڑ،

کود سے کد کڑ وغیرہ ۔ یہ زبان کی داخلی تبدیلی کہلاتی ہے جس کی تہہ میں اصول تشبیہہ کام کرتا ہے اور چالو روپوں کی مثالیں سامنے رکھ کر نئے نئے روپ تیار ہوتے رہتے ہیں ، زبان کی دوسری تبدیلی خارجی ہوتی ہے ۔ جب دو تمدنوں کی طرح دو زبانیں باہم متصادم ہوتی ہیں تو ایک دوسرے پر اپنے اپنے اثرات ڈالتی اور الفاظ و اسالیب مستعار لے لیتی ہیں ۔ چنانچہ اردو زبان میں بھی دوسری زبانوں کے کثیر تعداد الفاظ ، اسالیب دیکھے جا سکتے ہیں جو کسی زمانے میں فارسی سے اور موجودہ دور میں بیشتر انگریزی سے جوں کے توں آ گئے ہیں یا ترجمہ کرکے داخل کر لیے گئے ہیں ۔ اردو زبان میں یہ ایسے اضافے ہیں جن کا اس کے بنیادی اصولوں سے کوئی تعلق نہیں ہے اور اسی لیے ان کا وجود دیر پا نہیں کہا جا سکتا ۔ زبانوں کے کسی ایسے ہی آئندہ تصادم کے وقت یہ چیزیں ہماری زبان سے اتنی ہی آسانی کے ساتھ خارج ہو سکتی ہیں جتنی سہولت سے داخل ہوئی ہیں ۔

غرض مندرجہ بالا دو قسم کی تبدیلیوں کے علاوہ زبان میں اور کوئی تیسری تبدیلی ایسی نظر نہیں آتی جو اس کی اساس کو بدل دے ۔ اساس کا بدل جانا ایک منطقی مغالطہ ہے ۔ اساسی فرق کی موجودگی میں دو زبانوں کو ایک کہنا یا ایک زبان کے دو ارتقائی روپ قرار دینا اصولی طور پر غلط ہے ۔ مثال کے لیے پاکستان کی دو زبانیں پنجابی اور سندھی لے لیجیے جو پہلو بہ پہلو بولی جا رہی ہیں ۔ ان میں آپ کو اتنا فرق نہیں ملے گا جتنا چینی اور عربی یا انگریزی اور انڈونیشی میں بلکہ ان میں قابل قدر حصہ مشترک نظر آئے گا ۔ پھر بھی کوئی شخص انھیں ایک زبان کہنے میں حق بجانب نہیں ہوگا ۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ دونوں میں اساسی اختلاف پایا جاتا ہے اور زبانوں کی تقسیم ان کی اساس کے پیش نظر ہی کی جاتی ہے چنانچہ برصغیر پاک و ہند کی زبانیں شمار کرتے وقت ان کے اساسی فرق کو سامنے رکھنا اور قدر مشترک کو نظرانداز کر دینا ضروری ہے ۔

اساسی فرق کا یہ اصول جس طرح مکانی اعتبار سے صحیح ہے اسی طرح زمانی اعتبار سے بھی درست ہے یعنی جس طرح ہم معاصر زبانوں کی

تمیز میں اس اصول کو برتتے ہیں اسی طرح قدیم و جدید زبانوں کے تقابل و تفریق میں بھی اس پر عمل کرنا چاہیے۔ اگر اس موازنے میں بنیادی اختلافات ہمارے سامنے آتے ہیں تو لازم ہے کہ ہم انہیں دو مختلف زبانیں تسلیم کریں لیکن لوگ عام طور پر قدیم و جدید کے بنیادی اختلافات کو یہ کہہ کر ٹال دیتے ہیں کہ یہ ایک ہی زبان کی دو ارتقائی شکلیں ہیں۔ قدیم دکنی زبان کو اردوئے قدیم کہنے والوں کا شمار انہیں لوگوں میں ہوتا ہے اور سنسکرت کو موجودہ زبانوں کا ماخذ یا ادبی روپ بتانے والے بھی اسی گروہ سے تعلق رکھتے ہیں۔

مغربی محققین بھی ویدک زبان کو قدیم ہند یورپی کی ایک شاخ بتاتے ہیں اور دوسری شاخوں سے اس کے بنیادی اختلافات کو مختلف طریقوں سے ٹالتے ہیں۔ مثلاً ویدک کے مہاپرانوں کھ، گھ، بھ، پھ وغیرہ اورل کے متعلق کہتے ہیں کہ یہ قدیم ہند یورپی زبان میں پائے جاتے تھے لیکن اس کی دوسری شاخوں سے غائب ہو گئے ہیں۔ وہ ٹ، ڈ، ڑ کی آوازوں کو خالص ہندوستانی مانتے ہیں پھر بھی بعض بعض کا خیال ہے کہ یہ قدیم ہند یورپی کی دوسری آوازوں کی مدد سے پیدا ہوگئی ہیں۔ ویدک لری کی تشریح ان کے بس سے اب بھی باہر ہے اور تاریخ کی روشنی میں وہ یہ بھی بتانے سے قاصر ہیں کہ یہ تمام حروف قدیم ہند یورپی کی دوسری شاخوں سے کیوں غائب ہوگئے اور صرف ویدک میں ہزاروں سال بعد کیوں نظر آئے۔

اس تمام الجھن کی ایک بہت بڑی وجہ ہے۔ ہم موجودہ زبانوں کی آوازیں سن کر ان کی تفریق، تصدیق اور شناخت کر سکتے ہیں لیکن قدیم زبانوں کی آوازوں تک ہماری براہ راست رسائی ممکن نہیں۔ اسلاف کے صحیح تلفظ اور ہمارے کانوں کے درمیان ایک پردہ حائل ہوگیا ہے۔ ان کی آوازیں کسی گراموفون یا ٹیپ ریکارڈ میں بند نہیں ہیں۔ اب ان تک پہنچنے کا ہمارے پاس صرف ایک ہی ذریعہ ہے اور وہ ہے لپی لیکن لپی اور تلفظ یا حرف اور آواز کا نازک تعلق ایک علاقے اور ایک دور سے مخصوص ہوتا ہے اور جب علاقہ یا دور بدلتا ہے تو یہ تعلق

بھی کمزور پڑ جاتا ہے اور لپی آوازوں کو درہم برہم کرنے اور تلفظ کو بگاڑ دینے کا آلہ بن کر رہ جاتی ہے اس لیے قدیم زبانوں کی صحیح آوازوں تک پہنچنے کے لیے لپی پر پورا بھروسا کر بیٹھنا نہایت خطرناک ہوتا ہے۔

اس کی مثال کے لیے دور کیوں جائیے۔ ہم اردو زبان کے ایک لفظ کو دیکھتے ہیں جو پھونچ اور پہنچ کے دو مکتوبی روپوں میں نظر آتا ہے اور قدیم تحریروں میں پوہنچ اور ہونچ کے دو اور روپ بھی ملتے ہیں۔ غالباً اس باب میں کوئی اختلاف نہیں ہو سکتا کہ اس کا صحیح تلفظ ایک ہی ہوگا جس کو آج کل دو طریقوں سے تحریر کیا جاتا ہے اور یہ دونوں طریقے پڑھے لکھوں کے دو جداگانہ حلقوں میں پہلو بہ پہلو رائج ہیں۔ لطف کی بات یہ ہے کہ تلفظ پر دونوں حلقے متفق ہیں لیکن اصول کتابت میں اختلاف رکھتے ہیں۔ میں نے پھونچ لکھنے پڑھنے والوں کو اسے پھونچ یا پہونچ بولتے نہیں سنا۔ یہ الگ بات ہے کہ آئندہ اس روپ کو پڑھنے والا لپی پر مکمل اعتبار کرکے اسی طرح بولنے بھی لگے۔

م آ، چ آ، ج آ، ہ آ، ک ں آں، دھ ں، آں کو عام طور پر موا، چوا، جوا، ہوا، کنواں، دھواں لکھتے ہیں جن کو پڑھتے وقت تلفظ کے بگڑ جانے کا ہمیشہ کھٹکا لگا رہتا ہے۔ اسی طرح بھڑ آ، کل آ، گھڑ آ، بٹ آ کو بھروا، کلوا، گھڑیا، بٹیا لکھتے ہیں۔ یہ مکتوبی شکلیں بھی آوازوں کو صحیح طور پر ادا نہیں کرتیں۔ یہاں، وہاں، جہاں، تہاں، کہاں کو یاں، واں، جاں، تاں، کاں بھی لکھا ہوا دیکھا جا سکتا ہے۔ میرے نزدیک یہ دونوں مکتوبی شکلیں صوتی اعتبار سے غلط ہیں۔ ان کی اصل شکلیں ا آں، آ آں، ج آں، ت آں، ک آں تھیں۔ ایدھر، اودھر، جیدھر، کیدھر کے روپ بھی غلط معلوم ہوتے ہیں۔ یہ دلی میں کبھی اسی طرح بولے بھی جاتے تھے۔ غالباً ان کا بگڑا ہوا تلفظ ان کی مکتوبی شکلوں ہی کی بدولت پیدا ہوا ہے۔ پنچائت، گھائل، پائل کو بعض لوگ پنچایت، گھایل، پایل اور بھ آر کو بھوار اور بھوہار دونوں طرح لکھتے ہیں جس کے صاف معنی یہ ہیں کہ لپی ہمارے تلفظ کا ساتھ نہیں دے رہی ہے۔ ان مثالوں سے یہ بات واضح ہے

کہ اصول کتابت کے اختلاف سے آوازوں کی مکتوبی شکلوں میں اختلاف ہو جاتا ہے اور پھر ان کے ذریعہ اصلی تلفظ کے بگڑ جانے کا ہر وقت دغدغہ لگا رہتا ہے۔

میں نے قدیم تحریروں میں اس کو اوس، دکھ کو دوکھ، سکھ کو سوکھ، ٹھیر کو ٹھہر، کچھ کو کچھہ، ہاتھ کو ہاتھہ، فوارا کو پھوار، پھوہارا لکھا ہوا دیکھا ہے تو کیا میں اس بات سے یہ نتیجہ نکالنے میں حق بجانب ہوں گا کہ اس وقت کے مقابلے میں آج کی زبان بدل گئی ہے۔ میرے نزدیک ایسا سوچنا بالکل غلط ہے لوگ جسے زبان کا بدلنا کہتے ہیں وہ دراصل اصول کتابت کی تبدیلی ہے۔ اس کی مثالیں سنسکرت میں بھی ملتی ہیں جس میں ہماری زبانوں کے لاتعداد الفاظ شامل کر لیے گئے ہیں۔ مثلاً اترن (اترنا) کو سنسکرت میں اُوترن اور اوسرا (باری) کو اوّسر (موقع) لکھا گیا ہے جن کا واو ہمارے پیش کا بدل ہے۔ یہی نہیں بلکہ ویدک کے اصول کتابت کی رو سے اردو "ا" کو "ی" اور سنسکرت میں "ات" یا "اُو" سے بھی ظاہر کیا گیا ہے اس لیے کہ سنسکرت میں قدیم ہند یورپی زبان کے اصول کے مطابق ت اور و باہم متبادل ہونے کے ساتھ ساتھ حشوی بھی ہوتے ہیں چنانچہ پراکرت اجو تن (جوا اتارنا، جوا، کھولنا) کو ویدک میں "یوتن"۔ اردو "اپج" کو سنسکرت میں "ات پدیہ"، "اکال" کو "اوکار" (پراکرت میں ل اور باہم متبادل ہوتے ہیں جس سے یہ تبادل سنسکرت میں بھی مستعار گیا ہے) اور "اگھاڑن" (اگھاڑنا بمعنی کھولنا) کو "اوگھاٹن" لکھا ہوا دیکھا جا سکتا ہے۔ لوگ سنسکرت کے اصول کتابت پر غور نہیں کرتے اور اس کی لپی سے جو تلفظ اخذ ہوتا ہے اسی کو ہمارے تلفظ کا ماخذ قرار دے کر ہماری زبانوں کو سنسکرت سے مشتق سمجھ بیٹھتے ہیں۔ یہ بات جتنی سنسکرت کے باب میں صحیح ہے اتنی ہی دوسری قدیم زبانوں (یعنی قدیم تحریروں) کے متعلق بھی درست ہے۔

رومن لپی میں عبرانی زبان کے چند ناموں پر غور کیجیے جیکب، جیمس، جوشوا، جوزف، جون، جرمیا۔ ان کے ناموں کا آغاز رومن جے (j) سے ہوتا ہے لیکن ان کے جو نام عربی کے توسط سے ہم تک

پہنچے ہیں ان کی ابتدائی سے ہوتی ہے ۔ یعقوب ، یسوع (عیسیٰ غالباً اسی کی ابتدائی شکل ہے) ، یوشع ، یوسف ، یوحنا ، یرمیا ۔ اس کو لوگ ی اور ج کا تبادل کہہ اُٹھتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہاں لپی کا قدم درمیان میں آ گیا ہے ۔ اس بات سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ ان ناموں کی ابتدا ی اور ج میں سے کسی ایک حرف سے ہوتی تھی ۔ میرے نزدیک ان دونوں میں ی قدیم تر ہے ۔ میں عربی سے اپنے تعلق خاطر کی بنا پر ایسا نہیں کہتا بلکہ واقعات مجھے یہ بتاتے ہیں کہ قدیم زمانے میں یورپ کی مختلف زبانوں میں ی کو جے (j) سے لکھا کرتے تھے ۔ چنانچہ وسطی انگریزی میں وائی (y) کو زیڈ (z) سے لکھا جاتا ہے جس کی شکل (j) سے ملتی ہے اور اسی سے قدیم حرف صحیح ج بھی لکھا جاتا تھا (بلکہ آج بھی بین الاقوامی اصول کتابت میں ی کی آواز کے لیے جے کی علامت رکھی گئی ہے) بعد میں جب لوگ اس اصول کتابت کو بھول گئے تو جے (j) سے جیم کی آواز نکالنے لگے اور انھوں نے ی اور ج کے تبادل کا اصول گھڑ ڈالا ۔ انگریزی زبان کے مشہور شاعر چاسر کے عہد کی انگریزی لکھاوٹ پر غور کیجیے اور اسے آج کی املا سے ملائیے تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ جسے زبان کی تبدیلی کہا جا رہا ہے اس میں اصول کتابت کا کتنا ہاتھ ہے ۔

انگریزی کے ایک لفظ یوک (Yoke بمعنی جوا) پر غور کیجیے ۔ لاطینی میں اسے "جگُم" یعنی جے (j) سے لکھتے ہیں ۔ ایرانی میں "یو غم" ویدک میں "یگُم" اور قدیم یونانی میں "زغُن" لکھا گیا ہے اور قدیم ہند یورپی میں اس کی مفروضہ شکل "اِ ءگم" مانی گئی ہے ۔ لاطینی میں زیڈ (z) اکثر ی کی جگہ بھی لے لیتا ہے جیسے رونیر (Runior) بجائے یونیر (Iunior) یہ جونیر (junior) ۔ قدیم انگریزی میں لاطینی ز زیڈ کے بجائے جی (g) یا آئی (i) سے لکھا جاتا تھا الفاظ کی دہری شکلیں اس کی شاید ہیں مثلاً زیلس (Zealous) اورجیلس (gcolous) یہ دونوں الفاظ لاطینی زیلوسس (Zelous) سے بنے ہیں اور زیلوسس یونانی زیلوس (Sndos) سے لیا گیا ہے ۔ وائی کلف (Wycliffe) اور اس کے معاصرین جے لس (gelous) یا یے لس (ielous) لکھتے ہیں اور یہی آخری شکل جے لس (gealous)

کا ابتدائی روپ ہے ۔ اس کے علاوہ فارسی یار ، زار = ویدک جار، فارسی زمین = ویدک جمن ، فارسی جوان = ویدک یوان، انگریزی ییئر (Year بہ معنی سال) کا تلفظ ِ اِئر کیا جاتا ہے اور ویدک "یت" (گزرا ہوا) کا دوسرا روپ "ِات" بھی ملتا ہے ۔ اسی طرح ویدک و سنسکرت میں پراکرت جودھا (لڑاکا) کو یودھا اور جُوتِن (جوتنا) کو یوتِن تحریر کیا گیا ہے ۔ ان مثالوں کی رو سے ی ، ج ، ز اور ا ، سب کے سب حروف باہم متبادل قرار پاتے ہیں لیکن یہ سب کچھ محض کتابت کا اختلاف ہے جس نے الفاظ کے تلفظ میں بھی فرق پیدا کر دیا ہے ۔

کہا جاتا ہے کہ جب عربوں نے ایران کو فتح کر لیا اور ان کی قدیم تحریرات کو عربی لپی میں منتقل کرنے بیٹھے تو ایرانی الفاظ کے آخری کاف کو ہائے مختفی سے بدل دیا اور اس کی وجہ عام طور پر یہ بیان کی جاتی ہے کہ وہ ایران کی قدیم لپی کے حروف کاف اور ہا میں امتیاز نہیں کر سکے اس لیے انھوں نے بندک کو بندہ، مژک کو مژہ اور نامک کو نامہ تحریر کر دیا لیکن یہ بات دل کو نہیں لگتی کہ عرب کے عالم قدیم ایرانی لپی کے پڑھنے میں ایسی کھلی ہوئی غلطی کے مرتکب ہوں جس کی معمولی پڑھے لکھے سے بھی توقع نہیں کی جا سکتی ۔ پھر یہاں یہ بھی سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان کو الفاظ کے آخری کاف میں ہی اشتباہ کیوں پیدا ہوا ابتدائی اور درمیانی کاف میں ان سے یہ غلطی کیوں سرزد نہیں ہوئی ، اس الجھن کا میرے نزدیک واحد حل یہ ہے کہ عربوں نے ان الفاظ کی مکتوبی شکلوں کو نظرانداز کرکے انھیں بول چال کے مطابق تحریر کر دیا ہے یعنی ایرانی نامک لکھ کر نامہ اور بندک لکھ کر بندہ پڑھتے بولتے تھے اس لیے کہ ان کا اصول کتابت ہی یہ تھا ۔ ان الفاظ کا آخری کاف اس اعتبار سے حشوی تھا کہ اس سے "آ" کی آواز مراد لی جاتی تھی ۔ بالکل یہی صورت حال ہمیں ویدک و سنسکرت میں ملتی ہے جن کے الفاظ کا آخری کاف "آ" کا بدل ہوتا ہے ۔ مثلاً پراکرت بالا = سنسکرت بالکف ، پراکرت الّا = سنسکرت ، الک ، پراکرت گھوڑا = سنسکرت گھوٹک ، پراکرت کڑوا = سنسکرت کٹک وغیرہ ۔

قدیم ایرانی میں ایک ایسا حرف بھی ملتا تھا جس پر مرکب آواز

کا شبہ ہوتا ہے ۔ اسے فارسی میں "خو" اور ویدک میں "سو" سے لکھا گیا ہے ۔ عربی لپی میں واو پیش کی طویل آواز دیتا ہے اور کبھی کبھی پیش کا بدل بھی سمجھ لیا جاتا ہے غالباً یہی وجہ ہے کہ ہم فارسی لفظ "خوش"، کو "خش" بولتے پڑھتے ہیں اور اس کی اصل اور قدیم آواز سے دور ہٹ گئے ہیں اس لیے کہ "خو" کی آواز زبر کے ساتھ ادا ہوتی ہے چنانچہ فارسی کے شعرا سے صحیح تلفظ کے ساتھ "خش" نظم کرتے ہیں ۔ ویدک کے لفظ "سور" (= فارسی خور ، خورشید) کو لوگ بالعموم "سر" پڑھتے ہیں اور یہ غلط تلفظ بھی لپی کی بدولت پیدا ہوا ہے ۔ پراکرت کا لفظ "سُر" (آواز) بھی ویدک میں "سور" لکھا گیا ہے اور اس کا بھی یہی تلفظ کیا جاتا ہے جو اوپر مذکور ہوا ۔ ویدک لفظ "پرسوید" (لسپنیہ) ایرانی لپی میں (فر) خوید اور (فر) خوئید دونوں طرح لکھا جاتا ہے لیکن اس کی حقیقی آواز کسی ایک سے بھی ادا نہیں ہوتی ۔ ویدک میں اس کا حال فارسی سے بھی ابتر ہے جیسے آچاریہ اور اسکالر "پرسّید" پڑھتے ہیں ۔

مغرب کے علمائے لسانیات اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں کہ قدیم ہند یورپی زبان کی مختلف شاخوں میں سین ہا سے بدل جاتا ہے اور پھر ہ ساقط ہو جاتی ہے جس کے کھلے ہوئے معنی یہ ہیں کہ بعض مقامات پر یہ حروف (س اور ہ) حشوی ہوتے ہیں ۔ ان کا تلفظ سے کوئی تعلق نہیں ہوتا ۔ پھر جو لوگ وہاں ان کے تلفظ پر زور دیتے ہیں وہ اصول کتابت کو نظر انداز کر جاتے ہیں ۔ میں نے رگ وید سے (پراکرت) الفاظ کا آخری سین ان مقامات کو چھوڑ کر جہاں وہ حرف ماقبل کے ساتھ مل کر پراکرت مہاپران کی نمائندگی کرتا ہے علی العموم حشوی پایا ہے ۔ یہی حال قدیم یونانی کا ہے چنانچہ یونانی گنیس (جبڑا) = سنسکرت ہنو ۔ یونانی اگروس (کھیت) = سنسکرت اجر، یونانی آستروس (بعد کا) = سنسکرت اُتر ، یونانی ارتھروس (خون) = سنسکرت رُدھر ، یونانی زیس (آسمان) = سنسکرت دیاو ، تفصیل کل کے لیے یونانی لاحقہ استوس = سنسکرت اتھ وغیرہ ۔ مستشرقین ویدک اور یونانی کے اسی آخری سین کو ویدک و سرگ کا قائم مقام بتاتے ہیں لیکن ہنلٹ پابندی کے ساتھ و

سرگ کا تلفظ ہ سے کرتے ہیں جو علمائے لسانیات کے مندرجہ بالا خیال کی روشنی میں غیر ضروری ہے۔

ویدک زبان میں پراکرت اور ایرانی دونوں زبانوں کے الفاظ ملتے ہیں لیکن بعض پراکرت اور ایرانی الفاظ کو ایک ہی مکتوبی شکل میں ظاہر کیا گیا ہے اس لیے ان کے صحیح تلفظ تک رسائی حاصل کرنا آسان نہیں ہے۔ مثلاً پراکرت لفظ ابھ (اردو اب) اور ایرانی لفظ "ایئی" یا "اِوی" دونوں کو رگ وید میں ابھ لکھا گیا ہے۔ ملاحظہ کیجیے ویدک ابھتس (گردا گرد) یہ اوستائی آروِ تو یعنی ویدک کا حرف "بھ" ایرانی ہمزہ کا قائم مقام ہے۔ چنانچہ ویدک اُبھے (دونو) = اوسا اُیے یا اُئے، دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ ویدک کے پراکرت الفاظ میں حرف بھ سے بھ کی آواز ہی مراد ہوتی ہے لیکن ایرانی الفاظ میں یہ حرف محض حرکت ظاہر کرتا ہے۔ ان حالات میں ویدک زبان کو پڑھتے وقت پراکرت الفاظ کا تلفظ ہماری بول چال کے مطابق اور ایرانی الفاظ کا تلفظ ایرانی بول چال کے مطابق کرنا چاہیے۔ اس سلسلے میں ویدک کی ضمیر واحد متکلم فاعلی کے روپ "اہم" پر غور کیجیے۔ اوستا میں اس کا تلفظ "ازم" ہے اس لیے سنسکرت "اہم" کا تلفظ "ازم" ہی ماننا پڑے گا کیونکہ اوستائی تلفظ ویدک تحریر کے تلفظ پر مقدم ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ویدک میں ایرانی ز اور ژ کو دوسرے حروف سے ظاہر کیا گیا ہے لیکن ایرانی بول چال میں یہ صفیری آوازیں آج تک چلی آ رہی ہیں۔ خود دیدک و سنسکرت کے عالموں اور آچاریوں نے دیوتا گری کی "ہا" کو صفیریوں کے زمرے میں اسی لیے رکھا ہے کہ یہ ایرانی "ز" کی نمائندہ ہے۔ لطف یہ ہے کہ ہندوستانی لسانیات کے محققوں نے ویدک و سنسکرت کے اصول کتابت پر تو غور کیا نہیں اور ہ کو صرف ہ سمجھ کر سنسکرت "اہم" کو عددی اختلاف کے باوجود اردو "ہم" کا ماخذ قرار دے دیا حالانکہ اردو "اہم" پراکرت "امھ" سے مشتق ہے جس کی الف ہ سے اور مہا پر ان الپ پران سے بدل گیا ہے۔

یہاں ہ کے حشوی اندراج کے ثبوت میں سکھوں کے گرو گرنتھ صاحب کی گور مکھی سے چند مثالیں پیش کرتا ہوں۔

گرو نانک کہتے ہیں :

تیری کُدرت تو ہے جانیہ اَلر نہ دُوجا جانے
جس نو (ں) کر پا کر ہے میرے پ آرے سوئی تجھے پچھانے

(گرو گرنتھ صاحب ، ص ۱۱۸۵ مطبوعہ خالصہ گرو مت پریس امرتسر ۱۹۳۹ء) -

کبیر داس کہتے ہیں :

کہت کبیر سنھورے سنتو ملیے سارگ پانی ہرے

(ایضاً ، ص ۸۵۵)

یا

کہہ کبیر سیوا کرہو من سنجھ مرار

(ایضاً ، ص ۸۵۷)

ایک دکھ رام رائے کٹھو میرا
بابا اگن ہے ارگر یہ بسیرا

(ایضاً ، ص ۳۲۹)

ان اشعار میں جانے کو جانیہ ، کرے کو کر ہے ، گرو کو کرہو ، سنو کو سنھو ، سنتو کو سنتھو اور کاٹو کو کٹھو تحریر کیا گیا ہے لیکن ان مثالوں کو دیکھ کر یہ کہنا کہ اس زمانے میں یہ الفاظ جس طرح لکھے ہوئے ہیں اسی طرح بولے بھی جاتے تھے کسی طرح درست نہیں ہوگا اس لیے کہ گرنتھ صاحب کے علاوہ دوسرے مقامات پر یہ الفاظ اپنے موجودہ تلفظ کے ساتھ قلم بند کیے ہوئے ملتے ہیں -

ماحصل کلام یہ ہے کہ کسی زبان کی فوقانی یا زبانی تقسیم یعنی قدیم و جدید جیسی تفریق صرف ایک مغالطہ ہے جس کو نطق انسانی کی تحتانی یہ سکنی تقسیم سے تقویت مل رہی ہے - دنیا کی دوسری قدیم زبانوں مثلاً قدیم یونانی، لاطینی، قدیم فارسی اور اوستائی وغیرہ کے متعلق میں بس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتا کہ ان زبانوں پر تحقیق کام کرنے

والے انھیں مردہ کہنے سے قبل ذرا ان کی مختلف لپیوں کا گہرا تقابلی مطالعہ کریں اور پھر بتائیں کہ یہ زبانیں کس حد تک مردہ ہو چکی ہیں البتہ میں ویدک و سنسکرت کے متعلق زیادہ وثوق اور اعتماد کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ہمارے محققین جسے زبان کی تبدیلی کا نام دے رہے ہیں وہ حقیقت میں صرف کتابت کا بدلا ہوا طریقہ ہے۔ میرے نزدیک ہماری موجودہ زبانوں میں ویدک کال سے آج تک کوئی قابل ذکر فرق نہیں آیا ہے اور یہ زبانیں کم و بیش انھیں علاقوں میں جہاں آج ان کا چلن نظر آتا ہے۔ آریوں کی ہندوستان میں آمد سے قبل بھی انھیں آوازوں کے ساتھ بولی جاتی تھیں۔ رگ وید نہ صرف ویدک زبان کی بلکہ اس برصغیر کی قدیم ترین کتاب ہے جس کا اس مقالے میں کہیں کہیں حوالہ آ گیا ہے۔ میں اپنے مندرجہ بالا دعویٰ کی تائید میں ان سے مزید مثالیں پیش کر سکتا تھا لیکن اس عام بحث میں ویدک زبان پر خصوصی تبصرہ مناسب نہ تھا۔

میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ زبان ایک نامیاتی حقیقت ہے جو وقت کے ساتھ ساتھ نشو و نما پاتی ہے اس لیے اس کو ایک زندہ انسان یا درخت سے تشبیہ دی جا سکتی ہے لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ انسان یا درخت کی نشو و نما میں جو تبدیلیاں ظاہر ہوتی ہیں وہ اساسی نہیں ہوتیں یعنی ان کی بدولت انسان یا درخت کے بنیادی ڈھانچے میں فرق نہیں آتا۔ یہی کیفیت زبان کی ہے کہ ہم اسے چاہے جتنی تغیر پذیر مان لیں اس کی اساس بدستور قائم رہتی ہے۔ درخت کی پرانی پتیاں جھڑ جانے اور نئی کونپلیں نکل آنے یا انسان کی جلد سے بھوسی جھڑ جانے اور اندر سے تازہ پرت نکل آنے کو درخت یا انسان کے ڈھانچے کی تبدیلی نہیں کہہ سکتے۔ زبان کے چند الفاظ متروک ہو جانے اور چند نئے الفاظ کے داخل ہونے میں بھی ایسی ہی نامیاتی تبدیلی کا عمل ملتا ہے لیکن زبان کا تنا ور درخت اور اس کا عظیم و بزرگ ڈھانچہ اپنی جگہ جوں کا توں باقی رہتا ہے۔ جس طرح لباس بدل جانے سے انسان نہیں بدلا کرتا اسی طرح کتابت کے اصول بدل جانے سے زبان تبدیل نہیں ہو جاتی۔ انداز قد پر نظر رکھنے والے لباس کے رنگ سے دھوکا نہیں کھاتے۔

زبان کو انسان یا درخت سے تشبیہہ دینے میں محققین کو دوسری غلط فہمی یہ ہوئی ہے کہ وہ زبان کی عمر کو بھی انسان یا درخت کی عمر کے مساوی سمجھنے لگے ہیں۔ قانون قدرت یہ ہے کہ وہ سطحی تبدیلیاں جن کا اوپر ذکر ہوا ہے عمر کے طول و اختصار کی مناسبت سے جلد جلد یا بدیر ظہور پذیر ہوتی ہیں۔ چنانچہ زبانوں کی طویل العمری کے پیش نظر زبانیں چند صدیوں میں نہیں بدلتیں جیسا کہ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے بلکہ ان کی یہ تبدیلیاں بھی ہزاروں سال کی مدت پر پھیلی ہوتی ہیں۔ یہ سوچنا کہ عہد قطب شاہی کی دکنی زبان چند صدیوں میں بدل بدلا کر آج کی اردو بن گئی نہ صرف حقیقت سے دور بلکہ اردو کے انداز قد کو نہ پہچاننے کی بات ہے۔ رگ وید آج سے تقریباً ساڑھے تین چار ہزار سال پہلے مرتب ہوا تھا اس میں پراکرت کا جتنا حصہ ہے اس میں سے آج تک صرف چند الفاظ ہی متروک ہو پائے ہوں گے ویدک و سنسکرت کو وہی لوگ ہماری زبان کا ماخذ بتاتے ہیں جن کی نگاہیں صرف ان کے لباس میں اُلجھ کر رہ گئی ہیں۔ موجودہ زبانوں کے اصلی روپ اور قد کو پہچاننے کے لیے نگاہ کو اس لباس میں سے گزرنا ضروری ہے جس میں ویدک و سنسکرت زبانیں لپٹی ہوئی ہیں یعنی کتابت کے ان اصولوں کا سراغ لگانے کی ضرورت ہے جن کو سامنے رکھ کر مختلف زبانوں یعنی پراکرتوں اور ایراق زبان کے روپ اس میں تحریر کیے گئے ہیں۔

لپی ایک ایسا جامہ ہے جسے انسان نے زبان کے قد پر حتی الامکان درست و چست قطع کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے باوجود یہ لباس کسی نہ کسی جگہ پر جھول جاتا ہے۔ یوں انسان عمل تخلیق میں اپنے خالق کا ہمسر ہوتے ہوئے بھی اس سے کہیں پیچھے رہ گیا ہے۔ دنیا کی کوئی لپی اتنی مکمل اور جامع نہیں ہے کہ وہ مختلف زبانوں کی آوازوں کو صحت کے ساتھ محفوظ کر سکے۔ اس کے علاوہ کتابت کے اصول نہ صرف زمانے کے ساتھ ساتھ بلکہ ایک زمانے میں بھی ایک جگہ سے دوسری جگہ بدلتے رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایک ہی لپی میں ایک ایک لفظ کے کئی کئی روپ پہلو بہ پہلو مل جاتے ہیں جن کے اختلاف کو ہم

غلطی سے آوازوں کا اختلاف یا زبان کی تبدیلی کہہ اٹھتے ہیں - لپی زبان کی خادم ہوتی ہے اور حرف آواز کے تابع لیکن جب ہم کتابت کے بدلتے ہوئے اصولوں کو نظرانداز کر دیتے ہیں تو لپی زبان کی امین ہونے کے بجائے خائن بن جاتی ہے اور اس کے تلفظ کو یوں بگاڑ دیتی ہے کہ آوازوں کا پورا نظام تلپٹ ہو جاتا ہے -

(مطبوعہ "ہم قلم" کراچی ، اپریل ۱۹۶۳ء)

لپی اور تلفظ

انسانی صلاحیتوں سے پوری آگاہی نہ ہونے کے باعث یہ غلط مفروضہ قائم کر لیا گیا ہے کہ اس نے حیات ارضی کے دوران میں اپنی کوششوں سے ایجاد زبان کی قدرت حاصل کی دراں حالیکہ اس کا یہ ملکہ اکتسابی نہیں وہبی ہے۔ انسان دنیا میں گویائی اپنے ساتھ ہی لایا ہے جو حلقی تاروں کے ارتعاش محض سے آگے بڑھ کر معنی خیز اور معنی آفریں بھی ہے۔ آواز کی بھی معنویت جس کا دامن تعقل و تفکر سے بندھا ہوا ہے، اسے نوع حیوانی میں ایک ممتاز درجہ عطا کرتی ہے۔ اس لیے عقل اس بات کو تسلیم نہیں کرتی کہ انسانیت کسی دور میں بھی آوازوں کے اس ضابطے سے محروم رہی ہو جسے زبان کہتے ہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ اس باب میں خلط مبحث کر دیا جاتا ہے۔ دراصل وہ چیز جسے ہم انسان کا اکتساب کہہ سکتے ہیں، زبان نہیں فن تحریر ہے اور بلاشبہ آوازوں کا قلم بند کرنا انسان کا ایک ایسا عہد آفریں قدم تھا جس نے اس کی مادی و روحانی ترقیوں میں بہت کچھ مدد دی ہے، انسانی نسلوں کو اپنے بزرگوں کا سچا جانشین اور ان کی وراثت کا صحیح حقدار ٹھیرایا ہے اور انسان کے تفکر و تخیل کو وہ مسلسل تحریک بخشی ہے کہ آنے والی نسلیں اپنی فلاح و بہبود کے لیے ابدالآباد تک اس کی ممنون رہیں گی۔

لپی جو مختلف آوازوں کی تحریری شکلوں یعنی حروف ہجا کا ایک نظام ہوتا ہے، صرف اس لیے ایجاد ہوئی تھی کہ انسانی آوازیں آنے والی نسلوں کے لیے محفوظ ہو جائیں تا کہ اسلاف کے افکار و خیالات سے اخلاف بھی متمتع اور بہرہ مند ہو سکیں۔ اس اجتماعی عمل کی ابتدا یقیناً کسی فرد واحد سے ہوئی ہوگی جس نے قبول عام پا کر ایک مخصوص معاشرے

میں معیاری اور مستند حیثیت حاصل کر لی اور پھر ایک زندہ اور مسلسل روائت بن کر آنے والی نسلوں کو منتقل ہوتی رہی ۔ لپی کی ایجاد کی ضرورت آوازوں کو قلم بند کرنے کے لیے پیش آئی تھی ، اس لیے اس کی بنیادی غایت آج بھی اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتی کہ وہ کسی زبان کی جملہ آوازوں کو اس قدر قطعیت اور صحت کے ساتھ محفوظ کر لے کہ پڑھنے والے کی زبان سے وہ آوازیں بالکل اسی طرح ادا ہونے لگیں جس طرح متکلم کی زبان سے نکلی تھیں لیکن جیسا کہ ابھی کہا جا چکا ہے ، لپی اپنے مخصوص معاشرے میں جملہ افراد کی باہمی رضا مندی سے آوازوں کا ایک مشترک معیاری ترجمان بن جاتی ہے ۔ اس لیے کسی لپی کو اس کے معاشرے یا اس معاشرے کی کسی زبان کے تعلق سے پرکھنا بے سود ہے ۔ اس کی صحیح صحیح جانچ صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ اس میں کسی دوسری زبان کی آوازیں قلم بند کرکے دیکھا جائے یا کسی دوسرے معاشرے کے فرد کے ذریعے اسے استعمال کرایا جائے ۔

لپی ہی کی طرح تلفظ بھی ایک اجتماعی عمل ہے جو افراد معاشرہ کی عام رضامندی سے رواج پاتا ہے ۔ چنانچہ جس طرح کسی معاشرے کی آوازوں اور حروف میں مکمل ہم آہنگی ہوتی ہے ، اسی طرح وہاں کی زبان کا تلفظ اور لپی بھی باہمدگر پیوست ہوتے ہیں ۔ وجہ ظاہر ہے کہ حروف آوازوں کے لیے وضع ہوئے ہیں اس لیے تلفظ کو لپی پر تقدم حاصل ہے اور لپی تلفظ کی اسی طرح مطیع و منقاد ہوتی ہے جس طرح غلام آقا کا اور چونکہ اپنے آقا کی خدمت گزاری ہر غلام کا فرض ہوتا ہے ، اس لیے اگر کوئی لپی اپنے مخصوص معاشرے کی زبان کا تلفظ ادا کر دیتی ہے ۔ تو یہ کوئی بڑی بات نہیں ۔ غلامی کا کمال تو یہ ہے کہ کسی آقا کی خدمت سے مشرف ہو ، اسے شکایت کا موقع نہ دے ۔ چنانچہ لپی بھی وہی کامل کہلائے گی جو ہر زبان کا صحیح تلفظ ادا کر سکے لیکن ایسی مثالی لپی آج دنیا کے پردہ پر نہیں مل سکتی ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دنیا میں کم از کم ہزاروں زبانیں پائی جاتی ہیں اور ان کی آوازوں میں بھی کافی اختلاف ملتا ہے ، اس لیے موجودہ لپیوں میں سے کسی

ایک لپی میں تمام آوازوں کے ادا کرنے کی صلاحیت نہیں ہے ۔ لپیاں ہزاروں سال سے چلی آ رہی ہیں ۔ اس وقت وسائل آمد و رفت کی کمی کے باعث دنیا کے دور دراز مقامات کی آوازوں کا علم ہونا بھی ناممکن تھا اس لیے یہ لپیاں اپنے اپنے محدود علاقوں ہی کی ضروریات کو پورا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں -

اس میں شک نہیں کہ دنیا کے مختلف حصوں میں بولی جانے والی زبانوں کی بیشتر آوازیں مشترک ہیں ، پھر بھی کسی کسی زبان میں کچھ ایسی مخصوص آوازیں بھی نکل آتی ہیں جو دوسرے علاقوں میں نہیں ملتیں مثلاً انگلستان میں ت ، د وغیرہ اور یونان و ایران میں ٹ ، ڈ ، ڑ کی آوازیں نہیں ہیں - عربی میں اے ، آو ، پ ، چ ، ژ ، گ اور پاک و ہند کی دراوڑی زبانوں میں ع ، غ ، خ ، ز ، ژ ، ف ۔ ش ، و ، ہ ، ی وغیرہ کی آوازیں عنقا ہیں اور یہ وہ آوازیں ہیں جو ہم آج اپنے کانوں سے سن رہے ہیں۔۔ ان قدیم زبانوں کی مکمل آوازوں کا تو ہمیں علم بھی نہیں ہے جو سردہ ہو چکی ہیں - اس لحاظ سے ایسی کسی ایک لپی کا تصور جو دنیا کی تمام آوازوں کو اپنے اندر سمولے ، ناممکن ہے ۔ مجبوراً ہمیں لپیوں کے تقابل میں یہی معیار مقرر کرنا پڑتا ہے کہ جو لپی زیادہ سے زیادہ آوازیں پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے وہ دوسری سے بہتر ہے -

انقلاب و تغیر زمانے کا وہ رجحان ہے جس سے ہر شے متاثر ہوتی ہے بلکہ تلون پسندی خود سرشت انسانی کا ایک ایسا خاصا ہے جو اس سے اس ثی دنیا میں نت نئی تبدیلیاں کرتا رہتا ہے - اس صورت میں لپی بھی اس کی قطع و برید سے مستثنیٰ نہیں رہ سکتی تھی - دنیا کی کسی لپی کو لے لیجیے ، آج اس کی وہ صورت باقی نہیں رہی ہے جس پہ اس کی ایجاد ہوئی تھی - ہمیں بیک نظر اس تبدیلی کا احساس نہیں ہوتا کیونکہ ہر اجتماعی عمل سست گام ہوتا ہے اور لپی کی تبدیلی کا عمل تو سیکڑوں ہزاروں سال کی مدت پر پھیلا ہوا ہے ۔ لپیوں کی بتدریج تراش خراش کا پہلا اور بنیادی سبب تحریری سہولت تھا لیکن انسان کی نفاست پسندی اور حسن کاری نے بھی اس باب میں کچھ نہ کچھ گل ضرور کھلائے ہوں گے جنھیں معاشرے نے اسی طرح قبول کر لیا جس طرح

لپیوں کی ابتدائی شکل کو اپنا لیا تھا ۔

میں کہہ چکا ہوں کہ لپی تلفظ کی تابع ہوتی ہے اور اس کا ہر حرف ایک جداگانہ آواز کی نیابت کرتا ہے لیکن حرف اور آواز یا لپی اور تلفظ کا رشتہ عوام کی رضامندی سے قائم ہوتا ہے ۔ چنانچہ جب تک لوگ اس تعلق سے باخبر رہتے ہیں ، ہر لپی اپنے علاقے کے تلفظ کی مکمل طور پر امین و ترجمان ہوتی ہے لیکن یہ نازک رشتہ نظر سے اوجھل ہوتے ہی زبان کا پورا صوتی نظام درہم برہم ہو جاتا ہے ۔ ایسے ہی وقت میں لپی تلفظ کی صحیح ترجمانی سے منہ موڑ لیتی ہے اور غلام اپنے آقا سے بے وفائی کر جاتا ہے ۔ لوگ زبان کے صحیح تلفظ سے بے خبر رہ جاتے ہیں اور لفظ کی اصلی آوازیں کچھ کی کچھ ہو جاتی ہیں ۔ چنانچہ یہی صورت حال ہمیں آج ویدک اور سنسکرت ادب کے مطالعے میں پیش آ رہی ہے کیونکہ اس ادب کے صوتی روائت ہم سے بہت پیچھے رہ گئی ہے ۔ میں اس کی تشریح آئندہ سطور میں کروں گا ۔

تلفظ کی تبدیلی ہماری یومیہ زندگی کا کتنا ہی معمولی واقعہ کیوں نہ سمجھا جائے ، دنیائے صوتیات میں اس کی اہمیت ایک جاں گسل اور ہوش ربا سانحے سے کم نہیں ہے ۔ اس تبدیلی کے کتنے ہی اسباب ہیں جن میں سے ، ایک یہ ہے کہ بعض علاقوں کی زبان میں کچھ ایسی آوازیں پائی جاتی ہیں جو دوسرے مقامات پر نہیں ملتیں ۔ اس دقت کا حل انسان یوں نکال لیتا ہے کہ اس آواز کو اپنی زبان کی کسی دوسری ملتی جلتی آواز سے ادا کرنے لگتا ہے ۔ مثلاً یو ۔ پی کے عوام ز ، ض ، ظ کی آوازوں کو ج ، خ کو کھ ، ف کو پھ ، غ کو گ اور ش کو س بولتے ہیں اور مرضی ، منظور ، مزہ ، خرچ ، غفور اور شرم کو بالترتیب مرجی ، منجور ، مجا ، کھرچ ، گپھور اور سرم کہتے ہیں ۔ فرانسیسی مادام انگریزی میں میڈم ہو گیا ہے ۔ انگریزی کا ٹیلی گراف فارسی میں تلگراف اور عربی میں تلغراف بولا جاتا ہے اور قدیم ہند یورپی کا آتم انگریزی میں ایٹم ہو گیا ہے ۔ فارسی والے ہمارے ہر مہاپران کو الپ پران بولیں گے ۔ وہ لوگ تمہارا کو تمارا ، بھائی کو بائی کہیں گے اور ٹ ، ڈ ، ڑ کو ت ، د ، ر سے ادا

کریں گے - عربی میں ٹ کو ط سے اور ڈ کو ذ سے لکھ کر کام چلاتے ۔
مثلاً اٹلی (اطالیا) ، ڈائیبٹیز (ذیابیطس) ۔

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک لفظ کی جملہ آوازیں اپنی زبان میں موجود ہوتے ہوئے بھی لوگ اس لفظ کی بعض آوازوں کو اپنی بول چال کے رجحان کے مطابق بدل لیتے ہیں - مثلاً اردو کے "س" کو مشرق پاکستان میں "ش" اور "چھ" دونوں ہی آوازوں میں ادا کیا جائے گا اور پھسلنا کو پھشلنا یا پھچھلنا بولیں گے ۔ ہو سکتا ہے کہ آگے چل کر یہ لفظ وہاں کی لپی میں اسی تلفظ کے ساتھ قلم بند ہو اور یوں س اور اس کی آواز کا وہ ابتدائی اور بنیادی تعلق جو اردو میں قائم ہے ، بنگال والوں کے لیے اجنبی ہو جائے ۔ چنانچہ آنے والے زمانے میں بنگالی لپی کے پڑھنے والے محقق کے لیے اس لفظ کے صحیح تلفظ کا پتہ لگانا درد سر کا باعث بن سکتا ہے ۔

مندرجہ بالا دونوں قسم کی تبدیلی کا تعلق محض آوازوں سے ہے - چنانچہ جب ہم ایک زبان کے لفظ کو دوسری زبان میں بدلے ہوئے تلفظ کے ساتھ پاتے ہیں تو اس کا سبب نسبتاً آسانی سے سمجھ میں آ جاتا ہے اور تبادل حروف کی تشریح قدرے سہولت سے ہو جاتی ہے - صحیح تلفظ کو سمجھنے میں اصل دقت وہاں پیش آ جاتی ہے جہاں لپی کا قدم درمیان آ جاتا ہے - چنانچہ بعض اوقات جب کوئی لفظ ایک لپی سے دوسری لپی میں منتقل ہو جاتا ہے تو ابتدائی لپی کے بعض مشابہ حروف کے باعث پڑھنے والے کو تشابہ لگتا ہے اور وہ اس لفظ کو غلط آواز کے ساتھ دوسری لپی میں منتقل کر دیتا ہے - مثلاً جب مسلمانوں نے ایرانی کتابوں کو وہاں کی قدیم لپی سے پہلوی میں منتقل کیا تو اس کے آخری کاف کو ہائے ہوز پڑھا اور اسی طرح لکھ بھی دیا ۔ نتیجہ یہ نکلا کہ یہ الفاظ آگے چل کر ہائے ہوز ہی سے لکھے پڑھے جانے لگے اور اس غلطی کا حال اس وقت کھلا جب ان کی جمع پر غور کیا گیا ۔ ان میں بندہ اور مژہ جیسے بہت سے الفاظ شامل ہیں جن کی جمع بندگاں ، مژگاں اور ابتدائی شکل بندک ، مژک ہے ۔

تبادل حروف کا اہم ترین سبب یہ ہے کہ بعض زبانوں کی لپی اتنی ناقص ہوتی ہے کہ اس کا ایک ایک حرف کئی. کئی آوازوں کی نیابت کرتا ہے ۔ اس اعتبار سے قدیم ہند یورپی زبان کی ابتدائی لپی نہایت ہی ناقص تھی جس کا ایک ثبوت رومن لپی کے حرف ایکس (X) کی شکل میں آج بھی آپ کے سامنے موجود ہے ۔ یہی حرف قدیم ایرانی میں "خش" اور دیوناگری میں "کش" بولا جاتا ہے ۔ اس کی خصوصیت یہ تھی کہ یہ خ ، ش ، گ ، غ اور ز میں سے ہر ایک کی نمائندگی کرتا تھا ۔ چنانچہ انگریزی لفظ بوکس (Box) میں آپ اس کی آواز "کس" اور ایگزٹ (Exit) میں "گز" پاتے ہیں ۔ اسی حرف کو آپ موجودہ فارسی زبان کے دو مصادر افراختن اور افراشتن میں دیکھیں گے جو غالباً ایک ہی ابتدائی لفظ "افراخشتن" کی دو شکلیں ہیں ۔ فارسی زبان کے ہی زیر اثر یہ حرف پشتو میں بھی آ گیا ہے جہاں اسے خین کہتے ہیں ۔ چنانچہ خٹک بولی میں اسے ش اور دوسری بولیوں میں خ کی آواز سے بولتے ہیں ۔ مثلاً پشتو ، پختو ، پشاور ، پخاور یا پیخور ، نوشہرہ اور نوخار ، شے اور خے (بمعنی اچھا) شاپرک (فارسی شپرک بمعنی چمگادڑ) اور خاپرک وغیرہ اس حرف کا جلوہ آپ کو یونانی لفظ "ڈ ذ ر کے" فارسی لفظ "درخش" اور ویدک لفظ "درش" میں نظر آئے گا ۔ اسی کا کرشمہ آپ ویدک لفظ و کشن اور انگریزی لفظ اوشن (Ocean) بمعنی سمندر میں بھی دیکھیں گے اور یہی حرف ویدک کشترم ، اوستائی خشترم (حکومت) ، ویدک ور کش (درخت) ، اوستائی ورش (جنگل) ویدک چکشو (آنکھ) ایرانی چشو (چشم) ، ویدک د کش (دودھ دوھنا) ایرانی د غ یا دوغ وغیرہ میں مل جائے گا ۔

یہ صرف ایک قدیم حرف کی سرسری بات ہے اور وہ بھی ادھوری ہے ۔ اس کی سرگزشت کو مکمل کرنے کے لیے لگے ہاتھوں اس کی اس خدمت کا تذکرہ بھی کردوں جو اس نے ہندوستان میں آکر پراکرتوں کی نمائندگی کے سلسلے میں انجام دی ہے آریوں کی قدیم ایرانی زبان میں جھ اور چھ کی آوازیں نہیں تھیں ۔ جب وہ ہندوستان میں آئے اور ان کا سابقہ یہاں کی پراکرتوں سے پڑا تو انھوں نے دیکھا کہ ان میں جو بہت

سی نئی آوازیں ہیں ان میں ان دونوں کا بھی شمار ہے۔ اس لیے جہاں انھوں نے پراکرت الفاظ کو ویدک میں منتقل کرنے وقت دوسری آوازوں کے لیے دوسری علامات مقرر کیں وہاں جھ اور چھ کو ظاہر کرنے کے لیے اسی حرف کو منتخب کیا۔ یہی وجہ ہے کہ پراکرت جھر (جھرنا) رگ وید میں کشر اور پراکرت چھرا رگ وید میں کشرا تحریر کیا ہوا ملتا ہے، لطف یہ ہے کہ محققین ہند و پاک الٹے رگ وید "کشر" سے پراکرت "جھر" اور ویدک "کشرا" سے پراکرت "چھرا" کا اشتقاق ثابت کرنے کے کی جان توڑ کوشش کر رہے ہیں۔ فاعتبرو یا اولی الابصار!

میں تلفظ کی تبدیلی کے متعلق عرض کر رہا تھا کہ لفظ ایک لپی سے دوسری لپی میں پہنچ کر اپنا ابتدائی تلفظ کھو بیٹھتا ہے۔ اس کی مثال کے لیے دور کیوں جائیے اپنی ہی زبان (اردو) اور اپنی ہی لپی (نسخ یا نستعلیق) کو لے لیجیے اور ڈبیا، بٹیا، لٹیا وغیرہ الفاظ کی حقیقی آوازوں اور تحریری شکلوں کو ملا کر دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ یہ لپی آوازوں کی صحیح ترجمانی نہیں کر رہی ہے یعنی ہم ان کو "ی" کی مدد سے لکھتے ہیں حالانکہ ان کے تلفظ میں "ی" کی آواز کا دور دور تک پتہ نہیں ہے۔ اسی طرح کلوا (کالا آدمی)، ننھوا (ننھا)، جوروا (بیوی) وغیرہ الفاظ میں واو کا حرف مکتوبی ہے، ملفوظی نہیں ہے۔ یہ صرف رسم و رواج کی بات ہے کہ ہم نے ان الفاظ کی مکتوبی اور ملفوظی شکلوں کو ایک سمجھ لیا ہے اور ہم ان میں کوئی فرق محسوس نہیں کرتے۔ یعنی ہم ان الفاظ کے پڑھنے میں تلفظ کی روائت پر زیادہ بھروسا کرتے ہیں۔ اب اگر یہی الفاظ کسی ایسے مقام پر پہنچ جائیں جہاں کے لوگوں میں ان کی صوتی روائت پیشتر سے موجود نہ ہو تو وہاں کے افراد یقیناً ان الفاظ کی صرف مکتوبی شکلوں سے ان کے تلفظ تک پہنچنے کی کوشش کریں گے۔ وہ ڈبیا، بٹیا، لٹیا کو ڈب۔ یا۔ بٹ۔ یا، لٹ۔ یا اور کلوا، ننھوا، جوروا کو کل۔ وا، ننھ۔ وا، جور۔ وا بولیں گے۔

اس انقلاب کی مثال میں یوسف، میکائیل، یسوع، یعقوب، وغیرہ

نام بھی پیش کیے جا سکتے ہیں جو ایک ہی زبان عبرانی سے چل کر ایک طرف تو عربی لپی کے توسط سے مندرجہ بالا تلفظ کے ساتھ ہم تک پہنچے ہیں اور دوسری جانب رومن لپی کے وسیلے سے جوزف، سائیکل، جیسس، جیکب کی ملفوظی شکلوں میں ہمارے گوش گزار ہو رہے ہیں، حالانکہ ہمیں یہ اچھی طرح یقین ہے کہ عبرانی میں ان کا تلفظ ایک ہی طرح کیا جاتا تھا ۔ وجہ ظاہر ہے کہ جب لپی بدلی تو ان کی مکتوبی شکلیں ملفوظی روایات سے دور جا پڑیں اور جب لوگوں کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں رہا کہ وہ تحریر کو اساس مان کر ان کے تلفظ تک پہنچیں یا دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ جب حرف کو آواز پر ترجیح حاصل ہو گئی تو پورے کا پورا صوتی نظام بدل گیا اور بولنے والے محض فرضی اور غیر حقیقی آوازیں نکالنے لگے ۔ یہی وجہ ہے کہ آج انگریزی سینٹر (مرکز) اور سنسکرت کیندر، انگریزی ایٹم اور ویدک آتم، انگریزی جوئل، ویدک سُویر اور فارسی جوہر یا گوہر میں ہمیں کسی رشتے کا گمان تک نہیں ہوتا ۔

ویدک زبان میں پہنچ کر ایرانی الفاظ کا بھی کچھ ایسا ہی حشر ہوا ہے ۔ مثلاً اوستائی تخم، ویدک توکم، فارسی جدید تخم، فارسی دریا ویدک جریو، اوستا زست، فارسی جدید دست (ہاتھ)، اتھرب وید ہست، اوستائی خرتش، فارسی جدید خرد (عقل)، ویدک کرتس، اوستا درجم (لمبا) ویدک دیرگھم، اوستا وواُستا (تو جانتا ہے) ویدک ویتھ، اوستا جستئی (وہ آتا ہے) ویدک گچھتّی، اوستا زاتو (جنا ہوا)، فارسی جدید زادہ، ویدک جا تو، اوستا اعوتو (چاروں طرف)، ویدک ابھتس، اوستا بے زی، فارسی جدید، گر، ویدک بدی وغیرہ ۔

میرے نزدیک قدیم ہند یورپی زبان کے ان تمام الفاظ کا ابتدائی تلفظ جو قدیم ایرانی اور ویدک میں مشترک ملتے ہیں وہی تسلیم کرنا ہوگا جو ایرانی شاخ میں پایا جاتا ہے ۔ میرے اس خیال کو تاریخی حمایت حاصل ہے کیونکہ آریہ جب ہندوستان میں آئے تھے اس وقت ان کے منہ میں وہی زبان تھی جو وہ اپنے پیچھے بھی ایران میں چھوڑ آئے تھے اور یقینی طور پر وہ اسی طرح بولتے بھی ہوں گے جس طرح اوستا

وغیرہ میں بولی گئی ہے ۔ البتہ اس وقت جو دونوں میں فرق پایا جاتا ہے اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ہندوستان میں اس زبان کو دوسری لپیوں سے سابقہ پڑ گیا جنھوں نے اب آ کر اس کی صوتیات کو کچھ کا کچھ بنا دیا ۔ آج ہم چونکہ اس زبان کے ابتدائی تلفظ کی روائت سے بہت دور آگے بڑھ آئے ہیں ، ہمیں اس کا صحیح صحیح علم نہیں رہا ، اسی لیے ہم اس کی موجودہ لپی (دیوناگری) ہی کو بنیاد قرار دے کر اس کے تلفظ تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ وہ تلفظ جو اس لپی کو پڑھ کر براہ راست حاصل ہوتا ہے ، حرف بحرف صحیح ہونے کے باوجود آواز بآواز درست نہیں ہے ۔

بالکل یہی بات ہماری قدیم دراوڑی زبانوں (پراکرتوں) اور ویدک کے باہمی تعلق میں بھی پائی جاتی ہے ۔ آریوں نے یہاں آ کر ہماری زبانوں کے جو الفاظ ویدک میں داخل کیے اور ان کی جو مکتوبی شکلیں ہم تک دیوناگری کے ذریعے پہنچی ہیں ، ان کی آوازوں سے ہمارا موجودہ تلفظ مختلف نظر آتا ہے اور یہ اختلاف اس وجہ سے پیدا ہوا ہے کہ ویدک کے دراوڑی الفاظ کو کتنی ہی لپیوں میں سے ہو کر گزرنا پڑتا ہے ۔ ہر شخص جانتا ہے کہ دیوناگری ہندوستان کی وہ قدیم لپی نہیں ہے جو آریوں کے داخلے سے قبل یہاں رائج تھی اور رگ وید کو جس وقت اس لپی میں منتقل کیا گیا ہے ، اس وقت یہ اپنے تعمیری دور سے گذر رہی تھی ۔ چنانچہ اس کی دور بدور اصلاحیں اور اضافے خود رگ وید کے موجودہ نسخے میں صاف صاف نمایاں ہیں ۔ اس کے باوجود معتقدین ہیں کہ ویدک کا جو لفظ جس طرح لکھا ہے اس کو اسی طرح پڑھتے ہیں اور پھر یہ اصرار بھی کرتے ہیں کہ اس کا اصلی اور ابتدائی تلفظ یہی ہے ۔ یہ درست ہے کہ ہم رگ وید میں داخل کی ہوئی دراوڑی زبان کے مسئلے میں اس تاریخی حمایت سے محروم ہیں جو اس کے قدیم ایرانی جزو کے سلسلے میں ہمیں حاصل ہے لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ (رگ وید کی مکتوبی شکل میں جو اصول قدیم ایرانی زبان کے لیے کام میں لائے گئے ہیں ، وہی دراوڑی زبانوں کے لیے بھی برتے گئے ہیں ۔ چنانچہ دراوڑی اور ایرانی اجزا کی کتابت کے مشترک اصولوں کی

روشنی میں یہ بات بالکل صاف ہو جاتی ہے کہ جس طرح ایرانی جزو کی مکتوبی شکل کو اس کے ابتدائی تلفظ پر ترجیح نہیں دے سکتے ۔ اسی طرح اس کے دراوڑی حصے کا صحیح تلفظ معلوم کرنے کے لیے بھی ہمیں اپنی بول چال کی زبانوں کو معیار ٹھہرانا ناگزیر ہے ۔

اس کے برعکس دیکھنے میں یہ آتا ہے کہ لوگ ہماری زبانوں کی ملفوظی شکلوں کو ویدک اور سنسکرت کی مکتوبی شکلوں سے مستخرج کرنے کی دھن میں لگے ہوئے ہیں ، یعنی وہ ویدک اور سنسکرت کے حرف کو ہماری بھاشاؤں (یعنی بول چال کی زبانوں) پر ترجیح دیتے ہیں اس باب میں پراکرت کے گرامر نویسوں نے اور بھی غضب ڈھایا ہے کہ ہر ویدک لفظ کو دراوڑی اور ایرانی کی تفریق سے قطعی بے نیاز ہو کر چند مفروضہ اصولوں کے تحت بدل ڈالا اور اسے پراکرت کا نام ارزانی کر دیا ہمارے یہاں کچھ ایرانی الاصل الفاظ آج اپنی اصلی شکل میں بھی مستعمل ہیں اور کچھ بدلی ہوئی شکل میں بھی ملتے ہیں لیکن آخر الذکر قسم کے الفاظ گرامر نویسوں کی ذہنی ورزشوں اور لفظ سازی کی کوششوں سے رائج نہیں ہوئے بلکہ ان کے پس پشت جہاں کچھ تاریخی عوامل یعنی دیسی اور بدیسی باشندوں کے میل جول کی کار فرمائی نظر آتی ہے ، وہاں کچھ بدیسی لفظوں کی مکتوبی شکل بھی ان کے بدلے ہوئے تلفظ کی ذمہ دار ہے ۔

یہاں میں قدیم ایرانی کا ایک ایسا لفظ پیش کرتا ہوں جو گرامر نویسوں کی کوششوں کے باوجود ہمارے یہاں رواج نہیں پا سکا ۔ یہ لفظ ہے "ششت" جس کے معنی بیٹھنے کے ہیں اور جو سابقہ "ن" کے ساتھ آج بھی فارسی میں "نشست" بولا جاتا ہے ۔ رگ وید میں یہ لفظ 'تشٹھ' کی مکتوبی شکل میں ملتا ہے ۔ مجھے یقین ہے کہ ویدک کال میں بھی اس کا تلفظ وہی تھا جو آج فارسی میں رائج ہے لیکن لپیوں کی ردو بدل کے صدقے اس کا چہرہ اس قدر مسخ ہو گیا ہے کہ آج پہچاننے میں نہیں آتا اور وہ تعلق جو اس کے ابتدائی تلفظ اور لپی میں قائم تھا ، لوگوں کے دائرہ علم سے نکل گیا تو بڑے بڑے پنڈت اور اسکالر یہ سمجھ بیٹھے کہ اس کا اصلی تلفظ "تشٹھ" ہی ہے ۔ اس غلط فہمی نے ایک اور مضحکہ انگیز صورت یہ پیدا کی کہ جب سنسکرت کے ڈرامہ نگاروں نے

اس لفظ کو اپنی مصنوعی پراکرت میں ڈھالا تو اسے "چٹھ" کر کے چلتے سکے کی طرح تمام ڈراموں میں بلا استثنا استعمال کیا ، جیسے یہ بھی دراوڑی زبان کا ہی کوئی لفظ ہو ۔ چنانچہ سنسکرت کے کسی ڈرامے کو اٹھا کر دیکھ لیجیے آپ کو ہر جگہ اس لفظ کا پراکرت روپ "چٹھ" ہی ملے گا لیکن لطف کی بات یہ ہے کہ شمالی ہندوستان کی موجودہ زبانیں جن کو سبھی پراکرت سے مشتق مانتے ہیں ، اس لفظ سے خالی ہیں ۔ ان میں سے کسی ایک نے بھی یہ ورثہ نہیں سنبھالا اور گرامر نویسوں کی اس نادر دین کو ہاتھ نہیں لگایا ۔

میں اوپر کہہ آیا ہوں کہ قدیم ہند یورپی زبان کی لپی نہایت نادار تھی جس میں ایک ایک حرف کئی کئی آوازیں دیتا تھا ۔ چنانچہ اس زبان کی جو نسلیں مختلف ممالک میں پھیلیں ان میں تبادل حروف نے ایک مسلمہ اصول کا درجہ حاصل کر لیا ہے لیکن مجھے حیرت ان لوگوں پر ہوتی ہے جو ہندوستان کی قدیم دراوڑی زبان کو بھی اسی عینک سے دیکھتے اور ان میں تبادل حروف کا اسی دھوم دھام سے سراغ لگانے کی کوشش کرتے ہیں ۔ ایسے جوشیلے اور حوصلہ مند محققین سے میں بصد احترام گذارش کرتا ہوں کہ وہ پراکرتوں کا مطالعہ کرتے وقت کم از کم اس قدر جوش و خروش کا مظاہرہ نہ کریں کہ اشتقاق الفاظ میں جب چاہیں اور جہاں سے چاہیں کوئی حرف ساقط کر دیں یا کسی حرف کا اضافہ فرما دیں ۔ میں وثوق کے ساتھ کہتا ہوں کہ پراکرتوں میں تبادل حروف کا عمل تقریباً نہ ہونے کے برابر ہے ، اس لیے لفظ سازی کی دھن میں حسب منشا حروف میں ہیر پھیر کرنے کی ضرورت نہیں ہے ، بلکہ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ بھاشنہ (بول چال کی زبان) کی آوازوں کو اساس مان کر مکتوبی الفاظ کی تشریح کی جائے اور یہ سراغ لگایا جائے کہ ان آوازوں کو قلم بند کرتے وقت کن اصولوں کو مد نظر رکھا گیا ہے ، یعنی اس سلسلے میں ان لامعلوم لپیوں کی خامیوں اور کوتاہیوں کو کتنا دخل رہا ہے جن سے گزرنے کے بعد شوخی تحریر کے فریادی الفاظ کو موجودہ کاغذی پیراہن نصیب ہوا ہے ۔

حرف و صوت یعنی لپی اور تلفظ کے اس بنیادی حد کے پیش نظر

جس کی وضاحت سطور بالا میں کر دی گئی ہے ، زبانوں کے صحیح تلفظ کے معلوم کرنے کا خواہ وہ قدیم ہوں خواہ جدید ایک ہی اصول ہے کہ ملفوظی آوازوں کو مکتوبی حروف پر تقدم و ترجیح حاصل رہے ۔ اس برصغیر کی زبانوں کے مطالعے میں جو لوگ ویدک اور سنسکرت کی مکتوبی آوازوں کو ہماری بھاشاؤں کی ملفوظی روایت پر ترجیح دے رہے ہیں ، وہ لسانیات کے مذاق صحیح سے بیگانہ ہیں ۔ اس سلسلے میں اردو کے ان نام نہاد ہوا خواہوں کو بھی جو اردو کے لیے بھی کسی نہ کسی طرح رومن لپی ضروری سمجھتے ہیں اور جن کا کھانا محض اس لیے ہضم نہیں ہو رہا ہے کہ اردو عربی لپی میں لکھی جا رہی ہے، یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ لپیوں کا اختلاف ایک ہی زبان کی دو مکتوبی شکلوں کا ذمہ دار ہوتا ہے ، یعنی لپی کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ زبان کا ابتدائی تلفظ بھی بدل جاتا ہے ۔

(مطبوعہ اردو نامہ ، کراچی ، اکتوبر ۱۹۶۲ء)

———

سکون اول کا مسئلہ

(اسکول کے الف کی تحقیق)

لفظوں کو ادا کرنے کا طریقہ جسے تلفظ کہتے ہیں زبان کے ساتھ ہی وضع ہوا ہے ، اس لیے نہ کسی کو زبان کے اصول بدلنے کا اختیار ہے نہ تلفظ کو بگاڑنے کا حق ۔ انسان تلفظ کے معاملے میں بہت حسّاس ہوتا ہے اس لیے وہ جب کسی کو کوئی لفظ غلط بولتے ہوئے سنتا ہے تو فوراً ٹوک دیتا ہے یا اس پر ہنس پڑتا ہے ۔ زبان کسی فرد واحد کو اختراع و ابداع کا حق نہیں دیتی ۔ اس کا جمہوری مزاج کسی کی آمریت کو برداشت نہیں کر سکتا لیکن جب بظاہر کوئی نیا اصول زبان میں اس طرح رائج ہو جائے کہ اسے بولنے والوں کی کثیر تعداد قبول کر لے تو وہ بھی ٹکسالی سکے کی طرح چالو ہو جاتا ہے اور کسی کو اس پر اعتراض کا حق باقی نہیں رہتا ۔ اسی لیے ادیبوں نے غلط العام کو فصیح کا درجہ عطا کر دیا ہے ۔

زبان میں تبدیلیوں کا موقع اس وقت آتا ہے جب اس کا سابقہ کسی دوسری زبان سے پڑتا ہے ۔ اس وقت زبانوں میں نہ صرف لفظوں اور معنوں ہی کا لین دین ہوتا ہے بلکہ بولنے والے غیر زبان سے لیے ہوئے الفاظ کو اپنی زبان کے صوتی اصولوں کے مطابق بولنے بھی لگتے ہیں ، مثلاً اردو میں عربی لفظ کلمہ کو کل ۔ مہ اور عربی کو عر ۔ بی بولتے ہیں ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اردو کے تمام الفاظ ارکان پر مشتمل ہوتے ہیں اور ہر رکن دو یا تین اصوات صحیحہ سے مرکب ہوتا ہے جن میں سے پہلا حرف متحرک اور آخری ساکن رہتا ہے ۔ یوں ہر رکن ایک حرکت اور ایک سکون یا دو حرکات اور ایک سکون سے بنتا ہے ، مثلاً چل ۔ چلن وغیرہ ۔

دوسری زبانوں کے الفاظ بھی اردو میں اسی طرح ارکان میں تقسیم کر کے بولے جاتے ہیں -

یہی وجہ ہے کہ عربی کے لفظ شمع اور طرح کو جن میں آخری حرف متحرک ہے ہم دو حرکات اور ایک سکون سے شمع اور طرح بولتے ہیں اور طرح کا تلفظ تو اردو ادب میں بھی قبول کر لیا گیا ہے - اس اصول کی مثالیں ہمیں دوسری زبانوں سے بھی ملتی ہیں ، مثلاً پنجابی میں فارسی کے درخت ، دوست ، گوشت کو نہ صرف عوام بلکہ پڑھے لکھے بھی اسی طرح ارکان میں تقسیم کر کے در - خت ، دو - ست ، گو - شت بولتے ہیں - چنانچہ یہ نہ صرف اردو زبان کا بلکہ پاک و بھارت کی تمام زبانوں کا بنیادی صوتی اصول ہے جو ان زبانوں کے ساتھ ساتھ ہی وضع ہوا ہے لیکن جو لوگ اردو زبان کے مزاج سے واقف نہیں ہیں وہ اس قسم کے لفظ پر معترض ہوتے اور اصرار کرتے ہیں کہ یہ الفاظ ہماری زبانوں میں بالکل اسی طرح بولے جائیں جس طرح فارسی عربی میں مستعمل ہیں -

اس ضمن میں انگریزی کے الفاظ ٹکٹ ، پرمٹ اور منٹ وغیرہ کا ذکر بھی ضروری ہے - یہ الفاظ انگریزی میں کسرۂ ماقبل ٹ کے ساتھ سنائی دیتے ہیں لیکن جب اردو میں مستعار لیے گئے تو ان کا زیر زبر سے بدل دیا گیا اور اب یہ بے تکان ٹکَٹ ، پرمَٹ ، منَٹ بولے جاتے ہیں ، کیونکہ اردو الفاظ کی کثیر تعداد کا تلفظ اسی طرح کیا جاتا ہے جیسے آہٹ ، گھبراہٹ ، تلپٹ ، چوکھٹ ، سنکٹ ، جھنجھٹ ، کوڑا کرکٹ ، چنٹ ، پلٹ ، بکٹ ، رہٹ ، کروٹ ، جھپٹ ، لپٹ وغیرہ - اب اگر معترض یہ کہے کہ اردو والے ٹ سے پہلے زیر کیوں نہیں بولتے یا اردو کا نقاد یہ فیصلہ صادر کر دے کہ اہل اردو ٹ سے قبل زیر بول ہی نہیں سکتے تو میرے نزدیک یہ اعتراض اور یہ فیصلہ دونوں عجلت فکر کا نتیجہ ہوں گے ، کیونکہ اردو میں ہِٹ (ہٹنا) ، چِٹ ، مِٹ ، جیسے الفاظ بھی موجود ہیں - اسی طرح جب پنجابی میں انگریزی کا مِنٹ سکون ما قبل ٹ کے ساتھ منٹ بولا جاتا ہے تو معترض کو اعتراض سے

قبل یہ سوچ لینا چاہیے کہ تلفظ کا یہ طریقہ بھی ہماری زبانوں کے مزاج کے بالکل مطابق ہے اور اس تلفظ کے اجتماعی چلن کے پس پشت کوئی اصول ضرور کارفرما ہے اور وہ یہ ہے کہ لفظ کے آخری دو حرف اس وقت ساکن ہو سکتے ہیں جب کہ ان میں سے پہلا نون ہو جیسے پنج - چنٹ - کنڈم - ٹھنڈ - تند - دھُند (غبار) ، پھَند وغیرہ - ان پر قیاس کر کے انگریزی ِمنٹ کو مِنْٹ بولا جاتا ہے - کہنے کا مقصد یہ ہے کہ انفرادی تلفظ میں غلطی کا امکان ہوتا ہے لیکن زبانوں کا اجتماعی تلفظ کسی نہ کسی دیسی بدیہی اصول یا روائت کی طرف اشارہ کرتا ہے -

انگریزی کا لفظ سکُول (School) جو اردو میں مستعار لفظ کے طور پر اسکول بولا جاتا ہے ، اسی ذیل میں آتا ہے کیونکہ تمام اہل اردو اس کو اسی طرح بولتے ہیں اور اس کا یہ اجتماعی تلفظ اس امر کا ثبوت ہے کہ اس کو کسی نہ کسی اصول کی پشت پناہی حاصل ہے - بظاہر یہ لفظ کچھ عجیب سا ہے یا یوں کہیے کہ لفظوں کی یہ قسم عجیب سی ہے جس کی ابتدا میں دو حروف صحیحہ پے در پے آتے ہیں ، کیونکہ آج اس برصغیر میں جتنی زبانیں بولی جا رہی ہیں ان میں سے کسی ایک سے بھی بنیادی مادے کی کوئی ایسی مثال نہیں مل سکتی جس میں ابتدائی حرف صحیح ساکن ہو اور جس میں دو حروف صحیحہ کے درمیان حرف علت نہ بولا جاتا ہو - چنانچہ اس برصغیر کی کسی زبان میں بھی لفظ سکول (School) کا تلفظ سین ساکن سے نہیں کیا جا سکتا - لہٰذا اس کے صحیح تلفظ کے لیے ہمیں دوسری مثالیں دیکھنی چاہئیں -

انگریزی اور یورپ کی دوسری زبانوں بالخصوص ہند یورپی زبان کی تمام شاخوں میں ایسے لاتعداد الفاظ پائے جاتے ہیں جن میں مرکب حروف صحیحہ استعمال ہوتے ہیں اور الفاظ کے بنیادی اجزا یعنی مادوں میں بھی ان کی کوئی کمی نہیں ہے - مثلاً انگریزی فریم (Frame) ، ِکراس (Cross) گلاس (Glass) یا سنسکرت پران ، شلش (= فارسی سرش ، سرپش) وغیرہ لیکن ایسے الفاظ کو برصغیر کی قریب قریب تمام زبانوں میں پہلے دو حروف صحیحہ کے درمیان ایک زیر داخل کر کے

ِفریم ، ِکراس ، گلاس ، ِپران ، شلش بولا جاتا ہے ۔ یعنی ہماری زبانوں کا یہ ایک عام اصول ہے کہ بدیسی زبانوں کے ایسے الفاظ کا تلفظ جن کی ابتدا میں پے در پے دو حروف صحیحہ آتے ہیں ، ان کے درمیان حرکت کسرہ داخل کر کے کیا جاتا ہے ، کیونکہ ان زبانوں میں ہر لفظ کا ابتدائی حرف متحرک ہوتا ہے ۔ اس اصول کی رو سے انگریزی سکول (school) کا بھی اردو تلفظ ِسکول ہونا چاہیے تھا ۔ اس لیے مروجہ تلفظ اسکول بظاہر غلط سا معلوم ہوتا ہے جس کا سبب ہمیں کہیں اور تلاش کرنا ہوگا ۔

اے ۔ آر ۔ ڈائمنڈ نے اپنی کتاب "ہسٹری اینڈ اوریجن آف لینگوئج" مطبوعہ لندن ۱۹۶۰ء کے صفحہ ۱۸۶ پر لکھا ہے کہ دنیا کی کسی زبان کے بنیادی مادے میں دو حروف صحیحہ علی الاتصال نہیں آتے بلکہ ان میں ہر حرف صحیح کے بعد ایک حرف علت ضرور آتا ہے ۔ اس سے صرف ایک ہی نتیجہ نکلتا ہے اور وہ یہ کہ انگریزی میں یا ان ہند یورپی زبانوں میں جن سے یہ لفظ انگریزی نے مستعار لیا ہے اس کی مکتوبی صورت کچھ بھی کیوں نہ ہو اس کا حقیقی تلفظ وہ نہیں ہے جو آج اس کے مکتوبی روپ کو دیکھ کر کیا جا رہا ہے ۔ اس لیے بہتر یہ ہوگا کہ اس کے ابتدائی مکتوبی روپ کا سراغ لگایا جائے تاکہ ڈائمنڈ کے قول کی صحت کا بھی علم ہو اور اس کے صحیح تلفظ تک پہنچنے میں بھی مدد مل سکے ۔

انگریزی زبان میں ہند یورپی زبانوں کے ایسے بہت سے الفاظ رائج ہیں جن میں ابتدائی سین ساکن نظر آتا ہے لیکن یورپ کی دوسری زبانوں میں ان سے قبل ایک ای (e) یعنی الف مکسورہ زیادہ ملتا ہے بلکہ فرانسیسی میں تو بیشتر ابتدائی سین ساقط ہی ہو جاتا ہے اور اس کی جگہ صرف e ہی نظر آتی ہے مثلاً

انگریزی	معنی	ہسپانوی	فرانسیسی
Scale	چڑھنا	Escalera (سیڑھیاں)	Escalier (سیڑھیاں)
Scribe	لکھنا	Escribir	Ecrire
Scout	اسکاؤٹ	Escuchar (سننا)	Ecouter (سننا)
School	اسکول	Escuela	Ecole
Spain	ہسپانیہ	Espana (اسپانیا)	—
Spanish / Spaniard	ہسپانوی	Espanol	Espagnol / Espagneul قدیم فرانسیسی
Spirit	روح	Espiritu	Espirit
State	ملک ۔ حالت	Estado	Eta
Star	ستارہ	Estrella	Etoile
Student	طالب علم	Estudiante	Etudiant
Study	مطالعہ کرنا	Estudier	Etudier
Strange	عجیب	Extrano	Etrange

مندرجہ بالا الفاظ کے علاوہ انگریزی اور ہسپانوی کی مزید مثالیں یہ ہیں :

انگریزی	معنی	ہسپانوی
Special	خاص	Especial
Species	نوع	Especie
Spouse	شوہر	Esposo
Splendid	شاندار	Esplendido
Stable	مضبوط	Establo
Spectacle	نظارہ	Espectaculo
Spiritual	روحانی	Espiritual
Spectator	تماشائی	Espectador
Skeleton	ڈھانچہ	Esqueleto
Station	اسٹیشن	Estacion
Style	طرز	Estilo
Studio	اسٹوڈیو	Estudio
Stampede	یلغار	Estampida
Stomach	پیٹ	Estomago
Stupendous	عظیم - بزرگ	Estupendo

اب انگریزی اور فرانسیسی کے کچھ مشترک الفاظ ملاحظہ فرمائیے :

انگریزی	معنی	فرانسیسی
Screen	پردہ	Ecran
Scroll	طومار	Escroe
Stanchion	کھڑی سلاخ	Estance
Scholar	عالم	Ecolier
Spinach	پالک	Epinards
Standard	معیار	Estandard
Stuff	مال، سامان	Etoffe / Estoffe (قدیم)
Staple	خاص	Estaple قدیم
Sturdy	مضبوط	Estourdi (قدیم بمعنی حیران)
Spy	جاسوس	Espion
Squire	سرکس کا سوار	Ecuyer
Squirrel	گلہری	Ecureuil
Stranger	اجنبی	Etranger

ایک ہی زبان انگریزی میں بھی ایسے الفاظ کے جوڑے ملتے ہیں جن میں سے ایک میں ابتدائی سین موجود ہے اور دوسرے میں اس سے قبل e یعنی الف مکسورہ کا اضافہ ہوا ہے جیسے Special (خاص) اور Especially (خاص طور پر) State اور Stable-Estate (مضبوط) اور Establish (جمانا) - Spy (جاسوس) اور Espionage (جاسوسی کا پیشہ) اور Espial (جاسوسی) - Strange (اجنبی ، غیر) اور Estrange (غیر بنانا) - Scape (جس پر اپنا الزام ڈال دیا جائے) اور Escape (فرار) - Scallop (ایک قسم کی مچھلی) اور Escallop - Scarp اور Escarp (سخت ڈھلان) - Scot اور Escot (ٹیکس) - Scroll (طومار) اور Scudo-Escrow اور Escudo (ایک سکے کا نام) - Sparta (ایک ملک کا نام) اور Esparto (اسپارٹا سے موسوم ایک قسم کی گھاس) - Squire اور Esquire (تعظیمی لفظ ۔ صاحب) وغیرہ ۔

ہند یورپی زبانوں میں ابتدائی e (الف مکسورہ) کو hi اور si سے بھی ظاہر کیا گیا ہے کیونکہ ان کے عام اصول کے مطابق ابتدائی S کا تبادل h سے ہو جاتا ہے لیکن h کی آواز تلفظ میں مطلق نہیں نکلتی - مثلاً انگریزی honour (آنر ، عزت) ، hour (آور ، گھنٹہ) ، honest (آونیسٹ ، ایماندار) ، heir (ایر ، وارث) ، Hebrew (ابریو ، عبری ، عبرانی) ، فرانسیسی habile ، انگریزی able (قابل) ، یونانی و انگریزی hero ، فرانسیسی heros (ایرو) ، ہسپانوی heroe (ایرو) ، لاطینی و انگریزی Hispania ، ہسپانوی Hispana (اسپانیا) ، لاطینی histrio ، یونانی historia، انگریزی history story، فرانسیسی histoire (استوئر)، ہسپانوی historio ، (اسٹوریو) ، یونانی stat ، سنسکرت ستھات ، فارسی جدید استاد ، لاطینی sto ، sisto (کھڑا ہونا) ، سنسکرت ستھا ، فارسی جدید ستا ، استا ، سنسکرت ستھامی (میں کھڑا ہوتا ہوں) یونانی استیمی histemi ، فارسی جدید استم ، ایستم وغیرہ ۔

ابتدائی س سے قبل الف مکسورہ کے اضافے کے علاوہ ان زبانوں میں س کے بعد زیر کے اضافے کا ایک دوسرا رجحان بھی عام طور پر ملتا ہے - مثلاً یونانی sphaira فارسی سپہر ، انگریزی stalk (تنہ) ،

فارسی جدید ستاک ، ستاخ ، انگریزی star ، فارسی جدید ستارہ ، سنسکرت ستی (تعریف) ، فارسی جدید ستودن (تعریف کرنا) ستائش (تعریف) انگریزی study (علم حاصل کرنا) ، فارسی جدید ستدن (حاصل کرنا ، اپنا) ، انگریزی stamp (دبانا ، کچلنا) ، فارسی جدید ستم وغیرہ -

مندرجۂ بالا مثالوں کے علاوہ کافی تعداد ایسے الفاظ کی بھی پائی جاتی ہے جن کی دوہری دوہری شکلیں دونوں اصولوں کی پابندی کرتی ہیں - مثلاً سنسکرت ستھا (کھڑا ہونا) فارسی جدید ستادن ، استادن ، انگریزی star ، سنسکرت ستر ، اوستا ستار ، بلوچی استار ، کردی استرک ، فارسی جدید ستارہ ، سنسکرت شویت (سفید) ، اوستا سپیت ، پہلوی سپیت ، فارسی جدید اسپید ، سپید ، سنسکرت ستھور (مضبوط)، بلوچی استور ، یونانی spathe (لکڑی کی تلوار) ، ہسپانوی espada (تلوار) ، انگریزی spade (پھاوڑا) ، اوستا سپاد (فوج) ، فارسی جدید سپاہ ، یونانی sponggia ، انگریزی sponge ، spunge ، فارسی جدید اسپنج ، انگریزی spinach ، spinage ، قدیم فرانسیسی espinache ، فارسی جدید سپاناخ ، اسپاناخ ، اسپناج ، فارسی جدید سپند ، اسپند ، سنسکرت ستھا (کھڑا ہونا) ، فارسی جدید ستادن ، استادن ، سنسکرت ستھان (مقام) انگریزی stand ، فارسی جدید ستان (جیسے بوستان=بو+ستان) اور استان (جیسے گلستان=گل+استان ، شبستان=شب+استان ، ریگستان= ریگ+استان وغیرہ) - انگریزی station ، فرانسیسی اور فارسی جدید استاسیون وغیرہ -

کالڈ ویل نے اپنی کتاب "دراوڑی زبانوں کی تقابلی گرامر" کے صفحات ۷۹ ، ۸۱ پر لکھا ہے کہ تامل میں انگریزی سکول کو سکول اور سنسکرت ستری کو استری بولا جاتا ہے - یہی اصول ہنگری اور فن لینڈ وغیرہ ممالک کی زبانوں میں بھی عام ہے - بیستون کی تختیوں پر سپارٹا کی جگہ اسپارٹا لکھا ہوا ہے - وہ میکس مُلر کے حوالے سے کہتا ہے کہ لاطینی میں بہت سے الفاظ س+ک، س+ت، س+پ کے مرکبات سے شروع ہوتے ہیں لیکن چوتھی صدی عیسوی کے لاطینی کتبوں میں ان سے قبل الف مکسورہ کا اضافہ ہوگیا ہے - یہی بات ہمیں اس برصغیر

کے قدیم ادب میں بھی ملتی ہے ۔ پراکرت کے گرامر نویسوں نے الف مکسورہ کے اس اضافے کو اپنی گرامروں میں سؤر بھکتی کے نام سے موسوم کیا ہے اور سنسکرت لفظ ستری کا ایک پراکرت روپ استھی بھی دیا ہے ۔

میرے نزدیک مندرجۂ بالا مثالیں یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں کہ اردو زبان میں ہند یورپی لفظ کے ابتدائی مرکب حروف صحیحہ کے درمیان زیر کا اور ابتدائی ساکن صفیری سے قبل الف مکسورہ کا اضافہ اردو زبان کی اپنی ایجاد نہیں ہے بلکہ خود ہند یورپی زبانوں کا اصول ہے ، جس کا چلن اس برصغیر میں نہایت قدیم زمانے سے چلا آ رہا ہے ۔ لہٰذا اہل اردو جو سکول کو اسکول سٹیشن کو اسٹیشن اور سٹول کو اسٹول بولتے ہیں ، اسی ہند یورپی زبان کے اصول کی پیروی کرتے ہیں جس سے یہ الفاظ اردو میں مستعار آئے ہیں اور پاک و بھارت کی زبانوں کے اس عام دستور پر عمل پیرا ہیں جو ہزاروں سال سے جاری ہے ۔

(مطبوعہ روزنامہ ، کراچی ، اکتوبر تا دسمبر ۱۹۶۳ء)

حروف کا تبادل

قدیم و جدید زبانوں کے تقابلی مطالعے سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ کوئی مشترک لفظ اگر ایک زبان میں ایک حرف سے لکھا ہوا ہے تو دوسری زبان میں دوسرے حرف سے تحریر کیا گیا ہے، بلکہ کبھی کبھی تو ایک لفظ کی دو مکتوبی شکلیں ایک ہی زبان میں مل جاتی ہیں مثلاً اربھک (چھوٹا) اور اربھگ کہ ویدک زبان میں کہیں کاف سے لکھا ہوا ملتا ہے اور کہیں گاف سے، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ کاف اور گاف دونوں ایک دوسرے کی جگہ لیتے رہتے ہیں۔ اس صورت حال کو تقابلی لسانیات میں تبادل حرف کا نام دے کر ایک مہتم بالشان اصول کے طور پر پیش کیا گیا ہے جس کی توجیہ و تشریح اس مقام پر دلچسپی سے خالی نہ ہوگی۔

ہندوستانی لسانیات میں زمانۂ قدیم کے گرامر نویسوں سے لے کر آج کے گرامر نویسوں اور محققوں تک نے بالاتفاق رائے یہ تسلیم کر لیا ہے کہ ہماری موجودہ زبانیں اور ان کی مائیں جو پراکرتوں کے نام سے موسوم تھیں، سنسکرت سے مشتق ہیں۔ پراکرت کے گرامر نویس یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ پراکرتیں براہ راست سنسکرت سے نکلی ہیں لیکن بعض محتاط مستشرقین کا خیال ہے کہ وہ سنسکرت کی کسی ملتی جلتی بولی سے پیدا ہوئی ہیں۔ اسی طرح بعض محققین کہتے ہیں کہ موجودہ زبانیں براہ راست سنسکرت سے ماخوذ ہیں اور کچھ کا موقف یہ ہے کہ وہ سنسکرت سے بواسطۂ پراکرت مشتق ہوئی ہیں اور کچھ ایسے بھی ہیں جو سنسکرت کو موجودہ زبانوں کا ادبی روپ قرار دیتے ہیں۔ ان تمام آرا میں اختلافات کے باوجود سب سے بڑی قدر مشترک یہ ہے کہ موجودہ زبانیں ہوں یا پراکرتیں ان سب کا سلسلۂ نسب سنسکرت پر جا کر منتہی ہوتا ہے۔ دوسری طرف مستشرقین سنسکرت کو ویدک

کی ترقی یافتہ شکل کہتے ہیں اور ویدک کو قدیم ہند یورپی زبان کی شاخ بتاتے ہیں - یوں اس برصغیر کی تمام قدیم و جدید زبانیں بواسطہ سنسکرت و ویدک قدیم ہند یورپی زبان کی اولادیں ٹھہرتی ہیں -

اندریں حالات تبادل حروف کی تشریح میں یہ لازم ہے کہ میں زبانوں کے اس نام نہاد کثیر العیال خاندان (ہند یورپی) کی قریب قریب ہر اہم شاخ سے حوالے پیش کروں اور جہاں جہاں اختلافات نظر آئیں ان کی تشریح کرتا چلوں تا کہ اس لسانی گروہ بندی کا آریائی نقطہ نظر سب پر واضح ہو جائے کہ مستشرقین ، ایرانی علما اور ہندوستانی آچاریہ میں سے بعض اپنے آریائی ذہن کے باعث ایسا سوچنے پر مجبور ہیں ، بعض بعض کسی آریائی زبان سے شدید جذباتی وابستگی کے سبب اس خیال کے مؤید ہیں اور کچھ کثرت آرا سے متاثر ہو کر ان کے شریک ہوگئے ہیں اور خود انہوں نے تحقیق کی کوئی کوشش نہیں کی ہے -

اب آپ اس تبادل پر غور کیجیے جس کی ایک قسم حلقی و حنکی حروف کا تبادل ہے یعنی بعض زبانوں میں حلقی حروف (کاف اور گاف) حنکی حروف (چ اور ج) سے جگہ بدل لیتے ہیں - مثلاً ویدک شوک (شعلہ) سے شوچتی (وہ چمکتا ہے) - ویدک یوگ (جوا رکھنا، جوتنا) اور یجے (میں جوا رکھتا ہوں، میں جوتتا ہوں)۔ یونانی اگروس (کھیت) = ویدک اجرہ ، یونانی آءُ کسو = لاطینی آءُ گسے = ویدک اوجس (طاقت) - اوستا چسئتی (وہ آتا ہے) = ویدک گچھتی ، ویدک سنچتی (وہ خالی کرتا ہے) اور ویدک سکت (خالی کیا ہوا) - اوستا سوک (سوئی) = پہلوی سوچن ، فارسی آخشیج = آخشیگ وغیرہ لیکن اس قسم کا رجحان اس برصغیر کی موجودہ زبانوں میں نظر نہیں آتا جس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ تبادل پراکرتوں کے لیے غیر تھا لیکن اس تبادل کی مثال میں ور روچی سوتر ۲ - ۳۳ میں اور لکشمی دھر سوتر ۱-۳-۱۳ میں صرف ایک لفظ کراتو چلا دو پیش کرتا ہے جو ایک مفروضہ روپ معلوم ہوتا ہے کیونکہ کتابی پراکرت ایک مصنوعی زبان ہے جس کے صدہا مفروضہ روپ سنسکرت سے الٰہی اصولوں کے مطابق ڈھال لیے گئے ہیں جو سنسکرت اور قدیم ہند یورپی زبان سے مخصوص ہیں - دوسری طرف اگر "چلا دو" کو ایک حقیقی روپ بھی

تسلیم کر لیا جائے تب بھی پراکرت میں اس تبادل کو ثابت کرنے کے لیے یہ تنہا روپ کافی نہیں ہو سکتا ۔

اس تبادل پر تمام محققین کا اتفاق ہے لیکن اس کی توجیہ بہت کم لوگوں نے کی ہے ۔ جان بیمز اپنی کتاب "جدید آریائی زبانوں کی تقابلی گرامر" (مطبوعہ لندن ۱۸۷۲ء) کی جلد اول کے صفحہ ۷۲ پر کہتا ہے کہ قدیم آریائی (ویدک ، سنسکرت اور کتابی پراکرت) یونانی اور لاطینی کے علاوہ سامی زبانوں میں بھی جن کی آوازیں (چ اور ج) نہیں ہوتی تھیں ۔ اس کے نزدیک حلقی آوازیں (ک ، گ) ان سے قدیم تر اور ابتدائی ہیں جن سے بعد میں حنکی آوازیں پیدا ہوئی ہیں لیکن ایک قسم کی آوازوں سے دوسری قسم کی آوازیں پیدا ہونے کی بات گلے سے نہیں اترتی کیونکہ بیمز کے اس قسم کے اور بھی نظریات غیرمنطقی مفروضے ہیں ۔ البتہ جوزف رائٹ نے "یونانی زبان کی تقابلی گرامر (مطبوعہ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس ۱۹۱۲ء) میں ہند یورپی زبان کے حروف تہجی کا نقشہ دے کر تشریح کی ہے کہ اس زبان کی قدیم لپی میں حلقی اور حنکی دونوں قسم کی آوازوں کے لیے صرف ایک ہی قسم کے حروف ملتے تھے ۔ اس طرح حلقی اور حنکی حروف کے تبادل میں اس کے خیال کے بموجب ہند یورپی زبان کی ابتدائی لپی کا ہاتھ رہا ہے اور یہی بات قرین صحت معلوم ہوتی ہے ۔

دوسرا تبادل مصمت وغیر مصمت حروف کا ہے یعنی ک ، گ — ، چ — ، ج — ت ، د اور پ ، ب ، باہم جگہ بدل لیتے ہیں اور یہ بھی خالص ہند یورپی زبان کی خصوصیت ہے جو اس کی مختلف شاخوں یونانی، اوستائی اور فارسی قدیم کے علاوہ ویدک میں بھی ملتی ہے ۔ چنانچہ ہڈسن ولیم نے اپنی کتاب "تقابلی گرامر کا ایک مختصر تعارف" (مطبوعہ کارڈف ۱۹۳۵ء) میں ہند یورپی کے الپ پرالوں کا جو نقشہ دیا ہے اس میں ہند یورپی ب ، د ، گ کو گاتھک زبان کے پ ، ت ، ک کا متبادل ٹھہرایا ہے ۔ جوزف رائٹ نے اپنی کتاب کے صفحہ ۷۰ پر لکھا ہے کہ یونانی زبان میں مصمت وغیر مصمت حروف کا تبادل عام ہے بلکہ پارہ نمبر ۱۰۶ میں وہ یہ بھی کہتا ہے کہ قدیم ہند یورپی زبان کی مختلف

شاخوں میں تقسیم ہو جانے سے قبل ہی اس میں گ ، د ، ب کی آوازیں ک ، ت ، پ ہو چکی تھیں ۔ جیکسن نے اوستا گرامر میں اوستا اور ویدک کا موازنہ کرتے ہوئے یہی بات اوستا کے لیے کہی ہے اور میکڈانل نے بھی ویدک گرامر میں ویدک زبان کی یہی خصوصیت بیان کی ہے ۔ صاحب فرہنگ جہانگیری نے آئین ششم میں اس تبادل کو پیش کیا ہے اور انسائیکلو پیڈیا برٹانکا کی جلد نمبر ۲۱ میں حروف تہجی کے تحت بھی لکھا ہوا ہے کہ فارسی جدید میں فارسی قدیم سے جو اختلاف ہوا ہے اس میں ک ، ت ، پ ، چ ، کا ، گ ، د ، ب ، ز سے تبادل خاص ہے ۔ اس تبادل کی چند مثالیں ملاحظہ کیجیے :

ویدک ا بھک (چھوٹا) = اربھک ، کلبھ (خنہ) = کلبھ ، تج (بھہ) = تج ، چنٹ (کاٹنا) = چنڈ ، تاوت (تب تک) = تاود ، یاوت (جب تک) = یاود ، اپ جا (آب زاد) = اب جا ، اوستا کت (گھر) = پہلوی کنک = فارسی جدید کد ، کدہ ، اوستا ہچ = فارسی قدیم ہچا = پہلوی اج = فارسی جدید (ز ز) ، اوستا کرت (چھری) پہلوی کارت = فارسی جدید کارد ، فارسی تنبورہ ، دینورہ ، ستایش = سیدایش ، دراج = تراج ، گتید گفتیت کردید = کرتیت ، زردشت = زرتشت ، کاج = کاچ ، پہلوی چوپ (مکڑی) = فارسی جدید چوب = ویدک آپ = اوستا آپ = فارسی جدید آب ، سنسکرت لوپاش = پہلوی روپاس ، روباس = فارسی جدید روباہ سنسکرت شوک = فارسی جدید سوگ ، ویدک یکر = اوستایا کر = پہلوی جکر = فارسی جدید جگر ، ویدک وات = اوستاوات (ہوا) فارسی جدید باد ، ویدک کپوت = پہلوی کپوت کبوت = فارسی جدید کبوتر ، ویدک کشپ = فارسی جدید شب وغیرہا ۔

یہ تبادل پراکرت زبان کے لیے غیر ہے لیکن گرامر نویسوں نے اس کو بھی پراکرت میں تلاش کرنا چاہا ہے اور اس کی کچھ مثالیں پیش کی ہیں ۔ مثلاً سنسکرت ایکویا ایکم = پراکرت ایکویا ایکم (چنڈ ۱۲۰۳ ، لکشمی دھر ۱۰۳۰۱-۱۰۳۰) - ایگ کا لفظ آج کل کی زبانوں میں نہیں ملتا اور یہ ثبوت اس بات کا ہے کہ یہ روپ فرضی ہے ۔ البتہ بعض لوگ ایگیارہ (گیارہ) کو بھی اس تبادل کی مثال میں پیش کرتے ہیں کہ گنتی

کی ہر دھاتی ایک سے شروع ہوتی ہے، اس لیے ایگیا بھی ایک یا اگیا کا بدل ہوگا لیکن اس لفظ کی حقیقت کے متعلق اس وقت یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ لکشمی دھر سوترا ۳۔۱۳ میں ایک اور لفظ لوک = لوگ بھی دیتا ہے لیکن اس جوڑے میں معنوی اختلاف ملتا ہے۔ سنسکرت میں لوک کے معنی دنیا کے ہیں اور پراکرت میں لوگ کے معنی مرد کے ہیں جس کا اسم مؤنث لگائی عام طور پر ہماری زبانوں میں مستعمل ہے۔ پنجابی میں لفظ "لوک" سنسکرت کے زیر اثر "لوگ" ہی سے بنایا گیا ہے۔ چند سوتر ۳-۲۱ میں پشاچی کا بدل پساچی اور "کرت" کا بدل "کد" دیتا ہے۔ یہ بھی فرضی روپ ہیں۔ پشاچ کے اصل تلفظ کا تو مجھے اس وقت علم نہیں البتہ سنسکرت اور ویدک کا "کرت" پراکرت "کل اور کر" کا بدل ہے۔

محققین اس تبادل کی کوئی توجیہ نہیں کرتے البتہ اس سلسلے میں زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ قدیم ہند یورپی زبان کا تلفظ کچھ اس قسم کا تھا جس میں دو آوازیں ایک ساتھ ادا کی جاتی تھیں۔ اس کا اندازہ پنجابی زبان کے تلفظ سے لگایا جا سکتا ہے جس پر آریائی زبان کا زیادہ اثر پڑا ہے۔ چنانچہ اس میں بھرا، پھرا اور ٹول، ڈول وغیرہ کا تلفظ ایک ہی سا ہوتا ہے اور دوسری معاصر زبانوں کے حالیہ تام کی ت بھی د سے بدل گئی ہے۔ مثلاً کرتا = کردا، چلتا = چلدا وغیرھا۔ اسی آریائی تلفظ کے باعث ہند یورپی زبانوں میں ایک لفظ ایک مقام پر مصمت سے لکھا ہوا ملتا ہے تو دوسرے مقام پر غیر مصمت سے۔

تیسرا تبادل دندانی اور مخی حروف کا ہے یعنی ت اور د بالترتیب ٹ اور ڈ سے بدل جاتے ہیں لیکن یہ بات صرف ویدک اور لاطینی سے مخصوص ہے کیونکہ لاطینی میں ٹ، ڈ مقامی اثرات ہیں اور ویدک میں ٹ، ڈ، خالص ہندوستانی آوازیں ہیں جن سے یونانی اور اوستائی وغیرہ خالی ہیں۔ اس تبادل کو پراکرت کے گرامر نویسوں نے بڑے زور شور سے پیش کیا ہے۔ مثلاً سنسکرت تر سر = پراکرت تسر، (لکشمی دھر ۱-۳-۴۷)، سنسکرت دولا = پراکرت ڈولا، سنسکرت دنڈ = پراکرت ڈنڈ (لکشمی دھر ۱-۲ - ۳۵، ور روچی ۲ - ۳۵)، سنسکرت در = پراکرت ڈر

(ہیم چندر ۱-۲۱۷) وغیرہ یعنی ان کے نزدیک سنسکرت الفاظ کے دندانی حروف پراکرت میں مخی حروف سے بدل لیے گئے ہیں حالانکہ حقیقت بالکل اس کے برعکس ہے -

بعض بعض محققین ہندوستان کی ان مخصوص آوازوں کو بھی ہند یورپی کی آوازوں سے مشتق ثابت کرنا چاہتے ہیں ۔ چنانچہ جان بیمز حسب دستور سابق اپنی کتاب کے ص ۲۰۷ پر لکھتا ہے کہ ڈ اوستائی د + ر کی اور ٹ اوستائی ت + ر کی سی آواز دیتا ہے - مثلاً ویدک چندر = پراکرت چنڈ (چاند) اور ویدک پتر = پراکرت پٹ (بیٹا) - وہ کہتا ہے کہ اب آ کر ان کا ابتدائی تلفظ بدل گیا ہے اور انھوں نے موجودہ آوازیں اختیار کر لی ہیں جو قدیم آوازوں کی جگہ استعمال ہو رہی ہیں ۔ اس کے باوجود کثرت رائے اسی امر پر ہے کہ یہ آوازیں ہندوستانی ہیں اور قدیم ہند یورپی ان سے یکسر خالی تھی-

میکڈانل نے ویدک کے دندانی اور مخی حروف کے تبادل کی تشریح تو کرنا چاہی ہے کہ کن حالات کے تحت دندانی حرف مخی حروف سے بدل جاتا ہے لیکن اس کی وضاحت اس نے بھی نہیں کی کہ اس تبادل کا تعلق محض مکتوبی روپوں سے ہے یا آوازوں سے ۔ یہ میرے نزدیک اس تبادل کی تشریح و توجیہہ یہ ہے کہ آریا جو قدیم ایرانی زبان بولتے ہوئے ہندوستان میں داخل ہوئے تھے ، ابتداً میں یہاں کی مخی آوازوں (ٹ ، ڈ ، ڑ) کا صحیح تلفظ نہیں کر پاتے تھے - جیسا کہ آج کل بھی ایک ایرانی کے لیے ناممکن ہے - دوسرے یہ کہ ان کی قدیم لپی میں بھی جو وہ اپنے ساتھ لائے تھے ، ان آوازوں کے لیے کوئی علامات (حروف) مقرر نہیں تھیں اس لیے انھوں نے ویدک میں ان آوازوں کو ان سے مشابہ یعنی اپنی آبائی زبان کی دندانی آوازوں (ت ، د یا ت + ر اور د + ر) سے ادا کیا اور ویدک میں اپنی لپی کے دندانی حروف سے تحریر بھی کر دیا۔ اس کا اثر پنجاب کی زبان پر زیادہ پڑا کیونکہ آریاؤں کی بود و باش ہندوستان کے اس علاقے میں دوسرے علاقوں کی بہ نسبت زیادہ عرصے تک رہی ہے - یہی وجہ ہے کہ شور سینی پراکرات میں مہاراشٹری پراکرت کے اور پنجابی میں اردو کے مخی حروف کی جگہ بیشتر دندانی

حروف ملتے ہیں - مثلاً اردو ٹھکیل = پنجابی دھکیل ، اردو ٹوٹ = پنجابی تٹ وغیرہ -

یہ ویدک کے اس تبادل کی جزوی تشریح ہے کیونکہ ویدک میں غنی حروف کے استعمال میں بھی بڑی ناہمواری ملتی ہے یعنی جہاں اس میں پراکرت کے غنی حرف کو دندانی سے بدل کر موٹنڈ (سر) کو مورد ھانم ، اٹھاکو ورتھا ، بیٹھا کو ویدھا ، ڈول کو دروں ، لٹایا کو نہاثیا ، انڈل (وہ جانور جو خصبی نہ کیا گیا ہو) کو آنلت (بیل) ، گھٹا کو گھرتا ، ہٹ (ہل) کوورت ، ٹھنڈا کو شحندرا ، اکڑا کو اکرت ، باچھڑا (بچھڑا) کو باشرا ، گھوڑا کو گھورم ، سونڈ کو شولر اور سٹا (نزدیک) کو سچا لکھا گیا ہے ، وہاں دندانی کو غنی سے بدل کر وشتی کو وشٹی (وہ چاہتا ہے) ، فارسی است (ہے) کواشٹ ، اوستائی مرکب ست کوشٹ ، یونانی لاحقہ تفضیل کل استوس کواشٹھ ، ایرانی مرزد (صاف کیا ہوا) کو مرشٹ ، فارسی سرشت کو سرشٹی بھی تحریر کیا گیا ہے -

تبادل کی چوتھی قسم الپ پران (ک ، گ ، چ ، ج وغیرہ) اور سہاپران (کھ ، گھ ، جھ ، چھ وغیرہ) کے تبادل کی ہے اور یہ بھی صرف ویدک سے مخصوص ہے ، کیونکہ قدیم ہند یورپی زبان میں غنی حروف کی طرح مہا پر ان بھی نہیں تھے - یہی وجہ ہے کہ آج بھی اس کی شاخوں میں یہ حروف نہیں ملتے لیکن مستشرقین ویدک کو تمام و کمال قدیم ہند یورپی زبان سے مشتق گردانتے اور اس کے مہا پرانوں کو قدیم ہند یورپی کی ملکیت بتاتے ہیں ، حالانکہ وہ اس بات کی توجیہہ سے بھی قاصر ہیں کہ آخر قدیم ہند یورپی کی دوسری شاخوں سے یہ آوازیں کیوں اور کیسے معدوم ہوگئیں - دراصل ان کو ویدک کے پراکرت جزو کا علم ہی نہیں ہے اور یہ حقیقت بھی ان کی نظر سے رہ گئی ہے کہ جو زبان ایک جگہ سے دوسری جگہ کو سفر کرتی ہے، اس میں مقامی اثرات بھی داخل ہو جاتے ہیں -

میرے نزدیک اس تبادل کی توجیہ یہ ہے کہ آریوں کو ہندوستان میں آ کر جب غنی آوازوں کی طرح مہاپرانوں سے بھی سابقہ پڑا تو انھوں نے ان کی جگہ اکثر بعض الپ پران بول اور لکھ کر کام نکالا - اس کا

اثر یہ ہوا کہ آج نہ صرف اردو بلکہ ہند و پاک کی تمام زبانوں کے کثیر تعداد الفاظ میں قدیم مہاپرانوں کی جگہ الپ پران نظر آتے ہیں (دیکھیے میرا مقالہ "قدیم مہاپران اردو میں" مطبوعہ اردو نامہ کراچی شمارہ ششم) لیکن یہاں بھی ویدک میں وہی بے ضابطگی نظر آتی ہے جو دندانی و نحی کے تبادل میں اوپر بیان ہو چکی ہے - چنانچہ جہاں اس میں مہاپرانوں کو الپ پرانوں سے تحریر کیا گیا ہے وہاں الپ پران بھی مہاپران سے لکھے گئے ہیں - پہلے اول الذکر قسم کی مثالیں دیکھیے جن میں مہاپران الپ پران بن گئے ہیں -

پراکرت چڑھاؤ = ویدک چراؤ ، پراکرت بکھر (بکھرنا) = ویدک و کرت ، پراکرت پھول = ویدک پوت ، پراکرت بھپھ (بھاپ) = ویدک وربس ، پراکرت بھاٹا (پھٹی ہوئی) = ویدک پراچا ، پراکت اتھ (برباد کرنا) = ویدک اشن ، پراکرت اتھ (کھانا) = ویدک اشن ، پراکرت کنھ (کالا) = ویدک کرشن ، پراکرت لٹھی = ویدک رشٹی ، پراکرت چھنھ (جماع کرنا) = ششن پراکرت بھجن = ویدک ورجن ، پراکرت بھیھڑا = ویدک پیرو ، پراکرت آکھیا = ویدک (پنجابی بمعنی کہا) = ویدک آسیا ، پراکرت راکھتے (رکھتے) = ویدک راستے ، پراکرت سمجھتے = ویدک سماستے ، پراکرت لکھ (پرونا ، گوندھنا) = ویدک نشک ، پراکرت بھکھ (بھکنا ، کھانا) = ویدک بھکش ، پراکرت سکھاتا (سکھاتا) = ویدک سورشاتا ، پراکرت آچھے (بنگالی بمعنی ہے) = ویدک آشیے ، پراکرت چھڑ (سلاخ) = ویدک شر ، پراکرت چھڑیاں = ویدک شریام ، پراکرت لکھ ہی = ویدک دکش ہی ، پراکرت چھو (راجستھانی بمعنی ہو جاؤ) = شو ، پراکرت چھاگ (بنگالی بمعنی بکری) = شاگو ، پراکرت چھریا (برج بھاشا بمعنی بکری) = شریا ، پراکرت چھٹ (چھ) = ویدک شل ، پراکرت کھبا (پنجابی بمعنی بایاں) = ویدک سویا وغیرہ -

اب وہ مثالیں دیکھیے جن میں الپ پران مہاپران بن گئے ہیں :

فارسی ببر (شیر) ویدک بھبرو (بادامی) فارسی بغ = ویدک بھگ (بھگوان ، خدا) فارسی ، برگ (پتا) = ویدک بھرگ ، فارسی ابر (بادل) = ویدک ابھر ، فارسی درماں (چارہ) = ویدک دھرمن ، فارسی گردد (لڑھکتا

ہے)=ویدک گردھد ، فارسی=دادار=ویدک دادھار ، اوستا بوئتی (ہوتا ہے)=ویدک بھوتی ، اوستامئدیم (درمیانی)=ویدک مدھم فارسی بوم (زمین)=ویدک بھوم ، اوستا براتر فارسی جدید برادر=ویدک بھراتر ، اوستا بندم=ویدک بندھم ، اوستا درگم (لمبا)=ویدک دیرگھم فارسی بیم (خوف)=ویدک بھیم، یونانی ستیسس (قیام)=ویدک ستھتی وغیرہ بلکہ یہ ناہمواری اور بے ضابطگی خود پراکرت الفاظ تک جا پہنچی ہے ۔ مثلاً پراکرت سگرو (برج بھاشا بمعنی تمام)=ویدک سگھنو، پراکرت بیلا (برج بھاشا بمعنی وقت ، پنجابی ویلا)=ویدک وے دھا ، پراکرت باؤلے (پاگل)=ویدک واورد ہے=پراکرت بلاؤ، ویدک ودھاؤ، پراکرت بوجھا (سمجھا)=ویدک بھوشت وغیرہ ۔

تبادل کی مندرجہ بالا اہم قسموں کے علاوہ ی اور ج ، اور ب ، س اور ہ کے جوڑے بھی خاص توجہ کے مستحق ہیں ۔ ی اور ج کا تبادل ہند یورپی کی تمام شاخوں میں عام ہے اور اس کا سبب محض اصول کتابت کا اختلاف ہے ۔ یعنی کہیں ی کے حرف سے ج کی اور کہیں ج کے حرف سے ی کی آواز مراد لی جاتی تھی بلکہ یہ سلسلہ آج تک جاری ہے ۔ چنانچہ ی کی آواز کے لیے بین الاقوامی اصول کتابت میں جے (J) کا حرف رکھا گیا ہے ۔ اس کی مثالیں ملاحظہ کیجیے ۔ ویدک یکر=اوستا یاکر=پہلوی یکر ، جگر=فارسی جدید جگر ، اوستا یخت (ملا ہوا)=پہلوی جخت=فارسی جدید جفت ، ویدک واوستا یو=پہلوی یو ، جو=فارسی جدید جو اوستا اور ویدک یام=پہلوی یام ، جام=فارسی جدید جام ، ویدک یگیہ ، اوستا یسن=فارسی جدید جشن ، ویدک یا تودھان ، فارسی جادوداں ، ویدک یوان=فارسی جوان ، ویدک اریمن ، فارسی ارجمند (عالی مرتبت) ویدک یگم (جوا) لاطینی جگم وغیرہ ۔

پراکرت کے گرامر نویس بھی پراکرت میں اس تبادل کی نشان دہی کرتے ہیں حالانکہ "ی" ہندوستان سے باہر کا حرف تھا جو آریوں کے ساتھ قدیم و جدید زبانوں میں داخل ہوا ہے ۔ چنانچہ جا گیر دار ڈاکٹر ورما کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ پرانی شاکھیہ میں ویدک کی ی کو بعض مخصوص حالات (مصرع کی ابتدا ، لفظ کی ابتدا حروف صحیحہ کے مرکب وغیرہ)

میں ، ج کی طرح بولنے کی ہدایت ملتی ہے (انڈو ایرین لنگویجز، ص ۳-۱۰۲
۹۳ مطبوعہ پونا ۱۹۳۲ء) - اس کی وجہ یہی ہے کہ ویدک کے پراکرت
جزو میں ج کوی سے لکھا گیا ہے - مثلاً پراکرت جوگا (لائق)=ویدک
یجیو ، پراکرت جدھ (جب)=یدھ ، پراکرت جا (جانا)=ویدک یا ،
پراکرت گج بھاڑ (ہاتھیوں کو مار ڈالنے والا) ویدک گیس بھانو ،
پراکرت جاکو (جس کو)=یاسو ، پراکرت جوجن (ایک مقررہ فاصلہ)=
ویدک یوجن ، پراکرت جودھا (لڑاکا) =ویدک یودھا ، پراکرت ججھ ،
جوجھ (لڑنا)=ویدک یدھ ، پراکرت جوتن (جوتنا) ویدک یوتن، پراکرت
سورج=ویدک سوریہ ، پراکرت کارج=ویدک کاریہ وغیرہ -

ہند یورپی زبانوں میں و اور ب کا تبادل بھی کثیر الوقوع ہے -
مثلاً ویدک ور (پھل)=فارسی بر ، ویدک وجر (ہتھیار)=فارسی بزر ،
ویدک وخشی=فارسی بخش (دے) ، ویدک وراٹ=فارسی برات ، ویدک
وروتھ=فارسی باروت ، بارود ، فارسی خواب اور خواو ، تاب اور تاو،
بزرگ اور وزرگ ، بس اور وس ، نہیب اور نہیو ، نبشتن اور نوشتن
وغیرہ - پراکرت کے گرامر نویسوں نے سنسکرت کی تقلید میں اس
تبادل کا سراغ بھی پراکرت کے فرضی روپوں میں لگا ڈالا (دیکھیے ہیم
چندر ۱ - ۲۳۷) - حالانکہ ی کی طرح واو کی آواز بھی ہندوستان میں
پہلی بار آریوں کے ساتھ داخل ہوئی ہے جس کا اثر تمام پراکرتوں پر
پڑا ہے ، بلکہ یہ اثر جدید زبانوں تک چلا آیا ہے - یہی وجہ ہے کہ آج
کل کی زبانوں میں و اور ب کی قرار واقعی تفریق نہیں ملتی - چنانچہ
پنجابی میں ایک ہی لفظ کو کبھی واو سے بولتے ہیں کبھی ب سے -
برج بھاشا میں ب بولنے کا رجحان زیادہ ہے - بنگالی اور اڑیا میں دونوں
آوازوں کے لیے ایک ہی حرف ہے اور دیوناگری لپی میں بھی ایک
حرف سے دوسرا حرف تراشا گیا ہے - غرض ویدک کے پراکرت جزو
میں واو کی اصلیت صرف اتنی ہے کہ وہ پراکرت پیش پاب یا پھ کا بدل
ہوتا ہے یا پراکرت کے طویل حروف علت او یا آو کو ادا کرنے کے
لیے بطور جزو استعمال ہوتا ہے ، جیسے پراکرت بھجن=ویدک ورجن ،
پراکرت بھاگے بھاگے (الگ الگ)=ویدک واجے واجے ، پراکرت بھن

(بولنا ، کہنا)=ویدک ورن ، پراکرت بھنگ (منتشر)=ویدک ورنج ، پراکرت بلاؤ=ویدک ودھاؤ ، پراکرت بکری=ویدک ورشنی، پراکرت بیلا (وقت)=ویدک وینا ، پراکرت بدل (بادل)=ویدک ورتر ، پراکرت جائن (جاون ، جانا)=ویدک یاون ، پراکرت آترن (اترنا)=ویدک اوترن ، پراکرت لاؤ (اس جمع حاضر)=ویدک راسو ، پراکرت سر (آواز)=ویدک سون ، پراکرت اٹھا=ویدک ورشچا ، پراکرت اٹھا= ویدک ورتھا وغیرہ ۔

ہند یورپی زبانوں میں س اور ہ کا تبادل بھی عام ہے ۔ ھلسن ولیم "تقابلی گرامر کے مطالعہ کا مختصر تعارف" کے ص ۳۲ پر کہتا ہے کہ قدیم ہند یورپی کا س ، ایرانی ، ارمنی ، یونانی اور ویلش میں ہ سے بدل جاتا ہے مثلاً یونانی ہپت=ویدک سپت=لاطینی سپتم=اوستا ہپت=فارسی جدید ہفت ، لاطینی سال=یونانی ہیلس= قدیم انگریزی سیلٹ=جدید انگریزی سالٹ (نمک) ویدک سدس=یونانی ہیدوس=لاطینی سے ڈس= انگریزی سیٹ (نشست) ، ویدک دش= اوستا دس=فارسی جدید دہ ، ویدک کسمائے (کس کو یا کس کے لیے)=اوستا کہمائے ، ویدک سو ، (اچھا)=اوستا ہو ، ویدک شاس=فارسی شاہ ، ویدک سونر=فارسی ہنر، ویدک سوم (شراب)=اوستا ہوم ، ویدک سؤسار (بہن)=فارسی خواہر ، ویدک ماس (مہینہ) =فارسی ماہ ، ویدک سینا (فوج)=اوستا ہئین ، ویدک سنچتی (وہ خالی کرتا ہے)=اوستا ہنچتی ، ویدک سروم (سب ، کل)=اوستا هئر دم ، ویدک آسی (تو ہے)=اوستا اہی ، فارسی آماس= آماہ پہلوی روباس ، روباس=فارسی جدید روباہ وغیرہ ۔

پراکرت کے گرامر نویس (لکشمی دھر ۱-۳-۶۱-۱-۱-۳۹ اورہیم چندر ۱-۲۳۷ وغیرہ) جو اس تبادل کو پراکرت میں تلاش کرتے ہیں ، صرف ویدک و سنسکرت کی تقلید میں ایسا کرتے ہیں کیونکہ ہ ہندوستان سے باہر کی آواز ہے جو واو اور ی کی طرح پراکرت میں نہیں ملتی تھی ۔ ان لوگوں نے اس تبادل کو پراکرت میں تلاش کرنے کے لیے نہایت غلط سلط سے فرضی روپ پیش کر دیے ہیں ۔ مثلاً لکشمی دھر سوتر ۱-۳-۸۸ میں اور وررروچی سوتر ۲-۴۳ میں ویدک و

سنسکرت دوس کا پراکرت روپ دء ہو لکھتا ہے حالانکہ سنسکرت لفظ کا صحیح تلفظ وہی ہے جو یونانی زء س (Zeus) کا ہے اور جسے دء ہو کے تلفظ سے کوئی نسبت نہیں ہے۔

اس بات کو سمجھنے کے لیے کہ پراکرتوں میں ہ کی آواز نہیں تھی، موجودہ زبانوں کا تقابلی مطالعہ مفید ثابت ہوتا ہے ان کے دوہرے تہرے روپ اس کے استعمال کی ناہمواری اور بے ضابطگی کی روشن دلیلیں ہیں اور یہ ناہمواری اور بے ضابطگی بتاتی ہے کہ ہ کی آواز باہر سے لاکر زبان میں داخل کی گئی ہے۔ مثلاً اردو وہ=پنجابی او، اردو یہ =پنجابی اے، اردو یہاں، وہاں=یاں، واں، اردو دھی=بنگالی دوئی، اردو بہی (بہی کھاتا)=بنگالی بوئی (کتاب)، اردو، سنہار= سنھی سنار، اردو ہونہار=سنھی ہونار، اردو کلمہ تاکید "ہی"= قدیم ای۔ چنانچہ اردو آپہی=آپ+ای، اردو کسی=کس+ای، اردو ابھی=ابھ+ای، اور وہی=او+ئی، اردو یہی=اے+ای، اردو ایک=پنجابی ہک، اردو اور=پنجابی، ہور وغیرہ۔ غرض ہ کے استعمال کی ناہمواری جانئے کے لیے ایک ہی زبان میں یا دو زبانوں میں ایسے دوہرے روپ مل جائیں گے جن میں سے ایک میں ہ ملتی ہے اور دوسرے میں نہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہ کا حشوی اندراج سب ہی زبانوں میں ہوا ہے اور یہ بھی آریائی اثرات کا نتیجہ ہے۔ مزید توثیق و تصدیق کے لیے گروگرنتھ صاحب کی گورمکھی کے وہ الفاظ دیکھے جا سکتے ہیں جن میں حشوی ہ کا اندراج ہوا ہے لیکن دوسری قدیم تحریروں میں انہیں ہ کے بغیر لکھا گیا ہے اور آج کی بول چال میں بھی ان کا تلفظ ہ سے خالی ہے۔

ہند یورپی زبانوں میں ان کے علاوہ کچھ اور بھی تبادل ملتے ہیں جو خ، ز، ژ، ش، ف، غ کے حروف سے متعلق ہیں۔ پراکرت تو خیر ان کی آوازوں ہی سے خالی ہے لیکن وہلک دیوناگری لپی میں بھی ش کے سوا ان کے لیے کوئی حروف مخصوص نہیں ہیں۔ بلکہ اس میں ان آوازوں کو دوسرے حروف سے ظاہر کیا گیا ہے اور اس صورت حال نے ہندوستانی لسانیات میں وہ الجھنیں پیدا کر دی ہیں کہ ختم ہونے

ہی کو نہیں آتیں - ذیل میں ان حروف کے تبادل کا ایک مختصر سا نقشہ پیش کرتا ہوں -

۱ - ایرانی خ	=	ویدک س
بیخ (جڑ)		وس
لوخو (بہت سی شاخوں والا درخت)		پرسو
خار (کانٹا)		سار
۲ - ایرانی خ	=	ویدک ک
شُوخ		شوک
ریخت (گرایا)		رِکت (خالی کیا)
خرد (عقل)		کِرتُہ
تخم (بیج)		تُوکم
خری (خریدنا)		کری
خروش (شور و دغا)		کُرش
برخ (تھوڑا)		ورک (ٹکڑا)
فراخ (کشادہ)		پرک
خرامیم (ہم چلیں)		کرامیم
پُخت (ملا ہوا)		پُکت
آخت (کہا ہوا)		اُکت
ریغ (ذلیل شے)		ریک
۳ - ایرانی خ	=	ویدک ش
خف (سُم - کُھر)		شپھ

ایرانی		ویدک
خُشک		شُشک
خاک		شک
سُخ (بولنا)		شش
خُست (تکان ، ماندگی)		شُست
خوب		شُبھ
۴ - ایرانی خ	=	ویدک چ
ریخ (گرنا - پھیلنا)		رِچ
بیخ (چھانا)		وِچ
واخ (بولنا)		وچ
۵ - ایرانی ز	=	ویدک س
گز (کاٹنا)		گھس
زغند		سپند
۶ - ایرانی ز	=	ویدک ش
ورزاو (بیل)		ورشبھ
سُرز (معاف کرنا -		
آمرزیدن)		مرش (صاف کرنا)
زیبا		شِوا
زاو (طاقت)		شَو
۷ - ایرانی ز	=	ویدک ج
بزر (ہتھیار)		بجر
زانو		جانو
اوستا زانو ،		

فارسی جدید ، زادہ		جاتو
یزدان		یجتام
اوستا زور (طاقت)		جبر
زود (جلدی)		جوت
۸ - ایرانی ز	—	ویدک ہ
اوستا زست (ہاتھ)		ہست
بازو		باہو
اژ (بڑا سانپ)		اہی
آزر (آگ)		اہر (دن)
زد (مارا)		ہت
اوستا ازم (ہم)	—	
فارسی قدیم ، ادم		آہم
۹ - ایرانی ز	—	ویدک ج
مرز		مرج
روزن		روچن
پز (پکانا)		پچ
۱۰ - ایرانی غ	—	ویدک گ
بغ		بھگ (خدا)
مرغ (پہاڑی بکری)		مرگ (ہرن)
غردہ (گاڑی)		گرت
موغ (جَو)		مُنگ
۱۱ - ایرانی غ	—	ویدک گھ

دُغ (دودھ دوھنا)	دُگھ
دَغ (جلانا)	دَگھ
میغ (بادل)	میگھ
مغ (دولت)	مگھ
آغا (کلمۂ احترام)	آ گھا
دروغ (جھوٹ)	دروگھ
مَغ (مست ہونا)	مَگھ
غن (مارنا) تیل نکالنے والا اوزار	گھن

۱۲ - ایرانی غ	=	ویدک ہ
دُغ (دوھنا)		دُہ
دَغ (جلانا)		دَہ
میغ (بادل)		میہ
مغ (مست ہونا)		مُیہ
دروغ		دُرہ
غَن		ہَن
(آ) روغ (ڈکار)		رہ (اوپر چڑھنا)

۱۳ - ایرانی ف	=	ویدک پ
فرا		پر
تفت		تپت
فرشتہ		پرشٹھا
ہفت		سپت

اُفت (اُفتاذن)		وَپت (گرنا)
۱۴ - ایرانی ف	=	ویدک پھ
کف		کپھ
خف		شپھ
۱۵ - ایرانی ف	=	ویدک بھ
گرف (گرفتن)		گربھ
ناف		نابھی

اس مقام پر میں پراکرت کا تبادل بھی بیان کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ اس میں ٹ، ڈ، ڑ اور ان کے سہاپران باہم متبادل ہوتے تھے۔ مثلاً ٹنڈا (ہاتھ کٹا انسان)=ڈنڈا (شاخیں کٹا درخت) ٹھ بھیڑ= ڈھ بھیڑ، بڈھا=بوڑھا، مٹھی=منڈھی=مڑھی وغیرہ۔ ان کے علاوہ بھٹ، بھاڑ، بھوٹ، بھوڑ، چھٹ، چھوڑ وغیرہ کے دھرے روپ بھی اس کے شاہد ہیں۔ مارواڑی میں اردو ہی کی طرح ڈ اور ڑ کے لیے دو الگ الگ حروف مقرر ہیں لیکن دیو ناگری میں ڈ، ڈھ پر ایک نقطہ لگا کر ڑ، ڑھ کی علامات بنائی گئی ہیں۔ اردو کا عام اصول یہ ہے کہ طویل حرف علت کے بعد ڈ، ڈھ کی آوازیں ہمیشہ ڑ، ڑھ ہو جاتی ہیں، جیسے کوڑی، گاڑھا، بھیڑ، گاڑی وغیرہ۔ سرہٹی میں ڈ کے تلفظ کے لیے یہ اصول ہے کہ لفظ کی ابتدا اور تشدید کی حالت میں ڈ کی آواز دیتی ہے ورنہ دوسری صورت میں ڑ سے بدل جاتی ہے۔ چنانچہ نہ موجودہ زبانوں میں ڑ، ڑھ سے کسی لفظ کی ابتدا ہوتی ہے نہ انھیں مشدد بولا جاتا ہے۔

پراکرت میں ل، ن، ر کا تبادل بھی عام ہے، جیسے بانسلی، بانسری، تتلی، تیتری، بورانا، بولانا، لون، نون، لانگھنا، نانگھنا وغیرہ۔ البتہ ہند شمالی کے مشرق میں ل اور مغرب میں ر کی کثرت ملتی ہے اور اردو کے ر کی جگہ برج بھاشا میں بیشتر ل بولنے کا رجحان پایا جاتا ہے، جیسے اردو کا لا، برج بھاشا کا رو وغیرہ۔

پراکرت تبادل کے تیسرے گروہ میں بھی گ اور ب کے حروف بھی نظر آتے ہیں - مثلاً لگدی=لبدی ، بگولا=ببولا ، سگ (سگرو، برج بھاشا) =سب ، سا بودانہ=سا گودانہ ، چوبا (کسی تقریب کا بھیجا ہوا کھانا)=چوگا (رزق غذا) گولا=بولا (باجرے کے دانے کا چھلکا یا بھوسی) وغیرہ کے علاوہ بعض موجودہ زبانوں (اردو، پنجابی، راجستھانی برج بھاشا وغیرہ) میں علامت مستقبل گ ہے -(جیسے جائے گا، جائے گو ، کھائے گا ، کھائے گو وغیرہ) اور بعض زبانوں میں ب سے مستقبل بنتا ہے ، جیسے اودھی چلبوں (میں چلوں گا) ، چلب (ہم چلیں گے) ، چلبے (تو چلے گا) ، چلبو (تم چلو گے) وغیرہ ، بلکہ بعض اوقات چلب سے ہی تمام صیغوں کا کام نکالا جاتا ہے - گجراتی تینے اے کام کربوں (تو یہ کام کرے گا) ، مارے آ چوپڑی نانجہی (میں وہ کتاب پڑھوں گا) - بہاری مربوں (میں ماروں گا) ، اُڑیا کربوں (میں کروں گا) ، بنگالی کوربو (میں کروں گا) ، کوربے (تو کرے گا) ، آسامی کوروب (وہ کرے گا) - سرہٹی ملگیانیں پوتھی بانچابیں (لڑکا کتاب پڑھے گا) تامل شے بیں (میں کروں گا) شول بیں (میں کہوں گا) - اس کے علاوہ تامل میں گ بھی علامت مستقبل کے طور پر مستعمل ہے جیسے شے گیں (میں کروں گا) ، شول گیں (میں کہوں گا) وغیرہ - اس کے علاوہ بھی گ اور ب کا تبادل دکنی زبانوں میں ملتا ہے - غرض پراکرت تبادل کی یہ قسم اس برصغیر کے طول و عرض کی تمام جدید ہند زبانوں میں پائی جاتی ہے -

کہنے کا مقصد یہ ہے کہ تبادل حروف کی بہت سی قسمیں ہندوستانی لسانیات کے دیسی اور بدیسی محققین علی العموم پراکرت میں تلاش کرتے چلے آ رہے ہیں حالانکہ ان میں سے کچھ ہند یورپی زبانوں کی خصوصیات ہیں اور بعض سے پراکرت متعلق ہیں لیکن ویدک و سنسکرت میں دونوں ہی جمع ہوگئی ہیں - اس کی وجہ یہ ہے کہ ان زبانوں میں آریائی اور دراوڑی یعنی ہند یورپی اور ہندوستانی دونوں کے روپ اکٹھے کر دیے گئے ہیں - اس سلسلے میں یہ نکتہ بھی محققین کے پیش نظر رہنا ضروری ہے کہ حروف کے جتنے تبادل بیان کیے جاتے ہیں ان میں سے کچھ آوازوں سے متعلق ہیں اور بیشتر ایسے ہیں جو الفاظ کے مختلف مکتوبی روپوں

سے پیدا ہو گئے ہیں ۔ چنانچہ حلقی و حنکی حروف کا تبادل محض لہجے سے متعلق ہے اور مصبیت و غیر مصبیت کا تلفظ سے ۔ البتہ غنی و دندانی اور الپ پران اور مہاپران کے تبادل کا ایک حصہ تلفظ کے اختلاف سے تعلق رکھتا ہے اور دوسرا محض تحریر سے ۔ اسی وجہ سے الفاظ کے صحیح تلفظ کے لیے اس دوسرے حصے پر بھروسا نہیں کیا جا سکتا ۔ و ، ہ ، ی کی آوازیں پراکرت میں سرے سے ناپید ہیں اور صرف آریوں کے اثر سے ہمارے یہاں آئی ہیں ، اس لیے پراکرت کا ان کے کسی تبادل سے کوئی تعلق نہیں ہے ۔ البتہ پراکرت کے وہ تین تبادل جن کا میں نے آخر میں ذکر کیا ہے اس کی آوازوں کے تبادل ہیں اور پاک و ہند کے طول و عرض میں آج بھی پائے جاتے ہیں ۔ ہند یورپی میں ی ، ج اور و ، ب کے تبادل لہجے سے پیدا ہوئے ہیں اور س ، ہ کا تبادل ان حروف کے حشوی الدراج پر دلالت کرتا ہے جو صرف لکھے جاتے تھے ، بولے نہیں جاتے تھے ۔ یہی وجہ ہے کہ بعض حالات میں س کا ہ سے تبادل ہو جاتا ہے اور پھر ہ بھی ساقط ہو جاتی ہے ۔ چونکہ یہ مقالہ محض تبادل حروف سے متعلق ہے اس لیے سقوط حروف کے بارے میں پھر کبھی عرض کروں گا ۔

(مطبوعہ اردو زنامہ ، کراچی ، جون ۱۹۶۳ء)

بول اور معنی

بول ہر بھانت کی آواز کو کہتے ہیں ، چاہے وہ کسی بے جان کی ہو چاہے کسی جان دار کے منہ سے نکلی ہو - اس لیے ہم کہتے ہیں کہ جنگل بولتا ہے ، رن بولتا ہے ، چارپائی بولتی ہے، کوا بولتا ہے ، بھد بولتا ہے، انسان بولتا ہے بولِ دو بھانت کے ہوتے ہیں، بےمعنی یا مہمل جیسے ہجر بجر اور بیر بھیر میں ہجر اور بیر ، پانی وانی اور روٹی ووٹی میں وانی اور ووٹی ، انگڑ کھنگڑ اور آس پاس میں انگڑ اور آس ، جھوٹ موٹ اور جگ مگ میں موٹ اور مگ مہمل بول ہیں اور خالی تک ملانے کے لیے بولے جاتے ہیں - کچھ مہمل بول ایسے ہوتے ہیں جو بھار (وزن) پورا کرنے کے کام آتے ہیں جیسے بھیر بھار ، لیپ ٹاپ اور ڈھیل ڈھال میں بھار ، ٹاپ اور ڈھال یا منا منو کر اور چھو چھا کر میں منو اور چھا -

دوسری بھانت کے بول وہ ہیں جن سے بولنے والا اپنا سوچ بچار دوسروں تک پہنچاتا ہے - یہ معنی دار بول کہلاتے ہیں - انھیں کی ڈوری یا مالا کو ہم بولی کہتے ہیں - سنسار کی ہر بولی میں انھیں کی گنتی بڑھی ہوئی ہے اور انھیں کے سہارے آدم سماج کا دھندا چلتا ہے - بولی کا کام بھی یہی ہے کہ وہ دو انسانوں میں ناتا جوڑے اور وہ ناتا بولنے اور سننے والے کا ہوتا ہے - ایک آدمی اپنے من کا بھاؤ دوسرے کو جتاتا ہے اور پھر دوسرا اپنے آپ کو اس کا سنگی ساتھی سمجھنے لگتا ہے - انسانوں میں سنگ ساتھ کا یہ بھاؤ بولوں ہی سے جاگتا ہے ، پر یہ بول وہی ہیں جن میں بولنے والے کا سوچ لپٹا ہوتا ہے اور جن کے کچھ معنی ہوتے ہیں -

معنی اس ذہنی تصویر کو کہتے ہیں جو بول میں چھپی ہوتی ہے - وہ ذہنی تصویر یا معنی یا مراد یا مافی الضمیر یا الدیا (عندیہ) جو سننے

والے تک پہنچایا جاتا ہے ، بول میں لپیٹ کر ہی پہنچایا جاتا ہے ۔ اس کو سمجھنے کے لیے ایک مثال لیجیے ۔ کسی جگہ پتوں ، تنکوں اور چھوٹی موٹی لکڑیوں کا ڈھیر لگا ہوا ہے ۔ ایک شخص ماچس کی تیلی رگڑ کر اس ڈھیر میں ڈال دیتا ہے ۔ تیلی میں لال رنگ کی ایک لو نکلتی ہے اور دیکھتے دیکھتے اس کوڑے میں سے کہیں لو اور کہیں دھواں نکلنے لگتا ہے اور پتے تنکے چر مر ہونے اور سکڑنے لگتے ہیں جو پہلے سرخ ، پھر کالے اور پھر سلیٹی سے رنگ کے ہوتے جاتے ہیں ۔ اس گھڑی جو بھی آتا ہے ڈھیر کی یہ حالت آپ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتا ہے اور کسی کو اس سے کچھ کہنے کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی ۔ پر جب کچھ دیر پیچھے یہی بات کسی ایسے آدمی سے کہی جاتی ہے جس نے یہ حال اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا تھا تو کہنے والا بس اتنا کہہ دیتا ہے کہ ماچس سے کوڑے میں آگ لگا دی گئی اور وہ جل گیا اور سننے والا بس کا مطلب اچھی طرح سمجھ جاتا ہے ۔ اس گھڑی نہ ماچس آنکھوں کے سامنے ہوتی ہے ، نہ لو ، نہ کوڑے کا ڈھیر ۔ نہ چیزوں کی جگہ کہنے والے کے ذہن میں خالی ان کی تصویریں ہوتی ہیں، جنھیں وہ آوازوں میں لپیٹ کر سننے والوں تک پہنچاتا ہے ۔ اسے دوسری طرح یوں سمجھیے کہ "کوڑے" کا بول پتوں اور تنکوں کا کوئی مادی ڈھیر نہیں ہے اور نہ ان کی ذہنی تصویر ہے ، بلکہ وہ آواز ہے جو پتوں اور تنکوں کے ڈھیر ذہنی تصویر آجاتی ہے ۔

اب یہ دیکھنا ہے کہ چیزوں کی ذہنی تصویر کے لیے بول کس اصول سے مقرر کیے گئے ۔ یعنی چیزوں کے نام کیونکر رکھے گئے ۔ اس کے لیے کچھ بولوں اور ان کے معنی پر دھیان دیجیے ، جیسے گول (دائرہ ، بیل کا پھل ، بڑا مٹکا) لال (سرخ رنگ ، اس رنگ کا ایک قیمتی پتھر ، اس رنگ کی ایک چڑیا) ، باڑھ (پھیلاؤ ، تلوار کی دھار ، دیوار یا پشتہ) ۔ کالا (سیاہ رنگ اور سیاہ رنگ کا سانپ جسے انگریزی میں کوبرا کہتے ہیں) ۔ کھٹا (ترش اور ایک پھل جس کا مزہ ترش ہوتا ہے) ۔ ان بولوں کے معنی بتاتے ہیں کہ چیزوں کے نام رکھنے میں انسان کا سوچ دو منزلوں سے گزرا ہے ۔ پہلی منزل میں اس نے کئی چیزوں کو

دیکھا ، ان کا آپس میں ملان کیا ، ہر ایک میں کئی کئی گن ڈھونڈے ۔ پھر ان میں سے ایک ایسا گن ڈھونڈ نکالا جو سب چیزوں میں پایا جاتا تھا اور اسے ایک نام دے دیا ۔ پھر انسان کی سوچ دوسری منزل میں پہنچی ۔ وہ یہ گن لے کر آگے بڑھا اور اس نے بہت سی دوسری چیزیں دیکھیں اور جن جن میں اس نے یہ خاص گن ابھرا ہوا پایا ان کا بھی یہی نام رکھ دیا ۔ بات کو چھوٹا کرکے یوں کہا جا سکتا ہے کہ چیزوں کے نام ان کے گن پر رکھے گئے ہیں اور ایک ایک بول کے دو دو معنی ٹھہرائے گئے ہیں ۔ ایک گن اور دوسرے کوئی چیز یا ہستی جس میں وہ گن دوسرے گنوں سے ابھرا ہوا ملتا ہے ۔ اردو میں اسم اور صفت دونوں کے لیے جو ایک بول ملتا ہے اس کا کارن یہی ہے ۔

نام رکھنے میں انسان کے سامنے دوسری بات چیزوں کی حالت یا کیفیت رہی ہے ۔ مثال کے لیے کچھ دوسرے بول دیکھیے جیسے ڈھال (زوال ، نشیب یا ررک اور ایک ررکنواں ہتھیار) ۔ چھاپ (ڈھکاؤ یا اوٹ ، نقش ، سہر اور مہر لگانے کی انگوٹھی) ۔ ڈول (دائیں بائیں کی جنبش اور کنوئیں سے پانی نکالنے کا ایک برتن جو پانی نکالنے میں دائیں بائیں ہلتا رہتا ہے) ۔ بانٹ (تقسیم اور تقسیم کرنے والا لوہے یا پتھر کا وزن) ۔ بھیڑ (رگڑ یا لمس اور ایک چوپایا جو ایک دوسرے سے رگڑ رگڑ کر یا بھڑ کر چلتا ہے) ۔ جھول (پینگ یا چھوٹا اور ہاتھی کی پیٹھ پر پڑا ہوا کپڑا جو اس کے دونوں طرف جھولتا رہتا ہے) ۔ داب (دباؤ اور پودے کی وہ ٹہنی جو اس لیے دبا دی گئی ہو کہ اس میں جڑ نکل آئے) ۔ یہ مثالیں بتاتی ہیں کہ یہاں بھی نام رکھنے کے عمل میں انسانی سوچ انھیں دو منزلوں سے گزرا ہے جن کا ذکر پچھلی مثالوں کے ساتھ کیا جا چکا ہے ۔ ہر یہاں چیزوں کے نام ان کی حالت یا کیفیت پر رکھے گئے ہیں ۔ اسی لیے اردو میں اسم اور فعل میں بھی کوئی بل نہیں ملتا اور فعلی جڑیں سب کی سب اسم بھی ہوتی ہیں جیسے مار ، چھانٹ ، ڈانٹ ، دوڑ ، پھیر ، گھیر ۔

ان کے ساتھ ساتھ بولوں کی ایک بہالت اور بھی ہے جو چیزوں کے لیے نہیں ، ان چیزوں کے آپس کے ناتے کے لیے گھڑے گئے ہیں اور

یہ ناتے مکانی یا زمینی ہیں جو سمت اور رخ کو سامنے رکھ کر طے کیے گئے ہیں ، جیسے سے (آغاز ، پہلے ، سر) ، تک (اخیر ، پیچھے) - پر (اوپر)، میں (بیچ ، بھیتر ، من)۔ کو (پاس ، پنجابی کول ، ہریانی کن یا کنے) - کا (پیچھے ، مثل ، مانند ، کر؟) ان کے گھڑنے میں آگے پیچھے اوپر نیچے پاس اور دور جیسی مکانی سمتیں انسان کے سامنے رہی ہیں -

دنیا کی ہر بولی کی طرح اردو میں بھی ایک ایک بول کے کئی کئی معنی اور کئی کئی بولوں کے ایک معنی ہوتے ہیں - مثال کے لیے "نیل" کا بول لے لیجیے جس کے کئی معنی ہیں :

۱ - ایک بھانت کا رنگ ، چوٹ کا نشان ، آسمان (سنسکرت نبھ) ، پانی (ہندی نیر ، اردو محاورے "آنکھوں کا نیل ڈھلنا" میں نیل کے یہی معنی ہیں) - یہ سب نام رنگ پر رکھے گئے ہیں -

۲ - ڈھانکنا ، ہڑپ کرنا (اردو : نگل) ، سورج یا چاند کا پورا گہن جو سبز نیل کہلاتا ہے -

۳ - پھیل (فیل) ، پھیلاؤ ، اسی سے نیلا بنا ہے اور نیلے آدمی سے نیلیا (پھیلیا ، پھیلنے والا) مراد ہوتا ہے -

یہ جتنے معنی اوپر بیان کیے گئے سب کے سب اصلی ، حقیقی یا لغوی کہلاتے ہیں - پر جب بول اورکسی دوسری چیز میں تشبیہ کا ناتا یا کوئی اور رشتہ جوڑ دیا جاتا ہے تو وہ چیز اس بول کے مجازی معنی کہلاتی ہے ، جیسے حسین ، چاند کے اور بیٹا ، لال کے مجازی معنی ہیں - دونوں معنی (حقیقی اور مجازی) میں ایک اور بل یہ ہے کہ حقیقی معنی بدلے نہیں جا سکتے اور مجازی معنی ماحول کے ساتھ ساتھ بدلتے رہتے ہیں جب دو آدمی آپس میں باتیں کرتے ہیں تو وہ بولوں کے حقیقی معنی ہی کے سہارے ایک دوسرے کا الدیا (عندیا) سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں - جو ہر آدمی اپنے اپنے من بھاؤ یا من کی موج سے یہ معنی بدلنے لگے تو ایک کی بات دوسرے کو سمجھنا کٹھن ہو جائے اور وہ نیو ہی بیٹھ جائے جس پر بولی کا محل کھڑا کیا گیا ہے - بولنے والے خالی مجازی معنی بدل سکتے ہیں اور یہ اختیار بھی بولنے والوں کو اس لیے

دیا گیا ہے کہ ان کا بھیتری (ذہنی) اور باہری (مادی) ماحول بدلتا رہتا ہے - بھونرا بوالہوس کو بھی کہہ سکتے ہیں اور کالے آدمی کو بھی اور بھن بھنانے والے کو بھی اس نام سے پکار سکتے ہیں ، پر اس اختیار کی بھی ایک حد ہوتی ہے اور وہ یہ ہے کہ بول اور بول مجازی معنی میں زیادہ دوری نہ ہونے پائے ، نہیں تو ایک کی بات دوسرے کی سمجھ سے باہر ہو جائے گی -

بولوں کے ساتھ ساتھ یہاں محاوروں کا ذکر بھی ضروری ہے جو کبھی کبھی بہت بے تکے لگتے ہیں اور کوئی نہ کوئی منچلا کہہ اٹھتا ہے کہ محاورے اور اس کے معنی کا تو کوئی جوڑ ہی نہیں ہے - کچھ بھولے لوگوں کی یہ سوچ ہے کہ ہم بہت چتر اور سیانے ہیں اور پچھلے سب کے سب نا سمجھ یا لاپروا تھے جو یوں ہی اوٹ پٹانگ باتیں کہا کرتے تھے - انھوں نے جو بہت سی ان مل بے جوڑ باتیں کی ہیں ، انھی میں محاوروں اور ان کے معنی کو بھی سمجھنا چاہیے - اس سوچ نے ہی ہمیں محاوروں اور ان کے معنی کا کھوج لگانے سے روک رکھا ہے ، نہیں تو محاورے کوئی انوکھی چیز نہیں ہیں - یہ بولوں ہی سے بنتے ہیں ، اس لیے محاوروں سے پہلے ان بولوں کے معنی جان لینے چاہیے ، جن کے ملنے سے محاورے بنتے ہیں اور محاورے مجازی معنی دیتے ہیں پر مجازی معنی سے پہلے ہمیں ان کے حقیقی معنی پر دھیان دینا چاہیے -

اس بات کو سمجھنے کے لیے اردو کا ایک بول "چلّا" لے لیجیے جس سے کئی محاورے بنتے ہیں جیسے چلا چڑھانا ، چلا کھینچنا ، چلا باندھنا - پہلے محاورے میں اس کے معنی تانت ، دوسرے میں لکیر اور تیسرے میں تاگا ہیں اور تانت ، لکیر اور تاگا تینوں میں لمبائی اور سلسلے کا گن پایا جاتا ہے - اس لیے لمبائی یا سلسلہ اس بول کے اصلی اور حقیقی معنی ہیں - بولوں کے ان مجموعوں کے حقیقی معنی ہیں کمان کو کسنے کے لیے اس کے ایک سرے پر تانت چڑھانا ، وظیفہ پڑھنے کے لیے حصار کی لکیریں کھینچنا اور کسی مزار کی جالی یا کٹھہرے میں تاگا باندھنا - ان معنوں میں بولوں کے یہ مجموعے روزمرے کہلائیں گے - دوسری طرف ان کے مجازی معنی ہیں ، نقصان پہنچانے پر آمادہ

ہونا ، گھر میں بیٹھ رہنا اور منت ماننا اور ان معنوں میں بولوں کے بھی مجموعے محاورے کہلائیں گے ۔

ایک ہی معنی دینے والے دو بولوں کو ہم معنی یا مترادف کہتے ہیں ۔ لغت میں بول کے معنی بتانے کے لیے کسی دوسری بولی کا ہم معنی یا مترادف لکھ دینے کا چلن عام ہے اور کبھی کبھی اسی بولی کا کوئی ایسا بول بھی لکھ دیتے ہیں ، جو معنی میں اس سے ملتا ہوا ہوتا ہے ۔ کچھ جان کاروں کا کہنا ہے کہ ایک ہی بولی میں دو بول مترادف نہیں ہوتے ، پر میں ایسا نہیں سمجھتا کیونکہ اردو بولی میں آوازیں بدل کر یا گھٹا بڑھا کر بول کے ایسے روپ بھی بن جاتے ہیں جنھیں بہروپ کہہ سکتے ہیں ۔ جیسے ڈھانکنا اور ڈھانپنا ، لیدی اور لگدی ، ساہو دانہ ور سا گو دانہ ، اون اور نون ۔ مترادف اور بہروپ میں بل یہ ہے کہ مترادف کے معنی تو وہی ہوتے ہیں پر روپ کچھ اور ہوتا ہے ، جب کہ بہروپ کا روپ بھی پہلے بول کے روپ سے ہی بنتا ہے اور یہ کام کچھ اصولوں سے کیا جاتا ہے ، جن میں سے بہت سے میری کتاب "اردو کا روپ" میں دیے جا چکے ہیں ۔ ان اصولوں کا مطلب یہ ہے کہ بول کے معنی بدلے بنا اس کے کتنے ہی بہروپ بن جاتے ہیں ، جن میں سے کچھ تو اردو ہی میں چالو ہیں ۔ کچھ دوسری پڑوسی بولیوں میں بولے جا رہے ہیں اور کچھ ان اصولوں کے سہارے سے نئے بھی بن سکتے ہیں ۔ نیچے میں ان سب کو ایک جگہ لکھے دیتا ہوں ۔

ان اصولوں کو سمجھنے سے پہلے آوازوں کی وہ بھانتیں جان لینا چاہئیں جو اردو میں چالو ہیں ان کی گنتی چار (۴) ہے ۔

۱ ۔ سر (علت جیسے آ ، اے ، آوں اور دوسرے) ۔

۲ ۔ اسر (صحیح جیسے ب ، پ ، ت اور دوسرے) ۔

۳ ۔ غنہ (ں) جولگی سر کا ایک الگ ہوتا ہے ۔

۴ ۔ ہمزہ (ء) جو ایک بے رنگ سا اسر ہے اور سروں کو چلانے کے لیے دوسرے اسروں کی جگہ بولا جاتا ہے ۔ ہمارے بول کے شروع میں اسے الف سے لکھا جاتا ہے ۔

اردو میں سات سادہ اور پانچ نکی سر ہیں - یہ چھ چھ کے دو جتھوں میں یوں بٹے ہوئے ہیں :

(۱) آ ، اے ، آو ، او ، اِیں آیں -
(۲) آو ، ای ، اے ، آں ، اوں ، اوں -

اسی طرح اسروں کے بھی دو الگ الگ جتھے ہیں :

(۱) ب ، بھ ، ته ، ٹھ ، ج ، چھ ، د ، ڈ ، ر ، ڑ ، س ، کھ ، گ ، ل ، ابتدائی ن ، مھ ، درمیانی اور آخری م ، نھ ، و ، ہ ، ی ، ہمزہ -

(۲) بھ ، پ ، ت ، ٹ ، جھ ، چ ، دھ ، ڈھ ، رھ ، ڑھ ، مھ ، ک ، گھ ، لھ ، ابتدائی م ، نھ ، و ، ہ ، ی ، ہمزہ ، درمیانی اور آخری مھ ، ن نھ ، -

ان میں سے رھ اور مھ ہمارے بولوں میں اپنے اصلی روپ میں کہیں دکھائی نہیں دیتے - یہ دونوں ر ، ہ اور س ، ہ میں بٹ گئے ہیں - ان کے ساتھ ساتھ دوسرے مہاپران (بھاری آوازیں) بھی کہیں کہیں دو دو آوازوں میں بٹے ہوئے نظر آتے ہیں -

ان کو چھوڑ کر عربی فارسی کی جو آوازیں اردو میں آ گئی ہیں وہ یہ ہیں :

ٹیٹھ عربی : ث ، ح ، ص ، ض ، ط ، ظ ، ع ، ق -
ٹیٹھ فارسی ژ -
ٹیٹھ عربی اور ٹیٹھ فارسی : خ ، ذ ، ز ، ش ، غ ، ف -

یہ آوازیں عربی فارسی کے بولوں کے ساتھ اردو میں آئی ہیں اور انھیں بولوں میں بولی جاتی ہیں - یہ بدیسی آوازیں اردو کی آوازوں سے یوں بدل جاتی ہیں :

عربی فارسی	اردو
ث ، ص ، ش	س
، ز ذ ، ض ، ظ	ج

ح	ہ
خ	ک ، کھ
ط	ت
ع	ہمزہ (ء)
غ	گ
ف	پ ، پھ
ق	ک

اردو کے ان پڑھ یا کم پڑھے لکھے لوگ عربی فارسی کی ان آوازوں کی جگہ بدیسی بولوں میں اردو کی آوازیں بولنے لگتے ہیں اور پڑھے لکھے نہ یہ کہ عربی فارسی کی آوازیں ٹھیک بول لیتے ہیں ، بلکہ اردو کے بولوں میں بھی دیسی آوازوں کی جگہ عربی فارسی کی آوازیں بول اٹھتے ہیں - یہی کارن ہے کہ اردو کے بہت سے بول بدیسی لگنے لگے ہیں جیسے غپ (گپ) غچا (گچا) ، شفتل (سہتل) ، شوربا (سوربا) ، ذرا (جرا) اور دوسرے -

اب میں اردو کی آوازوں کے کچھ اصول نیچے لکھتا ہوں :

(۱) م ، مھ ، ن ، نھ سے پہلے اے اور او کے سر نہیں بولے جاتے -

(۲) ک ، کھ ، گ ، گھ سے پہلے آنے والے نون اور غنہ کے بل کی جانچ بول چال میں آنے والے ان کے وزن سے ہوتی ہے جیسے کنگنی میں کاف کے بعد غنہ اور کنگورا میں نون بولا جاتا ہے - یہاں اردو کی لکھاوٹ پر اس لیے بھروسہ نہیں کیا جا سکتا کہ دونوں بولوں میں غنہ اور نون دونوں ہی کے لیے نقطہ کام میں لایا گیا ہے -

(۳) آوازوں کی بدلائی اکہری بھی ہوتی ہے اور دہری اور تہری بھی - کبھی کسی بول کی خالی ایک ہی آواز بدلی جاتی ہے ، جیسے ڈھالکنا اور ڈھانپنا ، گھوڑا اور موڑا ، کبھی دو جیسے سیدھا اور ساد! ، گاڑھا اور گھر! ، گھلنا اور گلنا اور کبھی

تین جیسے بھرکی اور بنگی ، وردی اور باتی (پہناوا ، لباس) ۔

(۴) اوپر دیے ہوئے ہر جتھے کی آوازیں اسی جتھے کی دوسری آوازوں سے بے تکان بدل جاتی ہیں ، جیسے ڈھالک اور ڈھانپ ، چلتر اور چرتر ، اکھاڑ اور اکھیڑ ، اچال اور اچیل ، چوک اور چاک ، ڈلا اور ڈیلا ۔

(۵) ایک ہی سر کے چھوٹے بڑے روپ آپس میں آسانی سے بدل جاتے ہیں جیسے ، دب اور داب ، چم اور چوم ۔

(۶) غنہ جونکہ سر کا ایک انگ ہوتا ہے ، پہلے جتھے کے اسر (ر، ل اور دوسرے) اور دوسرے جتھے کے سر سے بدل سکتا ہے جیسے آں آم ، لنگڑانا لڑکھڑانا ، بانگ برگ (حد ، دیوار، ضلع) ، کونچا کوچا ، کیک کونک ، بکا بانکا ، مہکا ماں کا ۔

(۷) ایک جتھے کے سر کو دوسرے جتھے کے سر سے بدلنے کے لیے اس کے بعد ہمزہ یا پہلے جتھے کا ایک اسر بڑھانا پڑتا ہے جیسے کالا کوئلا ، اوٹنا الٹنا ، اوکنا ابکنا ، لو لیو ، دو دیو ، ریوڑی روڑی، بوتا برتا بولتا ، کرتی کوٹی ، گلٹی گٹی ، چیتا چتلا ، بلٹی بیٹی ۔

(۸) ایک جتھے کے اسر کو دوسرے جتھے کے اسر سے بدلنے کے لیے اس سے پہلے غنہ لگانا پڑتا ہے جیسے بھاڑ بھالک ، ہل بالک ، لچھ لالچ (عیب) ۔ اس اصول کو یوں بھی بیان کیا کیا جا سکتا ہے کہ ایک جتھے کے اسر کو دوسرے جتھے کے اسر سے بدلتے وقت اس سے پہلے کے سادہ سر کو لگی سر سے بدلنا پڑتا ہے ۔

(۹) دوسرے جتھے کا اسر پہلے جتھے کے دو اسروں سے یا ایک اسر اور غنہ سے بدل جاتا ہے جیسے چوک چورس ، گٹوٹی گٹھلی، گیارہ گیارس ، جاک چاند ، بھاک بھالا (گھاتا) ، اردا

آٹا، پاٹ پتھر، کردا کاڑھا کاٹا (نکالا ہوا)، ابھی اباری (ابارہی)، سبھی سبری ، ساجھا ساڑا ، کٹی کوٹھری ، کٹیا کٹھریا ، پردا پٹا (پاٹا) ، آگھانا آگلانا (وصول کرنا) ، سان مانڈ -

(۱۰) پہلے جتھے کا سر دوسرے جتھے کے ایک اسر (پ ، ت اور دوسرے) سے بدل جاتا ہے جیسے لو لاٹ لٹ ، لوکی لٹکی اور اپر (اوپر) ، بورا باپڑا ، لوٹنا لپٹنا ، کپڑی کوڑی ، چپڑاس چوڑاس ، چیترنگ چوڑنگ، کوٹ کپٹ ، چھینٹ چپٹ -

(۱۱) دوسرے جتھے کا سر پہلے جتھے کے اسر (ر، ل اور دوسرے) سے بدل جاتا ہے ، جیسے ایسا اس سا ، گیسا کس سا ، بیر بدل ، سیل سگل (شغل ، تفریح) ، گیر گتھر ، جیتا جا گتا -

(۱۲) دوسرے جتھے کے دو لگا تار اسر ، پہلے جتھے کے دو لگا تار اسروں سے بدل جاتے ہیں ، جیسے بھک باس ، اپھنا آسرنا ، اپت ابال ، گھات کار (گڑھا) ، دھاک داب (رعب) ، کوٹ گول ، پوت پھول ، (۱) ٹک تھوڑ (تھوڑا) ، کُوپ کُھول (خول) ، گھٹنا گنا گرنا ، پٹ پھیر ، سوکٹ سوکھر (خشک سالی) -

(۱۳) او کا سر او سے اور اے کا سر آئے سے بدل جاتا ہے ، جیسے بوری باوری (باولی) ، بوتی باوتی (تخم ریزی) ، کھلونا کھلاونا ، بچھونا بچھاونا ، گھنونا گھناونا، ہے ہے ہائے ہائے ، پائجامہ پیجامہ ، پاخانہ پیخانہ ، انگریزی فائر اردو فیر ، لائن لین -

(۱۴) ایں کا سر آئیں سے اور اوں کا سر آوں سے بدل جاتا ہے ، جیسے چیں چیں چائیں چائیں ، ہیں ہیں ہائیں ہائیں ، گوں گاوں، بھولرا بھانورا ، جھونری جھانوری -

(۱۵) پہلے جتھے کا سر آیں یا آئیں نون (آں) سے اور دوسرے جتھے

---

۱ - یہ بول رگ وید میں بھی انہیں معنوی میں آیا ہے -

کا سر آوں یا آؤں میم (اَم) سے بھی بدل جاتا ہے جیسے مَیں
ہریانی من (واحد متکلم) ، گینڈا گنڈا ، مینٹی منٹی ۔ دائیں
دن (ایک، آواز)۔ ٹھائیں ٹھائیں ٹھن ٹھن ، چھائیں جھائیں جھن
جھن ، سائیں سائیں سن سن، چونکنا چمکنا، لونڈا لمڈا ، بونکنا
بمکنا ۔

(۱۶) پہلے جتھے کا مہاپران (بھاری آواز) دو الپ پرانوں (ہلکی
آوازوں) سے بدل جاتا ہے ، جن میں سے ایک پہلے جتھے کا اور
دوسرا دوسرے جتھے کا ہوتا ہے جیسے کھار کسار (سنسکرت
کشار) ، ہاتھ ہست ، ہاتھی ہتی ، متھی متلی ، سوکھا سکڑا،
جاکھن جکڑن ، مکھن مسکن (مسکا) ، پھاڑ پسار ، تھالی
تسلی (تشلی) ، گُھبا گُبلا (گُوبلا) ، کُوٹھا کوٹلا ،
کوٹھی کوٹلی ، باتھی پتلی ، کاٹھی کستی یا دوسرے جتھے
کے ایک الپ پران (ہلکی آواز) اور ایک غنہ سے بدل جاتا ہے،
جیسے اچھال اونچال ، لچھ لانچ ، آٹھ آنٹ یا دوسرے جتھے
کے ایک الپ پران (ہلکی آواز) اور دوسرے بتی جتھے کے
ایک سر سے بدل جاتا ہے جیسے رکھ روک ، لچھ لوچ ،
سوٹا مٹھا ۔

(۱۷) دوسرے جتھے کا مہاپران (بھاری آواز) پہلے جتھے کے دو
الپ پرانوں (ہلکی آوازوں) سے بدل جاتا ہے جن میں سے ایک
اسی مہاپران (بھاری آواز) کا ایک انگ ہوتا ہے ، جیسے
ابھی اباری (ابارہی)، کبھی کباری (کبارہی) ، کُبھ کوبڑ ،
سوجھ سورج (روشنی) ، جھال جلال (تیزی ، ہانی کی چادر یا
دھار) ، دھار درار (ڈراڑ) دسار ، دھاک دباک ، رادھا لاڈلا ،
ڈھانا ڈگانا ، ڈھابا دڑیا ، گیارھا گیارسا ، چودھا چودسا ،
باڑھ برس (بہاؤ) ، کاڑھا کردا ، گاڑھا گدلا ، پگھا پا گرا
(رسی) ، کنگھا کنگر (دندانے دار) ، آ گھانا اُ گلانا (وصول
کرنا) ، دولھا دلڑا ، کُلھیا کلسیا ۔

(۱۸) ایک جتھے کے سر کو دوسرے جتھے کے سر سے بدلتے وقت پہلے جتھے کا ایک اسر آخر میں بڑھا دیتے ہیں جیسے گولر گول ، گھوڑا گھوسرا ، چہل چلر (چلانے والی) چیلا چلرا[1] (ایک قسم کی روٹی) ، چوچی چونچڑی ، کوچی کونچڑی (کونچنے والی) ، چیتا چتلا ، تتلی تیتی ، ہوٹی ہتلی ، ہوٹا ہتلا، گپا گپلا (گدوہلا) ، کپا کپلا (گدوہلا) ۔

(۱۹) بول کی آوازیں الٹ کر بھی روپ بدلا جا سکتا ہے ، جیسے کھوکا کوکھا (خالی) ، چغلا غچلا ، چکری ، چرک (چرخی) ، بدلا بلدا (واپسی) ، کور روک ، چلتی چتری (ہوشیار ، تیز) ، کھونٹنا ٹھونکنا ، چوسر چورس چوڑس ، اردو نار پنجابی رن (عورت) ، ٹال لاٹ (بلندی) ۔ اردو ڈونٹھ پنجابی ٹھنڈ ، سار رس (نچوڑ) ، رال برج بھاشا لار ، نام مان (عزّت) ، لوگ گول (مجمع ، غول) ، لٹالنا لٹلانا ، بٹھالنا بٹھلانا ، متلی ملتی (مالش ، ابکائی) ، کاٹنا ٹانکنا ، پانھنا تھاپنا ، گڑھل پنجابی گلٹھڑ ، گونچنا چونکنا ، ڈالنا لادنا ، دونکنا کوندنا ، ڈوبنا بوڑنا ، سانکنا کانسنا (جوڑنا) ، گلنا لگنا ۔

(۲۰) جس اثر پر دہراٹ (تشدید) ہو اس سے پہلے کے چھوٹے سر کو بڑے سر سے بدل کر دہراٹ (تشدید) دور کی جا سکتی ہے ۔ اس عمل کو تسہیل کہتے ہیں ، جیسے پتّھر پاتھر ، مکّھن ماکھن ، سجّنا سانجنا ۔

(۲۱) دہراٹ دور کرتے وقت پہلے جتھے کے اسر سے پہلے کا زبر آ سے، اے سے اور پیش او سے بدل جاتا ہے جیسے چلّو چالو ، کتّھا کاتھا ، متّھا ماتھا، بِلّا بیلا، گِلّی گیلی ، سِلّی سیلی، سِری سوڑی ، گُلّا گولا ۔

(۲۲) دہراٹ ہٹاتے وقت دوسرے جتھے کے اسر سے پہلے کا زبر آں

---

۱ ۔ تلگو میں روٹی کو چلّر کہتے ہیں ۔

سے ، زبر ای سے اور پیش آو سے بدل جاتا ہے جیسے کپا کانپا ، بٹا بانٹنا ، بھکو بھیکو ، بھچی بھیچی ، سپی سیپی ، چکّٹ چیکٹ ، کپّی کوپی ، بچی بوچی ، کٹّی کوٹی ، بلھا بوڑھا ۔

(۲۳) مشدد رے اکھرے ڑ سے بدل جاتی ہے کیونکہ ڑ اور ڑھ پر تشدید نہیں آتی ، یعنی یہ آوازیں دہرائی نہیں جاتیں ، جیسے کرّا کڑا ، مُرّی مڑی ، سرّی سڑی ۔

(۲۴) مشدد (دہرائی ہوئی) میم دوسرے جتھے کے ایک اسر یا پہلے جتھے کے دو اسروں کے برابر ہوتی ہے ، جیسے کمّل کمبل ، سمّت سمبت ، چمّک چمبک ، گمّد گمبد ، چمّا ، چمڈا ڈھا ڈھمرا (ڈھیلا) ڈھیرا ۔

(۲۵) مشدّد (دہرایا ہوا) نون پہلے جتھے کے ایک اسر کے برابر ہوتا ہے ، جیسے کھنّا کھورا (کھورنے والا) ، کنّی کرنی ، انّا ارنا ، چھنّی چھلنی ، منّا منڈا ، کھنّی کھرنی ۔ سنّی سیرنی (شیرنی ، مٹھائی) ، گھنّی گھرنی (دوران سر) برنی برج بھاشا ہنی ۔

(۲۶) کبھی کبھی پورا لگ (رکن) دو بار بولنے سے بھی تشدید دور ہو جاتی ہے ، جیسے بھُرّا بھر بھرا ، تُلّی تلتلی ، سرّی سڑّی سر سری ، ڈھلا ڈھلّ ڈھیلا ، کرّا کر کرا ، بھرّانا بھر بھرانا ، بھڑ بھڑانا ، چرّانا چر چرانا ۔

(۲۷) دوسری جڑ (مادّہ) بنانے کو پہلی جڑ پر جو کاف بڑھایا جاتا ہے ، وہ بھی دہراٹ (تشدید) کے معنی دیتا ہے جیسے بھڑکنا بھڑ بھڑانا ، بھڑکنا بھڑ بھڑانا ، چھکنا چھچھانا ۔ چلکنا چلچلانا ، سرکنا سرسرانا اور کبھی کبھی یہ کاف فالتو بھی ہوتا ہے جیسے دم دمک ، چم چمک ، بھڑ بھڑک ، اس کے بڑھانے سے معنی میں کوئی بل نہیں آتا ۔

(۲۸) اصول نمبر ۱۶ اور ۱۹ کو ملا کر بھی جو حروف بنتے ہیں ، ان سے بھی دہراٹ (تشدید) دور ہو جاتی ہے جیسے پتّی پتلی پتری ، پتّا پتلا ، چتّی چتلی (چتری ، اژدہا) ، بکّا بکڑا ، بکّی بکلی ، چکّی چکری چکلی ، چھتّی چھتری چتّی چتلی چیلی (کھڑاؤں) ۔

(۲۹) پہلے جتھے کا مشدد اسر دوسرے جتھے کے مشدد اسر سے بدل جاتا ہے ، جیسے گپّا گپّا ، بھبّس بھبس ، بھاّ بھاّ ، پٹّھا پٹّھا (لمبے بال) ، گدّا گدّھا ، کتّا کتّھا (سخت) ، مدّھا مدّا ۔

(۳۰) ہائے ہوز جب درمیان میں آتی ہے ، تو کبھی او اور کبھی اے کا سر ظاہر کرتی ہے ، یعنی اَو کا سر اَوہ سے اور آے کا سر آیہ سے بدل جاتا ہے جیسے بہنی بوہنی بوئی ، کہنی کوہنی کونی ، کہرا کورا ، بہت بوت ، چہل چول ، پہرا پھرا ، ٹھہرنا ٹھیرنا ، بہنگ بینگ ، مہنگی مینگی ، مہندی مینڈی ۔

(۳۱) سروں اور اسروں کے درمیان نیچے لکھی بدلائیاں بھی ہوتی ہیں :

آو=ارو ، اڑو ، الو جیسے آو آو (بدزیب ، نا موزوں) اڑو اڑو ، کٹو (کڑی لکڑی کا ایک پیڑ) کڑو ، بنو (بہو) بسو ، بنٹھو ، لٹو (لہو) لالو ۔

اوا=اَورا ، آوڑا ، آولا ، اونا ، آوندا جیسے گھروا گھروندا ، کلوا کلونسا ، گھنوا گھنونا ، اڑوا اڑیلا ، ہوا ہورا پنجابی ہو ہا ۔

اوّا=اروا ، اڑوا ، الوا جیسے (دکھوا ، دکھلاوا ، جھوّا جھالوا جھاڑوا ، کوّا کلوا کا گوا ، ہوّا ہا ہوا ، ہا لوا ، ہو لوا ، نوّا ناروا نالوا ، دھوّا دھاڑوا (پیغام بر) ، چوا چوڑوا ، سوّا (سہوا) مالوا ، ہوا ہاروا ۔

ای=آری ، آڑ ، آل ، ایر ، ایڑ ، ایل جیسے بنجی بنجار (تجارت کا کام) ، کھلاڑ کھیلی ، روگی روگل ، ہونڈی ہنڈیل ، سردی سردار ، بی بیل (آگے بڑھانا) ، گھنٹی گھنٹال ۔

ائی=اری اڑی ، الی جیسے بنی بڑی ، بنی بلی (بالی) ، ڈمئی دھری دھڑی ، تھئی تھلی ، چمبئی چماری ، چکئی چکری ، دلگئی دلگلی ، منی مری مڑھی[1] ۔

ایا=ارا ، اڑا ، الا جیسے بنجیا بنجارا (بنیا) ، کیا کرا ، لاہوریا لاہورالا (لاہور والا) ٹھیا ٹھارا ٹھورا ۔

ایّا=اریا ، اڑیا ، الیا جیسے لیّا لڑیا ، کیّا کوڑیا ، ڈھیّا دھڑیا ، نیّا ناریا ، دھیّا دھلیا دہلیا ، لکویّا لکوریا ، میّا ماریا مانا ماڑیا ، بھیا بھاریا بھاتا بھتریا ، پیا پاڑیا پیلیا ۔

(۳۲) بول میں دوسرے جتھے کا کوئی اسر گھٹانے یا بڑھانے سے معنی میں کوئی بل نہیں پڑتا ، اس لیے اسے گھٹا بڑھا کر بھی بہروپ بن جاتے ہیں جیسے جڑنا جکڑنا ، اڑنا اکڑنا ، ٹیلا ٹیکرا ، چھورا چھوکرا ، ٹوکرا ٹولا (ٹولنے والا) ۔ پیلا پیتلا چوڑی چکلی ، چترنگ چورنگ چوڑنگ ، اکڑوں اڑوں ، پلٹو پٹلو ، پٹلا پیٹ لا ، کاکریجی کلیجی (رنگ) ۔ بلیتھن لیتھن ، لیسی لسی (لس والی) ۔

(۳۳) کچھ بولوں کا ابتدائی الف (=آ ۔ آو جو دوسرے جتھے کے ایک اسر کے برابر ہوتا ہے) ، بھی گھٹا بڑھا کر بہروپ بنا لیتے ہیں جیسے کڑا اکڑا ، کال اکال (قحط) ، ناج اناج ، دھیلا ادھیلا ، دھیلی ادھیلی (اٹھنی) ، لوپ الوپ (غائب) ۔ کاس آکاس (آسمان) ، ڈھائی اڑھائی ، لبیٹا البیٹا ، چھوت اچھوت ، بھار ابھار (بھلاڑ ۔ پھول) ۔ در آدر (قدر ۔ احترام) ، لنگ

---

[1] یوپی (بھارت) میں بہت سی بستیوں کے نام آخری ٹکڑا منی ہوتا ہے جیسے دھرمنی (مین پوری) ۔

اٹنگ ، کھلنا اکھرنا ، جی اجی ، رے ارے ، ری اری ، تھا اتھا[1] ، ہے اہے[2] ، ای آئی[3] نی آئی[4] پڑنا اپڑنا ، بھرنا ابھرنا ، بٹنا اپٹنا (غازہ) ، اردو اچھال پنجابی چھال ، لانگنا الانگنا ، لوٹنا الٹنا -

(۳۴) پہلے جتھے سے دو اسر (جو دوسرے جتھے کے ایک اسر کے برابر ہوتے ہیں) ، گھٹا بڑھا کر بھی بھروپ بنا لیتے ہیں جیسے کنگلا کالا (کال کا مارا) دھندلکا دھول کا ، چندراتا چراتا (چلاتا) - بھورا بھونبرا (بھنا ہوا) ، بنگڑی بنگلی بالی (چوڑی) ، جنگلا جالا (جال کا کٹہرا) ، اپلے گھپلے (آپلے گیلے اپنڈلے گینڈلے -

(۳۵) آخری آ - اے اور او کے پیچھے پہلے جتھے کا ایک اسر بڑھا کر بھروپ بنا لیتے ہیں اور پھر دہری بدلائی سے اس کے اور بھروپ بھی بن جاتے ہیں ، جیسے میانی ملانی ، کیاری کیداری (سنسکرت کیدار کا) نیارا نرالا ، پیار پلار ، پتیار ، پلانا برج بھاشا پیانو ، جوارا جگارا ، دوار ڈلار ، سلانا برج بھاشا سوانو ، چھوانا چھلانا ، پیاس پلاس سنسکرت پپاس ، بیالیس پنجابی بتالیس ، چھیالیس پنجابی چھتالیس ، پیالا پینالا (پینے والا) ، پانا پپٹنا ، ڈھانا ڈھانا ڈھیرنا ، گانا گیتنا ، لانا لارنا ریلنا ، چھانا چھاجنا چھترنا ، یہی وجہ ہے کہ ان سروں پر ختم ہونے والی جڑوں کے حالیہ تمام 'آ' کی جگہ یا بڑھانے سے بنتے ہیں جیسے لایا ، سویا اور دوسرے -

(۳۶) پچھ لگوے (لاحقے) ملے ہوئے بولوں سے بھی اک ڈال بھروپ بن جاتے ہیں - نیچے ان کی کچھ مثالیں دی جاتی ہیں -

---

۱،۲- دوسری بولیوں جیسے دکنی وغیرہ میں بولا جاتا ہے -

۳،۴- مونث کے پچھ لگوے (لاحقے) جیسے گرمی گرمائی ، نرمی نرمائی ، سرخی سرخائی ، موری ، اونٹنی ، شیخانی ، سیدانی -

بول	جڑ	پچھ لگوا (لاحقہ)	بھروپ
کھنڈت	کھنڈ	آت	کھوٹ (خرابی)
پنگت	پنگ	آت	پانت (قطار)
پسار	پس (پھیلاؤ)	آر	پھاڑ (لمبائی)
نگل	نگ	ال	نہل (پڑپ)

آوازیں بدلنے یا گھٹانے بڑھانے کے جو اصول اوپر دیئے گئے ہیں۔ ان کو سامنے رکھ کر بولوں کے بھروپ بنانے یا گھڑنے کا ڈھنگ سمجھنے کے لیے "ڈپٹ" کی مثال کو لیجیے جو ڈ، غنہ پ اور ٹ سے مل کر بنا ہے - اس بول کے پہلے چھوٹے سر اکو لمبے سر آ سے بدلا، (اصول نمبر ۵) اور پھر اس کا ایک اسر گرا دیا (اصول نمبر ۳۲) تو ڈانٹ بن گیا - اسی بول کا ایک اور بھروپ بنانے کے لیے اس کے پہلے سر اکو آ کی جگہ او سے (اصول نمبر۴) اور غنہ کو ڑ سے (اصول نمبر۶) بدل کر اس کے دو اسر پ اور ٹ گرا دیے (اصول نمبر ۳۲) تو دوڑ کا بول ہاتھ آ گیا - یوں ڈانٹ اور دوڑ اس کے دو بھروپ بن گئے، جو اردو میں ہی بولے جاتے ہیں - ہماری بول چال میں ڈپٹنا ڈانٹنے کے لیے اور ڈپٹانا دوڑانے کے لیے عام طور پر کام آتا ہے۔

آوازوں کے انھیں اصولوں کی مدد سے پتا چلتا ہے کہ جس طرح اردو میں آوازوں (سروں اور اسروں) کی دو دو بھانتیں ہیں اور ہر بھانت میں دو الگ الگ جتھے ہیں - اسی طرح معنی کے بھی دو الگ الگ تھوک ہیں اور ہر تھوک میں کتنے ہی معنی اکٹھے ہو گئے ہیں۔ مثال کے لیے دوسرے جتھے کے اسر سے شروع ہونے والے ایسے بول لے لیجیے۔ جو تین تین آوازوں کے ملنے سے بنے ہیں - ان کی چار بھانتیں ہو سکتی ہیں - یہ ہندسے آوازوں کے جتھوں کے نمبر ہیں۔

۱ - اسر۲ + سر۱ + اسر۱ جیسے چال، پھنڈ۔

۲ - اسر۲ + سر۲ + اسر۱ جیسے کُھل (کھول) کُور، مونڈ۔

۳ - اسر + سر + اسر جیسے گھٹ (گھٹنا) ، کان ، مینج ۔

۴ - اسر + سر + اسر جیسے چُوٹ ، پُوٹ ۔

ان میں سے پہلی اور چوتھی بھانتیں دہری بدلائی سے ایک ہو جاتی ہیں جیسے چال اور چُوٹ (دھوکا) پینڈ اور پُوٹ (ڈھیر) ، جھولا اور جھوٹا (پینگ) ، بھالا اور بھونکا (بھونکنے کا ، نیزہ) ۔ اسی طرح دوسری بھانت بھی تیسری بھانت سے بدل جاتی ہے جیسے گھٹنا اور گھٹنا (کم ہونا) ، کور اور کان (سرا) سوند اور مینج (بند) ، یوں ان چار بھانتوں کی جگہ بس پہلی دو بھانتیں ہی بچ رہتی ہیں جن کے معنی میں بل ملتا ہے ۔ نیچے ان کی مثالیں دی جاتی ہیں ۔

(ملاحظہ فرمائیے صفحہ ۱۴۲)

پہلی بہالت

معنی	سلسلہ ، خط مستقیم (لمبائی ، چوڑائی ، اونچائی)	دائرہ	حرکت	وزن یا بھراؤ
مثالیں	چیر (دیوار) ، تاڑ ، پاڑ (بلندی) ، دھار ، تار (لمبائی) ، چوڑا (چوڑائی) -	گل ، گانج ، گھیر ، گھوم	چال ، جھول ، ہال	بھار ، بار ، ڈھیر

دوسری بہالت

معنی	سرا	خم	سستی	ہلکا پن
مثالیں	کُھور	چاند ، بانس (پہسل) ، موڑ	ڈھیل ، چُور ماند	سول ، کانس

اب پہلے جتھے کے اسر سے شروع ہونے والے ایسے بول لیجیے جو تین تین آوازوں سے بنے ہیں - ان کی بھی چار بھانتیں ہو سکتی ہیں -

۱ ۱ ۱
۱ - اسر + سر + اسر جیسے ہل ، ٹھیل -

۱ ۲ ۱
۲ - اسر + سر + اسر جیسے گول (گانٹھ) ، بھُول -

۱ ۱ ۲
۳ - اسر + سر + اسر جیسے گت ، بات -

۱ ۲ ۲
۴ - اسر + سر + اسر جیسے بانک ، ٹھونک -

یہاں بھی دہری بدلاؤ سے چوتھی بھانت پہلی میں اور تیسری بھانت دوسری میں سما جاتی ہے اور یوں چار بھانتوں کی جگہ بس پہلی دو بھانتیں ہی رہ جاتی ہیں ، جن کے معنی الگ الگ ہیں - نیچے ان کی مثالیں دی جاتی ہیں -

(ملاحظہ فرمائیے صفحہ ۱۴۴)

پهرين حالت

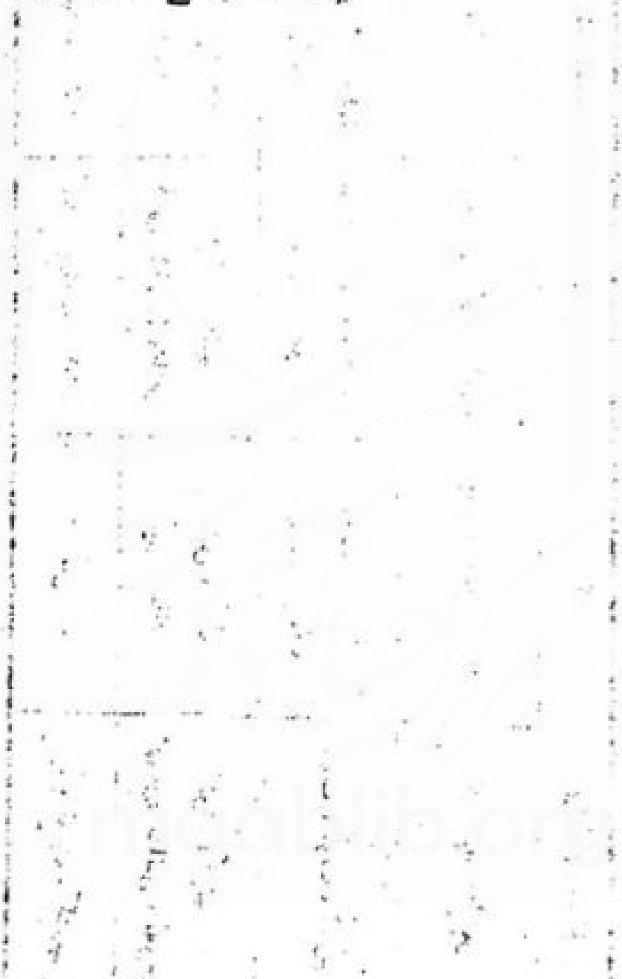
معني	سِرا	خم	سُستي	هلڪا پن
مثالي	ٻير	ٻل ، ٻهير ، داس (دراتي) ٻهنڊ	ٿهس ، ٻاد	ٻهول ، ٻهوس

دوسري حالت

معني	خط مستقيم ، سلسله	دائره	حرڪت	وزن يا ٻهراؤ
مثالي	ڏور ، ٻهيل ، ٻهاند ، دانگ (سمت ، ديوار) ، لانب	گول ، ڪاٺهه ، ٻهانس (۱) کهول (خول)	ساند ، ٽير ، ٽيل ، برج ٻهاڻا گِل	ٽوند ، لوٽو ، ٿهوس ، ٿهونس ، ٿهانس -

اب دوسرے جتھے کے اسر سے شروع ہونے والے بولوں کو پہلے جتھے کے اسر سے شروع ہونے والے بولوں سے ملا کر دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ یہ آپس میں بدل جاتے ہیں اور ان میں معنی کے بس دو ہی تھوک پائے جاتے ہیں - یہ بات نیچے دیے ہوئے نقشے سے اچھی طرح سمجھ میں آجائے گی جس میں ان کی تیسری اور چوتھی بھانتوں کے بیروپ بھی دیے گئے ہیں -

(ملاحظہ فرمائیے صفحہ ۱۳۶-۱۳۷)



معنی کا پہلا تھوک

معنی	خط مستقیم سلسلہ	دائرہ	حرکت	وزن یا بھراؤ
دوسرے جتھے کے امر سے شروع ہونے والے بول	چر ، باڑ ، تاڑ ، تار	کل، کاج، گھیر، گھوم	چال ، جھول ، ہال	بھار ، ہار ، ڈھیر
چوتھی بھانت کے بہروپ	چڑھ ، چوٹ (چوٹی) ہانت ، تانت	کوٹ ، کوپ ، کانچ ، گھونٹ ، گھوٹ	چونک ، جھونٹ چھوٹ ، ہانک	بُھوپ ، ہُوٹ ، ڈُھوپ
پہلے جتھے کے امر سے شروع ہونے والے بول	ڈور ـ بھیل پھاند لانب ، دانگ	گول ، کانٹھ کھول (خول) پھانس	کیَل ، تیَل تیَر ، سانڈ	لوند ، لُوتھ ٹھوس، ٹھانس ، ٹھوس
تیسری بھانت کے بہروپ	ڈاک ، پھینک ، لاٹ	گات ، پھننٹ ، گینٹ	تَن	لیپ ، ٹھیٹ ، کھیپ

معنی کا دوسرا لھوک

معنی	سرا	خم ، ہلال	سُستی	ہلکا پن
دوسرے جتھے کے اسر سے شروع ہونے والے بول	کُور ، کہل	چاند ، بانس ، مُوڑ - جھول	ڈھیل ، چور ، ماند	بُول ، بِس (ا) ، کانس
تیسری بھانت کے بہروپ	کان	جاک ، بک ، مکّ (ا)	مات	بات
پہلے جتھے کے اسر سے شروع ہونے والے بول	سِر	بل ، بینڈ، پھیر، داس	تھس ، باد	بھول ، بھوس
چوتھی بھانت کے بہروپ	سُوت	بانک ، بھانک ، ڈوک (ڈوکر)	تھپّ ، بوجھ	بھونک ، پھیں

ان مثالوں سے یہ بات پکی ہو جاتی ہے کہ اردو کے سب کے سب بول معنی کے دو تھوکوں میں بٹے ہوتے ہیں اور یہ تھوک آوازوں کی بانٹ پر بنائے گئے ہیں ، جیسے ڈھانپ (ڈھانپنا) اور ڈھانک جو معنی کے ایک ہی تھوک میں ہیں کیوں کہ ان کی آخری آوازیں (پ ، ٹ ، ک) اسروں کے دوسرے جتھے میں گنی جاتی ہیں - آوازوں کی بانٹ اور بدلائی سے ان کا چوتھا بھروپ ڈھانچ بھی بنتا ہے کیوں کہ "چ" بھی اسروں کے دوسرے جتھے ہی کی آواز ہے - پر یہ بول اردو بول چال میں ان تینوں سے الگ معنی دیتا ہے - اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہر تھوک میں معنوں کی اور بھی بانٹیں کی گئی ہیں - ایک اور مثال لیجیے - ت ، ٹ ، چ ، جھ اور ڑھ ایک ہی جتھے کے اسر ہیں اور آپس میں بدل سکتے ہیں - اس لیے ان کو بدل بدل کر کئی بھروپ بنائے جا سکتے ہیں - پر بول چال میں ان سے بننے والے بول الگ الگ معنی دیتے ہیں جیسے بوتا (طاقت) بوٹا (چھوٹا پودا) بوچا (کن کٹا کتا) ، بوجھا (سمجھ دار ، سمجھا) بوڑھا (ضعیف ، کہن سال) اور یوں معنی کا ایک تھوک اور بہت سے معنوں میں بٹ جاتا ہے - اس لیے ان کے بھروپ آوازوں کی دوسری بدلائیوں سے بنانے پڑتے ہیں -

اس پوری بات چیت سے اتنا تو پتہ چل گیا کہ بول بننے سے پہلے آوازوں کی بانٹ ہو چکی تھی - چیزوں کے ملان سے ان کے گنوں اور کیفیتوں کی جانچ ہو چکی تھی اور ان کے آپس کے ناتے بھی ٹھیر چکے تھے - پھر اگ لگوتے (سابقے) اور پچھ لگوے (لاحقے) لگ لگ کر بولوں سے اور بول بنتے رہے - ان کی گنتی بڑھتی رہی اور معنی میں پھیلاؤ آتا چلا گیا - پر یہ بات ابھی تک نہیں کھل پائی ہے کہ پہلے پہل کسی ایک معنی کے لیے ایک بول کس طرح گھڑا گیا ، یعنی کس معنی کے لیے وہی بول کیوں بنایا گیا جس سے وہ چپکایا گیا ہے - مثال کے لیے ایک بول "ڈھکنی" لے لیجیے جس کے معنی ڈھانکنے کی چیز کے ہیں - یہ بات تو سمجھ میں آ جاتی ہے کہ یہ بول ڈھانک (اڑھانا ، اڑھاؤ) پر سونث کی پہچان "نی" چپکانے سے بن گیا ہے - پر یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کی جڑ یا مادہ "ڈھانک" کو پہلے پہل اس کے معنی "اڑھاؤ"

سے کیوں جوڑا گیا ۔ اس کیفیت اور اس بول میں وہ کون سی ملتی جلتی بات تھی جس سے اس معنی کے لیے یہی بول ٹھہرایا گیا اور کسی دوسرے بول جیسے "چل" یا "ٹھہر" اسے نہیں چپکایا گیا ۔

ہر بول کچھ آوازوں کے ملنے سے بنتا ہے ۔ اس لیے کچھ لوگوں کو یہ دھوکا بھی ہوتا ہے کہ بول کی ان آوازوں اور بول کے معنی میں کوئی ملتی ہوئی بات ضرور ہوگی ، پر وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ اکہری آوازوں کے کوئی معنی نہیں ہوتے معنی صرف اس گھڑی شروع ہوتے ہیں ، جب کئی آوازوں کو جوڑ کر بول بنا دیا جاتا ہے ۔ یہاں جنگل کے راجا کی مثال سامنے رکھیے ، جیسے انگریزی میں لائن ، عربی میں اسد ، فارسی میں شیر ، سنسکرت میں سنگھ اور اردو میں باگھ کہتے ہیں ۔ یاد رکھیے کہ یہ بول مترادف ہیں ، بہروپ نہیں ہیں ۔ پھر بھی ہم یہ مانے لیتے ہیں کہ الگ الگ بولیاں بولنے والوں نے اس درندے کے کسی ایک ہی گن (جیسے طاقت) کے لیے الگ الگ نام رکھ دیے ہوں گے ۔ پر یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ان اتنی بہت سی اکہری آوازوں میں بھی جن سے یہ بول بنے ہیں کوئی ایسا قدرتی گن ہو سکتا ہے جو ایک دوسرے قدرتی گن (طاقت) سے میل کھاتا ہو ۔ شیر کو طاقت کا گن خدا نے دیا ہے اور آوازوں کی بانٹ آدمی نے کی ہے اور ان کے مجموعے بھی آدمی نے ہی بنائے ہیں ۔ یہی کارن ہے کہ ایک اکہری آواز طاقت بنانے والے بول میں بھی ملتی ہے اور کمزوری دکھانے والے بول میں بھی سنائی دیتی ہے ، جیسے اردو باگھ (شیر) اور بول (کمزوری بُودا پن) کاب ۔ یہی حال ہر اکہری آواز کا ہے ۔ اردو کے ہر اچھر کی تختی میں ہر بھانت کے معنی کے لیے بول ملتے ہیں ۔ اس لیے اکہری آوازوں کو چیزوں کے کسی گن ، کسی کیفیت یا کسی رشتے ناتے سے نہیں جوڑا جا سکتا ۔

اب آئیے بولوں کی طرف جو اکہری آوازوں کا مجموعہ ہوتے ہیں اور یہ سوچیے کہ جس طرح کچھ قدرتی عناصر کے مل جانے سے ایک گھول تیار ہوتا ہے ۔ جس کی خاصیت کیمیاوی عمل کے کارن ان عناصر کی خاصیتوں سے الگ ہو جاتی ہے ۔ اسی طرح اکہری آوازوں کے ملنے

سے ایک طرف تو بول بن جاتا ہے اور دوسری طرف اس میں وہ کیفیت پیدا ہو جاتی ہے جسے ہم معنی کہتے ہیں ، تو یہ سوچ بھی غلط ہوگی ، کیوں کہ آوازوں میں مادی عناصر کی سی خاصیت نہیں ہوتی - انسان نے ان کی بانٹ اپنے گلے ، جیبھ ، ہونٹ ، تالو اور دانتوں جیسے انگوں کے ناتے سے کی ہے اور ان کے جتھے بھی من کی موج سے بنائے ہیں اور جب یہ مان بھی لیا جائے کہ کچھ خاص آوازوں کے ملنے سے جو ایک بول بنتا ہے اس میں ایک خاص کیفیت آ جاتی ہے جسے معنی کہتے ہیں ، تو پھر یہ بھی ماننا پڑے گا کہ دھرتی کے کونے کونے میں ایک بول کے ایک ہی معنی ہو سکتے ہیں جو نہیں ہیں - اردو میں کوس کا بول دو میل کی دوری کے لیے بولا جاتا ہے اور فارسی میں اس کے معنی نقارے کے ہیں - ہم سیاہ کو کالا کہتے ہیں اور فارسی والے اس سے اسباب مراد لیتے ہیں - اردو میں ڈور کے معنی رسی کے ہیں اور انگریزی میں دروازے کے -

معنی میں اس بل کا کارن یہ ہے کہ جس طرح انسان نے ہر بولی میں اپنے من کی موج سے آوازوں کے جتھے بنائے ان کی بدلائی کے اصول بنائے اور ان کو ملا کر بول بنائے - اسی طرح اس نے اپنے من کی موج سے ان بولوں کو معنی بھی دیے ہیں - جس طرح شیر کو اردو میں باگھ کا نام دیا گیا ، اسی طرح کوئی اور نام جیسے باگ یا راس بھی دیا جا سکتا تھا - بول اور معنی کا ناتا خدا کا نہیں انسان کا جوڑا ہوا ہے اور جو ناتا اس نے ایک بار جوڑ دیا وہ پھر سدا کے لیے جڑ گیا - کیوں کہ بولی من مانی ریت سے بن کر چلی ہے اور چلی جا رہی ہے -

ایسا لگتا ہے کہ اردو میں انسان نے ایک طرف تو آوازوں کو دو جتھوں میں بانٹا اور دوسری طرف معنی کے بھی دو بڑے بڑے تھوک بنا دیے اور پھر یہ بات اس کے لیے بہت سیدھی سادی اور آسان ہو گئی کہ وہ کسی ایک جڑ (مادہ) یا آوازوں کے مجموعے یعنی بول کو کسی ایک تھوک سے چپکا دے - اس کے پیچھے آوازوں کی بدلائی کے سہارے بول سے بول بنانا کوئی بڑی بات نہیں رہی اور بولی پھیلتی اور بڑھتی چلی گئی - اس کو سمجھنے کے لیے ب کی تختی سے بننے والی دو

سادہ ، اکہری اور الگ الگ جڑیں اور ان سے بننے والے کچھ ایسے بول (بہروپ) نیچے دیے جاتے ہیں جن کے معنی تک آپ کی نظر آسانی سے پہنچ سکتی ہے :

(الف) با ۱ ۔ باد (بادل) ، بوجھ ، بوٹ ، بھاپ ۔ ۲ ۔ بال (بالک) ، بانچ (بچ ، بچا) ۔ ۳ ۔ بانک ، بھک ۔

(ب) بو ۔ ۱ ۔ بول ، بات ، باچ ، باک ۔ ۲ ۔ بود (بودا) ، بوند (بوندا) ، بونڈ (بونڈا) ۔ ۳ ۔ بانگ ، بان (بانی) ، بھاس (بھاسا ، بھاشا) ۔

یہ دونوں جڑیں معنی کے دو الگ الگ تھوکوں سے جڑی ہوئی ہیں اور دونوں تھوکوں کو الگ کر کے دکھاتی ہیں ۔ ان جڑوں کو پ کی تختی میں بھی بدلا جا سکتا ہے جو دوسرے جتھے کا اسر ہے ۔ ایسی صورت میں با کا بہروپ پُو اور بُو کا بہروپ پا ہوگا اور پھر پ کی تختی کے بہروپ بنائے جا سکیں گے ۔ یوں ہر اچھسّر کی تختی میں بننے والے بہروپ معنی کے انھیں دو تھوکوں میں بٹ جاتے ہیں ۔

اس پوری بات کا نچوڑ یہ ہے کہ انسان نے سب سے پہلے آوازوں کو سروں اور اسروں میں بانٹا اور اس کام میں سینے گلے ، تالو ، جیبھ ، دانتوں اور ہونٹوں سے کام لیا ۔ اس کے پیچھے وہ مادی سہاروں کے چنگل سے چھوٹ گیا اور آپ خالق بن کر اپنے من کی موج پر چلا ۔ اس نے آوازوں کے دو جتھے بنائے پھر آوازیں جوڑ جوڑ کر بول گھڑنے کے اصول ڈھالے ۔ بولوں کو معنی دیے اور معنی کو دو تھوکوں میں بانٹ دیا ۔ آگے چل کر ان تھوکوں کی اور چھوٹی چھوٹی باتیں ہوتی چلی گئیں اور آج یہ دن آ گیا کہ ایک ایک بول کئی کئی معنی دینے لگا اور کئی کئی معنی کے لیے خالی ایک ہی بول بولا جانے لگا ۔

(مطبوعہ : اردو نامہ ، کراچی مارچ ۱۹۷۵ء)

بول کے معنی

بولی بولوں کی مالا ہوتی ہے اور ہر بول ایک ایسی مانی ہوئی علامت ہے جو کسی سوچ یا چیز کے لیے منہ سے نکلتی ہے - انسان سدا علامتوں میں بات چیت کرتا ہے - ہر علامت آپ کوئی سوچ نہیں ہوتی - سوچ کی طرف ہمارا دھیان پھیرتی ہے جسے اس علامت کے معنی کہتے ہیں اور علامت اور معنی یا بول اور سوچ دونوں ریت کی ڈوری سے بندھے ہوئے ہیں - لکھاوٹ میں ان کی دوری دگنی ہو جاتی ہے کیونکہ لکھا ہوا بول آواز کی اور آواز سوچ کی علامت ہوتی ہے - ہمارا دھیان پہلے لکھاوٹ سے بول اور پھر بول سے سوچ تک سفر کرتا ہے - جب لکھاوٹ کی بھی کوئی اور علامت مان لی جاتی ہے جیسے تار دینے میں ابھر بوندیں اور لکیریں بن جاتے ہیں تو یہ دوری تگنی ہو جاتی ہے اور جب ان بوندوں اور لکیروں کو ڈمی کی چھوٹی بڑی آوازوں میں بدل دیتے ہیں تو دوری چوگنی ہو جاتی ہے مطلب یہ ہے کہ جیسے جیسے علامت کی علامت بنتی رہتی ہے - سوچ سے دوری بڑھتی چلی جاتی ہے اور ڈیل پرچھائیوں کا روپ دھار لیتے ہیں اور پھر پرچھائیاں بھی دھیمے اور بوندیں بن کر رہ جاتی ہیں -

بول میں جادو ہوتا ہے اور یہ جادو بول میں اسی گھڑی داخل ہوا ہے جب پہلی بار بول گھڑا گیا تھا اس لیے جادو کی تاریخ بھی اتنی ہی پرانی ہے جتنی بولوں کی - جادو کا عقل سے نہیں من بھاؤ (جذبات) سے ناتا ہوتا ہے اس لیے ہر آدمی جو اپنے من میں بھاؤ رکھتا ہے (اور بھاؤ سبھی آدمی رکھتے ہیں) بولوں پر مرتا ہے - کچھ لوگ تعویذ گنڈوں پر پورا پورا بھروسا رکھتے ہیں تو کچھ منتر اور افسوں پر اور

منتر[1] اور افسون[2] دونوں منہ سے نکلے ہوئے بول ہی ہوتے ہیں۔ دھرم کی نیو بھی عقل سے زیادہ بھاؤ پر ہوتی ہے۔ اس لیے دھر ماتما لوگ دعائیں اور وظیفے پڑھتے بھجن گاتے اور سمرن پرجاپ کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ افریقہ کے قبیلے اکثر دھرم کاج میں ایسے بول بولتے ہیں جن کے معنی ان کو نہیں آتے۔ چینی بودھ وہ پالی نہیں سمجھتے جس میں بدھ مت کی کتابیں لکھی ہوئی ہیں۔ رومن کیتھولک عیسائیوں اور یہودیوں کی بہت بڑی گنتی ایسی ہے جو اپنی لاطینی اور عبرانی دعائیں بے سمجھے بوجھے پڑھتے رہتے ہیں اور ہندو وید کے منتر توتے طرح کی دہراتے ہیں۔

پیدا کرنے والے نے کہا "کن فیکون" (ہوجا اور دنیا پیدا ہوگئی) یہ ایک بول "کن" کی طاقت تھی۔ خدا نے آدمؑ کو سب سے پہلے نام سکھائے اور نام بھی بول ہوتے ہیں۔ عہد نامہ جدید میں آیا ہے کہ سب سے پہلے بول تھا۔ پرانے کیلٹک لوگ "اوگمس" کو بولی کا دیوتا مانتے تھے۔ یونانیوں میں اس دیوتا کا نام ہرمس تھا۔ رومن لوگ اسے آیش لوکیوشس کہتے تھے۔ ہندوؤں کے یہاں واک[3] دیوی ہوتی ہے اور پرانے مصری اس دیوتا کو توت کہتے تھے۔ سم سم کے بول سے علی بابا نے خزانے کا دروازہ کھول لیا تھا۔ اسم اعظم سے داستانوں کا ہیرو جادو کے کوٹ جیت لیتا تھا۔ ہمارے نام بھی سم سم سے کم نہیں ہیں کیونکہ جیسے ہی کوئی ہمارا نام لے کر پکارتا ہے ہم میں اپنے بھاؤ کی سکت نہیں رہتی اور ہم اس کے سامنے بے بس ہو جاتے ہیں۔ لکھنے والوں پر بھی کچھ بولوں کا جادوں ایسا چل جاتا ہے کہ وہ بس انھیں کو بار بار اپنے لیکھوں میں لاتے ہیں۔ ہمارے تکیہ کلام کی نفسیاتی وجہ چاہے کچھ بھی ہو بولنے والے کے لیے اس میں بھی جادو ہوتا ہے جو وہ اسے جگہ بے جگہ بولتا ہی رہتا ہے۔

۱۔ من کے معنی ہیں بول گنگنانا۔
۲۔ فارسی میں افسی منہ کو کہتے ہیں۔
۳۔ واک کے معنی ہیں بول۔

ہر سوچ ہر بولی میں ظاہر کی جا سکتی ہے اس لیے ایک بولی سے دوسری بولی میں ڈھل سکتی ہے - ہر بول سوچ کی علامت ہوتا ہے اور بول کے چاروں کھونٹ بھاؤ کا جو ہالہ چکر کھاتا رہتا ہے وہ دوسری بولی میں نہیں ڈھل پاتا یعنی ایک بول کا دوسرے بول یا بولوں میں تو ترجمہ ہو جاتا ہے - ہر بول کے اس جادو کا ترجمہ نہیں ہو سکتا - اس لیے ترجمہ چاہے کتنا ہی اچھا کیوں نہ ہو لوگوں کی اس سے کبھی اطمینان نہیں ہوتا -

بول علامت ہونے کے ناتے سے کوئی نہ کوئی معنی بھی ضرور رکھتا ہے - اسے یوں سمجھیے کہ بول کسی سوچ کی علامت ہوتا ہے اور سوچ اس بول کا معنی کہلاتا ہے - جب ہم کان کا بول بولتے ہیں تو ہمارا دھیان جھٹ اپنے ڈیل کے اس انگ کی طرف پھر جاتا ہے جس سے سننے کا کام لیا جاتا ہے - کان اس انگ کی علامت ہے اور یہ انگ کان کا معنی ہے - ہر سوچنے کی بات یہ ہے کہ جس گھڑی بول گھڑا جاتا ہے تو معنی سے اس کا ناتا کیسے جوڑا جاتا ہے یعنی کسی سوچ یا چیز کے لیے بول گھڑنے میں کس بات کا دھیان رکھا جاتا ہے - ہم دیکھتے ہیں کہ جب ہمارے سامنے کوئی بول بولا جاتا ہے تو ہماری آنکھوں کے سامنے اس کے معنی کی تصویر سی کھچ جاتی ہے اور جیسے بول بھانت بھانت کے ہوتے ہیں - ایسے ہی ان کو سن سن کر ابھرنے والی تصویریں بھی بھانت بھانت کی ہوتی ہیں - ہمارا دھیان چھوٹتے ہی ان میں سے کسی کے روپ ، کسی کی آواز ، کسی کے مزے ، کسی کی بوباس اور کسی کے کڑے پن یا ڈھیلے پن کی طرف چلا جاتا ہے -

اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر معنی کی تصویر میں ایک گُن ایسا ہوتا ہے جو اس کے دوسرے گُنوں سے کچھ ابھرا ہوا ملتا ہے اور اسی گُن کو دیکھ کر اس کے لیے بول گھڑا جاتا ہے جیسے کریلے ہیں ہرا پن، چوہے کا سا ڈیل ، کھردرا چھلکا بہت کچھ دکھائی دے گا پر اس کی کڑواہٹ سب پر بھاری ہوگی - یہاں تک کہ کریلے کا بول سنتے ہی کچھ لوگوں کے تو منہ کا مزہ ہی کڑوا ہو جائے گا - اسی کڑواہٹ پر اس کا نام کریلا (کر=کڑوا کڑواہٹ اور ایلا=والا) رکھا گیا ہے - کچھ

بول ایسے بھی ہیں جن کے کئی کئی معنی نکلتے ہیں - جیسے کان کے معنی ہیں :

۱ - ہمارے ڈیل کا سننے والا انگ ۔

۲ - کپڑے کا بڑھا ہوا کونا -

۳ - چارپائی کا ایک طرف نکلا ہوا حصہ ۔

یوں دیکھنے میں تو یہ تینوں معنی الگ الگ ہیں ۔ پر دھیان سے دیکھیے تو تینوں میں ایک گُن ایسا ہوتا ہے جو اور دوسرے گنوں سے بڑھا ہوا ہے ۔ تینوں ہی نکلے ہوئے کونے ہیں - اسی ایک گُن پر ان تینوں کے لیے ایک بول "کان" گھڑا گیا تھا ۔ ان مثالوں سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ کسی سوچ یا چیز کے بول گھڑنے میں اس کے سب سے بڑھے ہوئے گُن کو سامنے رکھا جاتا ہے - پھر ریت بول اور معنی کے ناتے کو دہرا دہرا کر اتنا پکا کر دیتی ہے کہ ایک کو سن کر دوسرا چھٹ آنکھوں میں پھر جاتا ہے -

معنی کی نیو دو باتوں پر رکھی جاتی ہے :

۱ - سننے والے کا پچھلا تجربہ جو بول ایک بار پہلے بھی کسی گھڑی سنا اور سمجھا جا چکا ہے جب دوبارہ ویسی ہی حالت میں بولا جاتا ہے تو اس کے ٹھیک معنی جھٹ سمجھ میں آ جاتے ہیں اور جو پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا ہے اور بول پہلی ہی بار سننے میں آیا ہے تو انکل سے اس کے لگ بھگ معنی سمجھ لیے جاتے ہیں جو آگے چل کر بول کے دہرائے جانے پر دھیرے دھیرے اجاگر ہوتے چلے جاتے ہیں -

۲ - وہ سلسلہ جس میں کوئی بول بولا جاتا ہے - اس کے معنی سمجھنے میں سہارا دیتا ہے اس لیے جب بول کا آگا پیچھا بدلتا ہے اور وہ کچھ ایسے بولوں کے بیچ میں آ جاتا ہے جو نئے ہیں یا ایسے موقعے پر بولا جاتا ہے جو پہلے سے کچھ الگ ہے تو اس کے معنی بھی بدل جاتے ہیں -

بول اور معنی کے ناتے کو سامنے رکھ کر معنی کو دو بھانتوں میں بانٹا جا سکتا ہے:

۱ - لغوی یا حقیقی اور

۲ - استعمالی یا مجازی -

حقیقی معنی وہ ہوتے ہیں جن کے لیے وہ بول بنایا گیا تھا اور وہ اس کی بناوٹ پر دھیان دے کر ہاتھ آ جاتے ہیں - مجازی معنی اس بول کے چلن سے نکلتے ہیں - جیسے کریلا کے لغوی یا حقیقی معنی ہیں کڑواہٹ والا یا کڑوا اور کان کے حقیقی معنی ہیں نکلا ہوا حصہ - کریلا کے استعمالی یا مجازی معنی ہیں وہ ترکاری جسے سب لوگ کریلا کہتے ہیں - اسی طرح کان کے استعمالی معنی ہیں ہمارے ڈیل کا سننے والا حصہ اور چارپائی یا کپڑے کا نکلا ہوا کونا - جو لوگ ان دونوں بھانتوں کے بل پر پورا دھیان نہیں دیتے وہ لغوی یا حقیقی معنی کو تو چھوڑ دیتے ہیں اور بول کے کئی مجازی معنی ہی میں سے ایک کو حقیقی اور دوسروں کو مجازی کہہ اٹھتے ہیں -

اچار[1] بول کا بدن اور معنی اس کی روح ہے اس لیے کسی بول کے معنی سمجھنے کے لیے سب سے پہلے اس کے اچار پر دھیان دینا چاہیے - کسی نئی بولی کے سیکھنے میں اس کا اچار سننا اور سیکھنا اس لیے ضروری ہے کہ اچار بدلتے ہی بول کے معنی بدل جاتے ہیں لپی بھی معنی کو نہیں اچار کو جکڑنے کے لیے گھڑی گئی تھی ، پر دنیا کی کوئی لپی آج اتنی پکی ہوڑی نہیں ہے کہ وہ ہر بولی کی آوازیں پکڑ سکے اس لیے بولوں کے روپ ہمیں ان کے ٹھیک اچار تک نہیں پہنچا پاتے پر جب بولوں کا اچار ہر جگہ اور ہر گھڑی سننے کو نہیں ملتا تو ہار کر لکھاوٹوں کی طرف آنا ہی پڑتا ہے اب ہونا تو یہ چاہیے کہ روپوں پر پورا بھروسا نہ کرکے لوگ ان کا کبھی کبھی اچار سے بھی ملان کرتے رہیں - پر جو کسی وجہ سے ایسا نہیں کر پاتے تو وہ روپوں ہی

---

۱ - تلفظ -

کو سامنے دھر لیتے ہیں اور انہیں اکیلا سہارا جان کر اپنا اچار بگاڑ لیتے ہیں - دیکھنے میں یہ آیا ہے کہ ان پڑھوں سے پڑھے لکھوں کا اچار کہیں زیادہ بگڑا ہوتا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ کانوں سے کم اور آنکھوں سے زیادہ کام لیتے ہیں -

جب یہ آنکھوں دیکھی بات ہے کہ دنیا کی ہر لپی میں کچھ نہ کچھ کھوٹ ہے اور یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ لپی سے اچار بھی کھوٹا ہو جاتا ہے - تو لپی تو لپی کبھی اچار پر بھی پورا بھروسا نہیں کر لینا چاہیے - ایسے میں کسی بول کے ٹھیک ٹھیک معنی تک پہنچنے کا ایک ہی راستہ رہ جاتا ہے کہ اس کی جڑ (مادہ) ڈھونڈ نکالی جائے جو بول کے شروع میں ہی دکھائی دے جاتی ہے اور پھر اس جڑ سے بننے والے زیادہ سے زیادہ بولوں کا آپس میں ملان کر کرکے اس جڑ کے جتنے بھی الگ الگ معنی نکلتے ہوں انھیں بوجھنے کی کوشش کی جائے - اس ڈھب سے اور بھی بہت سے بولوں کے معنی آپ ہی آپ سمجھ میں آ جائیں گے - یہ ڈھنگ بہت آسان ہے اور بہت کام کا بھی ہے - اس میں کٹھنائی بس اسی گھڑی آتی ہے جب ایک جڑ سے بننے والے بہت سے یا کم سے کم اتنے بول اپنی بولی میں نہ مل سکیں کہ ان کا ملان کرکے جڑ کے ٹھیک ٹھیک معنی سمجھے جا سکیں - مثال میں ایک جڑ "کل" کے کچھ معنی اور اس سے بننے والے کچھ بول نیچے دیے جاتے ہیں :

نمبر شمار	جڑ	معنی	اس سے بننے والے دوسرے بول
۱	کل	بیتنا - وقت	کل (آنے والا یا بیتا ہوا دن - بنگلا کال) کل کلاں - کلپ (چار ارب بتیس کروڑ سال کا وقت)
۲	کل	چین - سُکھ	کلیان (بھلائی)
۳	کل	میٹھی آواز	کلک (خوش آوازی) کلاپی (مور) کلچڑا (ایک خوش آواز پرند) کلاونت (گوَیّا)

نمبر شمار	جڑ	معنی	اس سے بننے والے دوسرے بول
۴	کل	مشین - حرکت - جوڑ پیچ	کلائی (پہنچا) کلا (قلا) کلا بازی (قلابازی) کلی (ایک بھانت کا حقہ) اونٹ کی کل (جوڑ) کلیں لینا - کلاوا (ہاتھی کی گردن) کلاجنگ (کشتی کا ایک داؤ) کل بُت (سانچا - قالب
۵	کل	فن	کلا جیسے شلپ کلا - (فن تعمیر) - کلنکا (ٹھیٹھروں کی نقش کرنے والی چھینی)
۶	کل	سختی - مصیبت	کل جھبا - کلٹ (دُکھ) کلیس (سنسکرت کلیش - روگ - مصیبت - جنجال) کلّانا (سخت ہونا) کل جُگ - کلپ (کلف - مانڈی) کلپنا - کلپانا - کلانج (قلانج - مفلس- کنگال) کل گٹ (کلہاڑا)
۷	کل	سیاہی	کل سرا - کلّو - کلونجی - کالونچ - کلونس - کلنک - کلجھواں - کلوٹا - کلموہی -
۸	کل	کنارا	کلس - کلگی (کلغی) کام (قلم - کنپٹی کے بال)
۹	کل	گولائی	کلہندا اور کلنگڑا (تربوز) کلسا (گاگر) کلندری (قلندری ایک بھانت کی چھولداری) کلدار (گول روپیا - کلندار)
۱۰	کل	جوانی - بلوغ	کلور (جوان گائے) کلی (بن کھلا پھول) کلن (حمل)
۱۰	کل	عرق - تری	کلال - کلار - کلوار (شراب فروش - شراب کو کالا پانی بھی کہتے ہیں)

نمبر شمار	جڑ	معنی	اس سے بننے والے دوسرے بول
			کلیجا - کلیا (قلیہ شوربے دار گوشت) کلیوا یا کلیوا (ناشتہ) کلارنا (تھوڑے سے گھی یا تیل میں بھوننا) - کلک (گھی یا تیل کا بچا ہوا حصہ)
۱۲	کل	لمبائی	کلی (کُرتے کی) کلاوا (دھاگا) کلا بتو - کلچھا (کرچھا) کلم (قلم - شاخ - ٹہنی)
۱۳	کل	تلخی	کلر (نونا - (یہہ) کلی (قلعی - چونہ)

جس طرح ایک ایک بول کے کئی کئی معنی ہوتے ہیں - اسی طرح کئی کئی بول بھی ایک معنی دیتے ہیں - اس لیے معنی ڈھونڈنے کا دوسرا ڈھنگ یہ ہے کہ جس بول کے معنی ڈھونڈنا ہوں - آوازوں کی بدلائی سے اس کے برابر کے بہت سے بول بنا لیے جائیں - ایسا کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ ــ ایک جڑ یا بول کے جتنے معنی ہوتے ہیں اتنے ہی اس کے بہروپ بھی ہوتے ہیں جب پہلے ڈھنگ سے معنی نہیں نکل پاتے تو دوسرے ڈھنگ سے انہیں ڈھونڈا جا سکتا ہے پر اس کے لیے بولی کی پوری کی پوری پونجی سامنے رکھنا پڑتی ہے اور اردو کی دوسری ساتھی بولیوں پر نظر رکھی جائے تو اور بھی اچھا ہے کیونکہ دوسری بولیوں کا جاننا تو رہا ایک طرف کبھی کبھی اپنی ہی بولی کو کم جاننے کی وجہ سے یہ ہو سکتا ہے کہ کسی بول کا ایک بہروپ چھوڑ دیا جائے - اور اس پر دھیان نہ دیا جائے جیسے کھٹا اور کھوٹا جو سچ کے ایک ہی معنی رکھتے ہیں - دیکھنے میں ایک دوسرے سے بہت دور لگتے ہیں پران کا استعمال ہمارا یہ دھوکا دور کر دیتا ہے جیسے میرا جی اس کی باتوں سے کھٹا ہو گیا - اس جملے میں کھٹا سے ترش کا نہیں کھوٹا (کھوٹا والا) کا مطلب نکلتا ہے - اس بات کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے تین بول - ان کے معنی اور ان سے نکلے ہوئے دوسرے بول نیچے لکھے جاتے ہیں -

(١) مہر- (الف) عورت اور زنان خانہ - مہر یا مہر اور اسی بول سے بنے ہیں اور برج بھاشا اور اودھی جیسی بولیوں میں عورت کے لیے بولے جاتے ہیں - اس کا بیروپ "مہل" سنسکرت میں الف تانیث کے ساتھ "مہلا" دکھائی دیتا ہے - ہماری لپی میں یہ بول "محل" لکھا جاتا ہے اور بادشاہوں اور نوابوں کی بیویوں کے لیے بولا جاتا ہے جیسے نواب خاص محل، اختر محل - زنان خانے کو محل سرا اس لیے کہتے ہیں کہ یہاں محل کے معنی مہل، مہر یعنی عورت کے ہیں - یوں محل سرا کے معنی ہیں عورتوں کا مکان - وہ عورت جو زنان خانے میں کام کرتی ہے مہری کہلاتی ہے اور خواجہ سرا بھی جو عورتوں میں رہتا ہے محلی (مہلی، مہری) کہلاتا ہے - مہر کا ایک بیروپ مات ہے جس کے معنی ہیں ماں -

(ب) اونچائی - اس پر الف نسبتی بڑھا کر "مہرا" کا بول بنتا ہے اور مچان کے معنوں میں بولا جاتا ہے - مار مار مہرے بٹھانا اردو کا ایک محاورہ بھی ہے - محل (مہل، مہر) اونچے مکان کے لیے بھی بولا جاتا ہے اور محلے دو محلے کے روپوں میں زبانوں پر چانو ہے ان معنوں میں اس کا بیروپ ماچ (ماچا) ہے -

(ج) جھومنے کی حرکت - سانپ کے ڈس لینے پر انسان جھومتا ہے تو اس کو مہر آنا اور مہر لینا بولتے ہیں - ان معنوں میں اس کا بیروپ "لہر" ہے -

(د) چر، پھر، نیں، گشت - اس بول پر الف نسبتی لگا کر "مہرا" بنایا گیا ہے جو اوپر کا کام کاج کرنے والے نوکر کے لیے بولا جاتا ہے - ڈولی یا پالکی اٹھانے والے کہاروں کے افسر کو بھی مہرا کہتے ہیں - ان معنوں میں اس کا بیروپ "بھرا" ہے جس کا انگریزی راج کے دنوں میں بہرے بہاں بڑا مان تھا -

(۲) گل- (الف) راستہ ، نالی ، گلی اور گلیارا کے بول یہی معنی دیتے ہیں -
یہاں اس کا بھروپ "گیل" ہے جو برج اور راجستھان میں
راستے کے معنی دیتا ہے -

(ب) نیچے بیٹھ جانا - کنویں میں کوٹھی اتارنے کو کوٹھی گلانا
کہتے ہیں - یہاں اس کا بھروپ گابھ ہے -

(ج) سوراخ، منہ ، گلا (حلق) - گلوا (چکی کا منہ ، بھروپ گولوا،
گولا کنویں کو بھی کہتے ہیں - گنڈوا ، گڑوا) اور گلّا
(وہ صندوقچی جس میں رقم ڈالنے کے لیے منہ بنا ہوتا ہے -
بھروپ گجّا) کے بول انھیں معنوں میں بنے ہیں -

(د) پانی میں بھیگنا ، گلنا ، اردو کا بول "گیلنا" یہیؔ معنی دیتا
ہے جس کا بھروپ سیلنا بھی ہمارے یہاں چالو ہے -

(س) ٹکڑا ، ریزہ - دال گلنا کے معنی ہیں دال کا نرم ہو کر
ٹکڑے ٹکڑے ہو جانا - اس کا بھروپ گنڈ (کھنڈ) بھی ہے
اور کھل یا کھلی تل یا سرسوں کے ان ٹکڑوں کو کہتے
ہیں جو تیل نکلے پیچھے رہ جاتے ہیں -

(ط) بات چیت - پنجابی میں یہ بول انھیں معنوں میں کام آتا ہے
جیسے گل بات - اردو محاورے میں گلریاں چلانا لگاتار باتیں
کرنے کو بولتے ہیں - یہاں اس کا بھروپ گپ ہے -

(۳) ہس - اس کا ٹھیک روپ ہنس ہے جس سے بول ہسرنا (ہنسرنا) بنتا ہے۔
اب اس کے معنی اور اس سے نکلے ہوئے بول دیکھیے -

(الف) پھیلاؤ - ہسرنا پھیلنے کو اور ہسارنا پھیلانے کو کہتے ہیں۔
ہسلی (ہنسلی) پاپا نسلی - بھروپ ہانسری) اسی سے بنا ہے -
انھیں معنوں میں اس کا بھروپ ہکھ یا ہنکھ - ہسلی کا بھروپ
ہانکھلی یا ہانکھری اور ہسرنا کا بھروپ ہکھرنا (ہنکھرنا)
بنتا ہے -

(ب) گناہ ۔ سنسکرت میں یہ بول انھیں معنوں میں ملتا ہے ۔ یہاں اس کا بھروپ ہاپ ہے ۔

(ج) تری ، نمی ، سیل ۔ گائے بھینس کا تھنوں میں دودھ اتارنا پسرنا یا پسرانا کہلاتا ہے ۔ اسی سے اردو کے کچھ بول جیسے پسیو (نمی، سیت) پسیجنا (نم ہو جانا) پسینا (عرق بدن) پسانا (ابلے ہوئے چاولوں یا سوّیوں کا پانی نکال دینا) اور پنسوئی (کشتی) گھڑے گئے ہیں ۔ پنجاب میں پنسال نویس نہر کے اس ملازم کو کہتے ہیں جو نہر کے پانی کا آتار چڑھاؤ لکھتا رہتا ہے ۔ ان معنوں میں اس کا بھروپ پن یا پان اور پسرنا کا بھروپ نپسرنا ہے ۔ اس کے ساتھ ساتھ پنچھ ، پرچھ ، پنکھ اور پوکھ بھروپ بھی انھیں معنوں میں ملتے ہیں جن سے پنچھا (پسینہ پونچھنے کا بڑا رومال) پرچھا (کنویں کے منہ کا وہ پتاؤ جس پر چرس کا پانی انڈیلا جاتا ہے) پکھال (پنکھال، پنسال ، پانی کی مشک) اور پوکھر (پنکھر ، پنسر ، چھوٹا تلاؤ) کے بول بنے ہیں ۔ انگریزی کا بول "پس" جو گھاؤ کی پیپ یا پانی کے لیے بولا جاتا ہے ۔ ہماری ہی بولی سے گیا ہے ۔

اُردو میں بارہ سُر اور بتیس اَسُر ہیں ۔ ان سے بننے والے مادوں اور ان کے معنی کا حساب لگانا کٹھن ہے ۔ بتیس اُسروں میں سے ڑھ کو نکال کر جن سے ہمارا کوئی بول شروع نہیں ہوتا اور ہمزہ کو ملا کر کل اکتیس اُسر ہو جاتے ہیں ۔ اب ان بارہ سروں اور اکتیس اسروں کو ملا ملا کر جو پہلے مادے بنائے جا سکتے ہیں ان کی گنتی تین سو بہتر (۳۷۲) ہو جاتی ہے ۔ بارہ سر بھی چھ چھ کے دو جتھوں میں بٹے ہوئے ہیں اور ہر جتھے کے چھ سر آپس میں بدل جاتے ہیں اور ایک معنی دیتے ہیں ۔

(مطبوعہ اوراق ، لاہور)

حصه دوم

اردو شناسی

اُردو زبان کی بنیادی آوازیں

دنیا کی ہر زبان میں آوازوں کا ایک مخصوص نظام ملتا ہے جس کے مطالعے کو علم زبان میں بنیادی حیثیت حاصل ہے کیونکہ اسے سمجھے بغیر ہم کسی زبان کی بناوٹ ، قسم اور دوسرے متعلقہ مسائل سے اچھی طرح واقف نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ اردو زبان کے مطالعے کے لیے بھی ہمیں سب سے پہلے اس کی آوازوں پر غور کرنا ضروری ہے اور یہ چار قسم کی ہیں :

۱ - سُر

۲ - اَسُر

۳ - ہمزہ

۴ - غُنّہ

سُر

اس آواز کو عربی زبان میں صوت علّت کہتے ہیں - اردو زبان میں سُروں کی کل تعداد چوبیس ہے اور ان کی دو قسمیں ہیں :

(۱) سادہ سُر اور

(۲) نکی سُر اور پھر ان میں سے ہر ایک کی دو دو ذیلی قسمیں ہیں -

(۱) مختصر اور

(۲) طویل -

ان کا حساب یوں ہے :

قسم/ذیلی قسم	مختصر	طویل	مجموعی تعداد
سادہ	۷	۷	۱۴
نکی	۵	۵	۱۰
میزان	۱۲	۱۲	۲۴

چونکہ ہماری لپی میں ان سب کو ظاہر کرنے کے لیے مخصوص علامات پہلے سے مقرر نہیں ہیں اور انھیں بیشتر واو، الف، ی کی مدد سے قلم بند کیا جاتا ہے اس لیے نیچے جو نقشے دیے جا رہے ہیں۔ ان میں ان کے لیے علامات مقرر کر دی گئی ہیں تاکہ ان کی پہچان اور اُچار (تلفظ) میں آسانی ہو۔

۱ - سادہ سُر

مختصر			طویل		
علامت	تشریح	مثالیں	علامت	تشریح	مثالیں
ـَ	زبر	چَل - لَک - رَکھ	ـا	آ	چال - لاگ - راکھ
ـِ	زیر	مِرا - مِلن - بِھرنا	ـیٖ	اے	میرا - میل - بھیر
ـُ	پیش	کُھٹلا - مُڑنا - کُھلاوٹ	ـو	او	کُوٹھا - مُوڑ - کُھول
ـٖ	ای کی مختصر آواز	پِیار - بِھائی - ہِسائی - بِیٹا - لِٹھیا	ـی	اِی	بیج - نیچا - بینا - بیٹی - لاٹھی
ـٗ	او کی مختصر آواز	رُکھائی - سُکھانا - بھڑُوا - کلُوا	ـوٗ	اُو	روکھا - سوکھا - بھاڑو - کالو -
ـٖ	اے کی مختصر آواز	بہِن (بہنا) - اہرا - ٹھہرنا - کٹہرا	ـے	آے	بہین (بہینا) - ایرا - ٹھیرنا - ٹھیرا -
ـٗ	او کی مختصر آواز	بہت - رہک - چہل	ـو	او	بہوت - اور - کَون

۲ - نکّ سُر

مختصر			طویل		
علامت	تشریح	مثالیں	علامت	تشریح	مثالیں
ںَ	آں	کنڈیری - بنڈوڑ - چنگیر - پنجیری	اں	آں	چانگلا - کانٹا - سانبھا - آنج
ںِ	اں	سنجھائی - سنگھاڑا - سنگولی	ںِ	اِیں	نیند - پنڈی - سہنک (تنکا)
ںُ	اں	انگلی - گھنگرو - منڈاسا	ںُ	اوُں	مونڈ - گونج - اونٹ
ںٖ	آں	مہندی - مہنگی - لہندی - لہنگا	ںٖ	آیں	کھنچلی - گیند - بھینس
ںٗ	آں	پہنچا	ںٗ	آوں	ہونٹ - گونڈ - جھونپڑی

اَسُر

اردو زبان میں اَسُروں کی کل تعداد بتیس ہے اور ان کی بھی دو تقسیمیں ہیں :

(۱) حجم کے اعتبار سے اور

(۲) مخارج کے اعتبار سے -

ان تقسیموں کا حساب نیچے درج کیے ہوئے نقشے سے ظاہر ہے ۔

حجم/مخرج	حلقی	حنکی	مخی	دندانی	شفوی	انفی	صفیری	مجموعی تعداد
الپ پران (ہلکے)	۲	۳	۳	۳	۲	۲	۱	۱۶
مہا پران (بھاری)	۲	۳	۳	۳	۲	۲	۱	۱۶
میزان	۴	۶	۶	۶	۴	۴	۲	۳۲

ہلکے اَسُر (ب ، پ وغیرہ) الپ پر ان اور بھاری (بھ ، پھ وغیرہ) مہاپران کہلاتے ہیں - حلقی آوازیں حلق سے نکالی جاتی ہیں - حنکی تالو کی مدد سے ، مخی دانتوں کی جڑوں اور زبان کی نوک کی مدد سے ، دندانی دانتوں کے سہارے ، شفوی ہونٹوں سے اور انفی ناک میں گونج کر ادا ہوتی ہیں اور صفیری میں سیٹی کی سی آواز نکلتی ہے -

ان کی تفصیل ایک نقشے کے ذریعے پیش کی جاتی ہے :

مخرج/حجم	الپ پران	مہاپران	الپ پران	مہاپران	الپ پران	مہاپران
حلقی	ک	کھ	گ	گھ	—	—
حنکی	چ	چھ	ج	جھ	ر	رھ
مخی	ٹ	ٹھ	ڈ	ڈھ	ڑ	ڑھ
دندانی	ت	تھ	د	دھ	ل	لھ
شفوی	پ	پھ	ب	بھ	—	—
انفی	م	مھ	ن	نھ	—	—
صفیری	—	—	س	سھ	—	—

اردو داں طبقہ تمام الپ پرانوں کو بخوبی جانتا ہے اور بہت سے مہاپرانوں سے بھی واقف ہے البتہ چند مہاپران (رھ ، ڑھ ، لھ ، مھ ، نھ اور سھ) ایسے ہیں جنھیں بہت کم لوگ جانتے ہیں ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ ہمارے الفاظ میں نسبتاً کم استعمال ہوتے ہیں ۔

نیچے ان کی چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں :

رھ : برہا (برھا ۔کھیت میں پانی کی نالی) ۔گیارہ (گیارھا) ۔ بارہ (بارھا)۔ تیرہ(تیرھا) پندرہ (پندرھا)۔ سترہ (سترھا) اٹھارہ (اٹھارھا) وغیرہ ۔

ڑھ : گڑھا ۔ پڑھنا ۔ کاڑھا ۔ کاڑھنا ۔ چڑھنا ۔ کڑھائی وغیرہ ۔

لھ : دولھا - دلھن - کولھا - پُھولھا - کُلھیا - کُلھاڑی - کُلھڑ - کلھوا - ملھار (ملھد) - سولھا (سولہ) وغیرہ -

مھ : کمھار - کمھیڑا - کمھلانا - وغیرہ -

نھ : نھانا (نہانا) - ننھی - ننھا کنھیا - انھوربان - وغیرہ -

نہ صرف یہی بلکہ تمام مہاپران ہمارے الفاظ میں مکمل روپ میں بھی سامنے آتے ہیں اور ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بھی لکھے بولے جاتے ہیں کیونکہ ہماری عربی لپی میں ان کو ظاہر کرنے کے لیے مفرد حروف نہیں ہیں - چونکہ اب سے پہلے ہمارے یہاں ہائے ہوز اور دو چشمی ہے کے استعمال میں کوئی امتیاز نہیں تھا اس لیے مہاپران جا بجا الپ پران اور ہائے ہوز میں تقسیم ہو گئے ہیں اور پھر ان کے مکتوبی روپوں کو دیکھ دیکھ کر اور ان پر ضرورت سے زیادہ بھروسا کرکے ہم نے اپنا اچار (تلفّظ) بھی بگاڑ لیا ہے جیسے باہر (اصل بھار) - پہاڑ (اصل پھاڑ) - تہلکا (اصل تھلکا)- ٹہوکا (اصل ٹھوکا) دہاڑنا (اصل دھاڑنا) - سرہانا (اصل سرھانا)- ٹہکانا (اصل ڈھکانا - اسی مادے سے ڈھکوسلا بنا ہے) کہا. کہمی (پنجاب میں عام طور پر بولا جاتا ہے - اس کی اصل کھا کھمی ہے) وغیرہ البتہ سھ کی آواز ہماری زبان کے عربی لپی میں منتقل ہونے سے پہلے ہی دو ٹکڑے ہو چکی تھی اور یہ غالباً آریائی اثر تھا کیونکہ نہ ان کی آبائی زبان میں بھاری آوازیں تھیں اور نہ ان کی لپی میں ہی ان کے لیے مفرد حروف ملتے تھے - اس تبدیلی کی قدامت کا ثبوت یہ ہے کہ یہ مہاپران ہماری بول چال میں بھی الپ پران اور ہائے ہوز کے مجموعے کے روپ میں استعمال ہوتا ہے اور دیوناگری لپی میں بھی س اور ہ کے جداگانہ حروف سے لکھا جاتا ہے - جیسے سہرا - سہج (سیھج) - سہن (سھین) - سہارا (سھارا) - سہانا (سھو آنا) وغیرہ -

ہماری زبان میں ڑ، ڑھ کے علاوہ ہر آواز سے بول کی ابتدا ہو سکتی ہے اور جب یہ آوازیں شروع میں آتی ہیں تو ڈ، ڈھ میں بدل جاتی ہیں -

چوبیس کھڑی

اُردو زبان کا ایک اَکشر جب مندرجہ بالا چوبیس سُروں سے مل کر متحرک ہوتا ہے تو اس کی چوبیس شکلیں سامنے آتی ہیں لیکن ہندی والوں نے سنسکرت کے گرامر نویسوں کی تقلید میں اکشر کی صرف بارہ شکلیں ہی قرار دی ہیں جن کے نقشے کو وہ بارہ کھڑی کہتے ہیں۔

وہ نقشہ یہ ہے:

کَ ۔ کُ ۔ کِ ۔ کّ ۔ کٓ ۔

کِ ۔ کِٕ ۔ کُ ۔ کٗ ۔ کٗ ۔

کی ۔ کے ۔

کھَ ۔ کھُ ۔ کھِ ۔ کھِٕ ۔ کھّ ۔

کھٓ ۔ کھِ ۔ کھِٕ ۔ کھُ ۔ کھٗ ۔

کھں ۔ کھہ وغیرہ ۔

اس نقشے میں انہوں نے صرف ایک نگّ سُر رکھا ہے اور آخر میں ایک شکل وسرگ کی بھی شمار کی ہے جس کے اُچار میں ہائے مختفی کی سی آواز نکلتی ہے جیسے رام سے رامہ وغیرہ لیکن وسرگ کی شکل بھی اردو ہندی یعنی کھڑی بولی میں ابھی تک کہیں نظر نہیں آئی۔ ممکن ہے اس کا تعلق آریوں کی آبائی زبان سے ہو جسے لے کر وہ ہندوستان میں داخل ہوئے تھے۔ بہرحال جہاں تک اردو زبان کا تعلق ہے اس کے ہر اُکشر کی چوبیس متحرک شکلیں ہی قرار پاتی ہیں۔ اگر ہر اُکشر پر چوبیس سُر لگا کر ایک تحریری نقشہ بنا لیا جائے تو اس میں چوبیس کھڑیں لڑیں نظر آئیں گی اور اس نقشے کو ہم چوبیس کھڑی کہیں گے۔ مثلاً:

کَ - کاَ - کَں - کاں - کِ - کی -

کُ - کو - کے - کِ - کِیں - کوں -

کَے - کَو - کَیں - کَوں - کِ - کِ

کِن - کِں - کُن - کُو - کُوں - کُں -

کھَ - کھا - کھں - کھاں - کھِ - کھی -

کھُ - کھو - کھے - کھِ - کھیں - کھوں -

کھَے - کھَو - کھَیں - کھَوں - کھِ - کھِ -

کھِن - کھِں - کھُ - کھُو - کھُوں - کھُوں -

ہمزہ

ہمزہ نہ خالص سُروں کے زمرے میں شمار ہو سکتی ہے نہ خالص اسروں میں بلکہ ان دونوں قسموں کے درمیان ایک طرح کا رابطہ استوار کرتی ہے - یہ سُروں کے مدار کا کام دیتی ہے یعنی جب گلے سے محض سُر نکالا جاتا ہے تو اس آواز کے سہارے کی ضرورت پڑتی ہے جو اُسر نہ ہوتے ہوئے بھی اُسر کی طرح استعمال ہوتی ہے جیسا کہ سروں کے مندرجہ بالا نقشے سے بھی واضح ہوتا ہے اور جب کسی مقام پر اسر ساقط یا غائب ہو جاتا ہے تو وہاں بھی آواز سنائی دیتی ہے جیسے تلاب اور تلاو (تلاء) - کاگ (کوّا) اور کاؤ (کلہ) وغیرہ - اسی کو پراکرت کے گرامر نویسوں نے شیش (باقی) یا آدَرتن (بے رنگم) کہا ہے

یہ سُروں سے اس لیے جدا ہے کہ اس کی اپنی کوئی آواز نہیں ہے اور سُروں سے یوں الگ ہے کہ یہ ان کی طرح اُسروں کو متحرک نہیں کرتی بلکہ خود سُروں کا مدار بنتی ہے -

غُنّہ

غنہ کو عربی زبان کی اصطلاح میں نون غنہ اور سنسکرت میں انوسر کہا جاتا ہے - یہ اردو زبان کی خالص انفی آواز ہے اور اس کا شمار سُروں میں ہی ہو سکتا ہے کیونکہ اس کی مدد سے اِ ، اے (اَ) اور او (ہ) کو چھوڑ کر ہر سادہ سُر نکّی بن جاتا ہے - پراکرت کے گرامر نویسوں نے لکھا ہے کہ پراکرت میں غنہ کا استعمال اس وقت ہوتا ہے جب کہ سنسکرت الفاظ میں بھی غنہ موجود ہو - یہ عجیب و غریب پابندی ظاہر کرتی ہے کہ یہ لوگ پراکرت یعنی بھاشا (بول چال) کو سنسکرت (تحریر) سے مشتق سمجھتے تھے اس لیے انھوں نے سنسکرت اور پراکرت کا تقابلی مطالعہ اسی نظر سے کیا ہے - اسی صورت میں جہاں جہاں انھیں سنسکرت اور پراکرت الفاظ میں غنّہ مشترک نظر آیا اسے سنسکرت کی تقلید سمجھ لیا لیکن ایک آزاد زبان کی حیثیت سے پراکرت کے غنہ کی یہ تشریح ناقابل قبول ہے - البتہ ان لوگوں کا یہ کہنا درست ہے کہ بعض اوقات پراکرت کا غنّہ محض خوش آوازی کے لیے بھی داخل کر لیا جاتا ہے - چنانچہ یہ بات دیکھنے میں آتی ہے کہ ایک ہی لفظ ایک علاقے میں سادہ اور دوسرے علاقے میں نکّی سر سے بولا جاتا ہے بلکہ بعض اوقات تو ایک ہی علاقے میں سادہ اور نکّی دونوں سروں سے پہلو بہ پہلو بولا جا رہا ہے - لفظ کے آخری طویل سادہ سر پر غنہ کا جو حشوی اضافہ عام طور سے کر لیا جاتا ہے اس کی کثیر تعداد مثالیں دکنی ادب میں بھی دیکھی جا سکتی ہیں[1] -

اردو زبان میں غنہ کا نہایت مبسوط نظام موجود ہے اور اس کے

---

۱ - دیکھیے میرا مقالہ "قدیم دکنی اور اردو زبان کا تقابلی مطالعہ" مطبوعہ اردو نامہ کراچی شمارہ ۱۸ ، بابت دسمبر ۱۹۶۴ء -

استعمال سے متعلق قطعی اور واضح قواعد ملتے ہیں۔
ان میں سے چند یہ ہے:

(۱) کسی لفظ میں اے (ہ) اور او (ہُ) کے بعد غنہ نہیں آسکتا۔

یہی وجہ ہے کہ ان کو چھوڑ کر باقی ہر سادہ سُر کے مقابل ایک نکّی سُر ہوتا ہے جیسا کہ سروں کے نقشے سے بھی ظاہر ہے۔ اردو کے جن الفاظ میں ان (ہ ں) اور آن (ہ ں) کے مختصر نکّی سر بولے جاتے ہیں وہاں ان کے طویل روپ ہ ں اور ہ ں ہوتے ہیں۔ مثلاً کھنچنا اور کھینچنا۔ سنچنا اور سینچنا۔ گھنگنی اور گھونگنی۔ انگلی اور اونگلی (ہ ں گ ل) وغیرہ کیونکہ ہماری لپی میں یہ اور ہ دونوں کی مختصر صورت زیر اور ہ اور ہ کی مختصر صورت پیش سے لکھی بولی جاتی ہے اور جیسے چیرنا اور چرنا، چھیلنا اور چھلینا، پھیرنا اور پھرنا ، بھیڑنا اور بھڑنا ، سوکھنا اور سکھانا ، بھولنا اور بھلانا ، کھولنا اور کھلنا ، تولنا اور تُلنا وغیرہ۔

(۲) رے سے پہلے ہ ں (اوں) کے علاوہ (جیسے بھونرا، چونری ، جھونرا وغیرہ) اور کوئی نکّی سر نہیں آتا۔

(۳) رھ ، ڑھ ، ل ، لھ ، م ، مھ ، ن ، نھ سے پہلے بھی غنہ نہیں بولا جاتا۔

(۴) ب ، بھ ، پ ، پھ سے پہلے آنے والا غنہ میم کی آواز دیتا ہے بلکہ نب کا مرکب بھی پورے کا پورا میم سے بدل جاتا ہے جیسے لنبا (لمبا ، پنجابی لمّاں) ۔ لنبی (لمبی ، پنجابی لمّی) ۔ تھنب (تھمب، تھم)۔ تھنبا (تھمبا) ۔ تھانبنا (تھامنا) ۔ کھنب (کھمب ، کھم) کھنبا (کھمبا) تنبو (تمبو) ، تنبورا (تمبورا) ، تنباکو (تمباکو ، تماکو) ، تنبولی (تمبولی ، تمولی) ، کنبل (کمبل ، کمّل ، کملی) ، چنبل (چمبل ، چمل) چنبیلی (چمبیلی ، چمیلی) ، نینبو (نمبو) ، کُھنبی (کُھمبی ، کھمی) رنبھا (رمبھا) ، سنبھال (سمبھال ، سمھال) ، گنبھیر (گمبھیر) ، جنبھائی

(جمھائی) ، چُنبک (چُمبک ، چمکّ) ، چنبا (چمپا) ، چنپئی (چمپئی) ، چنبت (چمپت) ، کھبنی (کھمبی بمعنی جھینگ ، کوپل)، گُنبھا (کُنبھا) وغیرہ لیکن مجھے یہ اصول آریائی زبانوں سے مستعار معلوم ہوتا ہے۔ اس پر مزید تحقیق کرنے کی ضرورت ہے -

(۵) لفظ کا آخری غنہ پچھ لگوے (لاحقے) کے اضافے کے بعد مرکب کے آخر کو منتقل ہو جاتا ہے -

اس قاعدے کی وضاحت کے لیے ذیل میں چند الفاظ کا تجزیہ پیش کیا جاتا ہے :

دائیں (وا ء ں)=وان + ء (سمت ظاہر کرنے والا پچھ لگوا جیسے آگے=آگ + ء - پیچھے=پچھ + ء - نیچے=نیچ + ء) -

بائیں (بٰ ء ں)=باں + ء -

دائیں (دٰ ء ں) طرف=داں + ء (مؤنث نسبتی کا پچھ لگوا) طرف -

بائیں (بٰ ء ں) طرف=باں + ء (مؤنث نسبتی کا پچھ لگوا) طرف -

دایاں (دٰ ی ں) ہاتھ=دائیں + ءٰ (مذکر نسبتی کا پچھ لگوا) - دائیں کا - دائیں طرف کا - دائیں سمت کا -

بایاں (بٰ ی ں) ہاتھ=بائیں + ءٰ (مذکر نسبتی کا پچھ لگوا) - بائیں کا - بائیں طرف کا - بائیں سمت کا

سئیاں (شوہر)=سائیں + آ (حشوی پچھ لگوا) اور سائیں=سال + ای (نسبتی پچھ لگوا جیسے دھوبی ، بھنگی - سوتی وغیرہ) -

یعنی سئیاں=ساں + ء + ا جیسے لاہور سے لاہوریا ، قنوج سے قنوجیا ، دکھ سے دکھیا وغیرہ -

رواں (نرم بال)=روں + آ

دھواں=دھوں + آ

کنواں = کون + آ

اردو زبان میں غنّہ کے بولنے کا چلن غیر دراوڑی زبانوں کے مقابلے میں جتنا زیادہ ہے غنّہ کے حذف و سقوط کی مثالیں بھی اتنی ہی کثرت سے ملتی ہیں - عام طور سے ُسر کے مختصر ہو جانے پر غنّہ کے بولنے میں دقت اس کے سقوط کا باعث بن جاتی ہے - ُسر کے سکڑنے کے جو موقعے پیش آتے ہیں - ان کی تفصیل حسب ذیل ہے :

(۱) ایک ہمہ گیر اصول یہ ہے کہ جب کسی ابسر پر تشدید آ جاتی ہے تو اس سے قبل کا ُسر مختصر اور غنّہ ساقط ہو جاتا ہے - مثلاً اٹّا (آنٹا) ، اٹّی (آنٹی) بٹّی (بانٹی) ، بجھّا (بانجھا) ، بکّ (بنک ، ہنکارنا اسی مادے سے بنا ہے) - بھجّی (بھینجی) ، بتّی (باتی - چندہ - ورق) ، درخت وغیرہ) - ُچکّی (چونکی) ، ڈھکّا (ڈھانکا) ، سجّا (سانجھا) ، کپّڑ (کانپڑ) ، کھجّا (کانجھا) ، گتّھی (گونتھی) ، گتھّی (گھونٹی) ُمٹّھی (مونٹھی) ، مچھّلی (مونچھل) ، ہتّا (ہنتا ، مارنے والا) وغیرہ -

(۲) بولوں کے ابتدائی رکن کا غنّہ بھی بہت سے مقامات پر غائب ہو گیا ہے - یہ غالباً ہمارے لہجے کا اثر ہے جس میں بول کا پہلا ُسر مختصر کر دیا جاتا ہے جیسے اٹاری (اٹاری ، آنٹاری) ، اٹکنا (آنٹکنا) ، آٹنگا (اونٹنگا) ، اٹیرن (آنٹیرن) ، اٹیرنا (آنٹیرنا) ، اچانا (اونچانا) اچکنا (اونچکنا) ، اچلا چال (اونچلا چال) ، اچلک (وانچلک) ، اکانا (اونکانا) ، اکڑنا (آنکڑنا) اکھاری (اونکھاری) ، بٹیر (بانٹیر) ، بدھیا (بندھیا ، باندھیا ، یعنی بالجھیا) ، بکنا (ہنکنا) ، ہسانا (ہنسانا ، ہنس بمعنی ہانی) ، ہسلی (ہانسلی) ، ہکھال (ہنکھال) ، ہکھیرو (ہنکھیرو) ، پھٹکنا (پھانٹکنا) ُپھکنی (پھونکنی) ٹکا (ٹنکا) چھٹکنا (چھینٹکنا) ، چھٹی (چھانٹی ، چھنٹی) ، ِچھٹا ہوا ، (چھنٹا ہوا ، چھانٹا ہوا) ، ڈھکنا (ڈھنکنا دھکنا) سکڑا (سنکڑا ، سانکڑا) ، گھسنا (گھنسنا ، گھونسنا) ، ُمسکا (مونس کا) وغیرہ -

(۳) مرکّب بولوں کے دوسرے جزو کا غنّہ بھی اکثر مقامات

ہو گر گیا ہے مثلاً آمڈا (امنڈا، امنڈنا سے)، آمکا، (آمنکا، آمنک سے)، بھرکی (بھرنکی)، جھلکا (جلھنکا) ، گھمڈ (گھمنڈا، گھمنڈنا سے) - پلدی (پلاندی، پراندی ، پراندوالی) ، تلگو (تلنگو) وغیرہ -

(۴) بعض بولوں کے آخری حرف کی تشدید غائب ہوگئی ہے لیکن ان کا غنہ واپس نہیں آیا ہے جیسے بدھ (بدّھ باندھ یعنی باجھ) - تک (اصل ٹکّ، پھنک، پھانک) - دھت (دھت، اسی سے دھتّی بنا ہے - دھانت بمعنی تواتر) سچ (سچّ ، سانچ) - کھٹ (کھٹّ بمعنی برا ، کھانٹ) -

(۵) فعل متعدی سے لازم بناتے وقت جب اُسر مختصر ہو جاتا ہے تو کبھی غنہ گر جاتا ہے اور کبھی سنائی دے جاتا ہے - جیسے بانٹنا سے بٹنا ، بھونکنا (چھبونا) سے بُھکنا ، بھینچنا سے بھنچنا اور بھچنا، بھونکنا سے بھنکنا اور بھکنا ، ٹھانسنا سے ٹھنسنا اور ٹھسنا ، ٹھونکنا سے ٹھکنا ، جھونکنا سے جھکنا ، چھانٹنا سے چھٹنا ، سینچنا سے سنچنا اور سچنا ، کھینچنا سے کھنچنا اور کھچنا ، گانٹھنا سے گٹھنا ، گھونٹنا سے گھٹنا وغیرہ لیکن آنچنا سے انچنا ، پھانسنا سے پھنسنا ، دھانکنا سے دھنکنا ، مانجھنا سے منجھنا، مانگنا سے منگنا - موںڈنا سے منڈنا وغیرہ ابھی تک غنہ کا وجود ظاہر کر رہے ہیں -

مرکّب آوازیں

اُردو زبان میں چار مرکب آوازیں ملتی ہیں جن میں سے دو سُر ہیں - اَو (ہٗ) اور اَے (اٰآ) - ان کی تشریح یہ ہے :

اَو (ہٗ)=اَو (ہُ ہٗ) جیسے بچھونا (بچھاونا) کھلونا (کھلاونا) - گھنونا (گھناؤنا) - بولانا (باولانا) - بورا ,(باورا) پھونی (پھاونی) - کسوٹی (کساوٹی) - چکوتا (چُکاوتا) وغیرہ -

اَے (اٰآ)=اَے (ہٗ ہٖ) جیسے ہے ہے (ہائے ہائے) - پیجامہ (پائجامہ) پیخانہ (پائخانہ) - فیر (فائر) -

اُسروں میں میم اور نون مرکّب آوازیں ہیں - ان میں سے ہر ایک دو دو آوازوں کے برابر ہوتا ہے جن میں سے ایک غنہ ضرور ہوتا ہے یعنی ان کی مقدار دوسرے اسروں سے بقدر یک غنّہ بڑھی ہوئی ہے - اس نکتے کی وضاحت کے لیے ذیل میں کچھ مثالیں درج کی جاتی ہیں -

م=(۱) غنّہ اور ہمزہ جیسے گام (گانو) - لہام (لہانو) - نام (نانو) - جھاما (جھانواں) - دھیمر (دھینور) - مکر (کنور) کمل (کنول) وغیرہ -

(۲) غنّہ اور اسر جیسے بم (بانس) - دام (دانگ) - رام (رنگ - عیش) - رمنا (رنگنا - تفریح گاہ) وغیرہ

ن=غنّہ اور اسر جیسے سنترہ (سنگترہ) - چُنری (چندری) - رن بھوم (رنگ بھوم - رزم گاہ) کھنڈ (کھنڈ - منزل - ٹکڑا) - بیھان (بھانج - ریزگاری) - بان (باغ - بنج - تجارت) بھن بیری (بھنڈ

پیری - منحوس) - پنجابی رن (اردو رانڈ - عورت) - کانا (کانڑا) - فارسی نان (عام محاورہ اردو - نانْد) - تنور (عام محاورہ اردو - تندور) - بھونا (بھونجنا) - بھاننا (بھانجنا - بل دینا) ین (ہنڈ بمعنی کپاس بنڈی بمعنی روی کی سرزی) ہُن (ہنڈ ہُنلی بمعنی ہُن والی یعنی بینک کا چیک) وغیرہ

ان مثالوں سے ثابت ہوتا ہے کہ اردو کا دندانی نون اور شورسینی پراکرت (پنجابی ، راجستھانی وغیرہ کا مخی نون (جو دراصل غنّہ اور ڑ کا مرکب ہوتا ہے) مقدار اور نوع کے اعتبار سے ایک ہی ہیں اور ہمارے نون کے غنّہ میں تبدیل ہو جانے کی تشریح بھی یہی ہے کہ اس صورت میں نون کی جگہ غنّہ کے ساتھ ساتھ کوئی نہ کوئی اسر بھی نمودار ہو جاتا ہے جیسا کہ مندرجہ بالا مثالوں سے واضح ہے - اس کے علاوہ چونکہ م ، مہ اور ن ، ننہ بھی انفی آوازیں ہیں یعنی ان میں غنّہ چھپا رہتا ہے اس لیے غنّہ کی طرح ان سے قبل بھی آ اور ؤ کے طویل سُر نہیں آتے - ان سے پہلے زیر اور پیش کی جو حرکات ہمیں اپنی تحریروں میں نظر آتی ہیں ان کی طویل شکلیں ے اور ؤ ہوتی ہیں جیسے ڈھمّا (ڈھ مْ) - چمٹا (چِ م ٹْ) - چمدا (چِ نْ ک) کُمّا (کُ مْ) - چمّا (چِ مْ) - امڈا (ءِ م ڈْ) اُمنگ (ؤ مَ ن گ) - بھنک (بھ نْ ک) پنک (پِن ک) - گُھن (گھُ ن) گُھنّا (گھُ نْ) - بُھن (بھُ ن) - چن (چِ ن) چُنی بھسی (چِ نِ بھوسی) وغیرہ -

م ، مہ اور ن ، نہ جب کسی بول کے آخر میں آتے ہیں تو ان کے بعد بھی آ اور ؤ کے سُر نہیں بولے جاتے بلکہ ان کی جگہ ایں (ء ں) اور اوں (ء ں) کی آوازیں نکالی جاتی ہیں مثلاً دیکھیے ہے (جی نہیں بھرتا) کھانے سے (پیٹ بھر جاتا ہے) میں ہم آ کی آواز نکالتے ہیں لیکن دیکھنے سے - کھانے میں - میں نے کہا - جھوٹے سے - تھامے سے وغیرہ کون

اور م کے بعد ہ ن کی مدد سے دیکھنیں سے ۔کھانیں میں ۔ میں نیں کہا ۔ جھومیں سے ۔ تہائیں سے بولتے ہیں اور بولنے پر مجبور ہیں کیونکہ ہماری زبان کا قاعدہ ہی یہ ہے ۔ اسی طرح علامت تانیث ؑ (اُو) بھی م اور ن کے بعد ؑ ں (اوں) سے بدل جاتی ہے مثلاً بِلّو ۔ کُتّو ۔ کلو وغیرہ میں تو ؑ (اُو) کی آواز صاف نکلتی ہے لیکن بنو ۔ منو ۔ ڈنو ۔ چھمو اور ممو کو ہم بنوں ۔ منوں ۔ ڈنوں ۔ چھموں اور مموں بولتے ہیں ۔

دخیل آوازیں

اردو زبان میں کچھ آوازیں عربی فارسی سے بھی آ گئی ہیں جن میں سے بعض (ث ، ص ، ح ، ط ، ع) ہماری تحریروں میں نظر آتی ہیں اور کُچھ (خ ۔ ذ ۔ ز ۔ ش ۔ ض ۔ ف ۔ ق) ہمارے بولوں میں داخل ہوکر زبانوں پر بھی چڑھ گئی ہیں ۔ ان دونوں قسموں کی مثالیں نیچے دی جاتی ہیں ۔

(۱) مکتوبی دخیل آوازیں (ث ۔ ح ۔ ص ۔ ط ۔ ع) ۔

ث ۔ ص (بجائے س) ۔ آثار (آسار ۔ دیوار کی چوڑائی) ۔ ثار (سار ۔ سیر) ثابت (سابت ۔ سابوت بمعنی مکمل ، پورا) ۔ صفا (سپا) ۔ صفائی (سپائی) ۔ صفایا (سپایا ۔ صفم صفا (سپّم سپّا) ۔ صلواتیں (سل باتیں) ۔ سرائی (سراسی) اصیل (اتسیل ۔ ماما) ۔ صافہ (سپایا ۔ پگڑی) ۔ صحنک (سہنک ۔ تھالی) ۔ صفیلہ (سپیلا ۔ ستون ۔ پشتی بان) ۔ مُصلّی (مُسلّی ۔ ایک ذات جو مسلمان ہوگئی ۔ چوہڑ) ۔ مصری (مسری ۔ میٹھی) ۔

ح (بجائے ہ اور ہمزہ) ۔ احدی (ایدی ۔ موٹا تازہ جو ہل نہ سکے) احوال (آوال ۔ خبر) ۔ تلاحی (تلائی ۔ ترکاری ۔ سبزی) ۔ حاطہ (ہاتا ۔ آتا ۔ گھیرا ۔ چار دیواری) ۔ حال چال (ہال چال ۔ ہلن چلن بمعنی طور طریقہ ۔ رنگ ڈھنگ) ۔ حقہ (ہکا) ۔ حلوان ۔

(پلوان - الون - نرم) - حوالات (ہولات - اولات) - حوالی موالی (پالی مالی) - حوضیہ (ہودیا) - حونق (ہنک) مضحک (سہنکیہ تہالی) - محال (مہال - رقبہ آراضی) - محاورہ (مہاورا - عادت - لپکا) - محل (مہل - عورت) ملاحیاں (ملائیاں) -

ط (بجائے ت) - بساط (بسات - بوتا - طاقت) - بساطی (بساتی) - بسطغ (بتنک) - طاسہ (تاسہ - تاشہ) - طبلچی (تبلچی) - طبلی (چندیا - تبلی) - طرآر (ترآر) - طرارا (ترارا) طراوت (تراوت) - طرح (ترا) - طلا (تلا - مالش کا تیل) - طنبو (تنبو - تمبو) - طنبورا (تنبورا تمبورا) - طوطا (توتا) - طے کرنا (تے کرنا - لپیٹا) - واسطے (واستے - باستے - کے لیے) -

ع (بجائے ہمزہ) - جعل (جال) - جعلیا (جالیا) - عاری (آری - عاجز) - عرصہ (ارسا - مدت - دیر) - عمدہ (آمدا - آمڈا) - عمل ہائی (امل ہائی) - عندیہ (اندیا) - عین (آین - ٹھیک - بالکل) معرکے کا (مار کے کا) لعل (لال) -

(۲) ملفوظی دخیل آوازیں (خ - ذ - ز - ش - ض - غ - ف - ق) -

خ (بجائے ک - کھ) - بخاری (بکھاری) - بختے (بکتے) - بخرا (بکھرا) پٹاخا (پٹاکا) - تڑاخا (تڑاکا) - تڑخنا (تڑکنا) - تماخو (تماکو - تماکو) - تیخی (تیکھی) - لخ لخ (لک لک) - لخنا (لکنا) - لڑخانا (لڑکانا) - لڑخنا (لڑکنا) - چھنخ - (چھنک) - چٹاخ (چٹاک) - چٹاخ پٹاخ (چٹاک پٹاک) - چٹاخا (چٹاکا) - چٹخا (چٹکا) چٹخارا (چٹکارا) - چٹخانا - (چٹکانا) - چٹخنا (چٹکنا) - چٹخنی (چٹکنی) - چرخا (چرکھا) - چیخنا (چنکنا) - خٹا (کھٹا) - خدکا (کدکا) خرآنا (کھرآنا) - خرانٹ (کھرانٹ) - خستہ (کھستا - بوسیدہ - ٹکڑے ٹکڑے) - خسرہ (کھسرا - ایک بیماری - فصلی پیداوار کا نقشہ) خشکا (کھشکا - ابلے ہوئے چاول - بے مروت آدمی) - خصم (کھسم) - خصّی (کھسّی) - خلاصی (کھلاسی) - ریخ

(ریکھ ۔ لکیر) ریختہ (ریکھتا) سُلغا (سُلکھا) سُوخا (سوکھا) سوختہ (سوکھتا ۔ جاذب) گل خپ (گل کھپ) ۔ مخالص (لکھالس)۔

ذ ۔(بجائے ج) ۔ ذات (جات) ۔ مذاق ۔ مزاخ (مجاک) ۔

ز (بجائے ج ۔ جھ) ۔ الگیزنا (انگیجنا) ۔ بازیب (باجیب) ۔ پزادہ (پجاوا) پزار (پجار) جازم (جاجم) ۔ جہازی چھا لیا (جاجی چھا لیا) ۔ جہیز (جالیج) ۔ رزائی (رجائی) ۔ زپاٹا (جھپاٹا) ۔ زٹل (جھٹل) زڑ (جھڑ) ۔ زق زق بق بق (جھک جھک بک بک) ۔ زنّاٹا (جھنّاٹا) زیٹ (جھیٹ) ۔ ساز (ساج ۔ سجاوٹ کا سامان) ۔ گزی (گجی) ۔ پزارا (پجازا) ۔ بزاری بزاری (بجاری بجاری ۔ اصل بنجاری بنجاری) ۔

ش (بجائے س) ۔ آشفلہ ۔ آشقلہ (آسکلا) ۔ ہیچ کش (ہیچ کس) شپّا (سپّا) ۔ شدّے (سدّے) شُد بُد (سدھ بدھ) شرّاٹا (سرّاٹا) شُروا (سروا) ۔ شِشکاری (سیسکاری) ۔ شُور بُور (سُور بُور) ۔ شہانی (سہانی چوڑیاں ۔ دھانی) ۔ شیخی (سیکھی) ۔کُشتی (کُستی) ۔ لشتم پشتم (لسٹم پسٹم) ۔ مشکیں باندھنا (مسکیں باندھنا) ۔ ہُشکارنا (اُسکارنا) ۔

ض (بجائے ج) ۔ رضائی (رجائی) ۔ ضامن (جامن) ۔ ضبط (جبت ۔ قرق) ضبطی (جبتی ۔ قرقی) ۔ ضدّی (جدّی) ۔ ضلع (جلا) ۔

غ (بجائے گ) ۔ بغیا (بگیا) ۔ بُغارا (بُگارا) بُغدا (بُگدا) ۔ جُغادری (جُگادری) ۔ دوغلا (دوگلا) ۔ ریغل (ریگل) ۔ غالیا (گالیا) ۔ غبارا (گبّارا) ۔ غپ (گپ) ۔غبی (گبی) ۔غٹ (گٹ) ۔ غٹ ہٹ (گٹ ہٹ) ۔ غُتّا (گتّا) ۔ غٹکنا (گٹکنا) غچا (گچّا) ۔غچلا (گچلا) غدار (گدار ۔ بہت آباد شہر ۔ معمورہ) غرارا (گرارا) ۔ غرہ (گُرّا ۔ فاقہ ۔ ناغہ) ۔ غڑپ (گڑپ) ۔ غصہ (گسا ۔ ناخوش) ۔ غُصیل (گُسیل) ۔ غف (گپھ) ۔ غُلک (گُلک) ۔ غلیل (گلیل) ۔

غنڈا (گنڈا) غینغینا (گینگینا) ۔ کلغی (کلگی) ۔ مرغا (مرگا) ۔ مرغی (مرگی) ۔

ف (بجائے پ، پھ) ۔ برف (برپھی) ۔ جفتہ (جپھتا) ۔ سُلفا (سُلپا) ۔ فالتو (پھالتو) ۔ فتو فقیری (پھتو فقیرنی) ۔ فٹافٹ (پھٹا پھٹ) ۔ فق (پھک) ۔ فراٹا (پھراٹا) ۔ فارخطی (پھارکھتی) فرنٹ (پھرنٹ) ۔ فضیحتا فضیتا (پھجیتا) فاقہ فقر (فاقہ پھکڑ) ۔ فقط حال (پھکت حال ۔ مفلسی کے لیے) فلان (پھلان ۔ اندام نہانی) ۔ فلیتہ (پھلیتا) ۔ فن (پھن ۔ پھند) ۔ فند (پھند) ۔ فنس (چنبس) ۔ فوارہ (پھوارا) ۔ فوں فاں (پھوں پھاں) ۔ فی (پھی ۔ کمی) ۔ فیتا (پھیتا) ۔ فیل (پھیل) ۔ فیل پائی (پھیل پائی) ۔ فلیا (پھلیا) ۔ کافور (کپور) کوفتہ (کوپتا) کف (کپھ) لفنگا (لپنگا) ۔

ق (بجائے ک) ۔ بقا (بکا ۔ دھونیں کا) ۔ پٹاقہ ۔ پڑاقہ (پڑ کا ۔ پڑاکا) ۔ تڑاقا (تڑاکا) ۔ تڑقنا (تڑکنا) ۔ چپرقناتیا (چپرکناتیا) ۔ سابقہ (ساوکا ۔ ساتھ سنگت ۔ واسطہ) ۔ قتلا (کتلا) ۔ قرابین (کڑابین) قرولی (کڑولی) ۔ قسائی (کسائی) ۔ قلا (کلا) ۔ قلابہ (کلاوا) ۔ قُلانچ (کلانچ ۔ چھلانگ) ۔ قلمی (کلمی) ۔ قلقاری ۔ (ککاری) ۔ قلندری (کلندری ۔ چھولدادی) قنات (کنات) ۔ قوال (کبّوال) قینچی (کینچی) ۔ لقا (لکا ۔ ایک قسم کا کبوتر) ۔ لقات (لکات) ۔ لُقا (لکا) ۔ لقندرا (لکندرا) ہینق ۔ ہونق (ہیبک) ۔

اسی طرح و ، ی اور ہ کی آوازیں بھی دوسری زبانوں کے اثر سے اردو کے بولوں میں داخل ہوگئی ہیں ۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ جتنی کثرت سے و ، ی اور ہ کے حروف ہماری لپی میں نظر آتے ہیں اتنی کثرت سے ان کی آوازیں ہماری بول چال میں نہیں ملتیں اور جہاں یہ آوازیں بول چال میں داخل ہوگئی ہیں وہاں بھی ان کی کمزوری اور تزلزل کا یہ عالم ہے کہ ایک ہی بول میں کبھی ایک آواز سنائی دیتی ہے تو کبھی دوسری ۔ یہ حقیقت اس طرف اشارہ کرتی ہے کہ ہماری

بول چال میں بھی ان کا جس قدر داخلہ ہوا ہے وہ بیشتر لپی کا رہین منت ہے مثال کے لیے یہاں چند بول درج کیے جاتے ہیں جن کی املا میں اب تک بے قاعدگی چلی آ رہی ہے ۔

ہواو اور ہیاو ۔ باوان اور بایان ۔ باؤٹا اور بائیٹنا ۔ گونٹھانا اور گونٹواانا ۔ بھوار اور بھہار ۔ فوارہ ، پھوہارا اور پھوہارا ۔ تلاؤ اوز تلیّا ۔ نیا ، نئی اور نویلا ۔ ناؤ اور نوّا ۔ آہٹ ، آوٹ اور آٹ ۔ نباہ ، نبھاہ اور نبھاو ۔ چاہ اور چاو ۔ ٹھہرنا اور ٹھیرنا ۔ بانہہ اور بانو ، چھانہہ اور چھانو (چھاؤں) وغیرہ ۔

اب میں کچھ ایسے الفاظ پیش کرتا ہوں جن میں و ، ی اور ہ ابھی تک صرف مکتوبی ہیں ۔ ان کی آوازیں ہماری زبانوں پر جاری نہیں ہوتیں ۔ ان میں و اور ی کی کثرت ہے ۔ ہائے ہوز نسبتاً کم الفاظ میں ملتی ہے ۔

واو مکتوبی ۔ چاو ۔ جاو ۔ سونا ۔ دھونا ۔ بھاڑو ۔ جھاڑو ۔ بھڑوا ۔ بچھونا ۔ کھلونا ۔ نوا ۔ بروکھوا ۔ کوا ۔ کموا ۔ کماد ۔ اتارو ۔ جیوں ۔ تیوں ۔ یوں ۔کیوں ۔کون ۔ لون ۔ نونی ۔ ہونی ۔ بونا ۔ چلو ۔ سنو ۔ بولو ۔ چونری ۔ بھونری ۔ چوڑا ۔ سوکھا ۔ چونا ۔ گھوڑا ۔ کوڑا وغیرہ ۔

ہائے مکتوبی ۔ لینا ۔ دینا ۔ پینا ۔ سینا ۔ کھینا ۔ میلا ۔ جیسا ۔ تیسا ۔ ویسا ۔ ایسا ۔ بیٹھ ۔ پینٹھ ۔ بھینس ۔ چلیے ۔ سنے ۔ پیٹ ۔ بیل ۔ پہلا ۔ چترا ۔ تیلی وغیرہ ۔

ہائے ۔ مکتوبی ۔ چھوہارا ۔ تہاہ ۔ کہوہ ۔ لھوہ وغیرہ ۔

اب وہ الفاظ ملاحظہ فرمائیے جن میں و ، ی اور ہ کی آوازیں نکالی جاتی ہیں ۔ یہ آوازیں ہماری زبانوں پر عکس لپی کی وجہ سے چڑھ گئی ہیں کیونکہ لفظوں کی بناوٹ پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ جزو کلمہ نہیں ہیں بلکہ ہمزہ کا بدل ہیں اور سُر کا مدار نبی ہوئی ہیں ثبوت کے لیے ان لفظوں کی اصلی شکلیں بھی دی جا رہی ہیں ۔

واؤ ملفوظی - (۱) بعض بولوں میں اس کا اندراج حشوی ہے جیسے ہنلوی (ہندی - ہند کی) - ہنلوئی (ہنڈی - ہنڈ بعنی ہن کے سکّے والی) - منلوی (منڈی) - کلوار (کلال یا کلار - شراب بیچنے والا - شراب کو کالا پانی کہتے ہیں) - آوے ، جاوے ، دھووے ، رووے ، ہووے جیسے الفاظ اس زمرے میں بھی شمار کیے جائیں تو ان کی اصل بھی آئے (آہ) - جائے (جاہ) - دھوئے (دھوہ) - سوئے (سوہ) - ہوئے (ہوہ) ۔ ٹھیرتی ہے ورنہ یہ دوسری زبانوں کے مصادر آونا - جاونا - دھوونا - سوونا - ہوونا سے بھی مشتق مانے جا سکتے ہیں -

(۲) کبھی کبھی واو پیش کا بدل بھی ہوتا ہے جیسے دُتنا (اُتنا) وہاں (اُہاں) - وہی (اُہی) ورے (پرے کی ضد - ارے) دہ یا دو (او - ہ) وغیرہ -

(۳) کہیں کہیں واو الف کی جگہ بھی آ جاتا ہے جیسے دارنا (آرنا - نوچھاور کرنا - امن سے لفظ آرتی بنا ہے) - واری (آری قربان) دار ہار (آر ہار) وغیرہ

(۴) واو بعض اوقات میم کی جگہ بھی نظر آ جاتا ہے جیسے وار (مار - منافع ہونا) - دارا کھانا (مارا کھانا - منافع ہونا) - برج کے علاقے میں وہاں کو عوام مہاں بھی بولتے ہیں -

(۵) واو کہیں کہیں ب کا بدل بھی ہوتا ہے جیسے کروٹ (کر بمعنی کمر اور بٹ بمعنی بل سے) - سلوٹ (سل بٹ) وار (بار - موقع - فرصت) - وارا (بارا) - وال (بال) - والا (بالا) وغیرہ -

ہائے ملفوظی - یہ حرف ہر مقام پر ہمزہ کی جگہ بولا جاتا ہے جیسے :

یہ (ہ - اے) - یہاں ، ہاں (اہاں - ہ ہ ں) یہی (ہ ہ) - ہوں (ہ ہ ں) ہاہل (ہائل) - گھاہل (گھائل) - باہل (بائبل) - پنچاہت (پنچائت) - ناراہن (نارائن) - راماہن (رامائن) - اندراہن (اندرائن) - ناہک (نائک) - ناہکا

(ناٹکا) - کھایا (کھا آ) - پایا (پا آ) - دھویا (دھو آ) - رویا (رو آ) - گھڑیا (گھڑی آ) - پھڑیا (پھڑی آ) - مکھیا (مکھی آ) - (کٹیا - کٹی آ) - دایاں (دائیں آ) - بایاں (بائیں آ) - سیاں (سائیں آ) - بھیا (بھئی آ - بھائی آ) - میا (مئی آ - مائی آ) - ڈھیا (ڈھئی آ - ڈھائی آ) - دکھیارا (دکھ - یہ - آرا) - اندھیارا (اندھ - یہ - آرا) - بھٹیارا (بھی - یہ - آرا) وغیرہ -

ہائے ملفوظی - (۱) بعض اوقات الفاظ میں اس کا فالتو اندراج ملتا ہے جیسے -

اہرا (ابرا) - اکہرا (اکیرا) - سنہرا (سنیرا) - رُہیلا (رُہیلا) - پہلو بچانا (پہلو بچانا) - یہ (اُ) وہ (اُ) - ہاں (آں) - یہاں (یہ اں) وہاں (وہ اں) - وہی (وہ ی) - یہی (یہ ی) - چاہے (چاہے) - ہی (و جیسے آپی - آپ ہی - مجھی کو - مجھ ہی کو) - ہار - ہارا (آر آرا) - سرنہار (سرن آر - سرنار) - جانہار (جان آر - جانار) - لکڑ ہارا (لکڑ آرا) - ہم (ام) - ہمارا (امارا) - ہتیا (اتیا - ات بمعنی ظلم - زیادتی) - ہتنا (اتنا - مار ڈالنا ظلم کرنا) ہتیار (ایتار - مار ڈالنے والا آلہ) ہتیارا (ایتارا - ظالم - قاتل) انہوت (ان بمعنی نہیں - اوت بمعنی فائدہ - بہت - ان اوت) - گھبراہٹ (گھبراٹ) - وندناہٹ (وندناٹ) - جھنجلاہٹ (جھنجھلاٹ) ہاری (آری - عاجز - موجودہ املا عاری) وغیرہ -

(۲) اردو کے کثیر تعداد الفاظ ہائے ہوز مہاہران کے جزو کے روپ میں ملتی ہے جیسے -

نباہنا (نبھانا) نہانا (نہانا) - گہن (گھن - گھین) - گہا گہمی (گھا گھمی) - بہن (بھین) پہاڑ (پھاڑ) دہکنا (دھیکنا) - دہکانا (دھیکانا) - ڈہکانا (ڈھیکانا - اسی مادے سے ڈھکوسلا بنا ہے) دہلنا (دھیلنا) - باہر (بھار) - پہننا (پھننا - پھندنا جیسے لذا پھند) - پہلی (پھلی - پھیری - پھیر والی) - - دہی (دھئی) - بہت (بھوت) - لوہا (لھوآ) - لہار (لھوآر) کمہار (کمھار) - لہو - لوہو (لھوو) ٹہوکا (ٹھوکا) پہیا (پیا) - پہیہا

(بِہا) لہر (لہیر) نہرنی (لہرنی - نہیرنی) وغیرہ -

غرض یہ ہے کہ و ، ی اور ہ بھی ہماری زبان کی بنیادی آوازیں نہیں ہیں کیونکہ ان کے استعمال میں آج بھی بے قاعدگی نظر آ رہی ہے - ہماری تحریر میں یہ حروف بیشتر طویل سُروں کو ظاہر کرنے میں مدد دیتے ہیں جیسا کہ سُروں کے نقشے سے بھی واضح ہے - کبھی ان کا اندراج حشوی ہوتا ہے - کہیں یہ زیر - زبر اور پیش کی حرکات کا بدل ہوتے ہیں - واو کبھی کبھی ب یا میم کی قائم مقامی کرتا ہے اور ہائے ہوز کثیر تعداد الفاظ میں سہاہران کے ٹکڑے کی حیثیت سے سامنے آتی ہے - اس میں شک نہیں کہ ان آوازوں کو ہماری زبانوں پر چڑھانے میں ایک حد تک ہماری لپی بھی معاون ثابت ہوئی ہے لیکن میرا خیال ہے کہ جس کثرت سے یہ ہماری بول چال میں داخل ہو گئی ہیں اس کثرت کی ذمہ داری تنہا ہماری لپی پر نہیں ڈالی جا سکتی بلکہ اس میں بہت بڑی حد تک آریوں کی زبان کے اثرات بھی شامل ہیں اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ یہ آوازیں اردو والوں کے علاوہ اردو کی دوسری معاصر بولیاں بولنے والوں کی زبانوں پر بھی اسی کثرت سے جاری ہیں اور ان کی تحریروں میں بھی نظر آتی ہیں اور یہ حادثہ کسی زمانۂ قدیم میں رونما ہوا ہے -

اردو کی بنیادی آوازوں کا یہ جائزہ جو مندرجہ بالا صفحات میں پیش کیا گیا ہے میرے نزدیک ابھی مکمل نہیں ہے - اس سلسلے میں بہت کچھ تحقیق کی ضرورت ہے اور بہت سی باتیں دریافت طلب ہیں مثلاً میں اپنی بول چال میں ایک حلقی نون کی آواز بھی پاتا ہوں جس کا ذکر سنسکرت کے گرامر نویسوں نے بھی کیا ہے - یہ نون جنگل (بروزن فعلن) اور کنکر (بروزن فعلن) جیسے الفاظ میں گ اور ک سے قبل آتا ہے اور اپنے خواص میں ہمارے دندانی نون (ن) سے ملتا ہے چنانچہ جب اس سے پہلے کی حرکت کھینچ دی جاتی ہے تو یہ غنہ میں تبدیل ہو جاتا ہے جیسے جنگل سے جانگل (جانگلی - جنگلی) - کنکر سے کانکر اور تخفیف کی حالت میں بھی یعنی ماقبل سُر کو طویل کیے بغیر بھی اسے غنہ میں بدل لیتے ہیں چنانچہ جنگلا اور کنکریلا کو

اس طرح بولتے ہیں کہ اس کی آواز غنّہ سے مشابہ ہوکر بے وزن ہو جاتی ہے اور جنگل اور کنکر کی مقدار محض نمو کے برابر رہ جاتی ہے۔ سنسکرت کے گرامر نویسوں نے اپنی فہرست حروف میں ایک حنکی نون بھی درج ہے لیکن وہ مجھے اردو میں نہیں ملتا البتہ ان کا دیا ہوا مخی نون (نڑ) شورسیلی زمرے کی زبانوں مثلاً پنجابی، راجستھانی وغیرہ میں ضرور بولا جاتا ہے۔

ر - ڑ - ل کے خواص پر بھی کام کرنے کی ضرورت ہے کہ متعدد مقامات پر ان سے پہلے غنہ ساقط ہو جاتا ہے اور صوتی تبادل کی مدد سے بمشکل ہاتھ آتا ہے۔ یہ تینوں آوازیں باہم متبادل ہیں لیکن ان کے تبادل کا نظام دوسری آوازوں کے تبادل کے نظام سے قدرے الگ نظر آتا ہے۔ ان باتوں کے علاوہ ان کے مخارج پر بھی خصوصیت کے ساتھ کام ہونا چاہیے مثلاً رے کی آواز صحیح معنوں میں ان تمام قسموں سے الگ ہے جو اسروں کے نقشے میں دی گئی ہیں۔ اس کے اچار (تلفظ) میں زبان کی نوک یوں کانپتی ہے جیسے ہوا کے جھونکے سے کسی درخت کی پتی پھڑپھڑاتی ہے۔ ڑے کی آواز کو تمام علمائے زبان نے مخی کہا ہے اور یہ ڈ کا بدل بھی ہے لیکن حقیقت میں اس کا مخرج ٹ، ڈ سے مختلف ہے۔ لام کی بھی میں نے تین آوازیں سنی ہیں۔ ایک حنکی جو بالعموم اسریکی لوگ نکالتے ہیں۔ دوسری مخی جو ملیالم بولنے والوں سے سنی جا سکتی ہے[1] اور تیسری دلدانی جو ہم اردو والے بولتے ہیں۔ غرض اردو زبان کی بنیادی آوازوں پر مختلف جہات سے ابھی بہت کچھ کام ہونا باقی ہے۔

(مطبوعہ سہ ماہی نقوش لاہور اکتوبر ۱۹۶۴ء)

---

(۱) ممکن ہے ل اور ڈ یا ڑ کے تبادل کا سبب یہی اتحاد مخرج ہو۔

قدیم مہاپران اردو میں

لفظ "مہاپران" قدیم ایرانی زبان کا ایک مرکب ہے۔ اصطلاحاً اس سے وہ آواز مراد لی جاتی ہے جو گہری سانس سے پیدا ہوتی ہے۔ چنانچہ وہ حروف جن کو سینے کے زور سے ادا کیا جاتا ہے، مہاپران کہلاتے ہیں۔ مثلاً کھ، گھ، بھ، پھ وغیرہ۔ ان کے مقابلے میں وہ حروف جو ہلکی آواز سے ہی ادا ہو جاتے ہیں "الپ پران" کہلاتے ہیں۔ مثلاً ک، گ، ب، پ وغیرہ۔ حروف تہجی کی اس تقسیم کا علم ہمیں سنسکرت کے گرامر نویسوں سے ہوتا ہے جنہوں نے مخارج کے اعتبار سے ان کے درجے قائم کرکے ہر درجے میں مہاپران اور الپ پران کے جوڑے بنا کر رکھ دیے ہیں۔ اسی کے باعث مستشرقین نے بھی دیوناگری لپی کو بہت سراہا اور اسے دنیا کی لپیوں میں سب سے بلند مقام عطا کیا۔ انہیں لوگوں کی تحقیق سے یہ راز بھی دنیا پر منکشف ہوا کہ ویدک زبان کا سلسلہ قدیم ایرانی کے توسط سے قدیم ہند یورپی زبان تک پہنچتا ہے لیکن جب ویدک کا قدیم ایرانی یا قدیم یونانی و لاطینی سے موازنہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ ان دونوں زبانوں کے مقابلے میں ویدک میں مہاپرانوں کی تعداد کہیں زیادہ ہے۔

ذیل میں ان کا تقابلی نقشہ دیا جاتا ہے:

ویدک مہاپران	یونانی	قدیم ایرانی
(۱)	(۲)	(۳)
کھ	x	خ
گھ		غ
چھ		
جھ		
ٹھ		
ڈھ		

(۱)	(۲)	(۳)
تھ	θ	
دھ		
پھ	ø	ف
بھ		

اس نقشے سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم ایرانی میں صرف تین ہی مہاپران تھے ۔ جنھیں مستشرقین کے قول کے مطابق نرم کر لیا گیا ہے ۔ اگرچہ میں آج ان کے تلفظ سے انھیں مہاپران کی جگہ الپ پران ہی سمجھنے پر مجبور ہوں لیکن اس خیال سے انھیں مہاپران تسلیم کیے لیتا ہوں کہ شاید ان کے قدیم تلفظ میں سینے کے سہارے کی بھی ضرورت پڑتی ہو ۔ اس کے باوجود میں یہ کہے بغیر بھی نہیں رہ سکتا کہ میں نے ایرانی خ ، غ ، ف کو ہمیشہ ویدک کھ ، گھ اور پھ کا بدل بھی نہیں پایا ، بلکہ ان کی آوازیں ویدک کے دوسرے الپ پرانوں سے بھی ادا ہوتے دیکھی ہیں ۔ یونانی کے تین مہاپرانوں کے متعلق بھی یہی بات کہی جا سکتی ہے کہ یہ رگ وید میں ہمیشہ کھ ، تھ ، پھ کا بدل نہیں ہوتے ۔ اس سلسلے میں سب سے زیادہ مزے کی بات یہ ہے کہ مستشرقین جو ویدک زبان کو مکمل طور پر قدیم ہند یورپی زبان سے مشتق گردانتے ہیں ، اس قدیم ترین زبان کے مہاپرانوں کے باب میں یہ فیصلہ دیتے ہیں کہ وہ سب کے سب ویدک میں کمال صحت کے ساتھ محفوظ ہیں اور اس کی دوسری شاخوں سے معدوم ہو چکے ہیں ۔ چنانچہ جوزف رائٹ اپنی کتاب ”یونانی زبان کی تقابلی گرامر“ میں کہتا ہے کہ قدیم ہند یورپی زبان میں کھ ، گھ ، تھ ، دھ ، پھ ، بھ کے مہاپران ہوتے تھے لیکن ان لوگوں کی یہ منطق میری سمجھ میں آج تک نہیں آئی کہ جو علاقے آریوں کے ابتدائی وطن سے قریب ہیں اور جن میں آریوں کا داخلہ ان کے ورود ہند سے ہزاروں سال قبل ہو چکا تھا ، وہ تو اپنی اپنی زبانوں سے قدیم مہاپرانوں کو کھو بیٹھے اور ہزاروں سال بعد کی ویدک زبان میں پہنچ کر وہ از سر نو آموجود ہوئے ۔ اسی طرح اے اے میکڈانل کا اپنی کتاب ”ویدک گرامر“ میں یہ بیان کہ قدیم ہند یورپی زبان میں ”ل“ موجود تھا جو قدیم ایرانی سے غائب ہو کر ویدک زبان میں ابھر آئے

ابھر آیا، کسی منطقی استدلال سے ثابت نہیں ہوتا - اسی لیے میں اس قسم کے قیاسات و مفروضات کو عالم لسانیات کی داستانیں گردانتے پر مجبور ہوں -

اس تمام الجھن کی وجہ یہ ہے کہ ہند یورپی لسانیات کی پہلی اینٹ ٹیڑھی رکھی گئی ہے - ان لوگوں نے یہ کہہ کر کہ آریہ اپنے مسکن قدیم کو چھوڑ کر جہاں جہاں بھی گئے ، ایک فاتح کی حیثیت سے پہنچے ، بڑی عجلت سے یہ نتیجہ بھی نکال لیا کہ انھوں نے مفتوح اقوام پر جہاں اپنی بالا دستی قائم کی ، وہاں اپنی تہذیب و کلچر کے ساتھ ساتھ ان پر اپنی زبان بھی تھوپ دی -

چنانچہ ایک طرف تو ان علمائے زبان نے یونانی، لاطینی ، قدیم ایرانی اور ویدک وغیرہ زبانوں کی کچھ مشترک قدریں تلاش کرکے انھیں متحد الاصل ثابت کرنے کی کوشش کی اور دوسری طرف ان کے باہمی اختلافات کو یہ کہہ کر ٹال دیا کہ یہ مرور ایام اور لسانی ارتقا کے باعث پیدا ہو گئے ہیں - اس باب میں انھیں پراکرت کے گرامر نویسوں سے اور بھی مدد مل گئی جنھوں نے شمالی ہندوستان کی تمام پراکرتوں کو صرف ایک زبان سنسکرت سے مشتق ثابت کرنا چاہا ہے اور یوں ان لوگوں نے نہایت آسانی اور سہولت سے ویدک اور سنسکرت کے ساتھ پراکرتوں کو بھی ہند آریائی قرار دے دیا - ادھر ہند و پاک کے جدید علمائے زبان نے بھی کچھ تو ان گرامر نویسوں کے سمجھانے سے اور کچھ مستشرقین کے کہنے سننے سے اس بات پر صاد کر دیا - اس طرح ان تمام علما کے نزدیک ہند شمالی کی وہ اقوام جو آریوں کے داخلہ ہندوستان کے وقت متعدد مختلف زبانیں بولتی تھیں ، آریوں کے حملوں سے پسپا ہوکر بندھیاچل کے جنوب میں بھاگ گئیں یا پھر ہمالیہ کے پہاڑی علاقوں میں جا چھپیں اور ان میں سے جو تھوڑے بہت آدمی بچ رہے، وہ آریوں کے غلام بن کر انھیں کی بولی بولنے لگے اور یوں وہ قدیم زبانیں جو ہندوستان میں آریوں سے قبل بولی جا رہی تھیں ایک دم ہندوستان کے صفحے سے حرف غلط کی طرح مٹ گئیں - اس قیاس یا مفروضے کے لحاظ سے صرف وہی زبانیں دیسی سمجھی جا سکتی ہیں جو دکن میں بولی

جا رہی ہیں اور اسی لیے اس عجیب و غریب نظریے (نہیں بلکہ مفروضے) میں ہند شمالی کی زبانوں کو ہند آریائی کے سوا کوئی اور لقب دینے کی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی -

مجھے اس نظریے کے مدعیوں پر سخت حیرت ہے جنھوں نے فاتح و مفتوح کے تعلقات کو تاریخ کے شفاف آئینے میں نہیں دیکھا اور یہ نہیں سوچا کہ حاکم و محکوم اقوام میں تہذیب اور کلچر کا لین دین اک رخا نہیں دو رخا ہوتا ہے - یعنی حاکم اگر محکوم کو اپنی کچھ چیز دیتا ہے تو اس کے عوض میں اس کی بھی کچھ چیزیں لے لیتا ہے - میں کیا کوئی بھی اس بات کو تسلیم نہیں کر سکتا کہ حاکم ایک شیشے کے خول میں بند محکوم کے جذب و تاثر سے بالکل الگ تھلگ رہ کر صرف اپنی ہی شعائیں اس پر منعکس کرتا رہتا ہے - یہ کیونکر ممکن ہے کہ ہندوستان کے اس عریض و بسیط برصغیر میں آریوں کی ایک چھوٹی سی جماعت نے اپنی تہذیب تو اس کے کثیر تعداد باشندوں کے سر منڈھ دی ہو اور خود مقامی معاشرت کے اثرات سے بچ رہی ہو - میرے نزدیک جو لوگ اس قسم کے کچھ خیالات ظاہر کرتے ہیں وہ دو تہذیبوں کے تصادم کو سمجھنے کی تاریخی بصیرت نہیں رکھتے - کم از کم ہندوستان میں آنے والوں کے متعلق تو میرا یہ خیال ہے کہ وہ سب کے سب ایک دن "ہر چیز کہ در کان نمک رفت نمک شد" کے مصداق یہاں کی معاشرت میں یوں جذب ہوگئے کہ آج دیسی اور بدیسی عناصر کا سراغ لگانا بھی بہت مشکل ہے - چنانچہ میں تو یہ دیکھتا ہوں کہ فطرت پرست آریوں کے تمام دیوتاؤں میں جس شو اور وشنو کی اتنی دھوم ہے ، وہ قدیم حیوان پرست دراوڑوں کے معبود سانپ اور سانڈ ہیں ، جو خود ان کے نام شیو (= فارسی شیبا = مارافعی) اور وشنو (= پراکرت بجزو = اردو بجار یعنی سانڈ) سے بھی ظاہر ہے اور گو ہندوؤں کے دیوتاؤں میں شیو کا داخلہ نسبتاً بعد میں ہوا ہے لیکن وشنو کی توصیف میں تو خود رگ وید کے شعرا بھی رطب اللسان ہیں ، جنھوں نے اس کے لیے بھجن کے بھجن تصنیف کر ڈالے ہیں - آریائی عقائد میں دراوڑی عقائد کا یہ نفوذ و اثر ان دونوں تہذیبوں کے فکری و جذباتی اختلاط کی ایک ادنیٰ سی مثال ہے -

یہ بالکل صحیح ہے کہ ہر جانے والا اپنی زبان اپنے ساتھ لے جاتا ہے یا آنے والا اپنی زبان ساتھ لاتا ہے لیکن یہ یکسر غلط ہے کہ وہ قدیم باشندوں کی زبان کو نیست و نابود بھی کر دیتا ہے - ہندوستان آنے والوں میں فرنگیوں ، مسلمانوں اور آریوں کے نام لیے جا سکتے ہیں جو انگریزی ، فارسی اور قدیم ایرانی بولتے ہوئے آئے تھے لیکن جس طرح انگریزی یہاں کے عوام کی زبان نہ بن سکی اور فارسی ایک محدود و مخصوص جماعت سے باہر نہ نکل سکی - اسی طرح قدیم ایرانی بھی ہند شمالی کی پراکرتوں کو ملک بدر کر کے ان کی گدی نہیں چھین سکی - البتہ جس طرح انگریزی اور فارسی نے یہاں کی زبانوں پر کچھ اپنے اثرات ڈالے اور کچھ ان کے اثرات خود بھی قبول کیے ، اسی طرح قدیم ایرانی نے بھی پراکرتوں کو کچھ متاثر کیا اور کچھ ان سے خود بھی متاثر ہوئی - چنانچہ میرے نزدیک جہاں یونانی ، لاطینی ، ایرانی اور ویدک کی مشترک قدریں ان کے متحد الاصل ہونے کی دلیل ہیں ، وہاں ان کے اختلافات بھی مقامی اثرات کی نشان دہی کر رہے ہیں اور یوں یونانی و ایرانی کے مقابلے میں ویدک مہاپراتوں کے کثیر تعداد چراغ ہندوستانی لسانیات کی تاریک راہوں میں قدیم زبانوں یعنی پراکرتوں کی منزل کا سراغ دے رہے ہیں -

دنیائے لسانیات میں بالعموم اور ہندوستانی لسانیات میں بالخصوص قدیم زبانوں کے متعلق اس غلط فہمی کا واحد سبب یہ ہے کہ علمائے زبان ، زبان کی مکتوبی شکلوں پر توجہ مرکوز کر کے اس کی ملفوظی روایات کو بالکل نظر انداز کر دیتے ہیں - چنانچہ پراکرت کے گرامر نویسوں سے آج کل کے ماہرین تک سب کی برابر یہ کوشش رہی ہے کہ سنسکرت کے مکتوبی الفاظ سے بھاشاؤں (موجودہ بول چال کی زبانوں) کی آوازوں کو جو پراکرتوں سے پیدا ہوئی ہیں ، کسی نہ کسی طرح مشتق کر لیا جائے اور اس اشتقاق کو صحیح ثابت کرنے کے لیے کلاسیکی سنسکرت کے عہد سے آج تک نت نئے اصول بنتے چلے آ رہے ہیں - اس کے باوجود ہر نئی کوشش گذشتہ کوشش کی طرح ناقص اور ناکام رہ جاتی ہے - میرے نزدیک یہ طریق کار نہ صرف غلط بلکہ بالکل الٹا ہے -

چنانچہ منزل مقصود تک پہنچنے کے لیے سیدھی راہ یہ ہے کہ آواز کو حرف پر ، تلفظ کو لپی پر اور ملفوظی روایت کو املا پر ترجیح دی جائے اور پھر یہ سراغ لگایا جائے کہ قدیم زمانے میں مختلف آوازوں کو قلمبند کرنے کا طریقہ کیا تھا - مثلاً جب گریرسن یہ کہتا ہے کہ سرہٹی میں چاکر کو تساکر او ماجھا کو مادزھا لکھا جاتا ہے تو ہمیں یہ بھی تو دیکھنا چاہیے کہ ان روپوں کا تلفظ وہاں کے عوام کی زبانوں پر چاکر اور ماجھا ہے یا تساکر اور مادزھا اور اگر ملفوظی و مکتوبی آوازوں میں اختلاف ملتا ہے تو تلفظ کو مقدم رکھ کر املا کو نظرانداز کر دیا جائے کہ آواز حرف سے قدیم تر ہے - اسی طرح جب کالڈویل اپنی کتاب "دراوڑی زبانوں کی تقابلی گرامر" میں یہ کہتا ہے کہ دکن کی زبانوں میں سہاپران نہیں ہوتے تو یہ تحقیق ضروری ہو جاتی ہے کہ وہ لپی سے تو مغالطے میں نہیں آ گیا ہے ، یعنی کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ ان زبانوں میں سہاپران اور الپ پران کے لیے ایک ہی مکتوبی علامت مقرر ہو اور جب یہ بات ملفوظی آوازوں کی کسوٹی پر درست ثابت ہو تو سہاپران کو شمالی اور جنوبی ہندوستان کی زبانوں میں ما بہ الامتیاز قرار دے دیا جائے -

(بہرحال میرے نزدیک ویدک میں سہاپرانوں کی کثیر تعداد مقامی اثرات کے تحت پراکرتوں سے آئی ہے) ، بلکہ یہ تعداد بھی پوری نہیں ہے - یوں کہنے کو تو سبھی دیوناگری لپی کے گن گاتے ہیں کہ یہ دنیا کی بہترین لپی ہے اور آوازوں کے لحاظ سے اس کی ترتیب و نظام مکمل ہے لیکن مجھے تو یہ لپی پراکرتوں کی مکمل آوازیں ادا کرنے کی اہل نظر نہیں آتی - میری مراد اس وقت صرف قدیم سہاپرانوں سے ہے جن کی تعداد ویدک زبان کی دیوناگری لپی میں صرف دس ہے ، جب کہ پراکرتوں میں ان کی پوری تعداد پندرہ تھی - پراکرتوں میں جس طرح ہر مختصر حرف علت کے مقابلے میں ایک طویل حرف علت ہوتا تھا ، اسی طرح ہر الپ پران کے جواب میں ایک سہاپران بھی ملتا تھا اور یہی پراکرتوں کی قدیم لپیوں میں حروف کی بنیادی تقسیم تھی - چنانچہ ویدک زبان کے ان دس سہاپرانوں پر جو سطور گذشتہ میں دیے

جا چکے ہیں ، رھ ، ڑھ ، لھ ، مھ ، نھ کا اضافہ کرنے سے پراکرت کے مہاپرانوں کی تعداد پوری ہو جاتی ہے ، جنھیں رگ. وید میں دو دو حروف ملا کر تحریر کیا گیا ہے اور جن کا مزید ثبوت ہمیں انہی موجودہ بھاشاؤں سے بھی ملتا ہے - چنانچہ اردو زبان سے ان کی مثالوں میں رھ کے لیے گیارہ (۱۱) ، بارہ (۱۲)، تیرہ (۱۳) ، پندرہ (۱۵) ، سترہ (۱۷) ، اٹھارہ (۱۸) ، لھ کے لیے چولھا ، دلھن ، دولھا ، آلھا ، ملھار (ملہار) ، مھ کے لیے کمھیڑا ، کمھار ، نھ کے لیے نھانا ، کنھیا ، انھوری وغیرہ الفاظ پیش کیے جا سکتے ہیں - ڑھ کے لیے موجودہ دھونا گری لپی میں ڈھ پر نقطہ لگا لیا گیا ہے -

شمالی بھارت اور پاکستان کی موجودہ بھاشاؤں کے دور تک آتے آتے ان مہاپرانوں میں جو تغیرات ہوئے ہیں ، ان میں سے ایک یہ ہے کہ انھوں نے کثیر تعداد الفاظ میں الپ پرانوں سے جگہ بدل لی ہے -

اس تبدیلی کی وجہ یہ ہے کہ چونکہ آریوں کی قدیم آبائی زبان میں مہاپران نہ تھے ، اس لیے وہ ان حروف کو بولنے اور لکھنے میں الپ پرانوں سے اسی طرح ظاہر کرتے تھے جس طرح آج ایران اور سرحد والے کرتے ہیں یا جس طرح آج سے بہت قبل ہمارے اسلاف نے داخلہ ہند کے وقت کیا تھا ، جن کا ہندوستان میں آکر ہندوستانی زبانوں سے ساتھ پڑا تھا اور جو ابتدا میں اس کے ہر مہاپران کو الپ پران اور ہر نمی آواز کو دندانی آواز سے ادا کیا کرتے تھے- چنانچہ اردو کی قدیم تحریروں کے ان عام الفاظ میں بھی الپ پران نظر آ جائیں گے ، جنھیں ہم آج پراکرت کے قدیم مہاپران سے لکھتے ہیں - مثلاً ہات (ہاتھ) ، سات (ساتھ) وغیرہ -

سرور ایام نے جو دوسری بڑی تبدیلی ان مہاپرانوں میں کی ہے اور جس کے ثبوت میں ہمیں آج شمالی ہندوستان کی ہر زبان سے بکثرت مثالیں مل سکتی ہیں ، یہ ہے کہ انھیں دو حروف یعنی الپ پران اور ہائے ہوز میں تقسیم کر دیا گیا ہے - (مثلاً لھسن=لہسن ، دھکنا= دہکنا (آگ کا تیز ہونا) ، لھکنا=لہکنا (ہلنا) ، پنھانا=پہنانا ، نھانا=

نہانا ، بھئن = بہن ، گھن = گہن ، گھنانا = گہنانا (تاریک ہونا) بھوت = بہت) -

رگ وید میں جتنے مہاپران استعمال ہوتے ہیں ان میں سے بہت تھوڑے سے دیونا گری لپی کے صحیح حروف سے ظاہر کیے گئے ہیں ورنہ کثیر تعداد ایسی ہے ، جنھیں یا تو صرف الپ پرانوں سے لکھا گیا ہے یا الپ پرانوں پر ہائے ہوز کے اضافے سے تحریر کیا گیا ہے - گو ویدک اور سنسکرت کا یہ اثر تمام موجودہ زبانوں پر پڑا ہے اور ان سب میں رگ وید کی یہ خصوصیات مشترکہ طور پر پائی جاتی ہیں لیکن اردو زبان میں یہ رجحانات ان سب سے زیادہ نمایاں ہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ ایک طرف تو اس کی لپی مہاپرانوں سے خالی ہے اور دوسری طرف اس کے بولنے اور اپنانے والے وہ مسلمان تھے جو آریوں کے بعد ایک بار پھر ہندوستان پر حملہ آور ہوئے اور جن کا تلفظ قدیم زمانے کے آریوں کے تلفظ سے مکمل طور پر ہم آہنگ تھا -

(مطبوعہ اردو نامہ ، کراچی ، جون ۱۹۶۲ء)

اردو زبان کا صوتی آہنگ

آواز ہر موسیقی اور زبان دونوں کا دار و مدار ہے لیکن موسیقی میں صرف سر چلتے ہیں اور وہ آوازیں جنھیں حروف صحیحہ سے لکھا جاتا ہے استعمال نہیں ہوتیں - البتہ زبان کے لیے دونوں قسم کی آوازیں ضروری ہیں - یہی موسیقی اور زبان کی صوتیات کا پہلا فرق ہے - دوسرا فرق یہ ہے کہ موسیقی میں مفرد سر استعمال ہوتے ہیں . اور زبان کی ابتدا مرکب آوازوں سے ہوتی ہے - دوسرے لفظوں میں یوں کہنا چاہیے کہ مفرد آوازوں کے کوئی معنی نہیں ہوتے - معنویت ان میں اس وقت داخل ہوتی ہے جب دو یا دو سے زیادہ مفرد آوازیں ملا دی جاتی ہیں اور یہی زبان کا نقطہ آغاز ہے یعنی موسیقی بے معنی اور زبان بامعنی آوازوں کے نظام کو کہتے ہیں اس لیے زبان کا صوتی آہنگ موسیقی کے صوتی آہنگ سے ایک حد تک مشابہ ہوتے ہوئے بھی مختلف ہوتا ہے -

انگریزی زبان انگریز بھی بولتے ہیں اور امریکی بھی لیکن امریکیوں میں جو نکی سر سننے میں آتا ہے وہ انگریزوں میں نہیں ملتا - یہ دونوں کے لہجوں کا فرق ہے جس کا احساس خود امریکیوں کو بھی ہے - ہمارے یہاں کے قدیم گرامر نویسوں نے بھی لکھا ہے کہ پراکرت میں نون غنہ محض خوش آوازی کے لیے بولا جاتا ہے - یہ بات ہر مقام پر صحیح نہیں ہے کیونکہ آج اردو اور اس کی تمام معاصر زبانوں میں نون غنہ جزو کلمہ بھی ہوتا ہے - البتہ یہ درست ہے کہ نون غنہ کی گونج زبان میں لوچ اور نرمی پیدا کر دیتی ہے اور وہ کانوں کو بھلی لگتی ہے - بہت سی زبانوں میں بلکہ خود ہماری زبان کے بھی بعض الفاظ میں جو حشوی نون غنہ داخل ہوگیا ہے - وہ بولنے والوں کے اس رجحان کی غمازی کرتا ہے جو نون غنہ کو بطور جز و کلمہ بولنے سے پیدا ہوا ہے لیکن اس کی آسانی سے نشان دہی بھی کی جا سکتی ہے -

موسیقی میں صرف سات سادہ سر ہوتے ہیں اور ان کی تقسیم بلندی و پستی کے لحاظ سے کی گئی ہے لیکن ہماری زبان میں سروں کی دو تقسیمیں ہیں - ایک مقداری اور دوسری نوعی - پہلی تقسیم سروں کا اختصار اور طول بتاتی ہے یعنی ایک سر مختصر بھی ہوتا ہے اور طویل بھی اور ہر طویل سُر مختصر سُر کا دگنا ہوتا ہے - مثلاً زیر، زبر اور پیش مختصر سُر ہیں اور آ ، اے اور او طویل ہیں - دوسری تقسیم کے لحاظ سے سُر سادہ بھی ہوتے ہیں اور تنگ بھی مثلاً آ اورآں ، او اور اوں، اے اور ایں وغیرہ چنانچہ اردو زبان میں مختصر اور طویل اور سادہ اور تنگ کل ملا کر چوبیس سُر ہوتے ہیں اور یہ تعداد یقیناً موسیقی سے کہیں زیادہ ہے - ہماری زبان کی نغمگی کا سبب بھی یہی ہے اور اسی لیے اردو زبان کی ماں مہاراشٹری پراکرت - قدیم سنسکرت ڈراموں میں گیتوں کے لیے خصوصیت سے استعمال کی گئی ہے - سروں کا اتنا بڑا ذخیرہ دنیا کی کم ہی زبانوں کو نصیب ہوا ہوگا -

اردو زبان کے کسی لفظ کی مقدار تین رکن سے زیادہ نہیں ہوتی اور جب کبھی لاحقہ لگانے سے اس کی مقدار میں اضافہ ہو جاتا ہے تو ہمارا لہجہ سروں کو مختصر کرکے اس کی مقدار گھٹا دیتا ہے اور اسے تین رکن تک لے آتا ہے اور رکن صرف تین طرح کےہوتے ہیں - چل چال اور چلت اردو کے تمام الفاظ انہیں تین قسم کے ارکان میں تقسیم ہوتے ہیں - یہاں میں اردو زبان کے صرف دو لفظ مثال میں پیش کرتا ہوں (دکھیا دیکھنے والا) اور دکھویا (دکھانے والا) ہمارے لہجے کے مطابق ان میں صرف تین تین رکن بولے جاتے ہیں - ان کے ارکان کی تشریح یوں ہے - دکھیا ، دِکھ+ای+آ اور دکھویا=دکھ+وی+آ - اگر کوئی شخص ان الفاظ کے آخر میں لی سے دھوکا کھا کر آ کی جگہ یا کی آواز نکالتا ہے تب بھی آخری رکن کے وزن میں کوئی فرق نہیں پڑتا - یہ الفاظ کس طرح سکڑ سکڑ کر صرف تین ارکان میں محدود ہوگئے ہیں -

اس بات کو جاننے کے لیے ان کے مندرجہ ذیل تجزیے پر غور لازم ہے :

دکھیا=دیکھ (فعل اصلی)+آئی (کام یا فعل کا لاحقہ جیسے چلائی ، بھر آئی ، لگائی ، بھائی وغیرہ)+آ (لاحقہ فاعل ، دکھویا ، دیکھ (فعل اصلی)+آؤ (لاحقہ حاصل مصدر جیسے جھکاؤ، رکاؤ وغیرہ)+ آئی (کام کا لاحقہ جیسے اٹھوائی ، بسوائی وغیرہ)+آ (لاحقہ فاعل) اردو زبان کا یہ اصول الفاظ کے وزن و مقدار کو ایک خاص حد سے آگے نہیں بڑھنے دیتا - ہمارے لہجے کو سہولت ، کفالت اور روانی بخشتا ہے اور لفظوں کی اس تراش خراش سے زبان کو سڈول اور خوش آہنگ بناتا ہے -

دراوڑی زبانوں میں آواز کو دہرانے کا چلن عام ہے جسے ہم تشدید کہتے ہیں جیسے کچا پکا ، سچا وغیرہ - انھیں عام طور پر علی الترتیب کچ چا ، پک کا ، سچ چا بولا جاتا ہے - قاعدہ ہے کہ جس آواز پر تشدید ہوتی ہے اس سے پہلے کا سر سکڑ کر مختصر ہو جاتا ہے - اس لیے جب کسی حرف سے تشدید دور کی جاتی ہے تو اس کے پہلے کے سر کو بڑھا دیتے ہیں جیسے مٹی سے ماٹی ، اٹھا سے آٹا ، سچا سے سانچا وغیرہ - اس عمل کو لسانیات میں تسہیل کا نام دیا گیا ہے لیکن غور کرنے کی بات یہ ہے کہ اس سے لفظ کے وزن میں مطلق فرق نہیں آتا - مٹی اور ماٹی اٹھا یا آٹھایا سچا اور سانچا کا وزن فعلن ہی ہوتا ہے اور زبان کا آہنگ بدستور قائم رہتا ہے - ان مثالوں سے بھی ثابت ہے کہ حرف مشدد سے قبل کبھی نکی سر بھی ہوتا ہے جو تشدید میں غائب ہو جاتا ہے - البتہ تسہیل میں سادہ اور نکی دونوں قسم کے سر اپنی ابتدائی حالت میں ابھر آتے ہیں - اس کے باوجود لفظ کی مقدار دونوں حالتوں میں یکساں رہتی ہے یعنی بٹا کی تسہیل سے باٹا اور بانٹا (باں ٹا) کچا سے کاچا اور کانچا (کاں چا) اور تھکا سے تھاکا اور تھانکا (تھاں کا) دونوں قسم کے روپ حاصل ہوتے ہیں اور دونوں روپ ہم وزن ہیں - البتہ یہ جاننے کے لیے کہ تشدید سے قبل سادہ سر مختصر ہوا ہے یا نکی سر کافی سوچ بچار کی ضرورت ہوتی ہے -

دنیا کی دوسری زبانوں کی طرح دراوڑی زبانوں میں بھی ایک آواز دوسری آواز سے بدل جاتی ہے لیکن اس سے لفظ کے معنی نہیں بدلتے

ہماری روزانہ بول چال سے اس کی کتنی ہی مثالیں مل سکتی ہیں مثلاً لگدی اور لُبدی ، چوستا اور چوکھنا، چُسا ہوا اور چُڑا ہوا وغیرہ اسی طرح مندرجہ بالا الفاظ کا درمیانی نون بھی ر، ڑ یا ل سے بدل کر اسے دوسرا روپ تو دے دیتا ہے لیکن معنی میں کوئی تغیر واقع نہیں ہوتا - چنانچہ بانٹا جو بٹا کی تسہیلی شکل ہے - آوازوں کے تبادل سے بل ٹا ہو جاتی ہے اور بل فرق کو کہتے ہیں اور ٹا لاحقہ فاعلی ہے - اس طرح بٹا ، بانٹا ، بل ٹا کے مختلف روپ ہم معنی ہونے کے ساتھ ساتھ ہم وزن ہی رہتے ہیں اور زبان کے آہنگ کو بدستور قائم رکھتے ہیں - یہی صورت کچا کی ہے کہ ، کانچا کڑچا سب کے سب ایک لفظ کے مختلف روپ ہوتے ہوئے بھی ہم معنی اور ہم وزن ہیں کیونکہ کڑ سختی کو کہتے ہیں اور چا لاحقہ فاعلی ہے اور ان سب کا وزن فعلن ہے -

اردو زبان کے صوتی آہنگ اور نغمگی کو سمجھنے کے لیے اس کے اسموں ، مادوں اور مصدروں پر بھی نظر ڈالنا ضروری ہے اور ان کی مختلف قسمیں ہوتی ہیں - بعض اسماء تکراری ہوتے ہیں جیسے جُھر جُھرا، جُھری جُھری نھرتھری ، کپکپی ، گلگلا کھنکھنا ، بُلبلا ، سرسرا ، کُڑکُڑی ، بلبھلا بلبھلا مُرمُرا ، لجلجا ، چل چلاؤ - رکھ رکھاؤ وغیرہ اور بعض مقفیٰ ہوتے ہیں جیسے چُلبُلا ، گُڑ مڑی ، چر ہرا وغیرہ - اسی طرح بعض ایسے مصادر ملتے ہیں - جن میں ایک ہی مادے کو دہرا دیا جاتا ہے جو بیشتر صوتی و کیفی ہوتے ہیں جیسے بھٹ بھٹانا، چٹ چٹانا ، گڑ گڑانا ، بڑبڑانا ، چڑچڑانا ، تم تمانا ، بلبھلانا ، چر چرانا ، بلبلانا ، بھن بھنانا ، دندنانا ، گنگنانا ، بھبھانا ، کجکجانا وغیرہ اور بعض مادے مقفی ہوتے ہیں جیسے گڑ بڑانا جگمگانا ، تلملانا، ٹپٹانا ، لڑکھڑانا ، کسمسانا ، بلبلانا وغیرہ -

قافیے کا یہ التزام مہملات تک جا پہنچا ہے - ہماری زبان میں بعض بامعنی الفاظ کے آگے پیچھے مہمل الفاظ بولنے کا بھی زیادہ چلن ہے - یہ مہمل اگوے اور پچھوے ہمیشہ بامعنی لفظ کے ہم قافیہ ہوتے ہیں اور زبان میں رس اور کیف کا اضافہ کرتے ہیں - ان میں سے بیشتر مہمل

اگوے الف سے شروع ہوتے ہیں جیسے اٹ ، سٹ ، انٹ ، سنٹ ، آرپار ، آس پاس ، انگڑ کھنگڑ ، ٹوائی کھٹوائی ، اتا پتا ، ایرا غیرا الم غلّم ، اوبدانا ، اُلپھلانا وغیرہ اور بعض کی ابتدا ہائے ہوز سے بھی ہوتی ہے جیسے ہٹا کٹا ، ہجر مجر ، ہزاری بزاری ، ہیڑ دھبرہ ، ہڑبڑانا ، ہچکچانا وغیرہ ۔ مہمل پھوے بیشتر واؤ سے شروع ہوتے ہیں جیسے روٹی ووٹی ، پانی وانی ، کپڑا وپڑا وغیرہ ۔ کبھی درمیانی سُر کو آ سے اور کبھی آؤ سے بدل کر مہمل پھوے تیار کیے جاتے ہیں ۔ جو ہم قافیہ تو نہیں ہم وزن ضرور ہوتے ہیں جیسے چپ چاپ ، ٹیپ ٹاپ ، ٹیم ٹام ، ٹھوں ٹھاں ، بھوں بھاں (فوں فاں) بوندا باندی ، چھیڑ چھاڑ ، بھیڑ بھاڑ ، لوٹ لاٹ کر ، بوجھ بانجھ کر ، بینچ بانچ کر ، ٹائیں ٹوئیں ، چھان چھون ، سان سون کر ، لاد لود کر ، مار مور کر ، کھا کھو کر وغیرہ کبھی مادے کے آخری سر کو آ سے بدل کر بھی مہمل پھوا بنا لیا جاتا ہے جیسے لے لا کر ، پی پا کر ، دھو دھا کر ، کھو کھا کر دے دا کر وغیرہ ۔

اس سلسلے میں مرکبات کا تذکرہ بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا ۔ بعض مرکب اسما ہم قافیہ الفاظ سے بنتے ہیں جیسے کھٹ پٹ ، لپ جھپ ، لونڈ سونڈ ، توڑ پھوڑ ، جوڑ توڑ ، دُور جُھور ، سانٹھ گانٹھ ، لُوٹ پُھوٹ مار دھاڑ ، ریل پیل ، دھکڑ پکڑ ، اکڑ مکڑ ، آنٹ سانٹ ، مول تول گول مول ، ہلن چلن ، ہلچل ، گڑ بڑ ، تیل تھل ، ہال چال ، رونا دھونا ، کام دھام وغیرہ ۔ بعض متعلقات فعل کی یہی کیفیت ہے جیسے دھندر مدر ، گٹ ، پٹ ، گٹ مٹ ، کھٹ ہٹ ، چٹ ہٹ ، جھٹ پٹ وغیرہ ۔ بعض مرکب اسما بعض ہم وزن الفاظ سے تیار ہوتے ہیں جیسے چیر پھاڑ ، بات چیت ، جھاڑ پھونک ، کانٹ چھانٹ ، آڑ موڑ ، ہار جیت ، تین پانچ ، سیل سنت وغیرہ ۔ بعض مرکبات ایک ہی لفظ ارسے بنتے ہیں لیکن ان کے درمیان ایک آواز داخل کر دی جاتی ہے جیسے چل چل ، دیس بدیس ، رات برات ، چلا چل ، مارا مار ، کا چھک ہاتھوں ہاتھ ، کانوں کان ، ناکوں ناک ، راتوں رات ، آدھوں آدھ ، ٹانکوں ٹانک ، بھا گم بھاگ وغیرہ ۔ کبھی ان کے آخر میں بھی ایک آواز بڑھا دی جاتی ہے جیسے گتھم گتھا ، گالم گلوچ ، لٹھم لٹھ ، دھکم

دھکا ، دیکھا دیکھی ، ہما ہمی ، بھنا بھنی ، چلا چلی وغیرہ ۔ بعض اوقات دو مختلف الفاظ کو اس طرح ملاتے ہیں کہ ان کے درمیان اور آخر میں ایک ایک آواز بڑھا دی جاتی ہے جیسے ہاتھا پائی ، آنا کانی ، لپاڈگی ، چوما چاٹی ، دھنیگا مشتی ، اینچا تانی ، اگا پنیچی ، اٹھا بیٹھی ، کسا مسی ، لپٹا ہوئی وغیرہ ۔ غرض اس قسم کے مرکبات میں ایک ہی لفظ کے دہرانے سے گونج پیدا ہوتی ہے یا دو مختلف الفاظ کو ملانے سے جو سجع کی سی کیفیت پیدا ہوتی ہے اس سے زبان میں موسیقیت کی رو دوڑ جاتی ہے ۔

مندرجہ بالا مثالوں سے یہ بات اچھی طرح واضح ہے کہ اردو زبان کے لب و لہجہ میں صوتی آہنگ اور نغمگی کو بڑا دخل ہے ۔ زبان کی بہت کچھ شیرینی اور غنائیت اس التزام کی رہون منت ہے یہ مثالیں میں نے کسی کاوش کے بغیر بالکل سامنے سے لے لی ہیں لیکن مجھے یقین ہے کہ اگر زبان کا مطالعہ زیادہ محنت سے کیا جائے گا تو اس سے کہیں زیادہ اور متنوع مثالیں ہاتھ آ جائیں گی اور زبان کے بہت سے اور بھی ایسے پہلو سامنے آ جائیں گے جو اس کا آہنگ قائم کرنے میں غیر محسوس طور پر مدد دے رہے ہیں ۔

مطبوعہ اوراق ، لاہور، اپریل ۱۹۶۶ء

الفاظ کا مطالعہ

جس طرح انسان ہمیشہ سے اپنی بقا کا خواہش مند رہا ہے اور کسی نہ کسی مادی یا غیر مادی وسیلے سے اپنے آپ کو آنے والی نسلوں تک پہنچانے کی کوشش میں سرگرم ہے اسی طرح وہ گزرے ہوئے انسانی قافلے کے نقوش قدم دیکھنے اور اس کے تفصیلی حالات معلوم کرنے کے لیے بھی بے چین رہتا ہے چنانچہ باقیات انسانی جہاں دنیا سے جانے والوں کی تسکین کا باعث ہوتی ہیں وہاں دنیا میں آنے والوں کو بھی بڑی حد تک مطمئن کرتی ہیں اور یوں جانے اور آنے والے دونوں ہی زندگی کی تاریخ مرتب کرنے میں برابر کے شریک نظر آتے ہیں۔ اس کے باوجود ان کی کوششیں وقت کی ایک مقررہ حد سے آگے نہیں بڑھ پاتیں کیونکہ قدرت بھی فانی انسان کی مساعی کو برباد کرنے کے درپے رہتی ہے چنانچہ جیسے جیسے زندگی کی لکیر آگے بڑھتی جاتی ہے اس کا پچھلا سرا مدھم ہوتے ہوتے نگاہوں سے اوجھل ہوتا چلا جاتا ہے اور نتیجے میں تاریخی معلومات کی مقدار کا اوسط کم و بیش ہمیشہ ایک ہی سا رہتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کائنات میں حادثہ زندگی کے علاوہ بھی بہت سے حادثے ہوتے رہتے ہیں جو اس سے بھی زیادہ عظیم اور زیادہ وسیع و ہمہ گیر ہیں اور تسخیر عناصر کی انسانی کوششوں کے باوجود اس پر ہمیشہ غالب رہتے ہیں کیونکہ فضائے کائنات پر اختیار کلی تو صرف ایک ہی ذات کو حاصل ہے جو زمان و مکان سے ماورا ہے۔

انسان اپنی توفیق اور بساط کے مطابق مکانات تعمیر کراتا ہے۔ کنوئیں کھدواتا ہے۔ سڑکیں بنواتا ہے۔ باغات لگاتا ہے۔ مشینیں ایجاد کرتا ہے لیکن یہ تمام نقوش ایک نہ ایک دن فنا ہو جاتے ہیں اور

اس حد تک فنا ہو جاتے ہیں جیسے کبھی تھے ہی نہیں - تعمیرات کی عمریں زیادہ لمبی نہیں ہوتیں - وہ گرم و خشک ریگستانوں اور سخت سرد برفیلے علاقوں میں تو زیادہ عرصے تک باقی رہتی ہیں لیکن نم اور مرطوب آب و ہوا والے خطوں میں نسبتاً بہت جلد مٹ جاتی ہیں مثلاً صحرائے افریقہ میں فراعنہ مصر کے اہرام آج تک موجود ہیں لیکن اس برصغیر میں اتنی پرانی کوئی عمارت نہیں ملتی کیونکہ ہمارے یہاں کے موسمی تغیرات کے ساتھ ساتھ ہوا کی رطوبت تعمیرات کو گلا گلا کر اور چٹخا چٹخا کر بہت جلد ریزہ ریزہ کر ڈالتی ہے البتہ جو بستیاں بعض حادثات کے تحت زیر زمین دفن ہو جاتی ہیں وہ زیادہ عرصے تک محفوظ رہتی ہیں جس طرح موہنجوداڑو اور ہڑپا کے دفینے پانچ ہزار سال سے ہمارے مطالعے کا انتظار کرتے رہے ہیں - اس میں شک نہیں کہ اس قسم کی تعمیراتی میراث سے ہمیں اپنی تاریخ مرتب کرنے میں کچھ مدد مل گئی ہے لیکن ان سے حاصل ہونے والی معلومات اس قدر جزوی ، محدود اور خام ہیں کہ اس کی کثیر تعداد خلاؤں کو قیاسات و تخیلات سے پر کرنے کے باوجود اس علاقے کی بھی مکمل سماجی اور ثقافتی زندگی سامنے نہیں آتی - حقیقت یہ ہے کہ تعمیرات کی ہندسی اشکال معماروں کی ذہنی زندگی تک ہماری صحیح رہنمائی کرنے سے قاصر رہتی ہیں -

رسوم و روایات کی عمر تعمیرات سے زیادہ لمبی ہوتی ہے اور وہ مادی مظاہر کے مقابلے میں زندگی کی بہتر طور پر عکاسی کر سکتی ہیں کیونکہ وہ عناصر کی براہ راست زد سے محفوظ ہوتی ہیں - زندگی سے ان کا تعلق نسبتاً زیادہ قریبی ، زیادہ گہرا اور زیادہ معنی خیز ہوتا ہے اور خود انسانی سماج ان کی محافظت کا ذمہ دار ہوتا ہے لیکن وقت کے ساتھ ساتھ ان میں صوری و معنوی دونوں قسم کی تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں جن کے باعث ان کی تشریح میں بھی قیاسات کا بہت زیادہ عمل دخل ہو جاتا ہے اور یوں انسانی ثقافت اور سماجی اقدار کی اصلی روح تک ہماری رسائی کا یہ وسیلہ بھی زیادہ قابل اعتماد نہیں رہتا - یہی وجہ ہے کہ دنیا بھر کے عالم اور مورخ ان تمام وسائل سے مایوس ہو کر اب اس نتیجے پر پہنچ چکے ہیں کہ ازمنہ قدیم کی سماجی زندگی کا علم حاصل

کرنے کا وسیلہ صرف ایک ہی باقی رہ گیا ہے اور وہ ہے زبانوں کے الفاظ کا مطالعہ -

یہ علما تھک ہار کر جس نتیجے پر پہنچے ہیں اور انھوں نے اپنی مشکلات کا جو حل سوچا ہے وہ حقیقت میں تاریخ تمدن کی بخشش کا واحد سہارا ہے کیونکہ الفاظ میں جو جہان معنی پوشیدہ ہوتے ہیں وہ ہماری ثقافت اور تمدن کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کیے ہوئے ہیں اور ان سے نہ صرف انسانوں کی اسی زندگی کا حال معلوم ہوتا ہے جس کا تعلق خارجی عوامل اور بیرونی مظاہر سے ہے بلکہ یہ ایسے دریچے ہیں جن کے ذریعے ذہن انسانی میں جھانک کر ہم اس کی داخلی زندگی کا علم بھی حاصل کر سکتے ہیں۔ اس مطالعے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ انسانوں کی ان قدیم تحریرات کو سمجھنے کی کوشش کریں جو ہم تک آ پہنچی ہیں اور ان کی مدد سے پرانے زمانے کے لوگوں کی خارجی اور داخلی زندگی کا سراغ لگائیں۔ یہ وہ طریقہ ہے جس پر مغرب کے علمائے لسانیات گزشتہ صدی تک عمل پیرا رہے ہیں بلکہ آج تک کم و بیش اسی طریقے کو اپنائے ہوئے ہیں لیکن اس طریق کار میں سب سے بڑی دقت لپی (رسم الخط) کی آ پڑی ہے جو بعض اوقات بالکل اجنبی ہوتی ہے جس طرح موہنجوداڑو کی قدیم لپی ابھی تک ناقابل فہم بنی ہوئی ہے -

انسان فطری طور پر انقلاب کی مراد اندیشی میں اس حد تک مبتلا چلا آ رہا ہے کہ وہ اپنے تخیل کی ایک معمولی سی کروٹ کو بھی خارجی دنیا کے عظیم انقلاب کا نام دے دیتا ہے چنانچہ جب کبھی وہ کسی ایسی تحریر کو پڑھ اور سمجھ لیتا ہے تو آفتاب و ماہتاب کو اپنے اپنے مدار سے ہٹا ہوا محسوس کرتا ہے اور جب ایسا کرنے سے معذور رہ جاتا ہے تو یہ کہہ کر اپنے دل کو طفل تسلیاں دے لیتا ہے کہ دنیا کے عظیم انقلابات کے ہاتھوں اس تحریر کو سمجھنے کی چابی کہیں گم ہوگئی ہے اور لپی کا نام و نشان صفحہ عالم سے محو ہو گیا ہے لیکن تجربہ بتاتا ہے کہ نہ زبان کی روایت اتنی بودی ہے نہ لپی کی کہ اس قدر آسانی سے ختم ہو جائے - اشوک نے تیسری صدی قبل مسیح میں

جو سنگ کتبے نصب کرائے تھے وہ کھروشتی اور برہمی دو قسم کی لپیوں میں پائے جاتے ہیں اور علما کی نظر میں یہ دونوں لپیاں آج ناپید ہو چکی ہیں لیکن آج میرے ساتھ چل کر سرگودھا کی غلہ منڈی میں بیوپاریوں کا بہی کھاتا دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ وہ لوگ ایسی ہی لپی سے کام لے رہے ہیں - ایسی ہی لپی آپ کو مارواڑی بنیوں کے ہاں نظر آئے گی جو اسے مڑیا کہتے ہیں اور ایسی ہی ایک لپی کشمیر میں چالو ملے گی - رہی ان کتبوں کی دوسری لپی برہمی تو اس کا گورمکھی سے موازنہ کر کے دیکھ لیجیے کہ دونوں ایک دوسرے سے کس قدر قریب ہیں اور بعض محققین کا یہ بیان کہ گورمکھی کی ایجاد سولھویں صدی عیسوی میں محض گرو گرنتھ صاحب تحریر کرنے کے لیے ہوئی ہے کس قدر سطحی اور غلط آموز ہے - اسی طرح موہنجودڑو کی لپی ہماری جن مجبوریوں کے باعث ابھی تک پڑھی نہیں جا سکی ہے - ان پر پردہ ڈالنے کے لیے ہم نے یہ اعلان کر دیا ہے کہ انقلاب عالم کے ہاتھوں اس کا چلن اس سرزمین سے اٹھ گیا ہے اور جس دن اسے سمجھنے میں انسان کو کامیابی حاصل ہو جائے گی - اس روز پھر ایسے ہی ایک دوسرے انقلابِ عالم کا اعلان کر دیا جائے گا -

دراصل قدیم تحریروں کو پڑھنے اور سمجھنے میں دو دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے—ایک لپی اور دوسرے زبان—اگر دونوں ہی اجنبی ہوں تو پھر انسانی کوششوں کی کامیابی کا امکان بہت کم رہ جاتا ہے لیکن حوصلہ افزا بات یہ ہے کہ آج تک کی کسی قدیم تحریر کی زبان مکمل طور پر اجنبی نہیں پائی گئی اور یہ اس بات کی کھلی ہوئی دلیل ہے کہ کوئی زبان آج تک فنا نہیں ہوئی ہے - لہٰذا لے دے کے جو دقت انسان کے لیے باقی رہ جاتی ہے - وہ لپی ہی کی ہے—اور لپی کا لباس ہمیں اس قدر بھول بھلیوں میں پھنسا دیتا ہے کہ ہم بآسانی بولوں کے جسموں تک پہنچ ہی نہیں پاتے—قدیم تحریروں کو جنھیں عرف عام میں قدیم زبانیں کہتے ہیں محض لپیوں کی ان بھول بھلیوں کے باعث ہی اجنبی قدیم اور مردہ زبانیں کہہ دیا جاتا ہے—حقیقت یہ ہے نہ دنیا کی کوئی زبان مردہ ہوئی ہے اور نہ اساسی طور پر بدلی ہے بلکہ وہی زبانیں

قدیم سے آج تک برابر بولی جا رہی ہیں - البتہ ایک ہی زبان اگر مختلف لپیوں کا جامہ تبدیل کرتی رہتی ہے تو وہ پڑھنے والوں کو بدلتی معلوم ہوتی ہے - بلکہ بعض اوقات تو ایک لپی میں بھی ایک لفظ کو قلم بند کرنے کے کئی کئی طریقے ہوتے ہیں — اس صورت میں عالم فیصلہ دے دیتے ہیں کہ ایک زبان کئی ذیلی بولیوں میں بٹ گئی ہے - حالانکہ یہ بھی کم فہمی ہی کی بات ہے -

اس کو ایک مثال سے سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں - ہم سب لوگ اردو کے لفظ "پہنچ" کا ایک ہی تلفظ کرتے ہیں لیکن لوگ اسے لکھنے مختلف طریقوں سے ہیں- چنانچہ میں نے اس قدیم و جدید تحریروں میں پانچ طرح لکھا دیکھا ہے—پہنچ- پھونچ ، بھونچ - ہوہنچ اور ہونچ—اب فرض کر لیجیے کہ آج سے تقریباً پانچ ہزار سال بعد اس علاقے میں جہاں میں بیٹھا ہوا ہوں ایک مختلف حکومت قائم ہوتی ہے - جس کا محکمہ آثار قدیمہ کھدائی کے بعد میرے اس شہر کو دریافت کرتا ہے - اس دریافت میں اسے اردو زبان کی کچھ تحریریں بھی ہاتھ آ جاتی ہیں اور وہ ان کو کسی ماہر لسانیات کے سپرد کر دیتا ہے - اب ماہر لسانیات کی تحقیق کچھ اس طرح سے ہوگی—"آج سے تقریباً پانچ ہزار قبل اس خطہ' زمین پر ایک شہر آباد تھا - جسے سرگودھا کہتے تھے - اس شہر کے باشندے جو زبان بولتے تھے وہ اردو کہلاتی تھی (حالانکہ یہ بالکل غلط بات ہوگی کیونکہ سرگودھا لہندا کے علاقے میں واقع ہے البتہ ماہرین کو اتفاق سے صرف اردو زبان کی تحریریں ہی ہاتھ لگی ہیں) جو پانچ ذیلی بولیوں میں تقسیم تھی - اس کا ثبوت یہ ہے کہ اس میں ایک لفظ پہنچ کا تلفظ پانچ طرح ادا کیا جاتا تھا (یہ بات بھی پچھلی بات کی طرح غلط ہوگی کیونکہ سب جانتے ہیں کہ ہم اس لفظ کو کسی طریقے سے لکھیں بولتے ایک ہی طرح ہیں) - کچھ ایسا ہی حال آج کل کے ماہرین اور خصوصیت کے ساتھ ماہرین لسانیات کا ہے جو قدیم تحریروں کی لپیوں کے اصول کتابت دریافت کرنے سے کتراتے ہیں اور زبانوں کو ، اجنبی ، غیر مردہ اور مختلف ذیلی بولیوں میں منقسم کہہ کر ٹال دینے کو زیادہ آسان پاتے ہیں -

ان اسباب و شواہد کے پیش نظر یہ بات زیادہ صحیح ہے کہ جب سے ہمیں تحریریں ملنا شروع ہوئی ہیں ۔ اس وقت سے آج تک نہ کوئی زبان مردہ ہوئی ہے نہ کوئی نئی زبان وضع ہوئی ہے ۔ بلکہ جو زبانیں اس وقت بولی جاتی تھیں وہی آج بھی بولی جا رہی ہیں ۔ تلاش و جستجو البتہ اس میں درکار ہے کہ ایک قدیم تحریر کی زبان دنیا کے کس علاقے میں رائج ہے مثلاً اس خطہ ارض کی قدیم ترین کتاب رگ وید کی بنیادی زبان وہی ہے جو آج وادیٔ یعناب (روسی ترکستان) میں سغدی کے نام سے بولی جا رہی ہے ــــ اس کے علاوہ اس میں اس برصغیر کے مختلف علاقوں کی ان مقامی زبانوں کے آثار و نقوش بھی ملتے ہیں جو آج کل چالو ہیں ۔ چنانچہ رگ وید کو صحیح پڑھنے میں بنیادی دقتیں دو ہیں ۔ ایک یہ کہ اس کی لپی کے اصول کتابت دریافت کیے جائیں اور یہ سراغ لگایا جائے کہ اس زمانے میں جب یہ کتاب قلم بند ہوئی ہے ۔ کس آواز کے لیے کون سا حرف مقرر کیا گیا تھا ۔ یہ بھی عین ممکن ہے کہ رگ وید کا متن ایک سے زیادہ لپیوں میں منتقل ہو کر ہم تک پہنچا ہو ۔ اس صورت میں اگر اس کا ایک لفظ کئی کئی روپوں میں نظر آئے تو تعجب نہیں ہونا چاہیے ۔ دوسری دقت یہ ہے کہ اس میں آریائی زبان کے علاوہ مقامی دراوڑی بولیوں کے حصے کا بھی تعین کرنا ضروری ہے اور یہ کام ایک آدمی کے بس کا نہیں ہے ۔ کیونکہ ایک شخص کا اتنی بہت سی زبانوں پر عبور رکھنا محال نہیں تو مشکل ضرور ہے ۔

مزے کی بات یہ ہے کہ ہمارے ماہرین نہ تو رگ وید کے اصول کتابت کی بازیابی کے لیے کوشاں ہوتے ہیں اور نہ مختلف زبانوں کے اجزا کا تعین کرنے کی زحمت کرتے ہیں بلکہ یہ کہہ کر الگ ہو جاتے ہیں کہ یہ دیو بانی ہے یا ایک قدیم مردہ زبان ہے اور جب اس کے چند الفاظ کو اپنی بھاشاؤں کے الفاظ سے ملتا جلتا پاتے ہیں تو کہہ دیتے ہیں کہ ہمارے الفاظ کہیں سے مشتق ہیں اور ہماری زبانیں اسی وہلک میں سے پھوٹ نکلی ہیں ۔ اس سہل انگاری سے ہمارے ماہرین جو فیصلے سناتے رہے ہیں ان سے تو یہی ثابت ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک

ہم لوگوں نے اپنی آوازیں ویدک یا سنسکرت لپی کے حروف سے اور اپنی بھاشائیں ان کی تحریروں سے حاصل کی ہیں لیکن دنیا میں نہ آج تک ایسا ہوا ہے اور نہ ایسا ہونا ممکن ہے چنانچہ میرا موقف یہ ہے کہ ہماری بھاشائیں رگ وید کی تصنیف اور آریوں کی آمد سے پہلے بھی اپنے اپنے علاقوں میں بولی جاتی تھیں اور بالکل اسی طرح بولی جاتی تھیں جس طرح آج بولی جا رہی ہیں—یہ تو قطعی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ ہندوستان میں آریوں کی آمد سے کتنی مدت پہلے سے ان کا رواج ہوا ہے البتہ یہ بات یقینی ہے کہ جب سے یہ اس برصغیر میں وضع ہوئی ہیں تسلسل کے ساتھ بدستور رائج چلی آ رہی ہیں اور ان ہزاروں سال میں سے کوئی ایک ایسا قلیل وقفہ بھی نہیں گزرا جس میں ان کا چلن رک گیا ہو ۔ اس لیے یہ زبانیں جو ہمارے پرکھوں سے ہم تک پہنچی ہیں ماضی کی تاریخ مدون کرنے میں سماجی رسوم و روایات کے ورثے سے کہیں زیادہ اہم اور زیادہ مفید ہیں ۔

برصغیر کی موجودہ زبانوں کے مطالعے کی اسی اہمیت کے پیش نظر یہ ضروری ہے کہ ہم لوگ ان کے الفاظ کا مطالعہ کریں جن میں ہماری تہذیب اور تمدن اجتماعی زندگی کے ہر پہلو پر روشنی ڈالنے والی لاکھوں قندیلیں روشن ہیں ۔ یہ قندیلیں کسی غیر ملکی جھاڑ فانوس سے کسب نور نہیں کرتیں بلکہ خود اپنے حیات افروز روغن سے جوت جگا رہی ہیں ۔ یوں تو عوام الناس کی اس غلط فہمی کی کہ ہمارا ماہتاب کسی اور آفتاب کے بطن سے نکلا ہے یا اس سے ضیا مستعار لیتا ہے میں برابر نشان دہی کرتا چلا آیا ہوں لیکن اب جو میں نے اپنے الفاظ کے بطون میں جھانکنے کی مزید کوشش کی ہے اس نے مجھ پر یہ حقیقت بالکل واضح کر دی ہے کہ شمالی ہندوستان (شمالی بھارت اور پاکستان) کی وہ تمام زبانیں جنھیں ماہرین لسانیات اب تک ہند آریائی کہتے چلے آ رہے ہیں اپنی ابتدائی سطح پر ایک اور اصلاً خالص دراوڑی ہیں ۔ ان کے بنیادی ڈھانچے میں ایک ہی سے اصول کام کر رہے ہیں جن کی بدولت اس کے زندہ و متحرک مادے کثیر تعداد متبادل روپ دھار لیتے ہیں ۔ انھیں اصولوں اور رویوں کے مشترک سرمائے سے اپنا اپنا حصہ منتخب

کر کے جب یہ زبانیں دوسری سطح پر پہنچتی ہیں تو ایک دوسرے سے الگ ہوجاتی ہیں اور اپنے اپنے علاقوں سے نسبت پا کر گجراتی، بنگالی، سندھی، اردو، مرہٹی اور پنجابی وغیرہ کے ناموں سے پکاری جاتی ہیں۔

یہ بھی ایک عجیب اتفاق ہے کہ اردو جیسی آزاد، مکمل، کثیرالاستعمال اور وسیع الذیل زبان جو ہندوستان کے طول و عرض میں اپنی ثروت کا جواب نہیں رکھتی اپنی اصل و حقیقت کے بارے میں آج تک ماہرین زبان کی غفلت و سہل انگاری کا شکار رہی ہے اور ہندوستان کی سینکڑوں زبانوں میں سے صرف یہی زبان ایسی ہے جسے مختلف لوگ دیسی بدیسی زبانوں کی گود میں ڈالتے چلے آ رہے ہیں لیکن اس کے الفاظ کا مطالعہ شک و شبہات، غلط فہمیوں، کج بحثیوں اور کٹ حجتیوں کا یکسر قلع قمع کر دیتا ہے جو آج تک اس کی پیدائش کے متعلق کی جاتی رہی ہیں اور دوسری طرف قدما کے نظام حیات اور انداز فکر سے بھی ہمیں مکمل آگہی بخشتا ہے۔ اس مطالعے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا میں چیزوں کا تسمیہ کیونکر ہوتا تھا الفاظ کی معنویت میں توسیع کے لیے کن باتوں کو مدنظر رکھا جاتا تھا۔ ہمارے اسلاف ایک مادے کے لیے مختلف معنی اور مختلف مادوں کے لیے ایک معنی کا تعین کر کے زبان میں پھیلاؤ اور سمٹاؤ کے عمل کو بیک وقت کس طرح جاری رکھتے تھے۔ اس مطالعے سے یہ بھی پتہ لگتا ہے کہ الفاظ نے بیرونی زبانوں کے اثرات کب، کس حد تک اور کیونکر قبول کیے اور اس سے زبان میں کیا دشواریاں یا آسانیاں پیدا ہوئیں۔ غرض یہ اور اسی قسم کی بہت سی باتیں ہمیں الفاظ کے مطالعے سے معلوم ہوتی ہیں۔

مثال کے لیے لفظ "عینک" پر غور کیجیے جس سے آنکھوں پر لگانے والا چشمہ مراد لیا جاتا ہے۔ اس کا ابتدائی حرف "ع" اس لفظ کے عربی الاصل ہونے کا اعلان کر رہا ہے۔ اس کے علاوہ اس لفظ کی تشریح بھی یوں کی جاتی ہے کہ عینک کا لفظ آنکھ کی مناسبت سے بنا ہے کیونکہ "عین" عربی میں آنکھ کو کہتے ہیں لیکن یہ لفظ ان معنوں میں خود عربی زبان میں مستعمل نہیں ہے اسی لیے عربی کی فرہنگیں اس سے خالی ہیں اس کے علاوہ اسے عربی الاصل تسلیم کرنے میں ایک دقت

یہ بھی ہے کہ عربی گرامر کی رو سے اس کے آخری حرف "کاف" کی تشریح نہیں کی جا سکتی ۔ ایسی صورت میں مجبوراً فارسی زبان کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے جس میں آخری کاف اسم تصغیر کے لاحقے کے طور پر کثیر تعداد لفظوں میں نظر آتا ہے جیسے کنیزک ۔ بابک ۔ مامک ۔ دخترک ۔ مرغک ۔ چیزک وغیرہ لیکن اس زبان میں ابتدائی عین کو الف کا قائم مقام سمجھ کر عینک کا ابتدائی اور اصلی روپ "اینک" ماننا پڑے گا کیونکہ حرف عین فارسی زبان کے لیے اجنبی ہے ۔ یہ روپ اس لیے درست ہے کہ ہماری بول چال میں "اے" اور "آئے" کی آوازیں باہم متبادل ہوتی ہیں جس کی لاتعداد مثالیں ہمارے سامنے موجود ہیں جیسے فائر بندی اور فیر بندی ۔ ہائے ہائے اور ہے ہے ۔ پائجامہ اور پیجامہ وغیرہ چنانچہ اس اصول کی رو سے "اینک" کی اصل بھی "آئنک" قرار پاتی ہے جس کے معنی "چھوٹا شیشہ" ہوتے ہیں اور یہ معنی قرین قیاس بھی ہیں ۔ اس کے علاوہ میں نے رگ وید کے ایک بھجن میں بھی آئنے کا مفعولی صیغہ "آینم" (آئنے کو) لکھا دیکھا ہے ـــ
سم ہربرتے انو واتسیہ وِشتھا آینم گچھنتی سمنم ن یوشا (باد کا لشکر اس کے پیچھے یوں لپکتا ہے جیسے جوان عورتیں آئنے کے پیچھے) ۔
سوکت ۱۰-۱۶۸-۲

عینک کی مندرجہ بالا تشریح اس بات کا ثبوت ہے کہ جب سے مسلمانوں نے ایران فتح کیا اور اس کے تمام قدیم ادبی سرمائے کو عربی لپی میں منتقل کرنا چاہا ہے اسی وقت سے ہم میں فارسی کے ان گنت الفاظ کو معرب بنانے کا رجحان بھی پیدا ہوگیا ہے یہی وجہ ہے کہ فارسی زبان کے ہر چھوٹے بڑے لغت میں ایسے الفاظ کی اچھی خاصی تعداد مل جاتی ہے جن کی اصل و ابتدا خود فرہنگ نویس کے نزدیک مشتبہ ہے اور وہ یہ نہیں بتا سکتا کہ یہ الفاظ عربی کے ہیں یا فارسی کے ۔ عربی کو ترجیح دینے کا یہ رجحان اس قدر شدید اور راسخ ہوگیا ہے کہ آج تک لوگ نہ صرف دوسری زبانوں کے الفاظ کو عربی حروف سے لکھتے ہیں بلکہ ان الفاظ کی اصل کا سراغ بھی عربی الفاظ سے لگانے کی کوشش کرتے ہیں ۔ چند یوم کی بات ہے کہ بلھے شاہ کی

کالیوں کا ایک مجموعہ شائع ہوا تھا جس کے مقدمہ نگار نے لفظ "کاف" کی اصل سے بحث کرتے ہوئے اسے عربی لفظ قواف (قافیے کی جمع) سے مشتق بتایا ہے حالانکہ لفظ کاف مکمل نظم کے لیے استعمال ہوتا ہے جبکہ قافیہ مصرعے کا صرف ایک جز ہوتا ہے پھر بھی نہیں کہ عربی کے لفظ واحد (قافیہ) سے واحد (کاف) کا اشتقاق دکھایا جاتا بلکہ واحد کو جمع (قواف) سے مستخرج کیا گیا اور اس طرح یہ جتایا گیا کہ ہمارے اسلاف لفظوں کے نہ صرف تلفظ میں ہی بے اُصولے تھے بلکہ اشتقاق میں بھی کسی قاعدے قانون کی پابندی نہیں کرتے تھے لیکن میرے نزدیک یہ بزرگ نہ اس قدر جاہل تھے اور نہ اتنے بے اُصولے جتنے جاہل اور بے اُصولے بنا کر ان کے خلاف انہیں آج پیش کر رہے ہیں اور اس طرح خود اپنی ہی کم فہمی بلکہ نافہمی کا بھرپور خمیازہ ان ہمارے بزرگوں سے بھگتوا رہے ہیں -

حقیقت میں "کاف" فارسی زبان کا لفظ ہے اور مصدر کا فتن (بمعنی کھودنا چیرنا) سے بنا ہے جس کا ایک اور روپ دیدن بھی اس زبان میں انہیں معنوں میں مستعمل ہے اور یہ ثابت کرتا ہے کہ آریائی زبانوں میں واو اور ف کی آوازیں باہم متبادل ہوتی ہیں - کاوش اور کاو کاو اسی کے مشتقات ہیں اور تلاش و جستجو کے معنوں میں مستعمل ہیں اور کاف کا لفظ جو کھان کی چیز ، معدنی ، تلاش کی ہو ، چیر کر نکالی ہوئی وغیرہ کے معنی دیتا ہے یقیناً تلاش و جستجو سے حاصل کی ہوئی نظم ہی کا بدل ہو سکتا ہے - سنسکرت الفاظ کوی (شاعر) ، کویتا (شاعری) اور کاویہ (نظم) اسی کا فتن یا کاویدن کے مشتقات ہیں - بالکل اسی قسم کی غلط فہمی لفظ کافر کے متعلق لوگوں میں عام ہے جو فائے مکسورہ کے ساتھ عربی زبان کا اسم فاعل ہے اور منکر خدا اور برگشتہ کے معنی دیتا ہے اور بت کافر سے یقیناً بے دین کافر ہی مراد ہو سکتا ہے لیکن جب یہ لفظ فائے مفتوحہ کے ساتھ ایرانیوں کی بول چال میں استعمال ہوتا ہے تو فارسی زبان سے اپنا تعلق ظاہر کرتا ہے چنانچہ بت کافر (فائے مفتوحہ سے) سے وہ بت مراد ہوتا ہے جو پتھر سے تراشا گیا ہو پھر اس سے محبوبہ بھی مراد ہوسکتی ہے کیونکہ فارسی زبان میں کاف چیرے

یا شگاف یا نہر کو اور کاف ران اندام نہانی کو کہتے ہیں ۔

املا میں عربی حروف کے استعمال کا یہ رجحان اردو زبان کے الفاظ میں بھی پایا جاتا ہے چنانچہ بعض الفاظ کی ابتدا کے متعلق شک و شبہ کی جو کیفیت فارسی لغات میں ملتی ہے وہی اردو کی فرہنگوں میں بھی نظر آتی ہے مثلاً عربی زبان میں لفظ "عاری" کے معنی ہیں ننگا یا خالی جیسے وہ شرم و حیا سے عاری ہے مراد یہ کہ اس کو حیا نہیں ہے لیکن اردو کے لغت نویسوں نے اس کے ساتھ ساتھ عاجز اور شکست خوردہ کے معنی بھی لکھ دیے ہیں اور اصل اس لفظ کی بدستور عربی ہی رکھی ہے حالانکہ عربی کی فرہنگیں ان معنوں سے عاری ہیں ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خالی یا ننگے کے معنوں میں لفظ "عاری" خالص عربی ہے لیکن عاجز و درماندہ کے معنوں میں (جیسے میں اس کو سمجھاتے سمجھاتے عاری آ گیا) یہ ٹھیٹھ اردو زبان کا لفظ ہے جس کی املا میں ہم نے اسی رجحان کے سبق جس کا ذکر کیا جا رہا ہے الف کی جگہ عربی کا حرف عین درج کر دیا ہے چنانچہ اس اردو لفظ کی اصل "آری" ہے اور آری وہی ہے جیسے ہائے ہوز کے حشوی اندراج کے باعث ہم لوگ ہاری (ہار سے متعلق ۔ ہارا ہوا ۔ عاجز) بولنے لگے ہیں ۔

لفظ "حال" عربی میں حالت کا ہم معنی ہے ۔"بیمار کا حال اچھا ہے" اور "بیمار کی حالت اچھی ہے" ۔ میں کوئی معنوی فرق نہیں ہے لیکن جب ہم اردو میں اس لفظ کو "چال" کے ساتھ استعمال کرتے ہیں تو اس کے یہ معنی مشتبہ ہوجاتے ہیں کیونکہ حالت اور چال میں معنوی اشتراک کے قرائن نہیں ملتے چال میں حرکت کا جو مفہوم مضمر ہے وہ حال یا حالت میں نظر نہیں آتا ۔ اس لیے حال چال ہے (کہیئے کیا حال چال ہے) کا جوڑ کسی عنوان نہیں جچتا البتہ "ہال چال" کا مرکب معنوی اتحاد کا مکمل نمونہ بن جاتا ہے جس میں ہال کے معنی بھی ہلور اور حرکت کے ہیں چنانچہ جب کسی تانگے میں بہت جھٹکے لگتے ہیں تو ہم کہہ اٹھتے ہیں "اس تانگے میں بہت ہال ہے" ۔ اصوات علت کے اختصار سے یہی مرکب "ہلچل" کی شکل اختیار کر لیتا ہے ۔ اس کے علاوہ اس مرکب (حال چال) کی اصل "آل چال" بھی ہو سکتی ہے جس میں لفظ چال بنیادی اور اصلی

ہے اور چلن کے معنی دیتا ہے اور آل اس کا مہمل پیش رو ہے۔ اردو میں مہمل و موضوع کے ایسے مرکبات کا چلن عام ہے جیسے آس پاس، انجر پنجر، آمنے سامنے، اڑوس پڑوس، آر پار، ایرا غیرا، اونے پونے وغیرہ۔ "آل چال" میں آل کا الف اسی طرح ہائے ہوز بن گیا ہے جس طرح اردو کے دوسرے مرکبات میں بدلا ہے مثلاً ہکا بکا (اکا بکا) - ہچر مچر (اچر مچر) ہیر پھیر (ایر پھیر) - ہیل میل - (ایل میل) وغیرہ۔ غرض حال چال کی اصل ہال چال یا آل چال ہے۔

"عمدہ" عربی میں وزیر امیر کو کہتے ہیں اور اس کی جمع عمائد استعمال ہوتی ہے لیکن اردو میں یہ لفظ "اچھا" کے معنوں میں بطور صفت بولا جاتا ہے مثلاً آپ کی تجویز بہت عمدہ ہے۔ عمدہ لباس سبھی کو بھلا لگتا ہے۔ یہ معنی عربی زبان کے لیے بالکل اجنبی ہیں۔ اس لیے یہ ماننا پڑے گا کہ اچھائی کے معنوں میں یہ لفظ اردو زبان کا ہے جس میں عربی کا حرف (ع) داخل کر دیا گیا ہے چنانچہ اس کی صحیح شکل امد بمعنی امڈا بمعنی امگا ہے یہ مصدر امنڈنا سے بنا ہے اور بلند، اونچا، ابھرا ہوا وغیرہ کے معنی دیتا ہے۔ اس لفظ کا ابتدائی جزو "اوم" ہے جسے ہندو لوگ خدا کے لیے استعمال کرتے ہیں اور دراوڑ اس سے چاند مراد لیتے تھے۔ یہی لفظ رگ وید میں تبدیلی حروف کی بدولت "سوم" سنائی دیتا ہے اور سوم ناتھ (سوم یا اوم بمعنی چاند کا مالک) شوجی کا لقب ہے۔ اما (اوما) بھی شوجی کی زوجہ پاربتی کو کہتے ہیں۔ اردو میں اور بھی ایسے الفاظ ملتے ہیں جن میں "اوم" بطور جزو اول استعمال ہوا ہے اور جن سے بلندی کا مفہوم بھی نکلتا ہے مثلاً امنگ (اوم + انگ بمعنی جوش۔ لہر۔ اٹھان) امنڈنا (اوم + انڈنا بمعنی بلندی کی طرف بڑھنا) (کان) امیٹھنا (اوم+ اینٹھنا بمعنی اوپر کی طرف مروڑنا) امکنا (اومک + نا بمعنی اوپر کی طرف لپکنا) وغیرہ۔

ان مکتوبی روپوں کے علاوہ کچھ ایسے ملفوظی روپ بھی قابل غور ہیں جن میں بولنے والوں نے عربی فارسی کی مخصوص آوازیں داخل کر دی ہیں مثلاً لفظ "خراٹا" جس میں خ اور ٹ کا اجتماع ممکن نہیں ہے

کیونکہ غ فارسی زبان کی اور ٹ خالص ہندوستانی آواز ہے - موجودہ املا اور تلفظ کے ساتھ یہ لفظ فارسی میں شمار نہیں ہوسکتا - علاوہ بریں رائے مہملہ کی تشدید جس سے فارسی زبان قطعاً نا آشنا ہے اسے اردو کی گود میں ڈالے دیتی ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ تفریس کی عام دھن میں ہم لوگوں نے اردو کے حرف کھ کو فارسی غ سے بدل ڈالا اور اس لفظ کو کھراٹا سے خراٹا بنا دیا - لفظ کھراٹا دو اجزا کھر اور آٹا سے مرکب ہے - اردو میں آٹ یا آٹا کا لاحقہ آواز کے معنی دیتا ہے اور "کھر" وہ آواز ہے جو سونے والے کے گلے سے نکلتی ہے - یوں اس لفظ کے معنی ہوئے کھر کھر کی آواز - اردو کے ایسے ہی چند اور بھی صوتی کلمات ملاحظہ کیجیے - سناٹا (سن سن کی آواز) جھراٹا (جھر جھر کی آواز جو کپڑا پھاڑنے سے پیدا ہوتی ہے) - جھناٹا (جھن جھن کی آواز) چراٹا (چر چر کی آواز) وغیرہ اردو میں ایسے بہت سے الفاظ ملتے ہیں جن میں بولنے والوں نے عربی فارسی کی آوازیں داخل کر دی ہیں مثلاً زناٹا (جھمپاٹا) - فٹا فٹ (پھٹا پھٹ) - فراٹا (پھراٹا) - غٹا غٹ (گٹا گٹ) قلانچ (کلانچ کلانٹ - چھلانگ) وغیرہ - مندرجہ بالا الفاظ کی تمام تبدیلیاں اشاعت اسلام کی تاریخ سے عربی فارسی زبانوں کی بالا دستی کی مثالیں ہیں -

لفظ "کارستانی" کی ابتدا تاریخی ہونے کے ساتھ ساتھ نہایت دلچسپ بھی ہے - یہ لفظ اپنی صورت کے اعتبار سے فارسی کا معلوم ہوتا ہے اور خفیہ شرارت اور چالاکی کے معنی دیتا ہے - چونکہ اس میں لاحقہ نسبتی "ای" استعمال ہوا ہے اس لیے اس کی شکل کچھ ایسی بن گئی ہے جیسے پاکستانی ، بلوچستانی ، گلستانی وغیرہ اور اس کا تجزیہ فارسی زبان کے لحاظ سے یوں کیا جاسکتا ہے - کار + ستان (کلمۂ ظرف) + ای (لاحقۂ نسبتی) اور اس کے معنی ہوئے کارستان کا لیکن کارستان کسی مقام کا نام نہیں ہے - نہ ستان اس مقام پر فارسی کا لاحقہ ظرف اور نہ "کار" سے ہی اس کی معنویت میں کوئی مدد ملتی ہے - لامحالہ اسے اردو زبان کا کہنا پڑے گا جو ہندوستان میں مغربی ممالک سے آنے والے

عیسائی مبلغین کے ساتھ ساتھ وضع ہوا ہے ۔ اوّل تو تاریخ ہند اس بات کی گواہ ہے اور پھر ہمارا آج کا مشاہدہ بھی یہ بتاتا ہے کہ تبلیغ عیسائیت میں ان مغربی مبلغوں میں ہمیشہ چالاکیوں اور خفیہ ہتھکنڈوں سے کام لیا ہے جس کے باعث دیسی باشندوں نے ان کی ریشہ دوانیوں، شرارتوں اور اوچھی حرکتوں کو ان کے نام سے منسوب کر کے ایک نیا لفظ گھڑ لیا چنانچہ کارستانی کی اصل کرستانی یا کرسٹانی یعنی کرسٹان (عیسائی مبلغ) کی پوشیدہ چالاکی ہے ۔ اسی طرح "اردوئے معلیٰ" کی ترکیب جو زبان اردوئے معلی یعنی زبان اردو کے سلسلے میں استعمال ہوئی ہے تاریخی اہمیت رکھتی ہے "اردو محلہ" کی تفریس معلوم ہوتی ہے جو عہد شاہجہانی میں قدیم شہر دہلی سے باہر آباد ہوا تھا اور جس میں ہماری زبان بولی جاتی تھی ۔

تسمیے میں مقامی نسبت کی مثال کے طور پر لفظ "گڈریا" بھی سامنے ہی موجود ہے ۔ اس لفظ کو میں نے پراکرت کی گرامروں میں ڈال مشدد کے ساتھ گڈریا بھی لکھا دیکھا ہے لیکن گرامر نویس اس کی اصل کا سراغ لگانے میں حسب دستور ناکام نظر آتے ہیں کیونکہ وہ اس کا تجزیہ کرنے کے بجائے کسی نہ کسی سنسکرت لفظ سے اس کا جوڑ ملانے کی کوشش کرتے ہیں اور نہیں ملا پاتے ۔ اس کا ایک اور روپ گڑریا بھی سننے میں آتا ہے کیونکہ ڈ اور ڑ کی آوازیں اصلاً ایک ہی ہیں ۔ لفظ گڈریا پر جب اصول تسہیل کا اطلاق کیا جاتا ہے تو اس کی اصلی شکل گانڈریا سامنے آ جاتی ہے ۔ اردو الفاظ کا نون غنہ تشدید میں ہمیشہ غائب ہو جاتا ہے اور اس کے وجود کا علم ہمیں صرف اسی وقت ہوتا ہے جب اصول تسہیل کی رو سے تشدید دور کی جاتی ہے مثلاً سچ اور سانچ ۔ اٹی اور آنٹی ۔ کٹھی اور کانٹھی وغیرہ ۔ اسی طرح گڈریا اور گانڈریا ایک ہی لفظ کے دو روپ ہیں اور گانڈریا کا تجزیہ اس طرح پر ہے ۔ گانڈر (وہ مقام جہاں جڑیلی گھاس، پھونس اور ہتیل وغیرہ اگتی ہے مراد چراگاہ) ای (لاحقہ نسبتی) آ (حشوی) چنانچہ گانڈریا سے مراد ہے گانڈر سے منسوب ۔ وہ شخص جو بھیڑ بکریوں کو گانڈر میں چرایا کرتا ہے ۔

اسی طرح کوڑی وہ آبی جانور ہے جو کوڑ یعنی کڑ میں پایا جاتا ہے۔ کوڑ اور کڑ ایک ہی لفظ کے دو روپ ہیں اور کڑ سمندر یا دریا کے کنارے کی نشیبی زمین کو کہتے ہیں۔ اسی کڑ کو کچھ بھی کہتے ہیں۔ جس سے کچھوا منسوب ہے۔

لوگ کسی لفظ کی املا سے دھوکا کھا کر اس کی تشریح میں کس طرح غلطی کرتے ہیں اور پھر اپنی غلط تشریح کو صحیح ثابت کرنے کے لیے اپنی قیاس آرائی سے کس طرح اسلاف کو مضحک صورت میں پیش کرتے ہیں اس کی مثال میں ایک عام لفظ دپٹے کے متعلق کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ اردو کے قریب قریب تمام فرہنگ نویسوں کے مطابق یہ لفظ دو اور پاٹا سے بنا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ کپڑا دو پاٹ سے تیار ہوتا تھا لیکن مجھے اس بات میں اسلاف کی کوئی مصلحت نظر نہیں آتی کہ وہ دپٹے کو دو پاٹ سے تیار کریں۔ بعض لوگوں کا یہ بھی خیال ہے کہ گزشتہ زمانے میں کم عرض کا کپڑا بنا جاتا تھا اور دپٹے کے لیے بڑے عرض کی ضرورت ہوتی تھی اس لیے دپٹے کے لیے دو پاٹ ملا لیے جاتے تھے۔ اس تشریح سے یہ مضحکہ انگیز نتیجہ نکلتا ہے کہ قدیم زمانے میں لوگ اپنی ضرورت کے مطابق اشیا تیار نہیں کرتے تھے بلکہ جس قسم کی چیزیں مل جاتی تھیں بس انہیں کے لحاظ سے اپنی ضروریات میں ترمیم کر لیا کرتے تھے۔ آخر جو لوگ کم عرض کا کپڑا تیار کر سکتے تھے وہ اپنی ضرورت کے مطابق زیادہ عرض کا کپڑا بننے سے کیوں قاصر تھے؟ ظاہر ہے کہ یہ تمام تاویلات ایک غلط تشریح کو صحیح ثابت کرنے کے لیے کی گئی ہیں اور غلط تشریح اس لفظ کی املا سے دھوکا کھا کر کی گئی ہے کیونکہ ایک طرز تحریر کے مطابق دپٹا کو دوپٹا بھی لکھا جاتا ہے جسے عام لوگ دو+پٹا پڑھتے ہیں۔

اس لفظ کی حقیقت اور اصلیت کا پتہ لگانا بہت آسان ہے کیونکہ جب ہم عمل تسہیل سے اس کی تشدید دور کرتے ہیں تو اس کا روپ "دپاٹا" ہو جاتا ہے جو دپ، آٹ اور آ کے اجزا سے مل کر بنا ہے۔ اس کا ابتدائی جزو "دپ" مصدر ڈھپنا (بمعنی لپٹنا۔ چھپنا) کا مادہ ہے اور

آٹ اسم مجرد کا اور آ نسبت تذکیری کا لاحقہ ہے - اس طرح دھاٹا کے معنی ہوتے ہیں ڈھانپنے یا چھپانے والا اور حقیقت بھی یہی ہے کہ دوپٹے کا استعمال جسم چھپانے ہی کے لیے شروع ہوا ہے - اب جن بزرگوں نے دوپٹے کی اس امتیازی خصوصیت کے باعث اس کا یہ نام رکھا ہے ان کی سوجھ بوجھ کی داد دینے کے بجائے ان پر یہ الزام لگانا کہ وہ دو پاٹ ملا کر دوپٹا تیار کرتے تھے کہاں کا انصاف ہے -

اردو زبان کے پھیلاؤ اور سمٹاؤ کے لیے اس کے ایک مادہ "بکھ" پر غور کیجیے جس کے کتنے ہی معنی ہیں اور ہر معنی میں اس کا ایک جدا گانہ مترادف مادہ سامنے آ جاتا ہے مثلاً :

(۱) تتر بتر یا الگ الگ ہونا - اس سے اردو میں بکھیرنا اور پنجابی میں وکھرا (بکھرا - الگ - جدا) بنتا ہے - ان معنوں میں اس کا مترادف مادہ "بگ" ہے جس سے برج بھاشا کا لفظ بگرنو (بکھرنا - منتشر ہونا) بنتا ہے -

(۲) رہنا - اردو میں اس سے باکھر یا باکھل (بمعنی مکان - کوٹھری) کا لفظ بنتا ہے - اس معنی میں اس کا مترادف مادہ "بس" (بسنا) ہے جس سے ہندی میں باس جیسے رنواس (رن باس) اور باسا کے الفاظ بنتے ہیں -

(۳) ختم ہو جانا - رک جانا - لفظ باکھری اسی سے بنا ہے اور باکھری اس گائے یا بھینس کو کہتے ہیں جس کو بیاہے ہوئے کافی دن گزر چکے ہوں اور اس نے دودھ دینا بند کر دیا ہو - ان معنوں میں مادہ "بس" (ختم) اس کا مترادف ٹھہرتا ہے -

(۴) مسلسل بولنا - اردو بکھان بمعنی تقریر اور بکھاننا جیسے الفاظ اسی معنی کی نشاندہی کرتے ہیں - یہاں اس کا مترادف "بڑ" ہے جس سے بڑ ہانکنا اور بڑائی کرنا دونوں معنی نکلتے ہیں چنانچہ بکھان=بڑان اور بکھاننا=بڑاننا=بولنے کے ہی معنوں میں اس کا مترادف ایک اور مادہ "بد" بھی ہے جو شرط بدنا میں نظر آتا ہے اور سنسکرت میں بھی کافی رائج ہے -

اسی مادے سے بدن (بولنے کا ذریعہ یا آلہ یعنی منہ) بنتا ہے۔ دکن کی مشہور مثنوی۔ چندر بدن اور مہیار کی ہیروین کے نام "چندر بدن" کا فارسی ترجمہ ماہ رو ہوتا ہے۔

اب دوسرے مادہ "بگ یا باگ" کو دیکھیے جیسے میں نے سطور بالا میں "بکھ" کا مترادف کہا ہے اور اس کے ایک معنی بھی بیان کیے ہیں (واضح رہے کہ ہماری زبانوں کے مُسَر معنی بدلے بغیر بھی سکڑتے پھیلتے رہتے ہیں)۔ اس کے دوسرے معنی قطار یا دیوار کے بھی ہیں۔ اردو لفظ بگیا جو ہمارے یہاں عام طور پر غلطی سے باغ کا اسم تصغیر سمجھا جاتا ہے اسی سے بنا ہے۔ ان معنوں میں اس مادے کا مترادف لفظ باڑ ہے جو علی العموم کھیتوں یا باغوں کے گرد کھینچی جاتی ہے۔ اسی سے لفظ باڑی بنتا ہے جیسے پھل واڑی یعنی پھول باڑی چنانچہ بگیا اور باڑیا نہ صرف ہم معنی بلکہ لسانی اصول کے لحاظ سے ایک ہی لفظ کے دو روپ ہیں۔ ہندی میں بگ میل بھی باڑ یعنی قطار میں چلنے کو کہتے ہیں۔ بگ کے تیسرے معنی غبار اور پھیلاؤ کے بھی ہیں۔ ان معنوں میں اس کا مترادف بد یا باد ہے۔ اردو میں بد کاٹھ کو کہتے ہیں۔ اصلی قیمت پر بڑھی ہوئی وہ رقم جو بوپاری مال پر لکھ دیتے ہیں اور گاہک کو دام بتاتے وقت گھٹا دیتے ہیں باد کہلاتی ہے اور بادی اس شے کو کہتے ہیں جو پیٹ پھلاتی ہے۔ بادل نے بھی غبار یا پھیلاؤ سے ہی منسوب ہو کر اپنا نام پایا ہے یہی وجہ ہے کہ بگولا (باگ+ اول+آ) اور بادولا (غبار کو اوپر اڑانے یا اٹھانے والا) ہم معنی ہیں اور بگلا یا باگلا (ایک مشہور پرند) اور باد لا (بادل+آ۔ بادل سے منسوب) بھی مترادف بلکہ متبادل الفاظ ہیں۔ بگلے کے تسمیے میں اسے بادل سے غالباً اس لیے نسبت دی گئی ہے کہ بادلوں میں اس کی قطاریں اکثر نظر آتی ہیں اور اس کے پروں کا دہرا رنگ بھی بادلوں کے رنگ سے ملتا ہے۔

زبان اردو کی ثروت و وسعت کو دیکھتے ہوئے میں یہاں مطالعہ الفاظ کے چند پہلو پیش کر سکا ہوں بلکہ ان میں بھی بہت سی باتیں اور بہت سے نکات ابھی تشریح طلب رہ گئے ہوں تو کوئی تعجب نہیں

البتہ آخر میں جی چاہتا ہے کہ جو لوگ آئے دن اردو کی کم مائگی کا رونا رویا کرتے ہیں ان کی عبرت کے لیے اس بحرذخار کی گہرائی کا ہلکا سا عکس ضرور پیش کردوں اور اس کے پوشیدہ امکانات کی طرف سرسری سا اشارہ کردوں اس سلسلے میں مجھے اردو کے مادوں کی طرف توجہ دلانا ہے جن کی معنوی کثرت اور متبادل و مترادف روپوں کا آخری دو پاروں میں معمولی سا جائزہ لیا گیا ہے - اول تو اردو زبان کا ایک ایک بنیادی مادہ کتنے ہی مبتادل روپ رکھتا ہے جن میں سے کچھ خود اردو میں مستعمل ہیں اور کچھ اس کی مختلف معاصر زبانوں میں بولے جا رہے ہیں - پھر اس بنیادی مادے سے ثانوی مادے بھی تیار ہوتے ہیں جو اپنے کثیر تعداد مترادفات میں بنیادی مادوں سے کسی طرح پیچھے نہیں ہیں - ان دونوں قسم کے مادوں پر سابقے اور لاحقے اضافہ کر کے بھی ان گنت الفاظ بنتے ہیں اور ان پر لسانی قواعد و اصول منطبق کرکے بھی لغات کی اچھی خاصی تعداد حاصل ہو جاتی ہے - اس طرح ہمیں ہر نازک سے نازک اور باریک سے باریک خیال کے لیے کئی کئی لفظ مل جاتے ہیں - اگر اپنی زبان کے الفاظ کا محنت سے مطالعہ کیا جائے تو مجھے یقین ہے کہ ہمیں ایسے بے شمار الفاظ مل جائیں گے جو پہلے ہی سے بنے بنائے موجود ہیں اور انہیں ہم علوم جدیدہ بالخصوص سائنس کی مغربی اصطلاحوں کی جگہ نہایت سہولت اور آسانی سے استعمال کر سکتے ہیں - ان کے علاوہ ہماری زبان میں لفظ سازی کے اصول بھی موجود ہیں جن سے حسب ضرورت ہم جب چاہیں بہت سے الفاظ گھڑ سکتے ہیں -

یہاں توسیع اردو کے سلسلے میں ایک بات کا ذکر کرنا ضروری ہے - ہم بعض اوقات ایک لفظ اپنی بول چال میں استعمال کرتے ہیں لیکن اس کے دوسرے گرامری روپ کو بھول کر بھی یاد نہیں کرتے نہ اردو کے کسی لغت سے ہی ہمیں اس کا سراغ ملتا ہے - اگر ہم ان قواعد پر غور کرکے دوسرے روپوں کو بھی حاصل کر لیں تو اس سے زبان کی ثروت میں بہت کچھ اضافہ ہو سکتا ہے - مثال کے طور پر تونسا ہوا (لوٹا یا گھٹا ہوا) کی ترکیب سے سب واقف ہیں اور اسے

حسب ضرورت استعمال بھی کر لیتے ہیں جیسے ع - ''تونسے ہوئے سمند زبانیں نکالے ہیں''- لیکن یہ بھول گئے ہیں کہ لفظ ''تونسا'' کا یہ روپ گرامر کے اعتبار سے مجہولی ہے - اس کی معروف شکل ''تُسا ہوا'' ہمارے خواب و خیال میں بھی کبھی نہیں آتی حالانکہ مجہول روپ کے ساتھ ساتھ معروف روپ کا استعمال لازم ہوتا ہے - شاعروں میں ترک و اختیار کی رسم اگرچہ زبان کا گلا گھونٹنے والا آلہ ہے لیکن اس غیر مستحسن رسم کی رو سے بھی ''تُسا ہوا'' میں کیڑے نہیں ڈالے جا سکتے - اس لفظ کا ہم معنی ایک دوسرا لفظ ''تجا ہوا'' البتہ ہماری بول چال میں ابھی تک چلا آ رہا ہے - یہ لفظ گرامر کی رو سے معروف ہے اور ''تُسا ہوا'' کی جگہ استعمال ہوتا ہے لیکن اس کا مجہولی روپ تو ''تجا ہوا'' ہم سے نہ معلوم کس زمانے میں اور کن حالات کے تحت گم ہو چکا ہے - ایسی گمشدہ کڑیوں کی بازیابی بھی فروغ اردو میں بڑی معاونت کر سکتی ہے -

اوپر کہا جا چکا ہے کہ اردو اور اس کی تمام معاصر زبانیں اپنی اصل و نسل کے اعتبار سے دراوڑی اور اپنی ابتدائی سطح پر ایک ہیں یہی وجہ ہے کہ کسی مادے کا اگر ایک روپ ایک زبان میں رائج ہے تو دوسرا روپ دوسری زبان میں بولا جا رہا ہے - کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک لفظ ایک زبان میں لغوی معنی دے رہا ہے تو دوسری زبان میں وہی لفظ یا اس کا کوئی دوسرا روپ مجازی معنوں میں استعمال ہو رہا ہے - مثال کے طور پر اردو لفظ ''سہارا'' کا ایک متبادل روپ ''ڈھارا'' بنتا ہے لیکن یہ لفظ اردو زبان میں چالو نہیں ہے البتہ اس سے ملتا جلتا دوسرا لفظ ڈھارس ہماری زبانوں پر عام ہے - میں ڈاکٹر وزیر آغا کا شکر گزار ہوں جنھوں نے مجھے پہلی بار یہ بتایا کہ لفظ ''ڈھارا'' پنجابی زبان میں اس عارضی چھپر کو کہتے ہیں جو کاشتکار اپنی مزروعہ اراضی میں سہارے کے طور پر مویشیوں وغیرہ کے لیے چھا لیتے ہیں - اسی طرح اردو الفاظ کے نہ جانے کتنے متبادل روپ جو اردو میں مستعمل نہیں ہیں دوسری زبانوں میں تلاش کیے جا سکتے ہیں اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ بنیادی سرمائے اور اصولوں میں اردو اپنی

معاصر زبانوں سے بہت کچھ مطابقت رکھتی ہے۔ اس حقیقت حال سے ہم اصطلاح سازی میں یوں فائدہ اٹھا سکتے ہیں کہ اردو کی معاصر زبانوں سے مناسب الفاظ لے کر انہیں علوم جدیدہ کی اصطلاحوں کے طور پر اپنے یہاں رائج کر لیں۔ عربی، فارسی، یونانی، لاطینی یا انگریزی زبانوں سے اصطلاحی الفاظ مستعار لینے سے یہ طریق کار کہیں بہتر ہے کہ اردو کا رشتہ اسی سر زمین میں بولی جانے والی زبانوں سے قائم کیا جائے خصوصاً اس صورت میں جبکہ اردو کی جڑیں اسی مٹی کی کسی نہ کسی گہرائی پر پہنچ کر ان کی جڑوں سے نہ صرف گتھ جاتی ہیں بلکہ ان میں پیوست ہو جاتی ہیں۔

ہمارے یہاں صحیح معنوں میں تو خیر کیا ابھی جھوٹ موٹ بھی الفاظ کا مطالعہ شروع نہیں ہوا ہے اس لیے ہمیں اس بات کا پوری طرح احساس ہی نہیں ہے کہ اس مطالعے میں ہمارے کتنے فائدے مضمر ہیں اور یہ مطالعہ اپنے اندر کتنے گوناگوں پہلو، دلچسپاں اور رنگینیاں رکھتا ہے۔ اس میں ہمارے ماضی کی کتنی کروٹیں پوشیدہ ہیں اور کتنی نسلوں کی تہذیبی میراث محفوظ ہے۔ آج عمرانیات اور نسلیات جیسے علوم جدیدہ کے کتنے ہی حل طلب مسائل اس مطالعے کے منتظر ہیں۔ جو لوگ اپنے زعم میں عقل کل بنے ہوئے معراج انسانیت کی ڈینگیں مار رہے ہیں ان کی عقل پر سے پردے صرف اسی مطالعے کے ذریعے اٹھائے جا سکتے ہیں اور جو سر پھرے اپنی گفتگو کی ابتدا یوں کرتے ہیں کہ "ابتدا میں ہمارے مورث پہاڑوں کی کھوہ میں رہتے اور پتے لپیٹے تھے۔ کچا گوشت کھاتے اور بھیانک چیخوں سے بھی پہلے محض اشاروں کے سہارے زندگی تیر کرتے تھے" وہ اپنے بزرگوں کو اس مطالعے ہی سے پہچان سکیں گے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس مطالعے سے اردو زبان کی عظمت و توانائی کا علم بھی حاصل ہو سکے گا اور منکرین بھی اس کی وسعت ثروت پر ایمان لانے کے لیے مجبور ہو جائیں گے۔

(مطبوعہ اوراق لاہور ۱۹۶۶ء)

اردو کے کچھ بولوں کی تشریح

ابتدا سے آج تک اردو زبان کو کسی نہ کسی دوسری بولی سے مشتق بتایا گیا ہے اور اس بات کو یکسر نظرانداز کر دیا گیا ہے کہ یہ بھی ایک آزاد بولی ہے اور ایک منضبط اور بااصول ڈھانچا رکھتی ہے اس لیے اب تک کسی محقق یا ماہر زبان نے اس طرف توجہ ہی نہیں کی کہ اس کے بولوں کی بناوٹ پر دل جمعی سے غور کیا جائے اور وہ اصول دریافت کیے جائیں جن کو سامنے رکھ کر یہ بول گھڑے گئے ہیں۔ میں دیکھتا ہوں کہ ان میں سے کچھ بول تو ذرا سا غور کرنے پر ہی سمجھ میں آ جاتے ہیں لیکن بہت سے بول ایسے ہیں جن کی بناوٹ اتنی آسانی سے سمجھ میں نہیں آتی یا جن کی ظاہری صورت سے وہ معنی نہیں نکلتے جن کے لیے ان کا استعمال ہوتا ہے۔ ایسے بولوں کی تشریح کا کام دلچسپ ہونے کے باوجود کٹھن بھی بہت ہے۔ کیونکہ بعض اوقات تشریح کرنے والا بول کے کسی اہم اصول یا جزو کو نظر انداز کر دیتا ہے جس سے اس کی ساری محنت اکارت چلی جاتی ہے اور وہ صحیح نتیجہ نکالنے کی جگہ غلط راستے پر جا پڑتا ہے۔ اس خطرے کے پیش نظر یہ ضروری ہے کہ بولوں کے تجزیے کے وقت ان کی تمام آوازوں اور تمام معانی کو دھیان میں رکھا جائے۔

میرے نزدیک اردو الفاظ کی تشریح دو طریقوں سے کی جا سکتی ہے، ان میں ایک طریقہ یہ ہے کہ پہلے بول کے مادے کو دریافت کیا جائے اور پھر اس مادے سے بننے والے دوسرے مختلف بولوں کا باہمی تقابل کرکے اس کے معنی دریافت کیے جائیں۔ اس طرح بولوں کے ایک طویل سلسلے کی از خود تشریح ہو جائے گی۔ یہ طریقہ نہایت آسان بھی ہے اور بے حد مفید بھی۔ البتہ اس میں دقت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب ایک مادے سے بننے والے مختلف بول اپنی بولی میں دست یاب نہ

ہو سکیں یا اتنی تعداد میں نہ مل سکیں کہ ان کا موازنہ کر کے مادے کی صحیح معنویت کا تعین کیا جا سکے ۔

تشریح کا دوسرا طریقہ یہ ہے کہ جس بول کے مختلف معنی معلوم ہوں ، آوازوں کی بدلائی سے اس کے مختلف مترادفات بنائے جائیں اس عمل سے یہ ظاہر ہو جائے گا کہ جس طرح ایک مادے یا بول کے کتنے ہی مترادفات ہو سکتے ہیں اسی طرح وہ کتنے ہی مختلف معانی پر بھی دلالت کرتا ہے ۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہنا چاہیے کہ ایک بول کے جتنے معانی ہوتے ہیں اتنے ہی اس کے مترادفات بھی ہوتے ہیں ۔ ہمارے یہاں آوازوں کے تبادل کا اصول زبان میں معنوی وسعت پیدا کرنے والا اصول ہے ۔ چنانچہ جب تشریح کے پہلے طریقے پر عمل کرنے سے خاطر خواہ کامیابی نہیں ہو پاتی ، اس وقت اس دوسرے طریقے ہی سے مطلب براری ممکن ہے لیکن اس پر عمل کرنے کے لیے سرمایۂ زبان پر وسیع نظر رکھنا لازمی ہے جو کسی فرد واحد کو آسانی سے میسر نہیں آ سکتی ، اس لیے یہ عین ممکن ہے کہ بعض اوقات کسی مترادف بول کو اپنی معلومات کی کمی کے باعث ہی مسترد کر دیا جائے ۔ مثلاً کھٹا اور کھوٹا جو حقیقت میں مترادفات ہیں ، ظاہراً ایک دوسرے سے قطعی مختلف نظر آتے ہیں ، البتہ ہماری زبان میں ان کے استعمال پر ذرا سا بھی غور کر لیا جائے تو واضح ہو جائے گا کہ ایک موقع پر یہ دونوں بول ہم معنی ہوتے ہیں ۔ جیسے میرا جی اس کی باتوں سے کھٹا ہو گیا ۔ اس جملے میں کھٹا سے ترش کا نہیں کھوٹا (کھوٹ والا) کا مفہوم نکلتا ہے ۔

ذیل میں ایسے ہی کچھ بولوں کی تشریح پیش کی جاتی ہے :

آرسی : ایک آئینہ دار بڑی انگوٹھی کو کہتے ہیں جس میں دلہنیں اپنا منہ دیکھتی ہیں ۔ یہ بول آرس سے صفت نسبتی بنایا گیا ہے جس کے دو مترادفات ہیں ، آلس اور آنس اور دو معنی ہیں ۔

(۱) آلکس ، سستی ، تاخیر ، جس کی اکڑن وغیرہ ۔ آرسی یا آلسی سست آدمی کو کہتے ہیں اور ارسا (معرب بول عرصہ بمعنی

تاخیر اور دیر وغیرہ) بھی اسی سے بنا ہے ، السیٹ بمعنی رکاوٹ وغیرہ کا مادہ بھی آلس ہی ہے - لفظ آنس کے معنی بھی تکلیف کے ہیں جس سے آنسنا کا مصدر بنتا ہے -

(۲) آنکھ - السی (الس + کلمہ نسبتی ای) کا بول انھیں معنوں میں گھڑا گیا ہے کہ اس کا دانہ آنکھ سے مشابہ ہوتا ہے اور آنسو (آنس + علامت فاعلی او) کے معنی بھی آنکھ والا ہوتے ہیں - چنانچہ ایک خاص قسم کی انگوٹھی کے لیے آرسی کا بول بھی انھیں معنوں میں وضع ہوا ہے -

آلکس : سستی اور کاہلی کے معنوں میں آتا ہے ل اور ر کے تبادل سے آرکس بھی بولا جا سکتا ہے - اس کا مترادف آنکڑ (اکڑ) بنتا ہے - جس میں لام کا تبادل غنہ سے اور س کا تبادل ڑ سے ہوتا ہے اور آنکڑ یا اکڑ کے معنی اینٹھن الکس میں جسم کی اکڑن لازمی بات ہے - اس بول پر "ٹ" (آہٹ) کا اضافہ کرکے اکساہٹ (الکساٹ) بنتا ہے جس کے معنی سستی کی حالت اور اس کا مترادف ہے آنکڑاہٹ یا اکڑاہٹ یعنی جسم کے اکڑ جانے کی حالت -

آنکس : لوہے کی ایک سلاخ ہوتی ہے جو ہاتھی کو چلانے کے لیے چبھوئی جاتی ہے - اس کا مترادف آنکڑ ہے اور آنکڑ ہک یا کانٹے کو کہتے ہیں - واضح رہے کہ آنکس کی شکل بھی کانٹے کی سی ہوتی ہے - ہمزہ اور ہائے ہوز کے تبادل سے اس کا ایک اور مترادف روپ ہانکس بھی ہو سکتا ہے جس کے معنی ہیں ہانکنے والا یا ہانکنے کا آلہ -

آنو : کپڑے پر بنے ہوئے بیل بوٹے اور نقش و نگار کو آنو اور بیل بوٹے بنانے کو آنو کرنا یا آنو بنانا کہتے ہیں -

محمد اسماعیل میرٹھی کا شعر ہے :

یوں قدم پھونک پھونک دھرتے ہو
گویا آنو زمیں پہ کرتے ہو

زیادہ بٹنے کے باعث جسم پر مار کے کالی نشان بن جاتے ہیں تو محاورے میں اسے بھی آنٹو بناتا یا آنٹو کر دینا بولتے ہیں ۔ اس لفظ کے مترادف چٹی اور الٹو ہیں ۔ جن سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ آنٹو کرنے میں بیل بوٹے کپڑے پر ابھر آتے ہیں اور اگر بیل بوٹے کپڑے پر ٹھپے سے بنائے جاتے ہیں جیسا کہ جدید نسیم اللغات (مؤلفہ سید مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی) میں لکھا ہے تو یہ ٹھپا بھی کپڑے پر اس طرح لگایا جاتا ہے کہ نقش و نگار اس پر ابھر آتے ہوں گے ۔

اینٹھا : لپیٹ اور پھندے کو کہتے ہیں ۔ اگر کسی کھونٹی میں ڈور کی ایک لپیٹ یا پھندا دینا مقصود ہو تو کہتے ہیں کہ ایک اینٹھا دے دو ۔ اس کا مترادف ہے ہلیکتا اور اس کے معنی لپیٹ یا پھنسا ۔

انگیٹھی : ایک قسم کا جالی دار چولہا ہوتا ہے جس میں کوئلے دہکائے جاتے ہیں اور جو تاپنے یا دودھ وغیرہ گرم کرنے کے کام آتا ہے ۔ یہ بول انگ اور اٹھی سے بنا ہے ۔ انگ کے کتنے ہی معنی ہوتے ہیں ، جیسے جسم ، حصہ ، طریقہ ، جتن ، جی ، من آگ وغیرہ ۔ چنانچہ یہاں اس کے آخری معنی مراد ہیں ۔ انگارا (انگ+علامت فاعلی آرا) اور پنجابی اگ یا اگی (انگ یا انگی یعنی انگ والی) بمعنی آگ میں بھی اس کے یہی معنی شامل ہیں ۔ اس کا مترادف ال ہے اور الاؤ (ال+آؤ بمعنی گڑھا ، نشیب) کی حقیقت انگاؤ یعنی انگاروں کا کنڈ ہے ۔ اٹھی کے معنی ہیں اہرا ۔ اس مرکب بول کا مطلب ہوا انگاروں کا اہرا یا ظرف ۔

بتاسا : شکر کے قوام سے تیار کی ہوئی ایک مشہور گولی کا نام ہے ۔ بتاسا اس کا مترادف بول ہے اور بتاسا کا تجزیہ اس طرح ہو ہے ۔ بتاس (بتناس ، باتناس بمعنی عمل تقسیم)+آ (والا) جس سے مراد ہے بٹنے والا ، تقسیم ہونے والا ۔ جو لوگ اس کو بات یا باد بمعنی ہوا سے مشتق بتاتے ہیں وہ ہوا کا عمل دخل دوسری

اشیا میں کیوں نہیں دیکھتے ۔

بتانا : اس بول کے دو معنی ہیں :

(۱) کہنا ، اطلاع دینا ، جتانا وغیرہ ۔ ان معنوں میں یہ لفظ بات اور علامت مصدری "آنا" سے مرکب ہے جس کے معنی ہوئے بات کرنا ۔

(۲) چوڑی کا ناپ ۔ ان معنوں میں اس کا اصلی روپ بنتانا ہے جس کا مخفف بتانا ہے کی طرح عمل تخفیف سے ساقط ہو گیا ہے ۔

اس کی مختلف منازل یہ ہیں :

بتانا ، بنتانا ، بانتانا ، بونتانا = بونتان (بونتنے یا ناپنے کا عمل) + آ (والا) یعنی ناپ یا تپانا ، کپڑا بونتنا کے معنی ہیں کپڑا ناپنا ، کپڑے کا اندازہ یا حساب لگانا ۔ انہیں معنوں میں اس بول کا مترادف بٹانا (بنٹانا ، بانٹانا) بھی ہوتا ہے جس کا تجزیہ یوں ہے ، بٹان (تقسیم ، حساب ، پیمائش) + آ (والا) ۔

بھونچکا : بعض لوگ اس بول کو سنسکرت بھو آچکا (بہت اچکنے والا) سے مشتق بتاتے ہیں لیکن سنسکرت کا یہ اصلی بول نہیں ہے ۔ بلکہ ہمارے بول کو دیکھ کر محض اشتقاق ثابت کرنے کی خاطر گھڑا گیا ہے ۔ دوسرے یہ کہ دونوں کے معنوں میں بہت بڑا فرق ہے ۔ ہر اردو داں واقف ہے کہ بھونچکا ، دنگ اور حیران شخص کو کہتے ہیں جو ذرا دیر کے لیے بے حس و حرکت اور ساکت کھڑا رہ جاتا ہے ۔ اس کو اچکنے سے کیا تعلق ہو سکتا ہے ۔ تیسرے یہ کہ اردو میں اچکا ، اٹھائی گیرے کو کہتے ہیں جیسے چور اچکا ۔ اس کو بھونچکا سے کوئی مناسبت ہی نہیں ۔ میں عمل تسہیل سے جب اس بول کی تشدید دور کرتا ہوں تو اس کا مترادف "بھونچال کا" سامنے آتا ہے اور بھونچال جسے لوگ بھوئیں (زمین) اور چال (حرکت) سے مرکب بتاتے ہیں ، دراصل مرکب ہے بھون (دائرہ) اور چال سے ۔ چنانچہ

بھونچال دائرہ نما گردش یا حرکت کو کہتے ہیں ۔ مادہ بھون سے بھی کتنے ہی بول بنتے ہیں جن سے اس کے معنی کی تصدیق ہوتی ہے ۔ مثلاً بھوں (ابرو) بھونرا (دائرے میں اُڑنے والا مکوڑا دائرے میں گھومنے والا لٹو) ، بھونٹا (کند ، گول ، کنارے مڑا ہوا) وغیرہ ۔ اب جو شخص ایک دائرے میں گھومے گا یقیناً چکرا جائے گا اور پھر اس کی سمجھ میں کوئی بات نہیں آ سکے گی ۔ ایسے ہی شخص کو بھونچکا کہا جاتا ہے ۔ بعض لوگ اس بول کا غنہ ساقط کر کے بھوچکا بھی بولتے ہیں ۔

ترپولیا: اُس مقام کو کہتے ہیں جہاں ایک سمت میں تین دروازے ہوں ۔ اس بول کا تجزیہ یوں ہے ۔ تر (تن، تین)+ پول (دروازہ ۔ اسی سے لفظ پول بمعنی دہلیز ڈیوڑھی بنا ہے)+ ای (نسبتی) + آ (حشوی) ، تین دروازوں والا ۔

چپراسی: سپاہی ۔ پیادے یا ہرکارے کو کہتے ہیں ۔ بعض لوگوں نے اس بول کی تحقیق اور تجزیے میں اپنی قیاس آرائی کو انتہا پر پہنچاتے ہوئے کہا ہے کہ یہ بول فارسی چپ و راس سے بنا ہے جس کے معنی دائیں بائیں کے ہیں ۔ چونکہ یہ ملازم دائیں بائیں دیکھتا ہوا چلتا ہے اس لیے اس کو چپراسی یعنی چپ و راسی کہا گیا لیکن اس معنوی تاویل کے ساتھ ساتھ انھوں نے جس طرح اس کی صورت بگاڑنے کی بھی کوشش کی ہے ، وہ بھی کچھ کم افسوس ناک نہیں ہے ۔ دراصل یہ بول مرکب ہے ۔ چپراس اور ای (کلمۂ نسبتی) سے جس کے معنی میں چپراس والا ۔ وہ ملازم جس کے چپراس لگی ہو ، چپراسی کہلاتا ہے اور چپراس چوڑی پٹی کو کہتے ہیں خواہ وہ کرتے کے ملبے میں لگائی جائے خواہ سپاہی کی کمر میں ۔ اس کا مترادف بول چوڑاپس ہے ۔ اس طرح چپراسی کے معنی ہوتے ہیں چوڑی پٹی لگانے والا ۔

چپرقناتی: بالعموم خوشامدی یا متوسل کے لیے استعمال ہوتا ہے ۔ اردو کے اس بول پر عربی کا سایہ پڑنے کے باعث اس کا ابتدائی کاف

عربی کے قاف سے بدل گیا ہے اس کی اصل چھڑکاناتی ہے - جو شخص اپنے آپ کو خواہ مخواہ کسی کا حامی یا ہمدرد ظاہر کرتا ہے ، وہ اس کا چپرقناتی کہلاتا ہے -

چھپکلی : ایک مشہور چوپایہ ہے جو عام طور سے گھروں میں پایا جاتا ہے اور گرگٹ ، گھیرے وغیرہ کی نوع سے تعلق رکھتا ہے - لالا لوگوں نے اپنی باغ و بہار فارسی میں اس کا ترجمہ پوشیدہ غنچی کیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ لوگوں نے اس کے ایک جزو (چھپ) کو چھپنا کا مادہ اور دوسرے جزو (کلی) کو بن کھلا پھول سمجھا ہے - حالانکہ حقیقت میں اس کا پہلا جزو چھینٹ ہے جس کے معنی چھاپ ، چھوٹے چھوٹے نشان یا داغ کے ہیں - اسی سے ایک اور لفظ چھینٹی بنتا ہے جو کپڑوں ، بالعموم چندریوں میں چھوٹی چھوٹی بوندیں ڈالتا ہے - میں نے چھینٹی راجستھان کے علاوہ آگرے میں بھی دیکھے ہیں بلکہ آگرے کا تو ایک محلہ (چھینی ٹولا ، اصل چھینٹی ٹولا) بھی انہیں پیشہ وروں سے مخصوص چلا آ رہا ہے - آوازوں کی بدلائی سے یہ بول چھینٹ کا مترادف ہے جس کے معنی بھی باریک باریک بوندوں یا نشانوں کے ہیں - اس بول کا دوسرا جزو "کلی" درحقیقت کری (کی ہوئی) ہے اور ان دونوں روپوں میں ل اور ر کا تبادل ہوا ہے - یوں چھپکلی کی اصل چھینٹ (چھینٹ)+کلی (کری ، کی ہوئی) ہے - چنانچہ اس بول سے وہ جانور مراد ہے جس پر چھوٹی چھوٹی بوندیں ، چھینٹیں ، داغ یا نشان بنے ہوتے ہیں -

دھنا : چھٹے کو کہتے ہیں جس کے دونوں پھنوں کو دبا کر انگارے پکڑے جاتے ہیں - بعضوں نے اس کو فارسی دست پناہ (ہاتھ کو بچانے والا) سے مخفف مانا ہے اور خواہ مخواہ ت کو ساقط کرکے آخر میں ہائے ہوز کا اضافہ کر دیا ہے - یہ محض قیاس آرائی ہے جس کے لیے کوئی منطقی جواز یا دلیل نہیں ہے - اس بول کی اصل دوپنا ہے اور اس کا تجزیہ یوں ہے :

دسنا ، دلہنا ، دوہنا، دوہن (چھپانا، دبانا)+آ (والا) یعنی دبانے والا ، چھپانے والا ۔

سپوت : اس سے اچھا بیٹا مراد ہوتا ہے جو نیک بخت اور ماں باپ کا فرمان بردار ہو ۔ ہندی والے اور ان کی دیکھا دیکھی بعض اردو والے بھی اس لفظ کو س (اچھا) اور پوت (بیٹا) سے مرکب بتاتے ہیں لیکن ہندی یا اردو میں سین مفتوح اچھائی کے معنوں میں کبھی اور کہیں بھی اگ لگوتے (سابقہ) کے طور پر مستعمل نہیں ہے ۔ البتہ سنسکرت میں سین مضموم یہ معنی ضرور دیتا ہے جو اوستا میں ہائے مضموم لکھا ہوا ملتا ہے اس لیے ان لوگوں کی یہ تشریح قابل قبول نہیں ہے اور پھر اسی کی وجہ سے اس بول کا تجزیہ بھی ناقص ہو جاتا ہے ۔ میرے نزدیک یہ بول سپ اور اوت سے مرکب ہے ۔ سپ کا مترادف سٹ ہے جس کے معنی ہیں میل ملاپ اور اوت کے معنی ہیں بیٹا ، اوت (بمعنی نہیں ، اوت بمعنی بیٹا) سے لاولد شخص مراد ہوتا ہے ۔ چنانچہ سپوت کے معنی ہیں باپ سے ملا ہوا یا ملتا ہوا بیٹا ۔ اس کی مزید وضاحت لفظ کپوت سے آگے چل کر ہو جائے گی ۔

شمبھو : ہندوؤں کے مشہور دیوتا شو کا ایک نام ہے ۔

اس کے مترادفات کے مندرجہ ذیل دو سلسلے ہیں :

(۱) شمبھو ، سمبھو ، سنبھو ، سانبھو ، سانپو ۔

(۲) شمبھو ، سمبھو ، سنبھو ، سبھو (مبارک) ۔

چنانچہ شمبھو اصل میں سانپ ہے جسے دراوڑ دیوتا مانتے اور اس کی پوجا کرتے تھے ۔ آریوں نے ہندوستان میں کچھ عرصہ رہنے بسنے کے بعد داوڑوں کے اس عظیم دیوتا (سانپ) کو بھی اپنے دیوتاؤں میں شامل کر لیا اور اب یہ تمام ہندوؤں کا مشترک دیوتا بن گیا ہے جو آج بھی سانپ کو سبھو (سبھ بمعنی برکت و سعادت+ علامت فاعلی او) بمعنی

مبارک مانتے ہیں ۔

صلواتیں : یہ ان بولوں میں سے ہے جو معرب بنا لیے گئے ہیں ۔ عربی میں درود کو صلوات کہتے ہیں ۔ اس لحاظ سے صلواتیں کے معنی بہت سی درودیں ہو سکتے ہیں لیکن اردو زبان میں یہ بول گالیوں اور ناخوش گوار باتوں کے معنی میں استعمال ہوتا ہے جس سے ظاہر ہے کہ یہ عربی کا نہیں بلکہ خود اردو ہی کا بول ہے ۔ دوسرا قابل غور نکتہ یہ ہے کہ ان معنوں میں یہ لفظ ہمیشہ جمع کی حالت میں ہی استعمال ہوتا ہے ۔ ہمارے ایک محاورے "صلوات بھیجنا" میں البتہ یہ بطور واحد بھی مستعمل ہے لیکن اس موقعے پر اس کے معنی چھوڑ دینا ، نظر انداز کر دینا ، ختم کر دینا وغیرہ کے ہوتے ہیں ۔ خود فارسی زبان کے مقولے "گذشتہ را صلوات آیندہ را احتیاط" سے بھی یہی معنی نکلتے ہیں ۔ گالی دینا یا برا بھلا کہنا کے معنی مراد نہیں ہوتے ۔ اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ صلواتیں عربی کے لفظ صلوات کی جمع نہیں ہے ۔ میرے نزدیک اس کی اصلی "سل باتیں" ہے اور یہ مرکب ہے سل (سڑ یعنی سڑی ، گندی ، بری) اور باتیں سے ۔

کہاسی : یہ بول ہلکے پیلے رنگ کے لیے استعمال ہوتا ہے ۔ ظاہراً تو یہ کپاس (روئی) اور ای (نسبتی) سے مرکب نظر آتا ہے لیکن ہمارے یہاں کپاس بنولے والی روئی کو کہتے ہیں جس کا رنگ بالعموم سفید ہوتا ہے اس لیے یہاں لفظ کپاس کے یہ معنی جو عام طور پر مشہور ہیں ، ہرگز مراد نہیں ہو سکتے ۔ میرے نزدیک یہ لفظ کنپاس یا کانپاس تھا جو عمل تخفیف کے باعث کپاس ہوگیا ہے اور کنپاس اس کپکپی یا لرزے کو کہتے ہیں جو خوف سے پیدا ہوتا ہے اور جس میں چہرے کا رنگ ہلکا زرد پڑ جاتا ہے ۔ لہٰذا کپاسی کے معنی ہوئے وہ رنگ جو کپکپی کے باعث چہرے پر کھنڈ جاتا ہے ۔

کپوت : یہ لفظ سپوت کی ضد ہے اور ناخلف کے معنوں میں بولا جاتا

ہے جو لوگ سپوت کے سین مفتوح کو اچھائی کا اگ لگوا (سابقہ) بتاتے ہیں (حالانکہ یہ غلط ہے جیسا کہ پیشتر لکھا جا چکا ہے) وہی اس لفظ کے کاف مفتوح کو برائی کا اگ لگوا قرار دیتے ہیں لیکن برائی کے لیے اردو میں کاف مضموم استعمال ہوتا ہے جیسے کُلَّعب ، کھُور ، کُربت وغیرہ ۔ برائی کے معنوں میں کاف مفتوح نہ صرف اردو بلکہ کسی بھی ہندوی زبان میں مستعمل نہیں ہے ۔ خود سنسکرت زبان بھی اس سے خالی ہے اور ان معنوں میں وہاں بھی اردو ہی کا کاف مضموم استعمال ہو رہا ہے اس لیے میں اس بول کو کپ اور اوت سے مرکب سمجھتا ہوں ۔ اس کا مترادف کثوت ہے اور کثوت کا تجزیہ اس طرح پر ہے :

کٹ (اخراج ، نکالا) + اوُت (بیٹا) ۔ چنانچہ کپوت کے معنی ہوئے باپ سے کٹا ہوا یا کٹتا ہوا بیٹا جو باپ سے جداگانہ روش رکھتا ہو ۔

کھڑپینچ: اعتراض اور سین میکھ نکالنے کے معنی دیتا ہے ۔ یہ دو الفاظ کُھڑ اور پینچ سے مرکب ہے ۔ کُھڑ کے مترادفات ہیں کُھنڈ، کُھند (بمعنی دشمنی ۔ پنجابی میں اسی سے کُھندک بنا ہے) ، کُھنس (جو برج بھاشا میں عداوت کے معنی دیتا ہے) وغیرہ اور پینچ کا مترادف پیچ (جوڑ ، داؤ) ہے ۔ یوں اس بول کے معنی ہوئے عداوت اور دشمنی کے وار اور داؤ اور کُھڑ پینچ نکالنا سے دشمنی کے باعث اعتراضات کے وار کرنا مراد ہوتا ہے ۔ اس کا ایک اور مترادف کھول پیچ بھی ہے ۔

گھنگھور: گہری سیاہ اور دور دور تک پھیلی ہوئی گھٹا کی صفت کے طور پر اس بول کا استعمال ہوتا ہے ۔ اس کے دو جزو ہیں ۔ گھن اور گھور اس لیے اس کا صحیح اچار (تلفظ) وہ ہے جس میں نون بالا علان بولا جاتا ہے ۔ گھن کا بول بہت کے معنوں میں آتا ہے بلکہ ان معنوں میں بہت سی زبانیں گھنا کا بول بھی استعمال

کرتی ہیں ۔ ایک ہندی لغت "آدرش ہندی شبد کوش" نامی کے لغت نویس نے ان الفاظ کے جو معنی دیے ہیں وہ میں یہاں نقل کیے دیتا ہوں :

گھن : بہت ، زیادہ ، گھنا ۔

گھور : خوفناک ، گھنا ، گہرا ، بُرا ، زیادہ ، گرج ، آواز ۔

گھنگھور: ڈرونی آواز ، بادل کی گرج ، بہت گھنا ، خوفناک ۔

گھنگھور گھٹا : کالی کالی گھٹا ۔

ان الفاظ میں سے صرف ایک بول گھن کے معنی تو فاضل فرہنگ نویس نے دیے ہیں ، باقی تمام الفاظ کو قریب قریب ہم معنی بنا دیا ہے اور گھوم پھر کر ایک ہی معنی اور ایک ہی سے الفاظ تحریر کر دیے ہیں ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسے لفظ گھور کے صحیح معنی کا علم نہیں ہے ۔ تبادل اصوات کی رو سے لفظ گھور اور گھوم باہم مترادف ہیں اور گھوم پھیر ، گھیر اور پھیلاؤ کو کہتے ہیں ۔ مثلاً اس لہنگے میں بہت گھوم ہے یعنی یہ لہنگا بہت گھیردار ہے ۔ اس لیے گھنگھور کے معنی ہیں گھن گھوم ۔ بہت زیادہ گھیردار یا گھیرے والی ۔ بہت زیادہ پھیلی ہوئی ۔ دائرے میں دور دور تک چھائی ہوئی ۔ محض گہری ، کالی ، گرجدار ، یا ڈرونی گھٹا کو گھنگھور نہیں کہا جا سکتا ۔

مسٹنڈا : موٹے تازے ہٹے کٹے شخص کو کہتے ہیں ۔ یہ لفظ مرکب ہے مُسٹ اور انڈا سے ۔

اس کا تجزیہ یوں ہے :

مُسٹ = موٹ (موٹائی) اور انڈ = انگ ، جسم اور آ = والا ۔ چنانچہ مسٹنڈا کا مترادف موٹنگا ہوتا ہے جس کے معنی ہیں موٹے جسم والا ۔ اس بول کا ایک اور مترادف روپ مُٹلا بھی ہے ۔

ہڑ بونگ : افراتفری ، ہل چل اور شور و غوغا کے معنی دیتا ہے ۔ بظاہر تو یہ بول ہاڑ (ہڈی) اور بونگ (پچھلی ادلا) کا مرکب

معلوم ہوتا ہے لیکن یہاں ہلڑی اور ادلے گو ملا کر اس کا مفہوم نہیں نکلتا اس لیے میرے نزدیک اس کا تجزیہ اس طرح پر ہے : ہڑ = ہنڈ (بذریعہ تخفیف بمعنی دوڑ بھاگ) + بونگ = بول (آواز ، شور وغیرہ ۔ اس کا ایک اور متبادل روپ بوم بھی ہے جو گجراتی میں بولا جاتا ہے اور کراچی میں عام طور پر سننے میں آتا ہے جیسے بوم مارو یعنی آواز دو) ۔ چنانچہ ہڑبونگ سے وہ کیفیت مراد ہے جس میں دوڑ بھاگ اور شور و غل دونوں باتیں شامل ہوں ۔

ہڑتال : اس بول کے دو معنی ہیں :

(۱) دوکانیں یا کام بند کر دینا ۔

(۲) ایک قسم کی زہریلی دوا جو بال صاف کرتی ہے اور چوہے مارنے کے لیے بھی استعمال ہوتی ہے ۔ کچھ لوگوں نے اس کی اصل ہٹ تال بھی بتائی ہے اور کہا ہے کہ ہٹ کا لفظ ہاٹ (بازار) کا مخفف ہے اور تال سے تالا مراد ہے ، یعنی دکانوں میں تالا پڑنے کو ہٹ تال یا ہڑتال کہتے ہیں ۔ ہندوستانی لسانیات کے قریب قریب اُن تمام محققوں نے جنھوں نے اس لفظ کے متعلق لب کشائی کی ہے یہی بات دہرائی ہے لیکن یہ کوئی نہیں بتاتا کہ کام بند ہونے کے معنوں میں یا زہریلی دوا کے معنوں میں یہ تشریح کیوں کہ تشفی بخش ہو سکتی ہے اور اگر دوکانوں کے متعلق اسے قبول کر بھی لیا جائے تو دوسرے معنوں کے لیے کون سی تاویل کی جائے گی ۔ میں اس لفظ کی اس مروجہ تشریح کو بالکل قبول نہیں کرتا اور اس کی جگہ اپنی دو تشریحیں پیش کرتا ہے ۔

(۱) ہڑتال ، ہنتال ، ہتال (بذریعہ تخفیف) ، ہت (قتل ، اسی سے ہتیا اور ہتیارا بنا ہے) + آل (نسبتی) قاتل، مٹانے والی (زہریلی دوا)۔ اس کا مترادف ہتال (مٹانے والی) بھی ہے ۔

(۲) ہڑتال ، ہنتال ، ہتال (بذریعہ تخفیف) ، ہت (محرومی جیسے ہتاس

یعنی آس سے محروم ، مایوس ، یہ لفظ سنسکرت میں جا کر ہتاش ہو گیا ہے) +آل (نسبتی) ، محرومی سے متعلق کسی رہنما ، بڑے آدمی یا اپنے حقوق سے محروم ہو جانے پر دکانیں بند کرنا یا کام چھوڑ دینا - یہاں اس کے مترادف ہڑتال کے معنی ہیں ہٹ یا ضد والی - اس کا ایک اور مترادف اڑتال بھی ہے اڑت (روک ، بندش)+آل (نسبتی) ، رکاوٹ والی ، بندش والی -

(مطبوعہ صحیفہ ، لاہور ، اکتوبر ۶۹ء)

کوڑی

یہ فضول تو نہیں البتہ ایک عام سی چیز ضرور ہے جس سے ہمارے معاشرے کا قریب قریب ہر چھوٹا بڑا واقف ہے۔ اب سے کچھ عرصہ پیشتر اسے ہمارے یہاں بڑا اہم مقام حاصل تھا کیونکہ ماضی قریب میں جب روپے کی قوت خرید آج سے کئی گنا زیادہ تھی تو کم مقدار میں اشیا خریدنے کے لیے ایک پیسے کے بھی ٹکڑوں کی ضرورت ہوتی تھی اور اس ضرورت کو کوڑی پورا کیا کرتی تھی۔ ہم میں سے بہت سے ایسے ہوں گے جنھوں نے کوڑی کو چالو سکّے کی حیثیت سے خرید و فروخت میں استعمال ہوتے دیکھا ہوگا۔ چنانچہ میں نے بھی اپنے لڑکپن میں راجپوتانے میں ایک پیسے کے عوض چار کوڑیاں چلتے دیکھی ہیں۔ اب روپے کی قیمت خرید گھٹ جانے کے باعث سکّوں کی چھوٹی تقسیم مثلاً دمڑی، چھدام، دھیلے وغیرہ کا چلن جاتا رہا اور کوڑیاں بھی ان کے ساتھ ساتھ بازار سے غائب ہوگئیں۔ کیونکہ سکّوں کا چلن ان کی قدر و قیمت پر منحصر ہوتا ہے۔ جب کسی سکّے کی قیمت گھٹتے گھٹتے صفر کے برابر رہ جاتی ہے تو اس سکّے کا رواج جاتا رہتا ہے۔ پھر بھی کوڑی کے متعلق ہماری زبان میں جو محاورات وضع ہو چکے ہیں وہ آج تک اس کی یاد دلا رہے ہیں کہ ہماری مالیات میں اس کا زبردست حصّہ تھا مثلاً کوڑی کوڑی کو محتاج ہونا۔ پاس جھنجھی یا پھوٹی کوڑی نہ ہونا۔ کوڑیوں کے مول بکنا۔ دو کوڑی کا ہو جانا وغیرہ۔

کوڑی کا دوسرا استعمال کھیلوں میں ہوتا رہا ہے اور کھیل کھیل میں اس نے ہزاروں گھر اجاڑ ڈالے ہیں۔ چوسر کا دارو مدار تو خیر ہے ہی اس پر، دوسرے کھیل بھی اس کے سہارے کھیلے جاتے ہیں۔ چنانچہ ہمارا محاورہ "دور کی کوڑی لانا" بھی ایک کھیل ہی سے لیا گیا

ہے جس سے کوہ کندن وکاہ برآوردن کا سا مفہوم نکلتا ہے - پنجابی زبان میں کوڑی کو کوڈی کہتے ہیں اور اس کے اچار (تلفظ) میں کبھی کبھی ڈال مشدّد بھی سنائی دیتی ہے - کوڑی کے اس کھیل کو جس سے مندرجہ بالا محاورے کے علاوہ کوڑی بولنے کا محاورہ بھی نکلا ہے - اہل پنجاب کوڈی اور اہل اردو کبڈّی کہتے ہیں - یہاں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کوڈی کے مکتوبی واؤ ہی کو ب سے بدل کر اہل اردو نے کبڈی کا لفظ تیار کیا ہے اور جب کوئی کھلاڑی فریق مخالف کے پالے میں کبڈی (کوڑی) دینے "کبڈی کبڈّی" بولتا ہوا جاتا ہے تو اس کی اصل بھی "کوڑی کوڑی" بولنا ہی ہے - کبڈّی کے کھیل میں کوڑی کی اہمیت اتنی زیادہ ہے کہ اس کے نام سے کھیل ہی موسوم کر دیا گیا تھا - ایسا کیوں ہوا ہے اس کے متعلق تو میں آگے عرض کروں گا البتہ اس حقیقت کی نقاب کشائی کے لیے کہ واؤ اور ب آپس میں کیونکر جگہ بدل لیتے ہیں - یہاں ایک لفظ کی تشریح پیش کرتا ہوں -

اردو میں سفید اور کالے دھبوں والے (ابلق) جانورکو چتکبرا کہتے ہیں جس کا پہلا حرف "چت" دراصل "چٹ" (چٹا بمعنی سفید) کا بدل ہے اور "کبرا" کے متبادل روپ کو رایا کارا (کالا) ہیں - یوں "چتکبرا" کا لفظ چٹ کورا ، چٹ کارا ، چٹ کالا (سفید و سیاہ) کے ایک متبادل روپ کی حیثیت سے ہماری تحریر و تقریر میں رائج تو چلا آ رہا ہے لیکن لوگ اس حقیقت سے بے خبر ہیں - اسی طرح انھیں یہ بھی معلوم نہیں ہے کہ ملبا کی اصل ملوا (ٹوٹی پھوٹی چیزیں) - لبیں (مونچھیں) کی اصل لویں (روئیں) - قلابہ کی اصل کول آوا - تالاب کی اصل تلاؤ (نشیب ، تلیٹی) بھابی کی اصل بھاو (بھائی)+ای ، چبوترا کی اصل چوترا (اچوتار ، چودھرا ، چودھارا) - سابقہ (واسطہ ، ساتھ) کی اصل سادکا (سوکا جس سے ایک اور لفظ سوکن بنا ہے) اور کبڈی کی اصل کوڑی ہے -

پراکرت میں کوڑی کی دو شکلیں کوڈّی اور کوڈیا دیکھنے میں آتی ہے جن میں کاف کے بعد واؤ کا حرف بھی موجود ہے اور ان تحریروں

میں اس حرف (واؤ) کے استعمال میں اس قدر بے اعتدالی اور کثرت نظر آتی ہے کہ توبہ ہی بھلی چنانچہ کسی لفظ میں اس کی آواز واو کی سی نکلتی ہے - کہیں یہ ب کا بدل ہوتا ہے اور کہیں محض طویل آواز علت کے جزو کی حیثیت سے کام کرتا ہے - اب ان تحریروں کو پڑھنے والا اگر کسی لفظ کے اُچار سے پہلے سے واقف نہیں ہے تو وہ ب کی جگہ واو بولے گا - واو کی جگہ آواز علت نکالے گا اور آواز علت کی جگہ ب بولے گا - وجہ یہ ہے کہ ان کتابوں کی دیوناگری لپی میں بھی فارسی لپی کی طرح طویل آواز علت (اُو ، اَو ، آو) واو کی مدد سے ہی ظاہر کی جاتی ہے - چنانچہ جس طرح ہم میں سے کچھ لوگ بھڑوا کو بھڑ+وا بول اٹھتے ہیں یا اپنی قدیم تحریروں میں لفظ "اوس" کو "اُس" کی جگہ "اَوس" (شبنم) پڑھ سکتے ہیں اسی طرح ان کتابوں میں لکھے ہوئے لفظ اوترن (اُترن) کو آج بھی لوگ اس طرح بولتے ہیں کہ واؤ مفتوح صاف سنائی دیتا ہے -

پراکرت میں لکھے ہوئے کوڈی اور کوڈیا کو پڑھنے والا پنجابی اُچار سے بھی پڑھ سکتا ہے جس میں ان کا واو صرف طویل آواز علت کا جزو ہے (کُو) اور یوں بھی اچار سکتا ہے کہ کاف مفتوح کے بعد واو بھی مفتوح سنائی دے (کَوَ) کیونکہ دیوناگری لپی میں حروف پر فتحہ لگانے کا چلن نہیں ہے - چنانچہ جن حروف پر اعراب نہیں لگائے جاتے وہ مفتوح ہی پڑھے جاتے ہیں - بہرحال اب اس الجھن کو چھوڑیے اور یہ فرض کر لیجیے کہ پڑھنے والا پراکرت کی کتابوں میں لکھے ہوئے اس لفظ کو پنجابی اُچار کے مطابق بالکل صحیح بولتا ہے لیکن یہاں اس کتابی پراکرت سے اردو کا ناتا ٹوٹ جاتا ہے اور اس کے لفظ سے اردو کے لفظ کا اشتقاق نہیں مانا جا سکتا - کیونکہ پراکرت کا یہ اُچار نہ صرف اردو کے اُچار سے مختلف ہے بلکہ اردو کے اس صوتی اصول کی بھی خلاف ورزی کر رہا ہے کہ طویل آواز علت کے بعد تشدید نہیں آتی بلکہ ڈال کی آواز بھی ڑے میں تبدیل ہو جاتی ہے یہی وجہ ہے کہ ہم پنجابی کوڈی کو کوڑی بولتے ہیں - اب اگر کتابی پراکرت نے پنجابی اُچار کو محفوظ بھی کر لیا ہے تو اردو کو اس سے کیا تعلق ہو سکتا ہے جو

اس سے اردو کے الفاظ مشتق دکھانے کی کوشش کی جاتی ہے ۔

یہاں میں اس کو محض اتفاق ہی سمجھتا ہوں کہ کتابی پراکرت اس لفظ کے اچار میں پنجابی کی ہم نوا ہے ورنہ اس سے تو ہماری کوئی سی بھی موجودہ زبان مشتق نہیں کی جا سکتی ۔ اس کی وضاحت کے لیے پراکرت کے دوسرے روپ کوڈیا نظر ڈالیے کہ اس کا آخری الف تو پنجابی میں بھی نہیں بولا جاتا ۔ اردو اور پنجابی کا عام چلن یہ ہے کہ تذکیر و تانیث کے لیے بالترتیب "آ" اور "ای" کے خاتمے آتے ہیں ۔ جنس کی تفصیل میں جانے کا یہ محل نہیں ہے اس لیے اس سے صرف نظر کرتا ہوں البتہ صرف اتنا کہنا ہے کہ موجودہ مؤنث اسم (کوڑی) کے پراکرت روپ کوڈیا کا آخری الف سنسکرت کا الف تانیث معلوم ہوتا ہے جو آریائی زبانوں میں اوستائی عہد سے چلا آ رہا ہے ۔ پراکرت گرامر کی کوئی سی کتاب اٹھا کر دیکھ لیجیے ۔ اس میں کوڈیا کا سنسکرت روپ "کپر دکا" ہی نظر آئے گا جس کے آخر میں بھی الف تانیث اسی طرح موجود ہے ۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ پراکرت کے گرامر نویسوں نے جہاں بول چال کو نظر میں رکھا ہے وہاں سنسکرت کے مکتوبی روپوں کو بھی نظرانداز نہیں کیا اور ان سے بول چال کے لفظوں کو مستخرج کرنے کی کوشش کی ہے ۔

سنسکرت نہ کسی قدیم زبان کا نام ہے نہ مردہ زبان کا بلکہ زندہ موجودہ زبانوں ہی کا قدیم مکتوبی روپ ہے جسے پڑھنے والے قدیم اصول کتابت کے مطابق پڑھنے کے بجائے موجودہ اصول کتابت کے مطابق پڑھنے کی کوشش کرتے ہیں اور دھوکا کھاتے ہیں ۔ ان کی مجبوری تو یہ ہے کہ وہ ان اصولوں سے واقف نہیں جن کے مطابق بول چال کے لفظ سنسکرت تحریر میں محفوظ کیے گئے اور ہٹ دھرمی یہ ہے کہ ان اصولوں کی جستجو بھی نہیں کرتے جن کی مدد سے سنسکرت کو صحیح اچار سے پڑھ سکیں بلکہ الٹے ان تحریروں کے مکتوبی روپوں سے ہمارے زندہ موجودہ الفاظ کا استخراج ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور بے تکان کہہ دیتے ہیں کہ بولنے والوں نے فلاں آواز کو فلاں آواز سے بدل کر لفظ کو

یوں بگاڑ لیا ہے گویا ان کے نزدیک سنسکرت وحی آسمانی ہے جس کی نہ لپی کوتاہی کر سکتی ہے نہ اس کا لکھنے والا ہی ہمارے موجودہ اصول کتابت سے ہٹ کر کوئی اور اصول اختیار کر سکتا ہے ۔ ایسے ہی سنسکرت زدہ لوگ ہماری زبان کے لہجے اور اچار کو بگاڑ رہے ہیں ۔ یہاں یہ ثابت کرنے کے لیے کہ اردو ایک مکمل زبان ہے جو اپنی ساخت کے آزاد ، اٹل اصول رکھتی ہے لفظ "کوڑی" کا صحیح تجزیہ اور اشتقاق دکھانے سے قبل اور ٹھوس اس کے سنسکرت روپ "کپرد کا" کی تشریح ضروری معلوم ہوتی ہے ۔

کوڑی کا ابتدائی حرف (ک) سنسکرت میں بھی قائم رکھا گیا ہے لیکن اس کے آگے ابتدائی آواز علت "او ، کی جگہ پ" داخل کرکے "کو" کو "کپ" کر لیا گیا ہے ۔ آواز علت کی جگہ پ کا یہ اندراج سنسکرت روپوں میں جا بجا آپ کو نظر آئے گا ۔ جیسے اردو پیاس سنسکرت پپاس آردو بیاس (دریا): سنسکرت و پاس وغیرہ ۔ چونکہ سنسکرت لپی میں تشدید کے لیے ہماری لپی کی سی کوئی علامت نہیں ہوتی اس لیے سنسکرت میں دیسی الفاظ کی تشدید کے لیے نصف علت "رے" کا حرف علی العموم استعمال کیا جاتا ہے جیسے آردو گبّھ ، گابھ = سنسکرت گربھ ، آردو اگّے ، آگے = سنسکرت اگرے ، آردو مدّھم = سنسکرت مدھرم ، آردو دُودھ ، دودھ = ویدک دُوھر ، دوھرم ، آردو سدّھ ، سیدھ = سنسکرت سدھرم وغیرہ ۔

پنجابی اردو الفاظ کی ڈال اور ڑے کے مقابلے میں سنسکرت روپ میں دال نظر آتی ہے اور یہ بھی ایک عام بات ہے کہ سنسکرت میں قدیم غنی آوازیں اکثر و بیشتر دندانی کر دی گئی ہیں ۔ اس کی قدیم ترین لپی میں غنی آوازوں کے لیے بھی لکھنے والوں نے جا بجا دندانی حروف ہی استعمال کیے ہیں ۔ دوسری مثالیں یہ ہیں ۔ اردو ہنڈول (ایک راگ) = سنسکرت ، ہندول ، آردو ۔ ڈر = سنسکرت ، در آردو ڈولا = سنسکرت ، دولا ، آردو ڈنڈ = سنسکرت دنڈ ، آردو ، ڈاہ = سنسکرت ، داہ وغیرہ ۔ اب اس سنسکرت لفظ کے آخر میں "آ" کا اضافہ کرنا ضروری تھا جو

آریائی زبانوں میں مؤنث کی علامت ہے اور ہماری زبانوں میں جو "آ" کو مذکر کے لیے استعمال کرتے ہیں اسے بھی ختم کرنا تھا اس لیے سنسکرت والوں نے یہ قاعدہ بنا لیا کہ دیسی اسما کی علامت تذکیری "آ" کی جگہ "اک" اور علامت تانیث "ای" کی جگہ "اکا" کا اضافہ کر دیا جائے۔ سنسکرت الفاظ کے خاتمے ان کی اسی اصل کو ظاہر کرتے ہیں۔ مثلاً اردو بالا = سنسکرت بالک اردو بالی = سنسکرت بالکا، اردو گھوڑا، سنسکرت گھوٹک = اردو گھوڑی = سنسکرت گھوٹکا وغیرہ۔

غرض اس طرح دیسی لفظ کوڈی کو جب پہلے پہل سنسکرت میں تحریر کیا گیا تو اصول کتابت کے مطابق اس کی شکل "کپردکا" ہو گئی چونکہ لپی اور اچار کا تعلق چند مانے ہوئے اصولوں پر قائم ہوتا ہے اس لیے قدیم زمانے میں کسی نے بھی یہ نہ سوچا ہوگا کہ آگے چل کر لوگ اس تعلق سے بے خبر اور لپی کی روایات سے نابلد ہو جائیں گے اور سنسکرت میں "کوڈی" کو "کپردکا" پڑھنے پر اصرار کریں گے اور پھر "کپردکا" سے کوڈی اور کوڑی کا اشتقاق بھی دکھایا کریں گے۔

بہرحال ہم نے اس لفظ کی شکلیں پراکرت میں بھی دیکھ لیں اور پنجابی اور اردو میں بھی اسے سنتے چلے آ رہے ہیں لیکن ابھی تک اس کے لغوی معنی سے بے خبر ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ کوڑی ایک آبی جانور کے مردہ خول کو کہتے ہیں اور اس کا ہماری زندگی سے بھی بہت گہرا تعلق رہ چکا ہے لیکن ہم یہ نہیں جانتے کہ اس کا یہی نام کیوں رکھا گیا یعنی اس کے تسمیے میں اس کی کس خصوصیت کو اہم سمجھا گیا ہے۔ سنسکرت یا پراکرت کے مکتوبی روپ سے لاکھ اس کے نام کا اشتقاق دکھایا جائے یا میری طرح یہ سوچا جائے کہ دیسی لفظ ہی کو سنسکرت میں چند اصولوں کے تحت تحریر کیا گیا اور پھر اس کو از سر نو پراکرت میں ڈھال دیا گیا اس سوال کا جواب پھر بھی باقی رہ جاتا ہے کہ اردو جیسی آزاد اور مکمل زبان میں وضع الفاظ کے لیے کون سے اصول برتے گئے ہیں اور اس لفظ میں ان اصولوں کا کہاں تک استعمال ہوا ہے۔ چونکہ یہ بات پہلے ہی کافی طویل ہو چکی ہے اس لیے میں اس کا تجزیہ اور اشتقاق مختصر طور پر یہاں پیش کرتا ہوں اور اس

کے لیے صرف دو اصول بیان کرتا ہوں ۔ ان میں سے ایک کا تعلق اصوات علت کے تبادل سے ہے اور دوسرا اصوات صحیحہ کے تبادل میں کارفرما ہے ۔

اس برصغیر کی تمام زبانوں میں "اَو" اور "آؤ" ایک ہی آوا علت کے دو روپ مانے جاتے ہیں جیسے بچھونا اور بچھاونا ، کھلونا اور کھلاونا ، بونی اور باونی (تخم ریزی) وغیرہ ۔ دوسری طرف "آو" اور "آ" کی آوازیں بھی باہم متبادل ہوتی ہیں جیسے آونا اور آنا ، جاونا اور جانا ، بچھاونا اور بچھونا ، کھلاونا اور کھلانا وغیرہ اور یوں "اَو" کی آواز "آ" سے براہ راست بھی بدل جایا کرتی ہے جیسے بچھونا اور بچھانا (بستر) ، کھلونا اور کھلانا (بچوں کے کھیلنے کی کوئی چیز) ٹھور اور ٹھار (جگہ) ، جھوڑ اور جھاڑ (تکرار ، جھگڑا) ، بوڑی (باگل عورت) اور باڑی یا بڑی (بڑ یعنی ہانک لگانے یا بڑبڑانے والی) وغیرہ مزید ثبوت کے لیے بنگالی زبان کے لہجے کو ملاحظہ فرمائیے کہ اردو کی آواز "آ" بنگالی میں "اَو" ہو جاتی ہے جیسے اردو بھلا (بھالا)= بنگالی بھولو ، اردو گڑبڑ (گاڑ باڑ)=بنگالی گوڑ بوڑیا پھر برج بھاشا کے لہجے پر غور کیجیے جس میں اردو کی علامت تذکیری "آ" ہمیشہ "اَو" ہو جاتی ہے جیسے اردو گھوڑا=برج بھاشا گھوڑو ، اردو مرغا=برج بھاشا مرگو وغیرہ اسی طرح اردو کا مصدری "نا" بھی برج بھاشا میں "نو" بولا جاتا ہے جیسے اردو آنا=برج بھاشا آونو ، اردو ، کھانا= برج بھاشا کھاونو وغیرہ ۔ برج بھاشا کے علاوہ لہجے کی یہ خصوصیت راجستھان اور گجرات تک میں نظر آتی ہے اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ "اَو" اور "آ" کا تبادل ہماری بھاشاؤں میں ایک عام بات ہے ۔

اس وسیع اصول کی رو سے اردو لفظ "کوڑی" سے ایک دوسرا روپ "کاڑی" یا "کڑی" تیار ہو جاتا ہے (واضح رہے کہ اصوات علت کا سکڑنا اور پھیلنا ہماری زبانوں میں عام ہے) جو کئی معنوں میں استعمال ہوتا ہے مثلاً :

(۱) کنارا ، کنی ۔

(۲) سخت ، کری -

(۳) حلقہ ، پھندا ، چوڑی جیسے ہتھکڑی -

(۴) تلخ ، ناگوار یعنی کڑوی وغیرہ -

اسی طرح کوڑی کے بھی کئی معنی ہیں مثلاً : کٹار کی موٹی نوک ، پیٹ کے اوپر سینے کی ہڈی کی نوک اور یہ معنی کڑی کے پہلے دو معنوں کے مماثل ہیں - اگر کوڑی سے چھوٹا سنکھ مراد لیا جائے تو اس کی شکل بھی حلقہ زنجیر سے مشابہ ہوتی ہے - چنانچہ کوڑیالے (کوڑیالا = کوڑی + آلا بمعنی والا) سانپ پر حلقے ہی بنے ہوتے ہیں اور ناک میں کوڑی ڈال دینا کے معنی بھی ناک میں کڑی یا نتھ ڈال کر عاجز یا مطیع بنا لینا ہی ہوتے ہیں - علاوہ ازیں پنجابی زبان میں کڑی اور کڑوی کے معنوں میں بھی لفظ "کوڑی" ہی استعمال ہوتا ہے -

اس طرح مندرجہ بالا چاروں معنی میں کڑی اور کوڑی مترادف ٹھیرتے ہیں لیکن میرے نزدیک یہ تمام معنی لغوی نہیں مجازی ہیں کیونکہ لفظ کوڑی سے ہمارا ذہن سب سے پہلے آبی جانور کے اس خول کی طرف منتقل ہوتا ہے جو کبھی بطور سکّہ رائج رہا ہے اور جو آج بھی متعدد کھیلوں میں استعمال ہوتا ہے اس لیے اس وقت اس کے لُغوی معنی کی جستجو سب پر مقدم ہے اور اس کے لیے مجھے لفظ "کڑی" کا تجزیہ کرنا ہوگا - جو ایک بنیادی لفظ "مکڑ" اور لاحقہ نسبت تانیث "ای" سے مل کر بنا ہے - اردو میں کڑیا کاڑ اس نشیبی زمین کو کہتے ہیں جو ندی یا سمندر کے کنارے واقع ہو - پنجابی میں بھی دریا کے کنارے کی زمین کو کڈی (کڈّی) کہتے ہیں - اردو لحاظ سے کڑی کے معنی ہوتے ہیں کڑیا کاڑوالی اور کوڑی ایسی ہی زمین سے حاصل ہوتی ہے بلکہ یہیں آکر یہ راز بھی کھُل جاتا ہے کہ کبڈّی (کوڑی) کا کھیل بھی اسی قسم کی ریتلی زمین سے منسوب ہے - اسی لفظ "کڑ" پر "آڑ" کے اضافے سے ایک اور لفظ کڑاڑ (کڑکی آڑ) بھی بنتا ہے جس سے دریا کے کنارے کے وہ ٹیلے مراد لیے جاتے ہیں جو جگہ جگہ کی مٹی کٹ جانے کے باعث اُبھر آتے ہیں - کڑ انہیں ٹیلوں کی آڑ میں واقع ہوتی ہے -

دوسرے اصول کی رو سے جس کا تعلق صوات صحیحہ کے تبادل سے ہے "ڑ" اور "چھ" دونوں آوازیں باہم متبادل ہوتی ہیں ۔ اس صوتی تبادل کے نتیجے میں "کڑ" کو "کچھ" بھی کہتے ہیں ۔ چنانچہ گجرات کے قریب کا ایک طویل و عریض نشیبی علاقہ رن کچھ (کچھ کا میدان کہلاتا ہے جو سمندر سے ملا ہوا ہے ۔ اس میں کبھی گھٹنوں گھٹنوں پانی بھر جاتا ہے اور کبھی کم ہو جاتا ہے تو گدھے چرتے رہتے ہیں ۔ کچھوے نے اپنا نام کچھ سے ہی پایا ہے کیونکہ یہ جانور کبھی گہرے پانی میں نہیں جاتا اور دریا کے کنارے ہی پیٹ پوجا میں لگا رہتا ہے ۔ کچھ سے ایک اور لفظ کچھاڑ بھی بنا ہے اور کچھاڑ دریا کے کنارے کے وہ ٹیلے (کڑاڑ) کہلاتے ہیں جن میں شیر رہتا ہے لیکن انہیں عام طور پر کچھار کہہ دیا جاتا ہے جیسا کہ انیس مغفور نے فرمایا ہے ۔ ع نکلا ڈکارتا ہوا ضیغم کچھار سے

اس تمام گفتگو کا مقصد یہ ہے کہ اہل اردو اپنی زبان کی وسعت و ثروت کا اندازہ لگائیں اور اس خیال کو ترک کر دیں کہ ہماری زبان کم مایہ ہے یا اپنی ہئیت ترکیبی میں کسی دوسری زبان کی رہین منت ہے ۔ میں جس قدر اردو الفاظ کے اجزائے ترکیبی کا مطالعہ کرتا ہوں زبان کی وسعت پر میری حیرت بڑھتی جاتی ہے اور اس حقیقت پر میرا اعتماد زیادہ سے زیادہ پختہ اور مستحکم ہوتا جاتا ہے کہ ہماری زبان کی عمارت نہایت پائدار بنیادوں پر کھڑی کی گئی ہے عوام الناس کا یہ خیال کہ زبان یوں ہی خود بخود پیدا ہو گئی ہے محض ناواقفیت پر مبنی ہے کیونکہ مجھے اپنی زبان کی بناوٹ میں کچھ ایسے اصول نظر آتے ہیں جن سے کبھی انحراف نہیں کیا جاتا ۔ اس لیے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ہماری زبان انسانی ایجاد ضرور ہے لیکن یہ ایجاد اتنے پرانے زمانے میں ہوئی ہے کہ اس کے متعلق ہم تک کوئی معلومات نہیں پہنچ سکیں اور جس وقت سے متعلق ہمیں معلومات دستیاب ہونے لگی ہیں اس وقت سے آج تک کوئی زبان ایجاد نہیں ہوئی ہے جو کوئی زبان کی پیدائش کے مدارج کا آنکھوں دیکھا حال لکھتا اور ہمیں معلوم ہوتا کہ زبان کیونکر پیدا ہوتی ہے اور پھر کس طرح رواج پاتی ہے ۔

اردو زبان کی عمر کچھ نہیں تو کم از کم چند ہزار سال تو ضرور ہی مانی جا سکتی ہے کیونکہ اس کے الفاظ اس برصغیر کی قدیم ترین کتاب رگ وید میں آج بھی ملتے ہیں لیکن اُردو والوں سے میرا کہنا صرف اتنا ہے کہ سنسکرت یا پراکرت سے آردو کا جوڑ ملانے کے بجائے خود اس کے الفاظ کا مطالعہ کیجیے کیونکہ ان میں ایک ایسا جہان آباد ہے جس کا کاروبار مسلمہ اصولوں کے تحت چل رہا ہے ۔ آردو کے کسی لفظ کے ساتھ ساتھ سنسکرت ، پراکرت یا مختلف موجودہ زبانوں کے ہم معنی اور ہم شکل الفاظ گنا دینے سے اشتقاق کا حق ادا نہیں ہوتا ۔ آردو کوڑی کے برابر پنجابی کوڈی ، پراکرت کوڈی کوڈیا اور سنسکرت "کپردکا" رکھ دینے کو اشتقاق نہیں کہتے ۔ اشتقاق کے معنی یہ ہیں کہ اپنی زبان کے مادوں ، ان کے متعدد معنوں ، ان سے بننے والے مختلف لفظوں ، لفظوں کے مختلف اور روپوں اور روپوں کی بناوٹ میں کام کرنے والے اصولوں اور قاعدوں کا سراغ لگایا جائے ۔ سنسکرت سے موجودہ زبانوں کا جوڑ ملانے کی کوششیں تو میلاد مسیح سے آج تک برابر ہوتی چلی آ رہی ہیں لیکن ان کوششوں سے سوائے اس کے اور کوئی نتیجہ نہیں نکلا کہ ہم لوگوں میں غلامانہ ذہنیت اور دریوزہ گری کی عادت پیدا ہو گئی اور یہ سوچنے کی سکت ہی جاتی رہی کہ ہم ایک آزاد ، مکمل اور وسیع و بسیط زبان بول رہے ہیں جس کی ہلکی سی جھلک دکھانے کے لیے میں نے سطور بالا میں مختصر طور پر محض دو اصول پیش کیے ہیں ۔

(مطبوعہ نقوش، لاہور)

لفظ "کر" کی حقیقت

اردو زبان کا یہ لفظ جو تین بنیادی آوازوں کاف ، زبر اور رے کے ملنے سے تیار ہوا ہے ، بہ ظاہر ایک نظر آتا ہے ۔ لیکن یہ ایک نہیں ہے ۔ بلکہ ایک سے زیادہ الفاظ کا ہم صوت اور ہم صورت ہے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ یہ ہمارے ہاں مندرجہ ذیل مختلف گرامری حیثیتوں میں بولا جاتا ہے :

۱ ۔ یہ اپنی پہلی حیثیت میں ایک فعل کا ابتدائی یا بنیادی مادہ ہے جسے ہم امر بھی کہہ سکتے ہیں ۔ اس کے کتنے ہی معنی ہوتے ہیں ۔

بنا ـــ عمل میں لا ، انجام کو پہنچا ، چلا ، فروغ دے وغیرہ جیسے باتیں مت کر ، دوکان کر ، سودا کر ، سیر کر وغیرہ ۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ مصدر بھی ہے ۔ کیونکہ اس پر مختلف لاحقوں کے اضافے کے مختلف فعلی روپ کرتا ۔ (کر + تا) کر رہا (کر + رہا) کراتا (کرا + تا) کرنا (کر + نا) وغیرہ تیار ، مشتق یا صادر ہوتے یا نکلتے ہیں ۔

اس کی ہی حیثیت سے یہ کسی اسم پر اضافے کے بعد مرکب کو اسم فاعل بنا دیتا ہے اور "کرنے والا" کے معنی دیتا ہے جیسے ۔ دن کر (دن + کر یعنی دن کرنے والا ، سورج) پربھا کر (پربھا ، بمعنی روشنی + کر یعنی روشن کرنے والا ، سورج) وغیرہ ۔

۲ ۔ اسم کی حیثیت سے یہ ایک دوسرا ہی لفظ ہے جس کے مندرجہ ذیل معنی نکلتے ہیں :

(الف) ٹیکس ، محصول جیسے "جل کر (پانی کا محصول ، آبیانہ) -

(ب) کمر ، چنانچہ کروٹ کے معنی ہیں کر (کمر)+وٹ (بٹ بل) یعنی کمر کا پہلو -

(ج) عادت ، جیسے عرفان رضا کو کھانے کے بعد قیلولہ کرنے کی کر ہوگئی ہے - اس کا بہروپ "کل" بھی بولا جاتا ہے - جیسے مجھے اپنے ہی گھر کی کل پڑ گئی ہے - میں سفر پر نہیں جاسکتا -

(د) سختی ، اس سے کرا ، کڑکرا اور کرارا جیسے الفاظ بنے ہیں - اس کا بہروپ "کڑ" ہے -

۲ - متعلق فعل کی حیثیت سے یہ ایک تیسرا لفظ ہے جس کے کئی معنی ہیں اور کئی بہروپ بولے جاتے ہیں -

(الف) فعلی مادے پر لگ کر طریقہ ، وضع ، ڈھنگ اور حالت کے معنی دیتا ہے اور حالیہ ناتمام بناتا ہے - جیسے :

ہنس کر بولو (ہنستے ہوئے بولو) میرے پاس ہو کر جانا (میرے پاس ہوتے جانا) بچ کر نکلو (بچتے ہوئے نکلو) جان بوجھ کر جھوٹ مت بولو (جانتے بوجھتے جھوٹ مت بولو) ہاتھ پاؤں بچا کر کام کرو (ہاتھ پاؤں بچاتے ہوئے کام کرو) وغیرہ -

اس کا بدل "کے" (کاف ، زبر ، بڑی ے) ہے - اسے کر ، کے ، اور کرکے بھی بولتے ہیں - جیسے : بچ کر نکلو ، بچ کے نکلو ، بچ کرکے نکلو -

(ب) فعلی مادے پر لگ کر صفت کے معنی دیتا اور حالیہ تمام بناتا ہے - جیسے :

یہ اس سے بھی بڑھ کر ہے (یہ اس سے بھی بڑھا ہوا) ہم تم سے گھٹ کر نہیں رہیں گے (ہم تم سے گھٹے ہوئے نہیں رہیں گے) بھٹکر (پھوٹا ہوا ، ٹکڑے ٹکڑے ہو کر ، پھوٹ کر) -

اس کا بدل کے (کاف، زیر، بڑی یے) ہے۔ اسئے کَر، کے اور کر کے تینوں طرح بولتے ہیں۔ جیسے:

بڑھ کر بولی بولو، بڑھ کے بولی بولو، بڑھ کر کے بولی بولو۔

(ج) فعلی مادے پر لگ کر "کے بعد" کے معنی دیتا ہے۔ جیسے:
بادل برس کر کھل گئے (بادل برسنے کے بعد کھل گئے) کھانا کھا کر جانا (کھانا کھانے کے بعد جانا)۔

اس کا بدل "پر" ہے جیسے:
مچھلی کھا کر دودھ مت پینا۔ (مچھلی کھانے پر دودھ مت پینا)۔
اسے "کے" اور کر کے" بھی بولتے ہیں۔ جیسے
کھانا کھا کر جانا، کھانا کھا کے جانا۔

(د) اسم کے بعد آتا ہے اور "سے" کے معنی دیتا ہے۔ جیسے:

وہ اس معنی کر ہمارا رب ہے کہ ہمیں روزی دیتا ہے۔ وہ اس وجہ کر پریشان ہے کہ اس کی آمدنی کم ہے۔

لیکن اردو کے معیاری محاورے میں اس طرح نہیں بولتے۔
(ہ) اسم کے بعد آتا ہے اور "کی حیثیت سے"، "کے نام سے"، "کی ترتیب سے" "کے حساب سے"۔ کے معنی دیتا ہے اور کر، کر کر یا کر کے۔

تینوں طرح بولا جاتا ہے۔ جیسے:
وہ ہمارا دوست کر کے کام سے بچ گیا۔ احمد نواب کا بھائی کر کے یا کر کر مشہور ہے۔ وہ محلہ حکیماں کر مشہور تھا وہ محلہ حکیماں، کر کر یا کر کے مشہور تھا۔ وہ محلے بھر میں چور کر کے مشہور تھا۔ نوٹ ایک ایک کر کے گنوں، بوند بوند کر کے تالاب بھر جاتے ہیں۔ کھیل کے میدان میں کھلاڑی دو دو کر کے داخل ہوئے۔

(و) صفت اور دوسرے متعلق فعل کے ساتھ "طور سے" "طرح سے" "طریقے سے" کے معنی دیتا ہے - جیسے :

گرم گرم کھانا خاص کر جاڑوں میں اچھا لگتا ہے - میں نے اپنے بیٹے کی شادی میں اس کے دوست کو خاص کرکے بلایا تھا -

ع جانوں کسی کے دل کی میں کیوں کر کہے بغیر

میں بہت کرکے اس کی ہزار روپے سے مدد کر سکتا ہوں -

غرض اردو میں "کر" ایک نہیں ، تین ہم صورت اور ہم صوت الفاظ ہیں - ایک فعل دوسرا اسم اور تیسرا متعلق فعل اور متعلق فعل "کر" کے کرکر اور کرکے ، کے روپوں میں بھی بولا جاتا ہے - کر کا بہروپ "پر" بھی ہے - بالکل اسی طرح جس طرح "پر" کے بہروپ "کر" "پے" اور "پہ" ہیں -

(مطبوعہ قومی زبان ، کراچی ، نومبر ۱۹۸۶ء)

اردو زبان کے چند محاورے

محاورہ زبان کے بنیادی ڈھانچے کا ایک اہم جزو شمار ہوتا ہے۔ کسی زبان کے سیکھتے وقت اس کی گرامر کے ساتھ ساتھ محاورے پر بھی نظر رکھی جاتی ہے۔ کیونکہ وہ گرامر پر بھی بھاری ہے۔ چنانچہ اردو زبان کے جن انشا پردازوں نے بامحاورہ زبان لکھی ہے۔ انہوں نے گرامر کی کوئی پرواہ نہیں کی ہے۔ محاورے کی اہمیت اس بات سے بھی واضح ہوتی ہے کہ اس میں کسی کو جزوی رد و بدل کا بھی اختیار نہیں ہے اور جہاں اور جب کسی بڑے سے بڑے شاعر یا ادیب نے کسی وجہ سے محاورے میں تحریف کی ہے زبان کے نقادوں نے اس پر اعتراض جڑ دیا ہے۔ لیکن ہماری زبان میں بعض محاورے اس صورت میں چلے آ رہے ہیں کہ ان کے صحیح معنی سمجھ میں نہیں آتے اور ہم انہیں محض عمل استعمال کی رعائت سے اسی شکل میں بول رہے ہیں جس شکل میں ہمارے اسلاف انہیں ہمارے لیے چھوڑ گئے ہیں۔

ان میں سے کچھ محاورات ایسے ہیں جن کا اصل روپ تشدید دور کرکے سامنے آ جاتا ہے۔ بعض کے معنی پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دیسی آوازوں کی جگہ عربی فارسی کی آوازیں داخل کر دینے کے باعث ناقابل فہم ہوگئے ہیں۔ بعض محاورے ایسے بھی ہیں۔ جن کے الفاظ الگ سے ان معنوں میں ہمارے یہاں نہیں بولے جاتے جو وہ محاورات میں دے رہے ہیں اور کچھ محاورات کے الفاظ اس قدر اجنبی ہیں کہ جب تک آوازوں کی بدلائی سے ان کے دوسرے روپ سامنے نہیں آتے ان کے معنی واضح نہیں ہوتے۔ ذیل میں چاروں قسم کے محاورات مع تشریح پیش کیے جاتے ہیں۔

چھکے چھوٹنا

کنایہ ہے گھبرا جانے سے ، چھکے جمع ہے چھکا کی ، جو عام بول چال میں چھ کے عدد سے منسوب سمجھا جاتا ہے - تاش کے پتوں میں چھ بوندوں کا پتا چھکا کہلاتا ہے اور کرکٹ کے کھیل میں جب کوئی کھلاڑی گیند کو بلے سے مار کر کھیل کی حدود سے باہر پھینک دیتا ہے تو اس کو چھ رن دیے جاتے ہیں اور اس کی اس ضرب کو بھی چھکا لگانا اور چھکا بنانا بولتے ہیں لیکن موجودہ محاورے میں گنتی کا کوئی تصور نہیں ملتا اس کے علاوہ چھ کے عدد سے فعل چھوٹنا کی بھی کوئی مناسبت نظر نہیں آتی - دراصل عمل تشدید کے اصول کی رو سے یہ لفظ چھلکا یا چھال کا ہے - جس کے معنی بوچھار اور کثرتِ آب کے ہیں - ان معنوں میں اس کے ساتھ فعل چھوٹنا بالکل ٹھیک بیٹھ جاتا ہے - چنانچہ چھکے چھوٹنا کا مطلب ہوا کثرت سے پسینہ آنا جو گھبراہٹ اور پریشانی کی واضح علامت ہے -

کچّی گولیاں کھیلنا

نادانی اور بھولپن سے کنایہ ہے - یہاں کچی کا لفظ پکی کی ضد نہیں ہو سکتا - کیونکہ کھیلنے کی گولیاں کبھی مٹی کی نہیں بنائی جاتیں جن میں سے کچھ آگ میں رکھ کر پکا لی جائیں اور کچھ بدستور کچی ہی رہنے دی جائیں - البتہ یہ گولیاں علی العموم کانچ کی ہوتی ہیں - اس لیے کچی گولیوں سے کانچی (کانچ کی) گولیاں مراد ہو سکتی ہیں اور کانچ کی گولیاں بچے کھیلتے ہیں جو ان کی نادانی اور ناتجربہ کاری کا نشان ہے - کانچ کی گولی کو کنچا بھی کہتے ہیں -

آثار بندھنا

"امید ہونا" کو بولتے ہیں - عربی میں آثار جمع ہے اثر کی اور اس کے معنی ہیں نشانیاں -

آثار صنادید بزرگوں اور بادشاہوں کی نشانیوں یا عمارتوں کو کہتے ہیں اور آثار قدیمہ بھی پرانے زمانے کی یادگاروں یا عمارتوں کے لیے بولا

جاتا ہے - لیکن اس لفظ سے امید کے جو معنی اُردو میں مراد لیے جاتے ہیں عربی میں کہیں نہیں نکلتے - جیسے آج بارش کے آثار بندھے ہیں - یعنی آج بارش کی امید ہوئی ہے اس کے علاوہ آثار کے ساتھ بندھنا کا فعل بھی عربی معنی کے لحاظ سے نہایت ناموزوں ہے - کیونکہ نشانیوں، یادگاروں یا عمارتوں کا بندھنے سے کوئی تعلق نہیں - معلوم یہ ہوتا ہے کہ لپی کی بدولت اس لفظ کی ایک آواز میں تحریف ہو گئی ہے اور اب یہ سین کی جگہ ثے سے لکھا جانے لگا ہے - یعنی اس کی اصل آسار تھی - جس کا مادہ آس ہے اور اس بندھنا بھی اردو کا ایک محاورہ ہے لہٰذا لفظ آثار (آسار) امید کے معنوں میں بندھنا کے ساتھ استعمال ہو کر اردو زبان میں اب تک اپنے صحیح معنی دے رہا ہے -

روحانی پھر جانا

کنایہ ہے رونق آ جانے سے - یہ محاورہ بالعموم چہرے کے متعلق بولا جاتا ہے - لفظ روحانی عربی زبان کے لحاظ سے صفت ہے لیکن محاورے میں بطور اسم استعمال ہوا ہے۔ معنی کے اعتبار سے بھی رونق اور روحانی میں کوئی تعلق معلوم نہیں ہوتا - اس لیے یہاں یہ لفظ دیسی نظر آتا ہے - جس میں عربی زبان کی آواز (ح) داخل کر دی گئی ہے - اس کی اصل روہانی ہے اور روہانی اردو میں سرخی کو کہتے ہیں - روہو (مچھلی) اور روہوں (کنکروں) نے سرخی ہی کے باعث اپنا اپنا نام پایا ہے - چنانچہ روحانی پھر جانا دراصل روہانی پھر جانا ہے - جس کا مطلب ہے سرخی دوڑ جانا ، آب یا رونق آ جانا -

آنکھیں چار ہونا

نگاہیں ملانے کے معنی میں بولا جاتا ہے - اس سے یہ مفہوم لیا جاتا ہے کہ جب دو شخص ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتے ہیں اس وقت دونوں کی آنکھوں کی مجموعی تعداد چار ہو جاتی ہے اور یہ تشریح بظاہر قابل قبول بھی معلوم ہوتی ہے - لیکن "چار چاند لگنا" (رونق دو بالا ہونا) میں چار کی گنتی بے معنی ہو جاتی ہے اور ذہن میں معاً یہ خیال آتا ہے کہ اگر افزائش حسن ظاہر کرنے کے لیے

چاندوں کی تعداد ہی بتانا تھی تو اس مقام پر چار کی جگہ سینکڑوں کا لفظ زیادہ موزوں ہوتا ۔ اسی طرح "چار چوٹ کی مار" میں ممکن ہے۔ بعض طباع انسان چوٹوں کو چار فرضی قسموں میں بانٹنےپر تیار ہو جائیں لیکن ان کی یہ کوشش تاویل محض ہوگی ان مثالوں سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ لفظ "چار" سے یہاں گنتی مراد نہیں ہے جیسا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے بلکہ آوازوں کی بدلائی سے یہ لفظ چوڑ یا چوڑ کا مترادف ٹھہرتا ہے۔ جس کے معنی ہیں کشادگی ، پھیلاؤ وسعت وغیرہ ، مخی و دندانی آوازوں کی بدلائی سے یہ لفظ چاڑ بھی بولا جاتا ہے۔ جیسے چھاڑ کا چھاڑ (اصل چاڑ کا چاڑ) یعنی بہت چوڑا ٹکڑا ، اس تشریح سے یہ لفظ صفت تعدادی کے بجائے صفت مشبہ قرار پاتا ہے اور اب محاورات کے معنی بآسانی سمجھ میں آ جاتے ہیں۔ چنانچہ آنکھیں چار کرنا سے مراد ہے آنکھیں کشادہ کرنا، چوڑانا یا پھیلانا، آنکھیں چرانا اس کی ضد ہے جس کے معنی ہیں آنکھیں چھوٹی کرنا (آنکھیں چُنرانا) چار چاند لگنا کے معنی ہیں چوڑے چوڑے چاند لگنا اور چار چوٹ کی مار سے ایسی مار مراد ہوتی ہے جس سے چوڑی چوڑی چوٹیں لگتی ہوں۔

پتا توڑ بھاگنا

بہت تیز بھاگنے کو کہتے ہیں لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ پتے کے توڑنے کا تیزی رفتار سے کیا تعلق ہو سکتا ہے اور کیا کسی درخت کا پتا توڑنے سے انسان کی رفتار بھی بڑھ جاتی ہے علاوہ ازیں جب یوں کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص پتا توڑ بھاگا تو اس وقت دور دور تک کسی پتے کا پتہ نشان نہیں ہوتا کیونکہ یہ محاورہ تو ریگستان میں دوڑنے والے کے متعلق بھی بولا جاتا ہے اور بولا جا سکتا ہے چار ونا چار یہی ماننا پڑتا ہے کہ یہاں پتے سے کسی درخت یا گھاس کا پتا نہیں بلکہ وہ پٹا مراد ہے جو قید کی خاطر گلے میں باندھ دیا جاتا ہے اور پتا توڑ یعنی پٹا توڑ یا پٹاترا کر جب رہائی حاصل ہوگی تو یقیناً قیدی انسان یا جانور بے تحاشا اور بہت تیز بھاگے گا کہ کہیں دوبارہ گرفتار نہ کر لیا جائے ۔ یہاں پتا اور پٹا میں مخی اور دندانی آوازیں بدل گئی ہیں اور ان آوازوں کی بدلائی ہمارے یہاں بکثرت ملتی ہے۔

پنڈا پھیکا ہونا

بخار ہو جانے پر بولتے ہیں - پنڈا جسم کو کہتے ہیں - لیکن اس کا پھیکا ہو جانا اس لیے سمجھ میں نہیں لگتا کہ پھیکا سے عرف عام میں بے نمک یا کم نمک کا کھانا مراد ہوتا ہے - اس مقام پر پھیکا سے بے مزہ ، بے رونق بے آب کے مجازی معنی بھی مراد لیے جا سکتے ہیں - چونکہ بخار ہونے پر جسم کی کیفیت غیر معیاری ہو جاتی ہے - اس لیے اسے پھیکا کہہ دیا ہے اس کی دوسری تشریح یہ ہے کہ آوازوں کی بدلائی سے لفظ "پھیکا کا مترادف" "پھونکا" بنتا ہے اور پھونکا گرم کے معنوں میں عام طور پر مستعمل ہے - بخار ہونے کو جسم پھنکنا بولا جاتا ہے - چنانچہ پنڈا پھیکا ہونا سے پنڈا یا جسم کا پھنکا ہونا یا پھنکنا مراد ہے -

چھاجوں مینہ برسنا

کثرت سے بارش ہونا مراد ہے - چھاج کے معنی سوپ کے ہیں - جیسے چھاج سی ڈاڑھی (سوپ کی طرح خوب پھیلی ہوئی ڈاڑھی) لیکن چھاج کو مینہ کا پیمانہ بنانا کسی طرح درست نہیں - کوئی کتنی ہی تاویل کرے - مینہ کو چھاجوں کے حساب سے نہیں ناپا جا سکتا بارش کی کثرت کے لیے ایک دوسرا محاورہ موسلا دھار برسنا بھی استعمال ہوتا ہے جس میں مینہ کی دھار پر اصرار کیا گیا ہے - ایسی صورت میں چھاج سے مینہ کی دھار کا گہرا تعلق ظاہر ہوتا ہے - چھاج کا لفظ آوازوں کی بدلائی سے چھار یا چھال بھی بن جاتا ہے اس لیے چھاجوں مینہ برسنا سے چھاروں یا چھالوں مینہ برسنا ہی مراد ہو سکتا ہے - مینہ کی کثرت کا اندازہ اس نئی چھار یا چھال سے لگانا بالکل درست ہے -

ڈاڑھیں مار کر رونا

کنایہ ہے بہت زیادہ رونے سے - لیکن وفور گریہ کا ڈاڑھیں مارنے سے کوئی تعلق نظر نہیں آتا - پھر ڈاڑھیں مارنا کوئی محاورہ بھی نہیں ہے دانت مارنا ضرور بولتے ہیں لیکن اس کے معنی بھی کاٹنے کے ہوتے ہیں جس سے رونے میں کوئی مدد نہیں ملتی - اس مشکل کے حل کے لیے ہمیں

اردو ہی کے ایک اور مرکب "ڈھٹ بندی" پر غور کرنا چاہیے - مداری جب اپنا کوئی کرتب دکھاتے ہیں تو لوگوں کے عقیدے کے مطابق تماشائیوں کی نظر پر کچھ ایسا اثر ڈال دیتے ہیں کہ واقعہ یا کرتب اپنی اصلیت سے قدرے مختلف نظر آنے لگتا ہے ۔ مثلاً مداری زمین پر چلتا ہے تو تماشائیوں کو نظر آتا ہے کہ وہ رسی پر چل رہا ہے اس عمل کو ڈھٹ بندی یا نظر بندی کہتے ہیں ۔ چنانچہ "ڈھٹ" اور "نظر" ہم معنی الفاظ ہیں ۔ لیکن نظر کے لیے ڈھٹ نہیں ڈٹھ کا لفظ ملتا ہے اور شور سینی زمرے کی زبانوں مثلاً پنجابی ، گجراتی وغیرہ میں عام ہے ۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ عوام کی بول چال میں الٹ پھران اور سہاپران کی آوازیں بدل گئی ہیں اور وہ ڈٹھ بندی کی جگہ ڈھٹ بندی بولنے لگے ہیں اسی اصول کا اطلاق اگر موجودہ محاورے پر کیا جائے تو ڈاڑھیں یا ڈاڑھیں مار کر رونا کی اصل ڈھاڑیں یا دھاڑیں مار کر رونا ہے اور دھاڑیں اور ڈہاڑیں (بلند چیخیں) ایک ہی بات ہے ۔ جیسے بھاڑ اور پھاڑ، بھار اور باہر ، دھکنا اور دبکنا ، دھنا اور دہلنا اور تھلکا اور تہلکا وغیرہ ایک ایک لفظ کے دو دو روپ ہیں ۔ جن کے ایک روپ میں سہاپران کے دو ٹکڑے کر دیے گئے ہیں ۔

کھاری کنوئیں میں ڈال دینا

کنایہ ہے ضائع کرنے سے ۔ اس محاورے میں لفظ " کھاری" کنوئیں کی صفت نظر آ رہا ہے ۔ جس کا پانی کہیں میٹھا ہوتا ہے اور کہیں کھاری (شور) لیکن کسی شے کو ضائع کرنے کے لیے یہی کافی ہے کہ اسے کسی کنوئیں میں ڈال دیا جائے ۔ اس پر کھاری کی قید لگانے کی کوئی ضرورت نہ تھی اس لیے کہ میٹھے پانی کے کنوئیں میں بھی اشیا بالکل اسی طرح ضائع ہو جاتی ہیں جس طرح کھاری پانی کے کنوئیں میں تلف ہو سکتی ہیں اس مشکل کا صرف یہی حل ہے کہ مخی اور دندانی آوازوں کے تبادل کی رو سے کھاری کو کھاڑی مان لیا جائے کیونکہ کھاڑی اور کنوئیں میں سے کسی میں کوئی چیز ڈال دی جائے ضائع ہو جائے گی اس محاورے میں کھاری اور کنوئیں کے دو آزاد الفاظ بالکل اسی طرح یک جا کر دیے گئے ہیں ۔ جس طرح اردو کے بہت سے دوسرے مرکبات میں ملتے ہیں ۔

جیسے جھاڑ جھنکاڑ ، ذات پات ، کنواں پوکھر ، کونا پکھلا ، کام کاج ، سیل سنت وغیرہ ۔

یہاں ایک ذاتی مشاہدے کا بیان بھی فائدے سے خالی نہ ہوگا ۔ ہنڈون ریاست جے پور (راجستھان) کا ایک مشہور قصبہ ہے ۔ اس میں جلسین نامی ایک بہت بڑا تالاب ہے ۔ جس کے فاضل پانی کے لیے دو نکس ہیں ۔ ان میں سے ایک کو کھاری کہا جاتا ہے ۔ جس سے یقیناً کھاڑی مراد ہے ۔ جس زمانے میں یہ راستہ خشک ہوتا تھا اس میں شوراتری کا میلہ بھی لگا کرتا تھا ۔ اس کھاری میں ایک پختہ کنواں بھی تھا ۔ جس کا پانی میٹھا تھا اور قریبی محلوں کے باسی وہیں سے بھر بھر کر لے جایا کرتے تھے ۔ میں نے یہ کھاری اور کنواں دونوں ۱۹۲۸ء میں دیکھے تھے ۔

نانی مر جانا

دب جانے یا دبک جانے کی نسبت بولا جاتا ہے ۔ مثلاً جب ایک شخص بہت بڑھ بڑھ کر باتیں بناتا ہے اور دوسرا اس کے جواب میں کوئی ایسی بات کہہ دیتا ہے ۔ جس سے اس کی ساری شیخی کرکری ہو جاتی ہے ۔ تو کہتے ہیں کہ اول اللہ کر کی نانی مر گئی ۔ ایسے ہی موقعوں پر ماں مر جانا بھی بولتے ہیں اور ظاہر ہے کہ ماں کے مر جانے سے انسان بہت بڑی کمزوری محسوس کرتا ہے ۔ کیونکہ ماں دنیا میں سب سے زیادہ محبت کرنے والی ہستی ہوتی ہے ۔ اس کے پیار سے محروم ہو جانا انسان کی سب سے بڑی بدنصیبی ہے اور سب سے زیادہ غم و رنج کا موجب بھی ، لیکن نانی کے مرنے پر ایسی کسی کمزوری، افسردگی یا نقصان عظیم کا احساس نہیں ہوتا اس لیے اس محاورے کے لفظ "نانی" سے ماں کی ماں مراد لینا درست نہیں معلوم ہوتا البتہ اگر آوازوں کی بدلائی سے نانی سے مانی (بمعنی غرور و تمکنت،گھمنڈ، فخر و ناز) مراد لی جائے تو بات قرین قیاس ہو جاتی ہے اور میم اور نون کا تبادل اردو میں عام بھی ہے ۔ اسی طرح اگر ماں مر جانے کو بھی مان (گھمنڈ) مر جانا سمجھ لیا جائے ۔ تو معنی بالکل درست بیٹھتے ہیں ۔

نیل ڈھلنا

مرتے وقت آنکھوں سے آنسو ٹپکنے کو کہتے ہیں - لیکن جنھوں نے یہ آنسو دیکھے ہیں وہ اس بات کی گواہی دیں گے کہ یہ آنسو نیل کے نہیں پانی کے ہوتے ہیں - نیل ایک قسم کا نیلا رنگ ہوتا ہے - جس سے اردو کا ایک اور محاورہ نیل کی ماٹ یا ماٹھ بگڑنا (جھوٹی خبر اڑانا) بنا ہے - مرنے سے اس نیل کا کوئی تعلق نہیں - یہ بالکل صاف سی بات ہے کہ ہماری دیسی زبانوں میں لام اور رے کا باہمی تبادل بہت عام ہے اس تبادل کی روشنی میں نیل ڈھلنا سے نیر ڈھلنا مراد ہو سکتا ہے اور نیر پانی یا آنسو کو کہتے ہیں - انھیں معنوں میں اس لفظ سے ایک اور محاورہ نیل جلانا بھی بنتا ہے - جو بارش روکنے کا ایک ٹوٹکا ہوتا ہے - جب بارش بہت ہوتی ہے تو عوام نیل یا نیر یعنی پانی جلاتے ہیں جو ان کے عقیدے کے مطابق بارش روکنے کا تیر بہدف نسخہ ہے -

جوتیوں دال بٹنا

آپس میں جھگڑا ہونے کے معنی دیتا ہے - حیرت یہ ہے کہ گوشت، ترکاری اور دال میں سے صرف دال کو وجہ نزاع کیوں مانا گیا ہے - جس طرح جوتیوں یعنی جو تم بیزار سے دال تقسیم ہو سکتی ہے - اسی طرح گوشت ترکاری یا کوئی اور سالن بھی بٹ سکتا ہے - پھر یہ بات بھی ناقابل فہم ہے کہ کھانے میں رونق کی اہمیت سالن سے کہیں زیادہ ہے اسے چھوڑ کر اظہار خیال کے لیے دال جیسی ثانوی حیثیت کی چیز کو منتخب کیا گیا ہے - ظاہر ہے کہ یہاں دال کا لفظ سالن کے بجائے کسی اور معنی میں استعمال ہوا ہے - مخی اور دندانی آوازوں کی بدلائی سے دال اور ڈال میں کوئی فرق نہیں ہے اور دال یا ڈال کے کتنے ہی معنی ہوتے ہیں - مثلاً چنے کے دانے کا ایک حصہ ، روشنی کا لفظ ، ٹوکری یا چنگیر ڈلیوں میں سجا کر بھیجی جانے والی مٹھائی یا پھل وغیرہ جیسے عام طور پر ڈالی کہتے ہیں - شاخ ، ایک قسم کا گہنا ، بری کا سامان ، منافع ، نذرانہ ، بھینٹ ، رشوت وغیرہ - اب اگر غور کیجیے تو اس محاورے میں دال سے منافع جیسی چیز ہی مراد لی گئی ہے - جس کی تقسیم پر ہمیشہ جھگڑا ہوا کرتا ہے -

راتیں کالی کرنا

جاگ کر راتیں گزارنے کو کہتے ہیں ۔ اس محاورے میں لفظ "کالی" غور طلب ہے ۔ اس کے وہ معنی نہیں ہو سکتے جو ہم عام طور پر سمجھتے ہیں ۔ کیونکہ راتیں تو خود ہی کالی یا سیاہ ہوتی ہیں اور دن کے مقابلے میں سیاہی کا تصور رات سے ہی وابستہ ہے ۔ ایسی صورت میں راتوں کو اور کالا یا سیاہ کرنا مہمل سی بات ہے ۔ خود محاورے کے محل استعمال کو سامنے رکھا جائے تو کالی کرنا سے گزارنے کا مفہوم نکلتا ہے ۔ دراصل کالی (کال+ای) کا لفظ کال سے صفت بنایا گیا ہے ۔ جس کے معنی ہیں کال والی اور کال کے کئی معنی ہیں ، موت ، قحط ، کمی ، سیاہی ، گذرا ہوا دن (کل) گزرنے والا وقت ۔ موجودہ محاورے میں کال کے آخری معنی یعنی گزارنا مراد لیے گئے ہیں ۔ لیکن کالنا (بمعنی گذارنا) جیسا کوئی مصدر اردو میں الگ سے رائج نہیں ہے ۔ ان معنوں میں نکالنا استعمال کیا جاتا ہے ۔ جس کا سابقہ (نون مکسور) قطعیت کے معنی دیتا ہے اور اس سابقے کی اردو زبان میں بہت سی مثالیں ملتی ہیں ۔ جیسے نبڑنا=ن (بالکل قطعی) بڑنا (ختم ہو جانا) نپٹنا=ن+پٹنا (انجام کو پہنچنا) نڈھال=ن+ڈھال (ڈھلنا سے) وغیرہ چنانچہ راتیں کالی کرنا سے مراد ہے راتیں نکالی کرنا ، نکالنا ، گزارنا یا کاٹنا) ۔

کان کاٹنا

سبقت لے جانے کو کہتے ہیں ۔ لیکن آگے بڑھ جانے والا کبھی دوسرے کے کان تراشتا ہوا نہیں دیکھا گیا ۔ اس لیے ظاہر ہے کہ یہاں کاٹنے کے وہ معنی نہیں ہو سکتے جو عام طور پر مراد لیے جاتے ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ محاورہ گھڑ دوڑ سے لیا گیا ہے جس میں گھوڑوں کے ایک دوسرے سے آگے نکل جانے یا بڑھ جانے کا فیصلہ ان کے کانوں کی سیدھ سے کیا جاتا ہے ۔ جس گھوڑے کے کان دوسرے گھوڑے کے کانوں سے آگے نکلے ہوئے ہوں ۔ وہی آگے بڑھا ہوا شمار کیا جاتا ہے ۔ یہاں کاٹنا سے گذار دینا اور نکال دینا مراد ہے ۔ جو گھوڑا آگے بڑھ جاتا ہے ۔ وہ دوسرے گھوڑوں کے کان گذار دیتا یا کاٹ دیتا ہے ۔ یعنی ان

سے آگے گذر جاتا ہے ۔ ان معنوں میں کاٹنا کا دوسرا متبادل روپ کاڑھنا ہے ۔

گھر میں بھونی بھالگ نہ ہونا

کنایہ ہے نہایت بے سروسامانی اور مفلسی سے ۔ لیکن ساز و سامان اور مال و دولت کا انحصار بھونی بھانگ یا بھنی ہوئی بھنگ پر نہیں ہو سکتا ۔ نہ صاحب استطاعت لوگوں کے گھروں میں بھنگ کا ہونا ضروری ہے نہ بھنگ کا شمار مال و دولت میں ہی ہو سکتا ہے اور جو لوگ بھنگ پیتے بھی ہیں وہ بھی اسے بھون کر نہیں پیتے ۔ اس طرح یہ محاورہ سرے سے مہمل نظر آتا ہے ۔ جو لوگ اپنے اسلاف کو ذرا جاہل سمجھتے ہیں ۔ ان کے لیے اس قسم کا فیصلہ صادر کر دینا بڑی بات نہیں ہے جو لوگ انھیں اتنا گیا گزرا تو نہیں ۔ البتہ اپنے آپ سے ذہنی طور پر کمتر ضرور سمجھتے ہیں وہ اس کی کوئی اور تاویل کریں گے اور ہم میں سے کچھ ایسے بھی نکلیں گے جو دنیا اور دنیا والوں کے تمدنی و تہذیبی ارتقا پر ایمان رکھتے ہیں وہ کہہ دیں گے کہ پہلے زمانے میں انسانی معاشرہ بھنگ کو نہایت قدر کی نظر سے دیکھتا تھا اور اسے مال و دولت میں شمار کرتا تھا ۔ لیکن رفتہ رفتہ اس کی قدر و قیمت میں کمی آتی گئی اور اب لوگ اسے نشیلی بوٹی سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے ۔ لیکن میں ان میں سے کسی ایک تاویل سے بھی اپنے آپ کو متفق نہیں پاتا اور بھانگ کو بھانج یعنی ریزگاری سمجھتا ہوں کیونکہ اردو میں گ اور ج کا تبادل بھی عام ہے ۔ میرے نزدیک اس محاورے کے معنی ہیں گھر میں روپیہ چھوڑ بھنی ہوئی ریزگاری یا پیسے بھی نہ ہونا اور یہ کنایہ ہے انتہائی قلاش ہونے سے ۔

گھوڑے بیچ کر سونا

زیادہ دیر تک گہری نیند سونے کے موقعے پر بولتے ہیں اور اس سے وہ اطمینان قلب ظاہر کرنا مقصود ہوتا ہے جو فکر رفع ہونے کے بعد ہی ملتا ہے ۔ بظاہر یہ محاورہ گھوڑوں کے سوداگروں سے لیا گیا ہے

اور اس سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ گھوڑوں کے بیچنے کے بعد ہی انسان کو فکر سے نجات ملتی ہے۔ لیکن گھوڑوں کی سوداگری میں ضروری نہیں ہے کہ یک وقت سب کے سب گھوڑے فروخت ہو جائیں۔ دیکھنے میں یہ آتا ہے کہ سوداگروں کے پاس گھوڑے آتے جاتے رہتے ہیں۔ کچھ بک جاتے ہیں کچھ بچ رہتے ہیں اور کچھ نئے خرید لیے جاتے ہیں اور یوں ان کے یہاں گھوڑے برابر موجود رہتے ہیں۔ گھوڑوں کے تمام تھان یک وقت خالی نہیں ہوتے۔ پھر اس سے یہ نتیجہ بھی نکلتا ہے کہ گھوڑوں کی موجودگی سوداگری کی فکر و پریشانی کا مستقل سبب ہوتی ہے جس کے باعث وہ کبھی چین کی نیند نہیں سو سکتے اسی بات کو اگر ذرا اور وسعت دے دی جائے تو پھر ہر شے کا سوداگر آرام کی نیند سے محروم ہو جاتا ہے اس میں گھوڑوں کی تخصیص ہی کیا ہے۔

دراصل یہ معنوی اشکال لفظ "بیچنا" سے پیدا ہوا ہے جو اردو میں صرف فروخت کرنے کے معنوں میں مستعمل ہے۔ اس کے دوسرے معنی اردو دان طبقے کے علم سے باہر ہیں۔ البتہ مادۂ "بیچ" سے بنے ہوئے دو لفظ ہمارے یہاں اب بھی رائج ہیں ان میں سے ایک لفظ "بیچا" ہے۔ کاشت کار بانس کی کھپاچوں سے ایک انسانی ڈھانچہ تیار کرکے اس کو کپڑے پہنا دیتے ہیں اور اپنے کھیت میں اس لیے نصب کر دیتے ہیں کہ جنگلی جانور اسے انسان سمجھ کر ڈرتے رہیں اور کھیت کے نزدیک نہ آئیں۔ اس ڈھانچے کو بیچا (بیچ + الف فاعلی) یعنی بیچ والا کہتے ہیں۔ جس کا مقصد صرف کھیت کی حفاظت کرنا ہوتا ہے اس لفظ میں "بیچ" سے حفاظت، تحفظ، بچاؤ کا مطلب نکلتا ہے اردو کا دوسرا لفظ "بچالی" ہے اور بچالی (بیچ + آلی) یعنی بیچ والی اس گھاس کو کہتے ہیں۔ جو گھوڑوں کے تھان پر انہیں کیچڑ وغیرہ سے بچانے کے لیے بچھا دی جاتی ہے۔ یہاں بھی لفظ "بیچ" بچاؤ معنوں میں ہی استعمال ہوا ہے۔ یہ لفظ بنگالی زبان میں تنہا بھی استعمال ہوتا ہے اور صاف صاف بچاؤ کے معنی دیتا ہے۔ جیسے تو مار، دویانے بیچے، آچھے (تمھاری مہربانی سے بخیریت ہوں) یہاں بیچے کے معنی بخیر، بعافیت، محفوظ، بچا ہوا وغیرہ ہیں، اب اردو محاورہ گھوڑے بیچ کر سونا" پر نظر ڈالیے تو معنی بالکل

صاف ہو جاتے ہیں یعنی گھوڑوں کا بچاؤ کرکے سونا اور گھوڑوں کا تحفظ یا بچاؤ واقعی ان کے مالک کے لیے اطمینان قلب کا باعث ہوتا ہے ۔

اردو کے مندرجہ بالا چند محاورے ان محاوروں میں سے لے لیے گئے ہیں جن کے لغوی معنی آسانی سے سمجھ میں نہیں آتے ہر محاورے میں ایک ایسا لفظ ملتا ہے جو اس کی تشریحی کلیدکہا جاسکتا ہے لہٰذا ان محاورات کا اشکال دور کرنے کے لیے ان الفاظ کا مطالعہ اشد ضروری ہے جن سے یہ ترکیب پاتے ہیں اس میں شک نہیں کہ اردو زبان کے ہزاروں لاکھوں الفاظ کا مطالعہ ایک عمر نہیں عمروں کا مطالبہ کرتا ہے اور جب میں یہ دیکھتا ہوں کہ ہمارے الفاظ پاک و بھارت کی دوسری زبانوں کے ذخیرہ الفاظ سے بھی گہرا تعلق رکھتے ہیں تو اس نتیجہ پر پہنچتا ہوں کہ ان کو سمجھنے کے لیے نسلوں کی ریاضت درکار ہوگی ۔ لیکن اس خیال سے دل چھوٹا نہیں کرنا چاہیے کیونکہ ہماری گذشتہ نسلوں نے اردو جیسی وسیع ، باثروت ، آزاد اور بااصول زبان کی بناوٹ کو سمجھنے سے اب تک جتنی بےاعتنائی برتی ہے ۔ اس کی تلافی صرف اسی طرح ہو سکتی ہے کہ مطالعہ الفاظ کا کام بلا تاخیر شروع کر دیا جائے ۔

مطبوعہ "اوراق" لاہور ، جولائی ۱۹٦٦ء

اشخاص و مقامات کے نام

اگر ہم ناموں کی فہرست پر نظر ڈالیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ ہر نام کے کوئی نہ کوئی معنی ضرور ہوتے ہیں ۔ زبان کے ابتدائی منازل میں ہمیں سب سے پہلے ناموں ہی سے سابقہ پڑتا ہے اور یہ بات بھی بڑی دلچسپ ہے کہ یہ تمام نام بلا استثنا اسمائے معرفہ ہوتے ہیں ۔ اسمائے ذات بعد میں وضع ہوئے اور اسمائے مجردہ سب سے آخر میں ۔ اسم معرفہ ایک ایسی علامت ہے جو کسی ایک ہی انسان ، حیوان ، مقام یا چیز کی طرف اشارہ کرتی ہے ۔ انسان کے نزدیک اسم اور موسوم کا تعلق نہایت قریبی اور گہرا ہوتا ہے ۔ وہ اپنے نام کو اپنی شخصیت ہی کا ایک جزو تصور کرتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ جب ہم کسی کا نام لاپروائی سے بگاڑ لیتے ہیں تو وہ نہایت برا مانتا اور اس بات کو اپنی سخت توہین سمجھتا ہے ۔

برصغیر پاک و ہند کے ناموں کا مطالعہ کرتے وقت جب ہم تاریخ کو اپنے سامنے رکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ نام میں مذہب کو ہمیشہ سے بڑا دخل رہا ہے ۔ چنانچہ مقدس ہستیوں اور مقدس مقامات کے نام عام طور پر اشخاص کے ناموں کا جزو ہوتے ہیں ۔ یہ بات نہ صرف ہندوؤں ہی کے لیے کہی جا سکتی ہے بلکہ مسلمانوں میں بھی یہ رواج عام ہے ۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کے بعد سے ناموں میں چند اہم تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں ۔ ان میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ مسلمانوں کے ساتھ ساتھ جب ہندوستان میں ترکی ، فارسی اور عربی زبانیں بھی آئیں تو رفتہ رفتہ یہاں کے باشندوں کی زبانوں پر بدیشی الفاظ بھی چڑھنے لگے ۔ آج جو ہم کو ہندوؤں کے ناموں میں بدیشی الفاظ کا پٹ نظر آتا ہے وہ اسی آمیزش کا نتیجہ ہے ۔ دوسری جانب مسلمان بھی کچھ ناموں

میں ہندوؤں کے شریک ہو گئے ۔ لیکن اس قدر طویل میل جول کے بعد نظر دونوں میں قدر مشترک بہت ہی کم نظر آتی ہے اور اس کے دو سبب ہیں ۔ ایک حکومت دوسرے مذہب ۔ مسلمان فاتح کی حیثیت سے داخل ہوئے اور حاکم بن کر رہے ۔ لہٰذا دیسی باشندوں سے اتنا گھل مل نہ سکے جتنا کہ ایک دیس کے باسیوں کو مل جانا چاہیے تھا ۔ ان غیر مساوی حیثیتوں میں دونوں کا اس سے زیادہ قریب آنا نا ممکن تھا ۔ مذہب اور بھی سونے پر سہاگہ ہو گیا ۔ ایک مسلمان دوسرا ہندو ۔ دونوں کے سوچنے کے طریقے ہی جدا جدا تھے ۔ ہندوستان ایک کا گھر تھا تو دوسرے کا پردیس ۔ ہندو اپنے آپ کو ہندوستان سے وابستہ سمجھتا تھا تو مسلمان عرب سے ۔ یہ بنیادی اختلاف ہمیں دونوں کی زندگی میں صاف صاف نظر آتا ہے ۔ اسے ہم ناموں کے سلسلے میں واضح کرتے چلیں گے ۔

اس خطۂ ارض میں اولاد کا نام رکھنا والدین کا ایک اہم فریضہ سمجھا جاتا ہے اور اس کی تکمیل میں ہندو اور مسلمان سبھی یکساں طور پر سرگرمی کا اظہار کرتے ہیں ۔ چنانچہ نام رکھنا ہمارے یہاں کی ایک رسم یا سنسکار بن گیا ہے ۔ ہندوؤں میں بچے کی پیدائش پر زائچہ بھی تیار کرایا جاتا اور نچھتروں کے حساب سے نام رکھا جاتا ہے ۔ مسلمانوں میں عام طور پر بزرگ خاندان بچے کا نام تجویز کرتے ہیں ۔ بیشتر یہ دیکھا گیا ہے کہ نیا نام دوسرے افراد خاندان کے ناموں کا ہم قافیہ ہوتا ہے ۔ مثلاً محمود ، مسعود ، مقصود یا بشیر ، نذیر ، وزیر وغیرہ آج کل مفرد نام بہت کم ہوتے ہیں ۔ ہر نام کم از کم دو اجزا سے ترکیب پاتا ہے جن کا آخری جز باپ کے نام سے لے لیا جاتا ہے ۔ اس طرح ہر باپ اپنے بیٹے کے نام کے ذریعے زندہ رہنے کی کوشش کرتا ہے ۔

کچھ لوگ اصل نام پر ایک اور جز کا اضافہ بھی کر لیتے ہیں ۔ یہ اضافہ ابتدا میں یا خاتمے پر یا دونوں جانب ہوتا ہے اور قوم یا قبیلے کی نشاندہی کرتا ہے ۔ مثلاً ہندوؤں میں پنڈت سری کرشن مصر ابریم چند کھتری اور ٹھاکر رن بیر سنگھ کے اضافے ان کی قومیت کا پتہ دیتے ہیں ۔ اسی طرح مسلمانوں میں سید (میر) علی محمد شاہ ، مرزا نثار علی بیگ ، شیخ فضل حسین اور فتح علی خاں میں سید ، مرزا اور شیخ کے علاوہ

شاہ ، بیگ اور خاں کے اجزا ان کی قومیت ظاہر کرتے ہیں ۔ اس بڑی تقسیم کے علاوہ اور بھی چھوٹی چھوٹی خاندانی گروہ بندیاں ہوتی ہیں جن کو ہمیشہ ناموں کے خاتمے پر بڑھا دیتے ہیں ۔ مثلاً ہندوؤں میں دوبے ، چوبے ، سریواستو ، بھٹنا گر ، جاٹو ، بھٹ ، چوہان ، راٹھور وغیرہ ۔ کچھ مسلمان بھی جو ہندوستان کے قدیم باشندے ہیں اپنی قومیت اب بھی اسی طرح ظاہر کرتے ہیں ورنہ عام طور پر مسلمانوں میں یہ آخری جز نسبتی ہوتا ہے اور کسی شخص یا مقام سے نسبت ظاہر کرتا ہے ۔ مثلاً رازی ، غزنوی ، دہلوی ، لاہوری یا نقوی ، زبیری ، صدیقی ، حسینی وغیرہ ۔

اصل نام کے علاوہ مسلمانوں میں کنیت کا بھی رواج ہے جو انھی کے ساتھ عرب سے آیا ہے ۔ یہ نام باپ یا بیٹے اور ماں یا بیٹی کے نام سے قبل ابن یا ابو اور بنت یا ام کا اضافہ کر کے بنا لیا جاتا ہے ۔ مثلاً ابن انشا ، ابو القاسم ، بنت زہرا، ام سلمیٰ وغیرہ ۔ لیکن ہندوستان کے ماحول نے اس کی معنویت میں فرق پیدا کر دیا ہے اور اب یہ نام بیشتر کنیت کی جگہ اصل نام میں شمار ہونے لگا ہے ، اب ابو القاسم سے قاسم کا باپ مراد نہیں ہوتا ۔ بلکہ یہ کسی شخص کا بھی نام ہو سکتا ہے خواہ وہ شخص کنوارا یا لاولد ہی کیوں نہ رہے اور اگر اس کے اولاد بھی ہو تو یہ ضروری نہیں کہ اس کے بیٹے کا نام قاسم ہی رکھا جائے بلکہ اس کے بیٹے کا نام اگر ابو الحسن بھی ہو تو جائے تعجب نہیں ، اس لیے کہ بیٹے کے تسمیہ میں باپ اکثر قافیہ دو زن و آہنگ سے کام لیتا ہے ۔

اشخاص کے سب سے زیادہ فطری نام وہ ہیں جو ان کی کوئی نہ کوئی جسمانی صفت یا خارجی خصوصیت بیان کرتے ہیں ۔ مثلاً ننھے یا ننھا ، ننھی ، منے یا منا ، منی، منن ، سوکھا ، سکھا (دبلا پتلا)، سکھو ، سکھیا ، سکھن ، چھوٹے ، چھوٹا ، چھٹا ، چھٹن ، چھوٹو ، نتھو (جس کی ناک چھدی ہوئی ہو) ، اچھا ، اچھے ، اچھی ، اچھن ، بابو ، ببو ، ببن ، بی بی ، ببو ، ببن ، پتو (پوت کی تصغیر) ، پُتن ، بالُو (بچہ) ، بچو (بچہ کی تصغیر) ، بچن ، بٹیا (بیٹی کی تصغیر) ، بٹن ، جھبو (جس کے

سر پر زیادہ بال ہوں) ، چھنگا (چھ انگلیوں والا) وغیرہا - بنے ، بنی ، بنو یا دولھا ، دنو ، دنن والدین کی خواہش ظاہر کرتے ہیں جو اپنی اولاد کی شادی دیکھنا چاہتے ہیں - کلو (کالا) ، بھورا ، بھوری ، گوری رنگ کے لحاظ سے رکھے جاتے ہیں - یہ تمام نام ہندو مسلمانوں میں عام ہیں - بمل اور نرمل (صاف ستھرا) یا بملا اور نرملا ہندوؤں کے نام ہیں - کامنی اور پدمنی بھی ہندوانہ ہیں - کامنی چھریرے جسم والی لڑکی کو اور جس کے پاؤں میں ایک مخصوص نشان ہوتا ہے اسے پدمنی (مبارک قدم) کہتے ہیں -

بیشتر تعداد ایسے ناموں کی ہے جن میں مقامات کے نام بطور جز شامل ہیں - یہ نام مقدس دریاؤں ، پہاڑوں اور شہروں کے ناموں پر رکھے گئے ہیں - مثلاً دریا خاں ، دریا سنگھ ، گنگا دھر ، جمنا داس ، تربینی سہائے وغیرہ یا پہاڑوں کے ناموں پر بدری ناتھ ، کیلاش ناتھ ، پہاڑ سنگھ وغیرہ اور شہروں کے ناموں پر نگرسین ، بنارسی داس ، متھرا پرشاد ، کاشی رام ، پریاگ نرائن ، گوکل چند ، اجودھیا سنگھ ، دوارکا پرشاد اور گیا پرشاد بہت مشہور اور عام ہیں - یہ تمام مقامات ہندوؤں کے نزدیک متبرک سمجھے جاتے ہیں جن سے مسلمانوں کو کوئی علاقہ نہیں - یوں بھی مسلمانوں میں مقامات کے ناموں پر نام رکھنے کا رواج نہیں ہے - انہیں جس مقام سے خاص لگاؤ ہوتا ہے - اس سے نسبت ظاہر کرنے کو آخر میں ایک جز کا اضافہ کر لیتے ہیں جیسے حسین احمد مدنی یا محمد اجمیری وغیرہ - ایسے نسبتی اجزا کا ذکر اوپر گذر چکا ہے -

مقامی کے علاوہ اکثر نام زمانی بھی ہوتے ہیں جو دن ، تاریخ ، تیوہار یا تقریب ، مہینہ اور موسم سے تعلق رکھتے ہیں - ان میں بھی بعض صرف مسلمانوں سے مخصوص ہیں اور بعض صرف ہندوؤں سے اور کچھ ایسے بھی ہیں جو دونوں میں مشترک ہیں - مثلاً منگل ، منگلو ، بدھ ، بدھو یا بدھا اور اتواری دونوں ہی میں ملتے ہیں - البتہ جمن یا جما اور پیرو صرف مسلمانوں سے مختص ہیں - تاریخ کے لحاظ سے صرف

چند نام ملتے ہیں اور وہ بھی صرف ہندوؤں میں جیسے دوجو یا دوجی (دو تاریخ کو پیدا ہونے والا) اور پنچی یا پانچا (پانچ تاریخ کو پیدا ہونے والا) تیوہاروں پر مسلمانوں کے نام عیدو ، عیدن ، بقریدی ، شبراتی اور شبراتن سننے میں آتے ہیں - ہندوؤں میں ہولی رام یا ہوری اور میلا رام عام ہیں - مہینوں پر نام رکھنے کا رواج صرف مسلمانوں میں ہے - چنانچہ رمضانی ، رجب علی ، محرم علی ، مداری (مدار کے چاند میں پیدا ہونے والا) ، مدارو اور وفاتی (بارہ وفات کے چاند میں پیدا ہونے والا) ، وفاتن عام طور پر دیکھنے میں آتے ہیں ، ہندوؤں میں موسم بہار پر صرف ایک نام بسنتی دیوی ملتا ہے -

مکانی و زمانی ناموں کے علاوہ ناموں کی ایک اور قسم بھی ہے جس کا تعلق حیوانات ، نباتات ، معدنیات ، فلکیات اور جنگی متعلقات سے ہے - ایسے نام حیوانات و اشیا پر رکھے جاتے ہیں - چوپایوں میں شیر اور ہاتھی قوت و عظمت کے مظہر ہیں - چنانچہ شیر خاں ، شیر سنگھ ، ہاتھی سنگھ ، گج سنگھ ، اسد اللہ ، ضیغم حسین وغیرہ بہت نظر آتے ہیں - پرندوں کے ناموں پر شاہیں ، مٹھو ، طوطا رام ، شیاما ، باز بہادر ، شہباز خاں ، ہنس راج ، کوکلا وغیرہ عام ہیں - ان سے بھی زیادہ تعداد ان ناموں کی ہے جو پھول پودوں سے متعلق ہیں - مثلاً چنبیلی، کمل ، کنول ، کملا ، گلاب ، گلابو ، چمپا ، گیندا ، بیلا رام ، شمشاد علی، شبو ، لتا ،کیتکی ، نسرین ، پھول خاں ، پھول وتی اور نرگس وغیرہ - معدنیات میں قیمتی فلزات اور دولت کی افراط ظاہر کرنے والے الفاظ اکثر ناموں کا جز ہوتے ہیں - مثلاً سونے خاں ، موتی ، ہیرا ، پنا ، جوہر ، جواہر ، لال ، للو (لال کی تصغیر) زمرد ، الماس ، در ، یا قوت ، دولت خاں، دولت رام، دھنی رام، دھن پت، دھنا، کروڑی مل، ہزاری مل لکھپت وغیرہ بکثرت نظر آتے ہیں - آسمان اور اس کے متعلقات سے بننے والوں ناموں میں بادل بجلی ، مہ پارہ ، مہتاب خاں ، مہ جبیں ، چاند ، چاندنی ، چندا ، چند ، چندر ، آفتاب ، کوکب ، پروین ، ثریا ، نجم یا انجم ، اختر ، تارا ، ستارا ، سورج ، آسماں جاہ ، فلک ناز ، سپہر شکوہ وغیرہ عام ہیں اور متعلقات جنگ میں جنگ بہادر، جنگی، فیروزجنگ،

تیغ علی ، صمصام علی ، کھانڈے راؤ ، سیف اللہ ، زبیر وغیرہ ملتے ہیں ۔

اتنی اقسام کے بعد بھی ناموں کی ایک بہت بڑی تعداد بچ رہتی ہے اور جو بہت عام ہے ۔ یہ نام خدا ، انبیا ، اولیا ، بزرگان دین، اوتاروں ، دیوتاؤں ، رشیوں ، منیوں اور بادشاہوں کے ناموں سے ترکیب پاتے ہیں ۔ مسلمانوں میں اللہ کے ننانوے نام ، محمد ، احمد ، علی ، صدیق ، فاروق عمر ، عثمان ، حسن اور حسین مردوں میں اور فاطمہ ، عائشہ ، زینب کے علاوہ عربی قاعدے سے بنے ہوئے مؤنث نام مثلاً صبیحہ ، رابعہ وغیرہ عورتوں میں عام طور پر رائج ہیں ۔ بہت سے ایسے بھی نام ہیں جن کی ابتدا عبد یا غلام سے ہوتی ہے جیسے عبدالغنی ، غلام رسول وغیرہ ۔ ہندوؤں میں ہر ، ایشور ، بھگوان ، رام ، لکشمن ، کرشن ، مہا دیو وغیرہ مردوں میں اور سیتا ، رادھا ، پاربتی ، لکشمی وغیرہ عورتوں میں عام ہیں ۔ اسمائے مجردہ میں عروج و شادمانی ، حسن و خیر اور سیرت کی خوبیاں ظاہر کرنے والے نام رکھے جاتے ہیں مثلاً عظمت ، شجاعت ، فتح ، خیر ، پریم ، وجے ، جے ، تیج ، جیوتی ، روشن اور ان کے ہم معنی الفاظ ۔

ہر زبان میں ناموں کی ابتدا ایک جز سے ہوئی ہے ۔ مرکب ناموں کا رواج بعد میں ہوا ۔ اس لیے آج کل مفرد نام بہت کم اور مرکب نام بہت زیادہ ملتے ہیں جن میں کم از کم دو جز ہوتے ہیں اس لیے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان کے آخری جز کے متعلق بھی دو کلمے کہہ دیے جائیں ۔ مسلمان مردوں کے ناموں کا آخری جز اللہ یا اس کا کوئی نام ہوتا ہے اس کے علاوہ محمد ، احمد ، علی ، حسن ، حسین اور دین بھی بکثرت رائج ہیں ۔ ہندوؤں میں ناموں کا خاتمہ داس ، سنگھ ، دھر ، مل ، نرائن ، پرشاد ، کمار ، ناتھ ، دیو ، چند یا چندر ، کشن یا کرشن ، رائے ، راؤ ، راج ، پرکاش ، لال ، سہائے اورپت (رگھوپت ، دھن پت) وغیرہ پر ہوتا ہے ۔ مسلمان عورتوں کے نام خانم ، بیگم ، بانو اور خاتون پراور ہندو عورتوں کے نام دیوی ، کماری ، کنور ، کور ، بائی ، متی اور وتی پر ختم ہوتے ہیں ۔ عام اصول یہ ہے کہ مردوں اور

عورتوں کے نام الگ الگ ہوتے ہیں ، چنانچہ مذکر و مؤنث الفاظ کو کبھی یکجا نہیں دیکھا گیا - البتہ ہندوؤں میں وہ نام ایسے ملتے ہیں جو میاں بیوی کے ناموں کو ترکیب دے کر بنائے گئے ہیں اور وہ ہیں سیتا رام اور رادھا کرشن - مسلمانوں میں بھی دو نام ایسے ملتے ہیں جو ان کی صحیح نقل تو نہیں ہیں البتہ ان میں مذکورہ بالا عام اصول سے انحراف ضرور برتا گیا ہے اور وہ ہیں - غلام فاطمہ اور کنیز حیدر جن کی عام شکل کنیز فاطمہ اور غلام حیدر ہے -

اشخاص کے ناموں سے مقامات کے ناموں کا مطالعہ زیادہ دلچسپ ہے اور جتنا دلچسپ ہے اتنا ہی مشکل بھی ہے - وجہ یہ ہے کہ اول الذکر اپنی اصلی شکل میں ملتے ہیں لیکن مقامات نے اپنی پیدائش سے آج تک صدیاں گزار دی ہیں اور تاریخی ، لسانی ، سماجی وغیرہ بے شمار انقلابات دیکھے ہیں اس لیے ان کے ناموں کا گرد و پیش کی ان تمام تحریکات اور تغیرات سے متاثر ہونا قطعی ناگزیر تھا ۔ چنانچہ ان کی اصلیت کا پتہ لگانے والوں کو تاریخ کا سہارا لینے کے علاوہ اس برصغیر کی مختلف زبانوں اور بولیوں اور ان کے اصولوں سے واقف ہونا بہت ضروری ہے - مثلاً ہند آریائی زبانوں کا ایک عام اصول یہ ہے کہ لہجے اور تلفظ کی سہولت کے پیش نظر کثرت استعمال سے ان کے الفاظ میں تخفیف واقع ہو جاتی ہے اور بیشتر ایسا ہوتا ہے کہ حروفِ علت دب جاتے ہیں ۔ خاص طور پر جب آخری حروف گر جاتے ہیں تو ان کی اصلی شکل پہچاننے میں سخت دشواری کا سامنا کرنا پڑتا ہے - ذیل میں ہم اس مطالعے کا ایک اجمالی خاکہ پیش کرتے ہیں ۔

بستیوں کے لیے ہمارے یہاں گاؤں، گرام، گام ، پور ، پوری، پورہ (جو دکن میں جا کر پورم ہو جاتا ہے) ، نگر ، گڑھ ، گڑھی، گنج، کھیڑا ، کھیڑی، کوٹ ، کھاٹ بھوم، مئو ، واڑ یا واڑہ وغیرہ الفاظ زیادہ مستعمل ہیں اور بیشتر اپنی اصلی حالت میں مل جاتے ہیں ۔ مثلاً بھون گاؤں (مین پوری) ، جل گاؤں (بمبئی) ، سونار گاؤں (مشرق بنگال) ، بلگرام ، (تالگرام) اتر پردیش) ، بیلگام (بمبئی) ، چاٹگام (مشرق بنگال) ، کانپور (اتر پردیش) ، جے پور (راجستھان) ، جبلپور (سی پی)، رنگپور (مشرق بنگال) ، بیجا پور (دکن) مین پوری (اتر پردیش) ، جگن ناتھ پوری

(بہار) ، تری پورہ (مشرق بنگال)، مغلپورہ، شیخو پورہ (مغربی پاکستان)، بارونی پورم ، سہابلی پورم (مدراس) ، املا پورم (بلاری) ، اسلام نگر (بدایوں) ، بہاول نگر ، نونگر (کاٹھیا واڑ) ، علی گڑھ ، گڑھ مکتیشر (اتر پردیش) ، گڑھی اختیار خاں (بہاول پور) ، گوبی گنج (اتر پردیش)، باقر گنج (بنگال) ، آنول کھیڑہ (آگرہ) ، کھیڑی (اودھ) ، راول کوٹ (کشمیر) ، امر کوٹ (سندھ) ، بالا گھاٹ (سی پی)، راج گھاٹ (دہلی)، پر بھوم (الہ آباد) ، مان بھوم ، سنگھ بھوم (بہار) ، بالا مئو (پر دوئی)، چھپرا مئو (فرخ آباد) ، بھابھا مئو ، گوپا مئو (اتر پردیش) ، پالا مئو (بہار) ، انہلواڑہ (گجرات) ، بہلواڑہ (مظفر پور) ، چھندواڑہ (سی پی) ، مارواڑ ، میرواڑہ ، میواڑ ، جھالا واڑ ، کاٹھیا واڑ وغیرہ ۔ آخری قسم کے نام ہمیں زیادہ تر راجستھان ، سوراشٹر اور مدھیہ پردیش میں ملتے ہیں ۔

آباد ، سرائے ، باغ ، محل ، شہر اور بازار جیسے الفاظ ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کا پتہ دیتے ہیں جنہوں نے بعض بستیوں کے پرانے نام بدل کر نئے نام رکھے اور بعض شہر خود بھی آباد کیے چنانچہ اکبر آباد (آگرہ) شاہجہان آباد (دہلی) ، مصطفیٰ آباد (رام پور) ، حیدر آباد (دکن) ، مرشد آباد (بنگال) ، عظیم آباد (بہار) ، حافظ آباد (مغربی پاکستان) ، سرائے شیخ (مین پوری)، سرائے عالمگیر (مغربی پاکستان)، مغل سرائے (بہار) ، کالا باغ (مغربی پاکستان) ، علی باغ (بمبئی) آرام باغ (مغربی بنگال) ، ہزاری باغ (بہار) ، پنج محل (بمبئی) ، نور محل (جالندھر) ، راج محل (بہار) ، سردار شہر (بیکا نیر) ، بلند شہر (اتر پردیش)، نوشہرہ (مغربی پاکستان) ، امرت بازار ، قاسم بازار ، مولوی بازار (بنگال) وغیرہ ان کی مقدس یادگاریں ہیں ۔

شمالی ہند کے پانی پت ، سونی پت ، باغ پت وغیرہ کا پت مالک ، صاحب یا خاوند کے معنوں میں استعمال ہوا ہے جو دکن کے پیٹ مثلاً سونی پیٹ (حیدر آباد) ، سیدا پیٹ (مدراس) ، تندیا لم پیٹ (کڑپا) ، نارائن پیٹ (محبوب نگر) وغیرہ سے بالکل جدا ہے ۔ یہاں پیٹ بستی کے معنوں میں آتا ہے ۔ اسی پیٹ کو پٹن (بمبئی ، راجستھان ، نیپال ،

سومناتھ) ، پٹن چیرو (حیدر آباد) ، پاک پٹن (مغربی پاکستان) ، اما پٹن (تنجور) ، جھالرا پاٹن (راجستھان) ، پٹنہ ، پٹیالہ ، پٹودی ، سرنگا پٹم، مچھلی پٹم اور وزیگا پٹم وغیرہ میں پہچاننے کی کوشش کیجیے - اسی طرح بسنا مصدر کو بس (حصار) ، بستی (اتر پردیش) ، بس نگر (بڑودہ) ، بسی یا بسو گوہانہ (رہتک) میں اور کوٹ کو کوٹہ، کوٹرہ (راجستھان) ، کوٹری (سندھ) ، کوٹلا (مالیر کوٹلا) ، کوٹلی (کشمیر) اور کوئٹہ (بلوچستان) میں شناخت کیجیے -

راجستھان اور سی پی میں بیشتر نام میر ، نیریا نیرا پر ختم ہوتے ہیں - مثلاً اجمیر ، جیسلمیر ، بارو میر ، آمیر ، سانگا نیر ، بیکا نیر ، اچھنیرا (آگرہ) ، امنیر اور بد نیر (امراؤتی) ، کہیں کہیں الفاظ پتی یاوتی (بمعنی والی) اور متی اور وٹی یا واٹی (بمعنی حصہ زمین) نظر آجاتے ہیں جیسے امراوتی (سی پی) ، لکھنوتی (یوپی) ، سابرمتی (احمد آباد) ، رنگ متی (مشرق پاکستان) ، ہنچ وٹی (سی پی) ، شیخاواٹی اور تورا واٹی (راجستھان) وغیرہ - دکن کے اکثر نام اور اور پلی پر ختم ہوتے ہیں جیسے ترچنا پلی ، ارپلی (چندرا)، ہنگنا پلی (مدراس)، نیلا پلی (گود اوری)، انکاپلے(روز یگا پٹم)، ٹراونکور، مدورا، تنجور ، میسور ، بنگلور ، منگلور، کوئم بٹور وغیرہ - ایک نہایت دلچسپ بات یہ ہے کہ پنجابی دا ، دی ، دے کی زبان ہے لیکن پنجاب کے بہت سے نام کی اور کے پر ختم ہوتے ہیں جیسے مریدکے ، سکھیکی ، ہری کے ، پتو کی وغیرہ -

بعض ناموں کے آخر میں وان (مذکر) یا وانی (مؤنث) کا لفظ آتا ہے جس کے معنی جنگل کے ہیں - مثلاً بردوان یعنی بیلوں کا جنگل ، بروانی (اندور یعنی بڑ کے درختوں کا جنگل ، پھلروان (مغربی پاکستان) یعنی پھولوں کا جنگل اور ہلدوانی (کماپوں) یعنی ہلدی کا جنگل - وان بھچراں (مغربی پاکستان) میں یہ لفظ ابتدا میں آیا ہے - پنجاب میں اکثر ناموں کا آخری جز وال ، والا یا والی ہوتا ہے - مثلاً خانیوال ، ملک وال ، نارو وال ، گوجرانوالا ، میانوالی وغیرہ - اتر پردیش میں

بھی ہمیں ایک نام گڑھوال مل جاتا ہے۔ ان خاتموں کے آثار باذنیٰ تخفیف (واؤیا الف کر گرا کر) دوسرے ناموں میں بھی پائے جاتے ہیں۔ مثلاً ڈڈھیال (مغربی پنجاب) ، کرنال، انبالہ (جوانب اور والا سے مرکب ہے) ، سہالا (مغربی پاکستان) نارنول (الور) ، بھار دل (مین پوری) ، کاگا رول (آگرہ) ، مانگرول (کاٹھیا واڑ) ، ارنولی (کرنال) ، قرولی (راجستھان) لعبھر دلی (دہلی) آتر دلی (علیگڑھ) اور کوراولی (مین پوری وغیرہ۔

دو الفاظ کے ملنے میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آہنگ و تلفظ کی سہولت کے پیش نظر کچھ حروف گرا دیے جاتے ہیں۔ چنانچہ بداؤں (بدایوں) ، بچھراؤں (یو - پی)، جگراؤں (مشرق پنجاب) ، جالاؤں (جالون) اور رسوراؤں (الہ آباد) وغیرہ میں پورا گاؤں آباد نظر آتا ہے۔ سنبھلیڑہ، سنبھل اورکھیڑہ سے ارکاٹ (دکن)، ارک (بمعنی -ورج) اورگھاٹ سے اور امروہہ (یو پی) آم اور روہو سے مرکب ہے۔ جمپیر (سندھ) کی تصویر جام پور میں اور اودھ کی اصلی شکل اجودھیایا ایودھیا میں نظر آتی ہے اور اندور اور الور کو اند (بمعنی چاند) واڑہ اورال (بڑی کالی شہد کی مکھی) واڑہ میں پہچانا جا سکتا ہے۔ واڑ اور واڑہ کے معنی مقام، احاطہ اور علاقہ کے ہیں۔ لکھنؤ کے متعلق ابھی تک سنجیدگی سے غور نہیں کیا گیا۔ لاکھ ناؤ میں اس کی تلاش بے معنی ہے۔ ہمیں اس سے مشابہ دو نام لکھنا (اٹاوہ) اور لکھنوتی (سہارن پور) اور ملتے ہیں۔ تینوں کا پہلا جز لکھن یا لکشمن ہے۔ لکھنوتی کا اصل نام لکشمن وتی تھا۔ اگر لکھنؤ کا اصل نام بھی لکشمن منو ہو تو کوئی تعجب نہیں اس لیے کہ شمالی ہندوستان میں منو اور منی پر ختم ہونے والے نام بہت ملتے ہیں۔

مندرجہ بالا سطور میں ناموں کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے وہ نہایت مختصر اور سرسری ہونے کے باوجود خیال انگیز ضرور ہے جس سے دوسرے جوشیلے کام کرنے والوں کو تحریک مل سکتی ہے۔ بہرحال ناموں کا مطالعہ اپنے اندر تحقیق کے بے شمار امکانات رکھتا ہے جو لسانی، نفسیاتی، تاریخی، مذہبی، عمرانی اور سیاسی غرض ہر اعتبار سے بےحد

مفید اور دلچسپ ہو سکتا ہے - ان ناموں کے علاوہ جو اوپر گنا دیے گئے ہیں ، بے شمار نام ایسے موجود ہیں جن کے نقوش استداد زمانہ کے باعث کچھ سے کچھ ہو گئے ہیں اور انھی میں تحقیق کی بہت کچھ گنجائش ہے -

(مطبوعہ : صحیفہ ، لاہور ستمبر ۱۹۵۸ء)

اُردو گرامر کا اسم

بولی کی گرامر بول چال سے نکلتی ہے پر اردو کی گرامر عربی کی گرامر سے نکالی گئی ہے گرامری روپوں کے نام اور ان کی تعریفیں سب عربی سے لی گئی ہیں اور پھر ان کی مثالوں کے لیے اردو کے بول بے جانچے ارکھے ان کے سامنے رکھ دیے گئے ہیں۔ اب حال یہ ہے کہ روپ کی تعریف کچھ ہے تو مثال کچھ اور ہے۔ نہ تعریف مثال پر لگتی ہے نہ مثال تعریف پر پوری اترتی ہے۔ اسی لیے جب کوئی اردو کی گرامر پڑھنے بیٹھتا ہے تو ایک ایسی الجھن میں پڑ جاتا ہے جس سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ملتا۔

"رسالہ گلکرسٹ" میں گلکرسٹ نے لکھا ہے "اسم وہ کلمہ ہے کہ دلالت کرے ایک معنی پر ساتھ استقلال کے، یعنی دلالت کے واسطے محتاج دوسرے کی طرف نہ ہو اور اس کے معنی کے ساتھ زمانہ معتبر نہ ہو" پھر انہوں نے باب اول میں اشتقاق اور عدم اشتقاق کے لحاظ سے اسم کو تین بھانتوں میں بانٹا ہے۔ جامد، مصدر اور مشتق، مولوی فتح محمد خان جالندھری نے بھی اپنی کتاب مصباح القواعد میں لکھا ہے "اسم وہ کلمہ ہے جو اکیلا اپنے معنی دے اور اس میں کوئی زمانہ نہ پایا جائے" اور پھر بناوٹ کے لحاظ سے اسم کی یہی تین بھانتیں گنائی ہیں۔ مولوی عبدالحق نے اپنی کتاب "قواعد اردو" میں اسم کی تعریف یوں کی ہے "اسم وہ لفظ ہے جو کسی جاندار یا شے کی کیفیت کا نام ہو" انہوں نے بناوٹ سے اسم کی قسمیں کرنے یا گنانے کا جھگڑا ہی نہیں پالا۔

گلکرسٹ جامد کی تعریف میں لکھتے ہیں "جامد وہ اسم کہ نہ وہ مشتق ہے نہ وہ مشتق منہ ہے یعنی نہ نکلا ہے وہ کسو سے نہ اس سے کوئی نکلا ہے جیسا پتھر، ہاتھی، مرد، ندی"۔ مولوی فتح محمد خان کہتے ہیں۔

"جس سے کوئی دوسرا لفظ نہ نکلے اور نہ وہ کسی سے نکلتا ہے جیسے ہاتھی ، گھوڑا ، چاقو ، قلم ، ڈھال ، تلوار" ۔ اب ان بولوں پر دھیان دیجیے تو یہ بات کھلتی ہے کہ پتھر ، ہاتھی ، رنڈی ، گھوڑا اور تلوار کے بول ہتھ (ہاتھ) ، رنڈ ، گھوڑ (گھوم) اور تل سے بنے ہیں جو ہماری بولی کی جڑیں ہیں اور ڈھال بھی ایک جڑ ہے ۔ پھر ان سے پتھراؤ ، پتھری ، پتھریلا ، پتھرانا ، ہتھنی ، ہتھیانا ، ہتھیا پول (دہلی کے ایک دروازے کا نام) گھڑ دوڑ ، گھڑ چڑھی ، ڈھلیت ، تل نظر اور تلوریا کے بول بھی بنتے ہیں ۔ مرد اور چاقو فارسی کے بول ہیں اور قلم عربی کا ۔ اس لیے یہ مثالیں اس وقت ہماری بحث سے باہر ہیں ۔ اس طرح یہ سب کے سب بول یا تو کسی اور بول سے بنے ہیں یا ان سے دوسرے بول گھڑے گئے ہیں اس لیے جامد کی تعریف پر پورے نہیں اترتے اور انھیں پر کیا ہے ۔ جامد کی تعریف پر پورے اترنے والے اسم تو پوری اردو بولی میں نہیں ملتے ۔

اردو میں کچھ ایسے بول ضرور ملتے ہیں جو نہ کسی سے نکلے ہیں اور نہ ان سے کوئی دوسرا بول نکلتا ہے جیسے پر ، کو ، سے ، تک ، میں پر یہ اسم نہیں عامل ہیں ۔ جنھیں آج کل کتابوں میں حروف لکھا جاتا ہے ۔ انھیں کے ساتھ ساتھ ہماری بولی کی جڑوں کا ذکر بھی ضروری ہے جو کسی دوسرے بول سے نہیں نکلیں ۔ لیکن ان سے بہت سے بول اب تک بن چکے ہیں اور بہت سے آگے بھی بنتے رہیں گے ۔ اس لیے انھیں اوت (بے اولادا) سمجھنا ایک بہت بڑی بھول ہے ۔

اسم کی دوسری قسم مصدر بتائی گئی ہے ۔ جس کی تعریف میں گلکرسٹ لکھتے ہیں : "مصدر وہ اسم ہے کہ نکلیں اس سے افعال اور اسمائے مشتقہ" اور یہ بھی کہتے ہیں کہ "علامت مصدر کی ہندی میں حرف نا ہے یعنی نون و الف ساکن" ۔ مولوی فتح محمد خاں مصدر کی تعریف کرتے ہیں "جس سے اور الفاظ نکلیں جیسے کھانا سے کھایا، کھاؤ، ہم کھائیں گے ، وہ کھاتے ہیں ، تم نہیں کھاتے وغیرہ" لیکن مولوی عبدالحق "لوازم فعل" میں مصدر کو فعل کی ایک صورت بتاتے ہیں اور

اس کی تعریف میں لکھتے ہیں - "جس میں کام کا ہونا بلا تعین وقت کے ہو - اس کے آخر میں ہمیشہ نا ہوتا ہے جیسے ہونا ، کرنا ، کھانا - حقیقت میں یہ ایک قسم کا فعلی اسم ہے جو تجریدی طور ہر فعل کے کام یا حالت کو بتاتا ہے اور زمانہ اور تعداد سے بری ہوتا ہے - گلکرسٹ اور مولوی فتح محمد خان دونوں کی تعریف بتاتی ہے کہ مصدر سے دوسرے بول نکلتے ہیں اور عربی میں بھی نکلنے کی جگہ کو "مصدر" کہتے ہیں لیکن اردو میں یہ بات ٹھیک نہیں بیٹھتی کیونکہ ہمارے یہاں کوئی بول کسی مصدر سے نہیں نکلتا - اوپر کی مثالوں میں مولوی فتح محمد خان نے جتنے بول یا فعل دیے ہیں وہ "کھانا" سے نہیں "کھا" سے نکلے ہیں اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ ان میں سے کسی ایک میں بھی "نا" تو کیا خالی "ن" بھی نہیں ملتا جب کہ یہ اردو مصدر کا ایک ضروری جزو بتایا جاتا ہے - اردو میں جس بول کو مصدر کہتے ہیں وہ خود ایک بول سے نکلتا ہے جسے ہم جڑ یا اس کہہ سکتے ہیں - ہونا ، کرنا ، کھانا ، پینا کے بول ہو ، کر ، کھاپی کی جڑوں پر "نا" بڑھا کر بنائے گئے ہیں اور پھر ان سے آگے اور کوئی بول نہیں بنتا -

اس جگہ مولوی عبدالحق نے ٹھیک کہا ہے کہ مصدر کی علامت نا گرا دینے سے فعل کا مادہ رہ جاتا ہے اور اس سے باقاعدہ افعال بنتے ہیں - مثلاً ملنا کا مادہ مل ہے اور چلنا کا چل بندی فعل کا مادہ صورت میں امر مخاطب کے مشابہ ہوتا ہے"- مولوی فتح محمد خان کا دھیان بھی اس بات کی طرف گیا ہے اسی لیے وہ لکھتے ہیں "امر یہ اعلیٰ ندا پکار رہا ہے کہ اصل اشتقاق میں ہوں کیونکہ مجھ سے مضارع ، حال، استقبال ، اسم فاعل - اسم حالیہ متعدد صیغے مشتق ہوتے ہیں"- لیکن اس کے بعد ہی وہ پھر پرانے خیال کی طرف پلٹ جاتے ہیں اور کہتے ہیں - مگر جس طرح اس سے یہ صیغے بن جاتے ہیں اسی طرح مصدر سے علامت مصدر کے حذف کرنے سے یہ صیغے نکل آتے ہیں اس لیے ہم بھی اردو میں مصدر ہی کو اصل اشتقاق قرار دیتے ہیں" - صحیح بات یہ ہے کہ اردو میں مصدر کے بس دو ہی روپ بولے جاتے ہیں - جانا اور جانیں ، (جسے ہم جانے لکھتے ہیں) - چلنا اور چلنیں (چلنے) - ان میں سے پہلا

فاعلی اور دوسرا غیر فاعلی ہے - جیسے ٹہلنا اچھی عادت ہے اور ٹہلنے سے فائدہ ہوتا ہے - اس کا کوئی تیسرا روپ ہمارے یہاں نہیں بولا جاتا اور نہ اس سے دوسرے بول ہی بنتے ہیں اس لیے اسے مصدر ، (نکلنے کی جگہ ، نکاس) کہنا ٹھیک نہیں ہے - اس کی جگہ فعلی جڑ یعنی امر کو مصدر کہنا مناسب ہے کیونکہ اردو کے سب فعلی روپ امر سے ہی نکلتے ہیں -

مشتق کی تعریف رسالہ گلکرسٹ میں یہ لکھی ہے - "مشتق وہ اسم ہے کہ نکلے مصدر سے" اور مصباح القواعد میں لکھا ہے - "جو کسی اور کلمہ سے نکلا ہو جیسے لکھنے والا (اسم فاعل) لکھا ہوا (اسم مفعول) وغیرہ لکھنے سے مشتق ہیں" لیکن افضل القواعد میں مولوی فتح محمد خان نے اسی بات کو کھول کر یوں لکھا ہے "مشتق وہ جو مصدر سے بنا ہو" اور مثال میں آنے والا جانے والا لکھا ہوا پڑھی ہوئی - چلتے پھرتے ، دیکھنے والی ، سونگھتا ہوا کے بول پیش کیے ہیں جن میں سے آنے والا ، جانے والا اور دیکھنے والی کے بول (مرکب) ہیں ، اکہرے بول نہیں ہیں - یہ دو دو آزاد بولوں سے مل کر ایسے ہی بنے ہیں جیسے گاڑی والا ، گھوڑے والا ، گھر والا اور لکھا ہوا ، پڑھی ہوئی ، چلتے پھرتے اور سونگھتا ہوا کے بول لکھ ، پڑھ ، چل پھر اور سونگھ سے نکلے ہیں - انہیں لکھنا پڑھنا ، چلنا ، پھرنا اور سونگھنا سے مشتق سمجھنا غلط ہے کیونکہ اردو مصدر کی پہچان "نا" بتائی گئی ہے اور اس کا نشان ان بولوں میں دور دور تک نہیں ملتا۔

ان تعریفوں اور مثالوں کو پرکھنے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اردو میں جامد جیسا اسم تو سرے سے ملتا ہی نہیں - مصدر کی تعریف ٹھیک سمجھ لی جائے تو مثالیں غلط ٹھہرتی ہیں اور جو مثالوں کو ٹھیک مان لیا جائے تو تعریف غلط ہو جاتی ہے اور جب مصدر کا یہ حال ہے تو اس سے نکلنے والے بول (مشتق) کی مثالیں کب ٹھیک ہوں گی اور جو ان مثالوں کو ٹھیک سمجھ لیا جائے تو ان کا استخراج اس روپ سے نہیں مانا جا سکتا جسے آج کل اردو کا مصدر کہتے ہیں -

اس طرح بناوٹ سے اردو کے اسم کی جو تین قسمیں بتائی گئی ہیں وہ سب کی سب غلط سلط دکھائی دیتی ہیں -

معنی کے لحاظ سے گلکرسٹ نے اسم کی دو قسمیں گنائی ہیں - نکرہ اور معرفہ اور معنی کے لحاظ سے یہی دو قسمیں مولوی فتح محمد خان نے افضل القواعد میں لکھی ہیں - لیکن مصباح القواعد میں انھوں نے معرفہ اور نکرہ کو اسمِ جامد کی قسمیں لکھا ہے جو بہت ہی غلط ہے - مولوی عبدالحق نے بھی اپنی کتاب میں معرفہ اور نکرہ کا ذکر کیا ہے اور انہیں اسم خاص اور اسمِ عام کا نام دیا ہے - گلکرسٹ نے معرفہ کی چار قسمیں لکھی ہیں ، عَلَم ، ضمیر ، اسم اشارہ اور اسم موصول - مولوی فتح محمد خان نے بھی معرفہ کو اسی طرح بانٹا ہے لیکن مولوی عبدالحق نے اسم خاص (معرفہ) کی ایسی کوئی تقسیم نہیں لکھی اور یہ اچھا ہی کیا کیونکہ اسم اشارہ اور اسم موصول ایک ضمیر ہی کی قسمیں ہیں - اور ضمیر اس بول کو کہتے ہیں جو اسم کی جگہ بولا جاتا ہے - میں ، ہم ، تو اور تم کسی کے نام نہیں ہیں - ناموں کی جگہ بولے جانے والے بول ہیں - اس لیے انہیں اسم نہیں کہا جا سکتا اور ضمیر کو اسم کی قسم نہیں ٹھہرایا جا سکتا - کہنے کا مطلب یہ ہے کہ گلکرسٹ اور مولوی فتح محمد خان کی یہ تقسیم بھی غلط ہے -

گلکرسٹ نے عَلَم کی تعریف یوں لکھی ہے کہ "عَلَم وہ ہے کہ نام ہو ایک شخص معین کا" - اس تعریف سے لاہور اور تاج محل عَلَم کے تحت نہیں آتے اور نہ باقی تین قسموں ضمیر ، اسم اشارہ اور اسم موصول میں ہی گنے جا سکتے ہیں - سمجھ میں نہیں آتا کہ پھر انھیں کس درجے میں رکھیں اور انہیں اسم معرفہ کیونکر کہیں - مولوی فتح محمد خان کا کہنا ہے کہ "اسی طرح لوگ سب چیزوں کے نام رکھ لیتے ہیں اور سب عَلَم ہیں اور عَلَم کی مثالوں میں انہوں نے حامد ، محمود اور احمد کے ساتھ ساتھ ، گنگا جمنا ، چاند اور سورج کے بول بھی لکھے ہیں یعنی ان کے کہنے کے مطابق یہ سب عَلَم ہیں لیکن انہوں نے "عَلَم کی خالی پانچ قسمیں ہی کی ہیں - خطاب ، القب ، کنیت ، عرف اور تخلص - اب الجھن یہ پیدا ہوتی ہے کہ گنگا اور سورج کو علم کی کس قسم میں

رکھا جائے اور ذریت احمد کو کس قطار میں شمار کیا جائے۔ اس گڑ بڑ کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے سیدھے سادے نام کے لیے کوئی الگ قسم ہی نہیں رکھی۔ مولوی عبدالحق نے بھی لکھا ہے کہ اشخاص کے اسم خاص بھی کئی قسم کے ہوتے ہیں" اور ان قسموں کو خطاب، لقب، عرف اور تخلص کہا ہے۔ یوں انھوں نے بھی سیدھے سادے خاص نام جیسے احمد، محمود، حامد اور سرگودھا کے لیے کوئی الگ قسم مقرر نہیں کی اور پھر دوسروں کی بیان کی ہوئی قسموں میں سے کنیت کا ذکر بھی اڑا گئے جب کہ ہمارے یہاں منو کی ماں اور پپو کے ابا جیسے مرکبات بھی بولے جاتے ہیں جو عربی کے ابو الحسن (حسن کا باپ) اور ام المومنین (مومنین کی ماں) جیسے مرکبات کے برابر ہیں اس لیے جہاں انھوں نے "علم کی چار قسمیں مان لی ہیں وہاں پانچویں رکنیت بھی مان لیتے تو کیا برائی تھی۔

گلکرسٹ نے اسم نکرہ کی کوئی قسم نہیں لکھی۔ مولوی عبدالحق نے اسم عام (یعنی نکرہ) کو تین قسموں میں رکھا ہے۔ عام نام، اسم کیفیت اور اسم جمع۔ اس تقسیم میں دو قسمیں تو ٹھیک لگتی ہیں۔ لیکن تیسری قسم (اسم جمع) بیکار ہے جسے عام نام میں ہی رکھا جا سکتا تھا کیونکہ فوج، انجمن، قطار اور جھنڈ چاہے کتنے ہی آدمیوں کی گنتی کے لیے بولے جائیں اردو میں واحد ہی سمجھے جائیں گے۔ نہیں تو پھر ان میں "بول" اور "جملے" کو بھی ملانا پڑے گا کیونکہ بول آوازوں کا اور جملہ بولوں کا مجموعہ ہوتا ہے۔ جوڑا دو آدمیوں یا چیزوں کا ہوتا ہے۔ درجن بارہ کی کوڑی بیس کی اور سینکڑا سو کی ڈھیری کو کہتے ہیں اور جوڑا، درجن، کوڑی اور سینکڑا واحد ہی بولے جاتے ہیں۔ اس لیے مولوی صاحب اسم نکرہ کو خالی دو قسموں میں بانٹ کر مادی اور مجرد یا خیالی کے نام دے دیتے تو ٹھیک ہوتا۔

مولوی فتح محمد خان نے اسم نکرہ کی دس قسمیں گنائی ہیں۔ اسم ذات، اسم کنایہ، اسم استفہام، اسم صفت، مصدر، حاصل مصدر، اسم فاعل اسم مفعول، اسم، معاوضہ اور اسم حالیہ۔

مزے کی بات یہ ہے کہ وہ مصدر کو جامد سے الگ بھی ایک اسم مانتے ہیں ۔ جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے اور اب اس بانٹ میں اسے جامد کی ایک قسم بھی منوا رہے ہیں کیونکہ نکرہ کو وہ جامد ہی کی قسم ٹھہراتے ہیں یعنی وہ مصدر کو جامد کا بھائی بھی مانتے ہیں اور اس کا ہوتا بھی گرداتنے ہیں ۔ حاصل مصدر ، اسم فاعل ، اسم مفعول ، اسم معاوضہ اور اسم حالیہ کو نکرہ کی قسمیں بتاتے ہیں اور مصدر کے مشتقات میں بھی گناتے ہیں ۔ کنایہ ، استفہام اور صفت کو کسی آدمی ، چیز یا جگہ کا نام نہ ہونے پر بھی اسم کہتے ہیں ۔ اسم ذات کی پانچ قسمیں اسم آلہ ، اسم ظرف ، اسم صوت ، اسم مصغر اور اسم مکبر بتاتے ہیں اور اسم آلہ میں دھونکنی ، بھکنی ، بیلن ، چھلنی اور نکیل جیسے نام بھی لکھتے ہیں جن کی گنتی مشتقات میں ہونا چاہیے اور مشتقات میں ہی اسم مصغر اور اسم مکبر کو رکھنا چاہیے ۔ اسم ظرف کی مثال میں گھر ، گلی ، گاؤں ، شہر ، ملک ، صبح ، شام ، رات اور دن کے بول لکھتے ہیں جو عام نام ہیں ۔ انہیں وقت اور جگہ کی ایک الگ قسم میں رکھنے کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی ۔ غضب یہ ہے کہ مولوی صاحب ان کے ساتھ ساتھ جہاں اور جب کو بھی اسم ظرف کہتے ہیں جب کہ یہ کسی کے نام نہیں ہیں ۔

اردو بولی میں اسم مصغر اور اسم مکبر جیسی اسم کی کوئی قسم نہیں ملتی پر مولوی فتح محمد خان اور مولوی عبدالحق ہیں کہ عربی کی یہ قسمیں بھی اردو میں ڈھونڈ رہے ہیں ۔ یہ لوگ اردو کے اشتقاق پر دھیان نہیں دیتے کہ :

(۱) اس کے بہت سے بولوں کے آخر میں "آ" اور "ای" مذکر اور مؤنث کے (لاحقے) ہیں جیسے بالا بالی ، بیٹا بیٹی ، لڑکا لڑکی ، ٹوکرا ٹوکری ، شیشا شیشی ۔

(۲) کچھ بولوں کے آخر میں " آ " کا لاحقہ فالتو جوڑ دیا جاتا ہے ۔ لیکن اس میں چھٹائی ، بڑائی کا کوئی لحاظ نہیں ہوتا جیسے بھائی سے بھیا (بھائی آ) مائی سے میا (مائی آ) کوئی سے

کیا (کوئی آ)، جورو سے جروا (جورو آ) لاہوری سے لاہوریا
(لاہوری آ) اور قنوجی سے قنوجیا (قنوجی آ) -

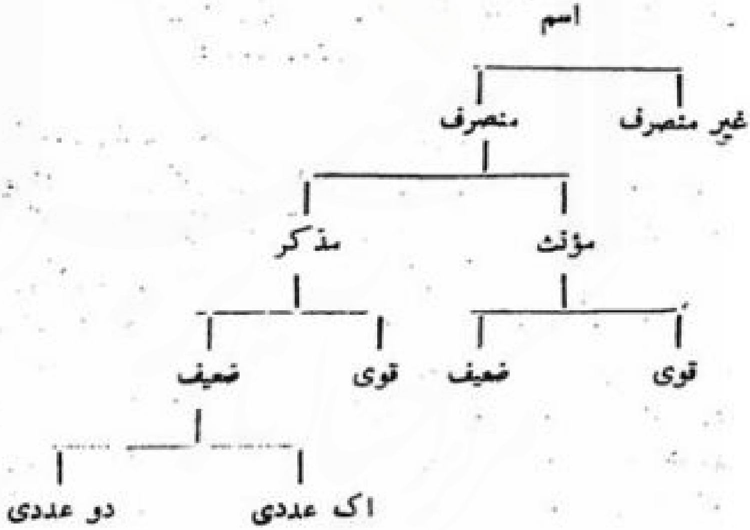
(۳) کچھ بولوں کے آخر میں دوسرے لاحقے بھی بڑھا دیے جاتے ہیں جیسے ڑی سے (مؤنث کے لیے) پلنگڑی، ٹنگڑی، انکھڑی، ہنکھڑی اور پگڑی، ڑا سے (مذکر کے لیے) مکھڑا اور دکھڑا پران فالتو لاحقوں سے معنی میں کوئی فرق نہیں آتا جس طرح جوتا جوتی سے اور بیٹا بیٹی سے ڈیل میں بڑا نہیں ہوتا یا جس طرح بھائی سے بھیّا جورو سے جروا، لاہوری سے لاہوریا چھوٹا بڑا نہیں ہوتا اسی طرح مکھ اور مکھڑا، دکھ اور دکھڑا، آنکھ اور انکھڑی، پلنگ اور پلنگڑی، ٹانگ اور ٹنگڑی کے بول بھی برابر ہوتے ہیں - ان بولوں کو مکبر اور مصغر کہنے سے پہلے ان لوگوں کو ان کے لاحقوں پر بھی دھیان دے لینا ضروری تھا -

ان سب باتوں کا خلاصہ یہ ہے کہ اردو گرامر کی کتابوں میں اسم کی تقسیم دو طرح کی گئی ہے - ایک بناوٹ سے دوسری معنی سے ہر عربی کی گرامر سامنے رکھ کر گرامری روپ ٹھہرائے اور ان روپوں کی تعریف طے کرنے میں بناوٹ اور معنی دونوں کو گڈ مڈ کر دیا ہے - ان میں دی ہوئی بہت سی مثالیں بھی اس لیے غلط ہو گئی ہیں کہ یہ عربی کے روپ اردو میں فرض کر لینے کے بعد ڈھونڈی گئی ہیں - سب سے اہم بات یہ ہے کہ کتابیات (گرامر) میں بناوٹ اور معنی سے بحث نہیں ہونا چاہیے - بناوٹ کی بات لفظیات میں اور معنی پر غور معنویات میں ہو سکتا ہے - نظامیات جمع میں الفاظ کی مرتب و تعلق کی بات کرتی ہے اس لیے اسم کی تقسیم تعریف کی رو سے ہونا چاہیے - پھر یہ بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ گرامر کا معنی سے کیا ناتا ہے کیونکہ معنی کی بحث تو معنویات میں ہوتی ہے اور معنویات کا جوڑ توڑ لغت سے ملتا ہے اس لیے گرامر میں معنی کی بحث اٹھانی ہی نہیں چاہیے اور نہ گرامری روپ معنی سے طے کیے جانے چاہئیں - گرامر جب پوری بات یا بولوں

سے بحث کرتی ہے تو ان کی بناوٹ اور ان کے ایک دوسرے سے بندھن اور تار پر دھیان دیتی ہے ۔ ان کے معنی کو نہیں چھیڑتی کیونکہ یہ اس کا میدان ہی نہیں ہے ۔ اس لیے اس پوری بحث کا نچوڑ یہ ہے کہ بناوٹ سے اسم کی بس دو بھانتیں ہو سکتی ہیں ۔ ایک مصدر جو کسی سے نہیں بنتا پر اس سے دوسرے بول نکلتے ہیں جیسے چال اور لات جن سے چلن اور لیتا نا کے بول بنتے ہیں ۔ اس کو نکاس بھی کہہ سکتے ہیں ۔ دوسرے مشتق جو کسی دوسرے بول سے بنا ہو جیسے جل سے جلاپ ، پھونک سے پھکنی ، رنگ سے رنگائی ، سو سے سوتا ۔

اسم کی ایک اور بھانت تصریف سے بھی ہو سکتی ہے اور اس کا نقشہ کچھ اس طرح بنتا ہے ۔

گرامری تقسیم



ان بھانتوں کی تشریح یہ ہے ۔ ان کا احاطہ نہیں ہوتا دادا ۔ نانا

غیر منصرف

یہ اسم واحد بولے جاتے ہیں اور فاعلی یا غیر فاعلی کسی حالت میں نہیں بدلتے جیسے ہرنا ، نتھوا ، تاج محل ، احمد اور دوسرے

منصرف

یہ اسم واحد اور جمع دونوں طرح بولے جاتے ہیں ۔ ان کی جمع غیر فاعلی آخر میں "اوں" بڑھا کر بنتی ہے جیسے بیل ، لڑکی اور لڑکا سے بیلوں ، لڑکیوں اور لڑکوں ۔ ان کا امالہ ہوتا ہے ۔

مؤنث

یہ اسم مادہ کے لیے بولے جاتے ہیں اور جمع فاعلی و غیر فاعلی دونوں میں روپ بدلتے ہیں جیسے لڑکی ، عورت اور گائے سے لڑکیاں ، عورتیں اور گائیں ۔ ان کی دو بھانتیں ہوتی ہیں ۔

(الف) قوی

اس اسم مؤنث کے آخر میں "ای" کی آواز نکلتی ہے اور اس کی جمع "آں" اور "ایں" دونوں پچھ لگووں سے بنتی ہے جیسے لڑکی سے لڑکیاں اور لڑکئیں ، گھوڑی سے گھوڑیاں اور گھوڑیئیں ۔

(ب) ضعیف

اس اسم مؤنث کے آخر میں "ای" کو چھوڑ کر اور کوئی آواز ہوتی ہے ۔ اس کی جمع "ایں" کے پچھ لگونے سے بنتی ہے ۔ جیسے میز سے میزیں ، عورت سے عورتیں ، بیسوا سے بیسوائیں ، بیوہ سے بیوائیں ، ماں سے مائیں ۔

۲ ۔ مذکر

یہ اسم نر کے لیے بولا جاتا ہے ۔ اس کی بھی دو بھانتیں ہوتی ہیں۔

(الف) قوی

اس اسم مذکر کے آخر میں "آ" کی آواز نکلتی ہے اس کے واحد فاعلی اور جمع فاعلی روپ الگ الگ ہوتے ہیں ۔ یعنی واحد سے جمع بناتے وقت آخری آواز "آ" کو "اے" سے بدل دیتے ہیں جیسے لڑکا سے لڑکے، گھوڑا سے گھوڑے مسئلہ سے مسئلے ، مقدمہ سے مقدمے ۔

(ب) ضعیف

اس اسم مذکر کا واحد اور جمع فاعلی روپ ایک ہی ہوتا ہے جیسے ایک مرد آیا ، دس مرد آئے ، ایک بیل بھوکا ہے ، دس بیل بھوکے ہیں پھر اس کی بھی دو بھانتیں ہوتی ہیں ۔ اک عددی اور دو عددی، اک عدد اسم مذکر کا فاعلی روپ تو واحد ہوتا ہے پر وہ جمع میں بولا جاتا ہے ۔ جیسے معنی دام بمعنی قیمت (اس بول کے معنی لغت میں دیکھو آج کل ہر چیز کے دام بڑھ گئے ہیں) دو عددی اسم مذکر واحد اور جمع دونوں طرح بولا جاتا ہے جیسے یہ ہل اچھا ہے یہ ہل اچھے ہیں ۔ اس کا ہاتھ لمبا ہے ۔ اس کے ہاتھ لمبے ہیں ۔

(مطبوعہ اوراق ، لاہور)

اردو زبان کا عامل

عامل اردو زبان کا وہ لفظ ہے جو اجزائے کلمہ کا ربط باہم ظاہر کرتا ہے جیسے میں ، سے ، تک ، پر ، کر ، نے وغیرہ ۔ اسما اور ان کی کیفیات کے بعد یہ تسمیے کے تیسرے درجے میں آتا ہے اور اسے واضعین زبان نے مکان و زمان کے پس منظر میں ڈھالا ہے ۔ اس کی چند خصوصیات یہ ہیں :

۱ ۔ اس کا مقام اسم کے بعد آتا ہے جیسے زمین پر ، صندوق میں ، بازار تک وغیرہ ۔ انگریزی میں اس کا ہمسر اسم سے پہلے آتا ہے اس لیے پری پوزیشن کہلاتا ہے جب کہ اردو کے عامل کو انگریزی میں پوسٹ پوزیشن کہتے ہیں ۔

۲ ۔ یہ اسم کو غیر فاعلی حالت میں لے آتا ہے۔ یعنی یہ جس اسم کے بعد آ جاتا ہے وہ فاعل نہیں رہتا جیسے احمد کو کتابیں نہیں ملیں ۔ محمود نے روٹی کھائی ۔ گدھے سے گھاس نہیں چری گئی ۔ ان جملوں میں کتاب ، روٹی اور گھاس کے اسما فاعل ہیں کیونکہ ان کے افعال ملیں ، کھائی اور چری گئی جنس اور عدد میں اپنے اپنے فاعل سے مطابقت رکھتے ہیں اور احمد ، محمود اور گدھے کے اسما ان سے بالکل بے تعلق ہو چکے ہیں ۔

۳ ۔ یہ اسم کے آخری الف یا ہائے مختفی کو "اے" سے بدل دیتا ہے جیسے لڑکے کو بلاؤ ، گھوڑے نے سوار کو گرا دیا ۔ مدرسے میں گھنٹی بج گئی ۔ ان جملوں کے اسما جو اصلاً لڑکا ، گھوڑا اور مدرسہ تھے اپنے بعد میں آنے والے عوامل کو ، نے اور میں کے باعث نہ صرف غیر فاعل ہو گئے ۔ بلکہ لڑکے ، گھوڑے اور مدرسے کی شکل میں بھی بدل گئے ۔ اس عمل کو

امالہ کہتے ہیں - چونکہ اردو میں واحد مذکر غیر فاعلی کا روپ وہی ہے جو جمع مذکر فاعلی کا ہوتا ہے جیسے لڑکے سے کہو اور لڑکے آئے اس لیے جن اسما کی جمع مذکر فاعلی نہیں بولی جاتی ان کی واحد مذکر غیر فاعلی بھی نہیں بنتی ، یعنی ان کا امالہ نہیں ہوتا - نیچے کچھ ایسے ہی اسما درج کیے جاتے ہیں جن پر نہ امالے کا اطلاق ہوتا ہے نہ ان کی جمع ہی بولی جاتی ہے -

دادا ، نانا ، چچا ، تایا ، پھوپھا ، ابا ، بھیا ، دولھا ، داتا ، دیوتا ، راجا ، کلوا ، نتھوا ، اچھا ، رکھا ، لکھا ، لالا، (لالہ)، امریکا ، افریقا وغیرہ -

یہاں یہ کہنا غلط ہے کہ رشتے یا مقامات کے اسما ہونے کے باعث ان کا استثنا ہوا ہے کیونکہ ان جیسے اور بہت سے دوسرے اسما کے امالے کا چلن ملتا ہے جیسے بھتیجا ، بھانجا ، نواسا ، بیٹا ، پوتا ، سالا ، منا ، ننھا ، بھولا ، اٹاوہ ، ایٹہ ، ٹونڈلا ، کلکتہ ، سرگودھا ، گوجرانوالہ ، بھیرہ وغیرہ -

جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے ان الفاظ (عوامل) کی تہ میں مکان و زمان کے تصورات کارفرما ہیں - چنانچہ "سے" (سر) ابتداء آغاز کے لیے "تک" (پنجابی توڑ) اخیر اور انجام کے لیے "ہر" (ہار) باہر یا بعد کے لیے ، "میں" (من) اندر کے لیے اور "کو" (پنجابی کول ، ہریانی کن یا کنے) طرف یا سمت کے لیے استعمال ہوتا ہے - البتہ "کا" صرف رشتہ بتاتا ہے اور یہ رشتہ کسی قسم کا بھی ہو سکتا ہے اور "نے" ذریعے یا آلے کے لیے بولا جاتا ہے -

ذیل میں ان (عوامل) کے وہ مختلف معانی پیش کیے جاتے ہیں جن میں علی العموم بولے جاتے ہیں -

عام طور پر اردو کے قواعد نویس کہتے ہیں کہ یہ فاعل کی علامت ہے اور فعل ماضی متعدی کے ساتھ آتا ہے لیکن یہ دونوں باتیں غلط ہیں

کیونکہ

(الف) پاک بھارت کی زبانوں کا ایک ہمہ گیر اصول یہ ہے کہ جملے کا فعل عدد و جنس کے معاملے میں اپنے فاعل کا اتباع کرتا ہے یعنی فاعل اگر واحد ہے تو فعل بھی واحد ہوگا اور اگر فاعل مؤنث ہے تو فعل بھی مؤنث ہوگا۔ مثلاً لڑکا آیا، لڑکی آئی، لڑکے آئے، لڑکیاں آئیں۔ ان جملوں کے افعال (آیا)، آئی، آئے، آئیں، بالترتیب اپنے اپنے فاعل (لڑکا، لڑکی، لڑکے، لڑکیاں) سے عدد و جنس میں مطابقت رکھتے ہیں۔

اب نیچے لکھے ہوئے چند دوسرے جملوں پر غور کیجیے۔

احمد نے روٹی کھائی، عورت نے ایک لڈو کھایا، لڑکوں نے چھ پوریاں کھائیں۔ لڑکیوں نے دس پیڑے کھائے۔ ان جملوں کے افعال کھائی، کھایا، کھائیں اور کھائے اپنے عدد اور جنس میں بالترتیب روٹی، لڈو، پوریاں اور پیڑے سے مطابقت رکھتے ہیں اور قواعد نویسوں کے عام خیال کے خلاف احمد، عورت، لڑکوں اور لڑکیوں سے کوئی تعلق نہیں رکھتے۔ اس سے یہ بخوبی ثابت ہو جاتا ہے کہ "نے" فاعل علامت نہیں ہے۔ بلکہ غیر-فاعلی حالت کی دلیل ہے جو حالت آلی کہلاتی ہے۔ ان جملوں کے فاعل روٹی، لڈو، پوریاں اور پیڑے ہیں۔

(ب) "نے" کا استعمال صرف ماضی متعدی سے مخصوص کر دینا بھی غلط ہے اس لیے کہ "نے" ان افعال کے ساتھ بھی بولا جاتا ہے جنھیں اردو کے قواعد نویس لازم کہتے ہیں۔ مثلاً احمد نے تھوکا، محمود نے چھینکا، بیمار نے کھانسا، ان جملوں میں تھوکنا، چھینکنا اور کھانسنا قواعد نویسوں کے خیال سے افعال لازم ہیں لیکن ان کے ساتھ "نے" کا استعمال ہوتا ہے دوسری طرف بعض متعدی افعال کے ماضی مطلق کے ساتھ "نے" نہیں آتا جیسے وہ ایک کتاب لایا، سیکھے ہیں سہ رخوں کے لیے ہم مصوری، آج مولانا مجلس خوب پڑھے۔

ان جملوں میں لایا ، سیکھے ہیں اور پڑھے افعال ماضی متعدی ہیں پھر بھی ان کے ساتھ " نے " نہیں بولا جاتا ۔

پھر لازم اور متعدی میں اردو افعال کی تقسیم ہی غیر منطقی اور غیر فطری ہے ۔ مثال کے لیے ان چند جملوں پر دھیان دیجیے ۔

احمد نے چال چلی : محمود نے شطرنج کھیلی ، نرتکی نے خوب کتھک ناچا، کھلاڑی نے پے درپے تین دوڑیں، بیمار نے خون تھوکا، ان جملوں میں چلنا ، کھیلنا ، ناچنا ، دوڑنا اور تھوکنا اردو کے قواعد نویسوں کے خیال میں افعال لازم ہیں ۔ اب اگر ان کے نزدیک احمد ، محمود ، نرتکی ، کھلاڑی اور بیمار ان جملوں کے فاعل ہیں تو یہ افعال ان (فاعلوں) کی جگہ چال ، شطرنج ، کتھک ، دوڑیں اور خون سے مطابقت کیوں رکھتے ہیں ؟ ان آخر الذکر اسما کو نہ وہ مفعول کہہ سکتے ہیں نہ خبر کیونکہ فعل لازم کے ساتھ نہ مفعول آ سکتا ہے نہ خبر ۔ لامحالہ انہیں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہی فاعل ہیں ۔

اب ان جملوں پر نظر ڈالیے :

(۱)	(۲)
احمد نے روٹی کھائی	احمد سے روٹی کھائی گئی/نہیں کھائی گئی[1] ۔
عورت نے ایک لڈو کھایا	عورت سے ایک لڈو کھایا گیا / نہیں کھایا گیا ۔
لڑکوں نے چھ پوریاں کھائیں	لڑکوں سے چھ پوریاں کھائی گئیں/ نہیں کھائی گئیں
لڑکیوں نے دس پیڑے کھائے	لڑکیوں سے دس پیڑے کھائے گئے/ نہیں کھائے گئے

۱۔ بول چال میں ان جملوں کی بیشتر یہی ، نکاری شکل آتی ہے ۔

اوپر کے دونوں گروہوں میں افعال وہی ہیں اور اردو کے قواعد نویسوں کے مطابق افعال متعدی ماضی ہیں پھر بھی یہ فرق ہے کہ پہلے گروہ کے جملوں میں " نے " آیا ہے اور دوسرے گروہ کے جملوں میں "سے" کا عامل بولا گیا ہے۔ اس کی وجہ اس کے سوا اورکچھ نہیں ہے کہ پہلے گروہ کے تمام افعال (کھائی ، کھایا ، کھائیں اور کھائے) طور معروف میں اور دوسرے گروہ کے افعال (کھائی گئی ، کھایا گیا، کھائی گئیں اور کھائے گئے) طور مجہول میں بولے گئے ہیں۔

اس تمام بحث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ:

(۱) " نے " نہ صرف ماضی متعدی کے ساتھ آتا ہے بلکہ ماضی لازم کے ساتھ بھی بولا جاتا ہے اس لیے اسے صرف ماضی متعدی سے مختص کر دینا غلط ہے۔

(۲) " نے " اور "سے" دونوں حالت آلی کے عامل ہیں۔ ان میں سے " نے " ماضی معروف کے ساتھ اور "سے" ماضی مجہول کے ساتھ آتا ہے۔

(۳) نے صرف اسی ماضی معروف کے ساتھ آ سکتا ہے۔ جس کے مجہولی طور کے ساتھ "سے" بھی آتا ہے۔

سے

(۱) حالت آلی کی علامت کے طور پر ، ذریعے کے معنوں میں جیسے مجھ سے کھانا کھایا نہیں گیا۔ تم سے اتنا سا کام بھی نہیں ہو سکا۔ پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا۔ آدمی کے چہرے سے اس کے دل کا حال کھل جاتا ہے۔کتابیں ڈاک سے بھیج دو عقل سے کام لو۔ انھوں نے مجھ سے دو سو روپے لے لیے۔

(۲) معیت یا ساتھ کے معنوں میں جیسے شوق سے دیکھو ، توجہ سے سنو ، غور سے پڑھو ، بارے آرام سے ہیں ، اہل جفا میرے بعد محنت سے کام کرو ، وہ محبت سے ملا ، احمد آج روزے سے ہے ، قاعدے سے بات کرو ، تہذیب سے بولو ، ہر

ایک کو اس کے صحیح نام سے پکارو ، تم اوپری دل سے بات کرتے ہو ، وہ عورت پیٹ سے ہے ۔ خدا برے سے پالا نہ ڈالے، میں قسم سے کہتا ہوں ، تمھیں نام سے کیا غرض ۔

(۳) کو یا تئیں کے معنوں میں ، کہنا ، پوچھنا ، ملنا، فریاد ، سوال، فرمائش یا خطاب کرنا کے ساتھ جیسے محمود نے یہ بات اپنے بیٹے سے کہی ، شاگرد نے استاد سے پوچھا ، بیوی نے شوہر سے فرمائش کی ، بندوں نے خدا سے فریاد کی ، غیروں سے بھی خوش ہو کر ملو ، قوم نے موسیٰ سے سوال کیا ۔

(۴) مقابلے کے معنوں میں جیسے احمد کا قلم محمود کے قلم سے اچھا ہے ۔ دوزخ بھی میرے واسطے جنت سے کم نہیں ۔ اس دنیا میں ایک سے ایک پرہیز گار موجود ہے ، اچھے سے آم بھیجو ، بہت سے آدمی چلے گئے ، تھوڑے سے ورق باقی ہیں ، تم کون سے قلم کی بات کرتے ہو ۔ غالب خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں ۔

(۵) طور و طریقہ کے لیے جیسے جھٹ سے ، دھڑام سے ، آہستہ سے ، پوری رفتار سے ، زور سے حساب سے ، آم گنتی سے بکتے ہیں یا وزن سے ، سب کو ایک نظر سے دیکھو ۔

(۶) کو چھوڑ کر ، کے پیچھے یا کے بعد کے معنوں میں جیسے میں لاہور سے آ رہا ہوں ، وہ کہیں سے کہاں پہنچ گیا ۔ وہ کیا سے کیا ہو گیا ۔ میں شام سے آپ کا انتظار کر رہا ہوں ، جب ہوائی سے دو روز گزر جاتے ہیں ، تب کھیتوں میں پانی دیا جاتا ہے ، ہم صدر سے دو میل پیدل چل کر شہر پہنچے ، لڑکا گھر سے نکل گیا ۔ یہ بات ذہن سے اتر گئی ، وہ نگاہوں سے گر گیا ، آخر کس کس سے روٹھو گے ۔

(۷) وجہ اور سبب کے معنوں میں جیسے وبا سے پچاس آدمی مر گئے۔ وہ طبی معائنے میں آنکھوں سے رہ گیا ۔ وہ آج کل پیسے سے

پریشان ہے ، احمد اپنے کیے سے نادم ہے ، بیٹا باپ کے خوف سے پڑھتا ہے ، نوکر صرف کہے سے کام کرتا ہے ۔

(۸) غایت اور مقصد کے معنوں میں جیسے وہ ایک کام سے لاہور گیا ہے ، آدمی اپنی غرض سے خوشامد کرتا ہے ۔

(۹) کے معاملے میں یا کے باب میں جیسے بیمار چلنے پھرنے سے معذور ہے ، وہ پیسے سے خالی ہے ، انھیں کام سے روک دیا گیا ، وہ گھر جانے سے رہ گئے ۔

(۱۰) واحد مذکر تشبیہی "سا" کی جمع یا امالے کے طور پر جیسے مجھ سے حقیر انسان پر آپ کا یہ احسان ہے ، پھول سے چہرے ۔

پر

(۱) باہر یا اوپر کے معنوں میں جیسے کتاب میز پر رکھی ہے فقیر دروازے پر کھڑا ہے ۔

(۲) پیچھے یا بعد کے معنوں میں جیسے ، اس نے کھانے پر کھا لیا ، مونے پر سو دُرے ، دیکھیں اب مر گئے پر کون اٹھاتا ہے مجھے ، دو پر چھ منٹ آئے ہیں ، دو پر ایک صفر بڑھانے سے بیس ہو جاتے ہیں ، ہمارے ہی دوست ہمیں چوٹ پر چوٹ دیتے رہے ۔ تم جو قرض پر قرض لیے چلے جاتے ہو تو چکاؤ گے کیسے ۔

(۳) لیکن یا مگر کے معنوں میں ، تم لاکھ کہو پر میرا دل نہیں مانتا ۔

(۴) مقابلے کے معنوں میں جیسے مجھے ان کی بات پر بات یاد آ گئی ۔ انھوں نے اپنے حریف کے نہلے پر دہلا مارا ۔

(۵) کے ذمے یا حساب میں جیسے ایک ایک لڑکے پر پانچ پانچ سو روپے خرچ ہوتے ہیں ، کھانے پر سب سے زیادہ روپیہ اٹھتا ہے ، احمد پر بہت زیادہ قرض ہے ، تم پر فرض ہے کہ والدین کا حکم

مانو ، تمہارا مجھ پر کچھ نہیں آتا ، یہ بات ہم تم پر چھوڑتے ہیں ، قرض خواہ نے مقروض پر دعویٰ کر دیا ۔

(۶) کے مطابق یا برابر کے معنوں میں جیسے وہ اپنے باپ پر پڑا ہے، ہر چیز اپنی اصل پر جاتی ہے ، باپ پر پوت پراہت گھوڑا، تم وقت پر آئے ہو ۔

(۷) لیے یا کے لیے کے معنوں میں (غایتی) جیسے وہ جانے پر تلا بیٹھا ہے ، وہ آج سے ملازمت پر جانے لگا ، ہر شخص نام پر مرتا ہے ۔

(۸) کی جانب یا کی طرف کے معنوں میں جیسے سودا گر رفتہ رفتہ بے ایمانی پر آ گیا ، تمہاری نظر کس پر پڑی ہے کہ بے چین ہو گئے ہو ، آج احمد کے گھر پر مجمع ہے ۔
تمہارا کس پر دل آ گیا ، اس بات پر کسی کا خیال نہیں گیا ، ہمارا ایمان خدا پر ہے ، ہمیشہ اپنے ہی بازوؤں کی قوت پر بھروسا کرو ، کل ہماری دکان پر آ جانا ، میں اس کے مکان پر گیا تھا لیکن وہ نہیں ملا ۔

(۹) کے حساب سے یعنی طور و طریقہ کے معنوں میں جیسے وہ چار سو روپے ماہانہ پر ملازم ہے ، نو کو تین پر تقسیم کرو تو تین حاصل ہوں گے ۔ ٹھیکے پر مکان بنوانے میں زیادہ روپیہ لگتا ہے ، خالد مزدوری پر کام کرتا ہے ۔

(۱۰) ذریعہ کے معنوں میں جیسے تار پر خبر بھیجو تا کہ جلدی پہنچ جائے ، آم ڈاک پر دور دور جاتا ہے ۔ وہ میرے یہاں کار پر آیا تھا ۔

(۱۱) وجہ ، سبب یا باعث کے معنوں میں جیسے تم کس بات پر خفا ہو ، کس پر اتنا بھولے ہو ، وہ اپنے کیے پر تا دم ہے ، اس بات پر ان کی خوب تعریف ہوئی ۔

کو

(۱) کی طرف کے معنوں میں جیسے یہ سڑک باغ کو جاتی ہے ، آج کل جس کو دیکھو وہی افلاطون بنا ہوا ہے ۔

(۲) وقت کے معنوں میں جیسے رات کو جلدی سو جانا چاہیے ۔ کل کلاں کو مجھ سے نہ لڑ بیٹھنا ۔

(۳) کی خاطر ، کے لیے ، کی غرض سے یعنی غائتی معنوں میں جیسے پینے کو پانی لاؤ ، مجھ کو پنکھا جھلو ، آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک ، بات کو سوت نہیں ہے ۔

(۴) کے تئیں کے معنوں میں جیسے تم کو کیا ہو گیا ہے کہ ہر ایک سے لڑ بیٹھتے ہو، احمد کو بخار آ گیا ، بلی کو مت مارو۔

(۵) کے قریب کے معنوں میں (والا) وہ لاہور جانے کو ہے ، میں تم سے کہنے کو ہوں کہ کچھ دن خاموش رہو ۔

(۶) کے بارے میں یا کی بابت کے معنوں میں جیسے وہ کل تم کو پوچھ رہا تھا ، بازار کے بھاؤ کو کیا پوچھتے ہو بس آگ لگی ہوئی ہے ۔

(۷) کے عوض کے معنوں میں جیسے آج کل اٹلی کا کمبل کتنے کو آتا ہے ، آہنی گھنٹا پچیس روپے کو ملتا ہے ۔

(۸) سے پہلے یا تک یا میں کے معنوں میں ، رمضان کو کتنے دن باقی ہیں ۔

(۹) کے بعد کے معنوں میں ، روزوں کو کتنے دن ہو چکے ۔

تک یا تلک

(۱) اخیر یا حد یا انتہا (راجستھانی تائیں ، پنجابی توڑ) کے معنوں میں ، یہ بات تمھیں تک رہے ، ہم کراچی تک آ گئے ، شام تک آ جانا ، مجھ تک کب ان کی بزم میں آتا تھا دور جام ، ہمیں گھر تک پہنچا دو ، میں ذرا بازار تک جا رہا ہوں ۔

(۲) بھی کے معنوں میں جیسے مجھے اس کا نام تک نہیں آتا ، شوہر بیوی کو پوچھتا تک نہیں لیکن وہ اسی کا کلمہ پڑھتی ہے -

(۳) سے پہلے ، ہم بھی ہیں ایک عنایت کی نظر ہونے تک ، اب کل تک میرا پیچھا نہیں چھوڑے گا ، آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک -

میں

(۱) کے بیچ ، اندر یا درمیان کے معنوں میں جیسے کپڑے صندوق میں رکھے ہیں - آٹے میں بازار سے مٹھائی لیتے آنا -

(۲) کے عوض کے معنوں میں جیسے ایک قلم کتنے میں آتا ہے ایک سلائی کا سرمہ تو مفت مل جاتا ہے - یہ میز مجھے سترہ روپے میں پڑی -

(۳) تک ، کو یا سے پہلے کے معنوں میں جیسے تمھارے جانے میں کتنے دن باقی ہیں ، یہ کام کتنے دن میں ہو جائے گا -

(۴) ذریعے کے معنوں میں راہ پر ان کو لگا لائے تو ہیں، باتوں میں آنکھوں آنکھوں میں اشارے ہو گئے -

(۵) معیت یعنی کے ساتھ کے معنوں میں جیسے اسی سوچ میں آنکھ لگ گئی ، اس کے ہاتھ میں شفا ہے ، احمد آج غصے میں ہے - اے داغ تم تو بیٹھ گئے ایک آہ میں ، میرا بیٹا میرے کہے میں ہے ، تم مزے میں ہو ، حلال کی کمائی میں برکت ہوتی ہے -

(۶) کے حساب سے کے معنوں میں جیسے یہ تختہ چوڑائی میں پانچ فٹ ہے - یہ درخت طول میں گز ہے ، آٹا تول میں چار سیر ہے ، وہ مجھ سے قد میں بڑھ گیا ، احمد محمود سے باتوں میں پیچھے رہ گیا -

کا

(۱) کسی طبقے یا گروہ کی رکنیت کے معنوں میں جیسے کل نائی کا آیا تھا ، بہشتی کا بڑھ بڑھ کے باتیں بنا رہا تھا -

(۲) اہلیت ، لیاقت ، صلاحیت یا صفت ظاہر کرنے کے لیے جیسے کام کا آدمی ، یہ ٹھاٹھ بس دیکھنے کا ہے ، پینے کا پانی ، میں وہاں نہیں جانے کا ۔

(۳) کے برابر کے معنوں میں جیسے چار روپے کا ، پانچ ہاتھ کا ۔

(۴) ملکیت کے لیے ، احمد کا گھوڑا ، طالب علم کا بستہ ، دھوبی کا کتا ۔

(۵) بناوٹ کے لیے ، اینٹ کا مکان ، لیزے کا قلم ، سونے کا نوالا ، مٹی کی رکابی ، لکڑی کا کھمبا ۔

(۶) نسبت کے لیے ، لاہور کا پہلوان ، گھر کا بھیدی ، اسکول کا لڑکا ۔

(۷) کے حساب سے کے معنوں میں جیسے قد کا لمبا، مزاج کا کڑوا ، دل کا نرم ، ہاتھ کا سچا ، کانوں کا کچا ۔

کی

کا کی تانیث

کے

(۱) کا کی جمع جیسے لاہور کے پہلوان ، احمد کے گھوڑے ، اسکول کے لڑکے ۔

(۲) کا کی مغیرہ صورت جیسے گھر کے بلاؤ نے چوہا پکڑا ۔

(۳) نحوی استعمال میں غرض و غایت کے لیے جیسے لڑکے نے بلی کے چھڑی ماری ، آج احمد کے دعوت ہے ، میں نے اس کے چٹکی لی ۔ گدھے نے خالد کے لات ماری ، استاد نے شاگرد کے تھپڑ مارا ، سنار کے آج صبح بیٹی ہوئی ہے ، بندر کے تو شروع ہی سے دم نہیں تھی ۔

غرض یہ تمام عوامل جو اسما اور ان کی کیفیات کا باہمی تعلق ظاہر کرنے کے لیے وضع ہوئے ہیں ۔ زبان کے مزاج کی صحیح صحیح عکاسی کرتے ہیں ۔ اس کے نظام میں منصب جلیلہ پر فائز ہیں اور اسما و افعال

ے ہمسری کا دعویٰ رکھتے ہیں بلکہ اس لحاظ سے ان کی اہمیت کچھ زیادہ ہی ہو جاتی ہے کہ ہم غیر زبانوں سے اسما مستعار لے لیتے ہیں اور ان کے اسما و افعال سے خود اپنے یہاں بھی الفاظ بنا لیتے ہیں لیکن دوسری زبانوں کے عوامل یوں مستعار نہیں لیتے اور نہ ان سے الفاظ ہی وضع کرتے ہیں - اردو کے عوامل میں ، نے ، سے اور کے صرفی اور نحوی دونوں طرح سے مستعمل ہیں - باقی تمام عوامل کا استعمال صرفی ہوتا ہے -

(مطبوعہ : اوراق ، لاہور ، اگست ۱۹۷۶ء)

اسم فعل "کرنا"

جہاں تک میں سمجھتا ہوں یہ اردو کا سب سے زیادہ استعمال ہونے والا فعل ہے جس نے مرکب افعال بنا بنا کر ان کی تعداد میں بہت زیادہ اضافہ کیا ہے ۔ اسے اردو کے پرانے قواعد نویس مصدر کہتے آئے ہیں ۔ حالانکہ یہ مصدر نہیں ہے ۔ کیونکہ عربی میں مصدر اس کو کہتے ہیں جس سے دوسرے الفاظ بنتے ہیں اور اس سے فعل کی کوئی شکل نہیں بنتی بلکہ یہ خود بھی دوسرے فعلی روپوں کی طرح مادہ "کر" سے مشتق ہے اور اس پر "نا" کے اضافے سے بنا ہے ۔ چنانچہ "کر" مادہ بھی ہے، مصدر بھی ہے اور اسم بھی ہے اور "کرنا" فعل کا نام ہے جس کے معنی عمل میں لانا اور بنانا ڈھالنا وغیرہ ہیں ۔ مثلاً "ایجاد کرنا" کے معنی ہیں ایجاد کو عمل میں لانا یا "آڑ کرنا" کے معنی ہیں کسی شے کو آڑ بنانا ۔ اردو زبان میں اضافی "کرنا" کے استعمال کی تین صورتیں ہیں :

(۱) کسی دوسرے فعلی مادے پر اضافہ کرکے فعل مرکب بنا لیتے ہیں جیسے جانچ سے جانچ کرنا ۔ حالانکہ اردو ہی میں اس مادے کا اسم فعل "جانچنا" بھی اپنی الگ اور مستقل حیثیت رکھتا ہے ، انہیں معنوں میں استعمال بھی ہوتا ہے اور "جانچ کرنا" اس کا مترادف بھی ہے ۔

ذیل میں اس قسم کی چند اور مثالیں پیش کی جاتی ہیں :

اتار کرنا	اتارنا	چاہ کرنا	چاہنا
اجاڑ کرنا	اجاڑنا	چیت کرنا	چیتنا
اڑ کرنا	اڑنا	چھانٹ کرنا	چھانٹنا
بانٹ کرنا	بانٹنا	چھل کرنا	چھلنا

بگاڑ کرنا	بگاڑنا	چھیڑ کرنا	چھیڑنا
بیاہ کرنا	بیاہنا	روک کرنا	روکنا
پوچھ کرنا	پوچھنا	سار کرنا	سارنا
کھونٹ کرنا	کھونٹنا	کھیل کرنا	کھیلنا
لوٹ کرنا	لوٹنا	مان کرنا	ماننا
مانگ کرنا	مانگنا	ناپ کرنا	ناپنا
ناچ کرنا	ناچنا		
پہچان کرنا	پہچاننا	سدھار کرنا	سدھارنا
نباہ کرنا	نباہنا	نبیڑ کرنا	نبیڑنا
پھانٹ کرنا	پھانٹنا	سوچ کرنا	سوچنا
توڑ کرنا	توڑنا	کاٹ کرنا	کاٹنا
جانچ کرنا	جانچنا	کرید کرنا	کریدنا
نکھار کرنا	نکھارنا	وار کرنا	وارنا
بُھڑک کرنا	بُھڑکنا		

(۲) اسے کسی فعلی مادے سے بنے ہوئے اسم مجرد (حاصل مصدر) پر اضافہ کرکے فعل مرکب بنا لیتے ہیں جو اسی مادے سے بنے ہوئے اسم فعل کے ہم معنی ہوتا ہے جیسے مادہ "لکھ" سے ایک طرف تو اسم مجرد "لکھائی" بنتا ہے جس پر "کرنا" بڑھا کر فعل مرکب "لکھائی کرنا" بنایا گیا ہے اور دوسری طرف اس پر "نا" کے اضافے سے اسم فعل "لکھنا" بن گیا ہے جو اسی کے ہم معنی فعل ہے یعنی لکھائی کرنا = لکھنا۔

نیچے اس قسم کی چند مثالیں دی جا رہی ہیں :

(الف)	آگھائی کرنا	آگھانا	بھنائی کرنا	بھوننا
	بٹائی کرنا	بانٹنا	پٹائی کرنا	پیٹنا

	بوائی کرنا	بونا	پڑھائی کرنا	پڑھنا
	بھرائی کرنا	بھرنا	تلائی کرنا	تولنا
	بھڑائی کرنا	بھڑنا	ٹکائی کرنا	ٹانکنا
	چھٹائی کرنا	چھانٹنا	سلائی کرنا	سونا
	رگڑائی کرنا	رگڑنا	کٹائی کرنا	کاٹنا
	رٹائی کرنا	رٹنا	کٹائی کرنا	کوٹنا
	رنگائی کرنا	رنگنا	کاڑھائی کرنا	کاڑھنا
	سلائی کرنا	سینا	کھدائی کرنا	کھودنا
	ٹھکائی کرنا	ٹھونکنا	چرائی کرنا	چیرنا
	جتائی کرنا	جوتنا	چڑھائی کرنا	چڑھنا
	جڑائی کرنا	جوڑنا	چلائی کرنا	چلنا
	چنائی کرنا	چیتنا	چُنائی کرنا	چننا
	چخائی کرنا	چیخنا	چھپائی کرنا	چھاپنا
	کھنچائی کرنا	کھینچنا	گھسائی کرنا	گھسنا
	گٹھائی کرنا	گانٹھنا	لدائی کرنا	لادنا
	گڑائی کرنا	گوڑنا	لڑائی کرنا	لڑنا
	گُھٹائی کرنا	گھونٹنا	منجھائی کرنا	مانجھنا
	گھڑائی کرنا	گھڑنا		
(ب)	سجاوٹ کرنا	سجانا	سلاوٹ کرنا	سلانا
	بناوٹ کرنا	بننا ، بنانا	رکاوٹ کرنا	روکنا
	دکھاوٹ کرنا	دکھانا	گلاوٹ کرنا	گلانا
(ج)	بھڑنت کرنا	بھڑنا	جڑنت کرنا	جڑنا
	پچھنت کرنا	پوچھنا	چلنت کرنا	چلنا

	لڑنت کرنا	گھڑنت کرنا	لڑنت کرنا	گھڑنا
(د)	بچاؤ کرنا	بچنا	چکاؤ کرنا	چکانا
	بناؤ کرنا	بننا	چناؤ کرنا	چننا
	برتاؤ کرنا	برتنا	چھپاؤ کرنا	چھپنا
	بھراؤ کرنا	بھرنا	چھٹاؤ کرنا	چھانٹنا
	کٹاؤ کرنا	کاٹنا	کھنچاؤ کرنا	کھنچنا
	گٹھاؤ کرنا	گانٹھنا	گلاؤ کرنا	گلانا
	جماؤ کرنا	جمنا	چھڑکاؤ کرنا	چھڑکنا
	گھراؤ کرنا	گھیرنا		

(۳) اس کے استعمال کی تیسری صورت یہ ہے کہ اسے کسی بھی اسمی مادے سے بنے ہوئے کسی مادی یا مجرد اسم یا صفت بڑھا کر فعل مرکب بنا لیتے ہیں جیسے بات کرنا ، کام کرنا ، چال کرنا، ہاتھ کرنا، منہ کرنا، رات کرنا ، بڑا کرنا ، سیدھا کرنا ، کالا کرنا ، گاڑھا کرنا ، کھیت کرنا وغیرہ - ان میں سے بعض کو اسی میں تبدیل کر کے ان سے بھی اسم فعل بنا لیتے ہیں جیسے بات کرنا سے بتانا اور بتیانا ، کام کرنا سے کمانا ، لاج کرنا سے لجانا ، لالچ کرنا سے للچانا ، ہت کرنا سے ہتیانا ، آدھا کرنا سے ادھیانا ، لوبھ کرنا سے لبھیانا ، چوری کرنا سے چرانا وغیرہ -

اسم فعل "کرنا" کا یہ استعمال دخیل الفاظ کے ساتھ بھی ہوتا ہے جس سے اردو میں بہ یک وقت مفرد اور مرکب دونوں قسم کے افعال بنتے ہیں اور یوں افعال کی اس تعداد میں بہت بڑا اضافہ ہو جاتا ہے جو پہلے ہی کثیر ہے - اردو بولنے والوں کو اس اسم فعل کے استعمال میں جو تجربہ حاصل ہو چکا تھا اس کی روشنی میں انھوں نے اسے دخیل الفاظ کے ساتھ بھی انھیں تین طریقوں سے استعمال کیا ہے -

نیچے تینوں قسم کی مثالیں دی جاتی ہیں :

(۱) دخیل فعلی مادے پر "کرنا" کے اضافے سے فعل مرکب بنانا اور اس کے ساتھ ساتھ اسی مادے پر "نا" کے اضافے سے ہم معنی فعل مفرد تیار کرنا جیسے :

در گزر کرنا ، در گزرنا ، تلاش کرنا–تلاشنا ، خرید کرنا ، خریدنا ، گزر کرنا ، گزرنا ، گردان کرنا، گردانا وغیرہ ۔

(۲) دخیل فعلی مادے سے بنے ہوئے اسم مجرد پر "کرنا" کے اضافے سے فعل مرکب بنانا اور مادے پر "نا" کے اضافے سے اسی کے ہم معنی فعل مفرد تیار کرنا جیسے :

آزمائش کرنا ، آزمانا ، فرمائش کرنا ، فرمانا ، نوازش کرنا ، نوازنا ، بخشش کرنا ، بخشنا ، گزارش کرنا ، گزارنا وغیرہ ۔

(۳) دخیل اسما و صفات پر "کرنا" کے اضافے سے افعال مرکب بنانا۔ اس کی دو قسمیں ہیں :

(الف) ایک وہ جس کا اردو قاعدے سے متبادل مفرد فعل بھی بنا لیا گیا ہے جیسے :

نرم کرنا سے نرمانا ، شرم کرنا سے شرمانا ، بحث کرنا سے بحثنا ، قبول کرنا سے قبولنا ، دفن کرنا سے دفنانا ، رنگ کرنا سے رنگنا ، تجویز کرنا سے تجویزنا ، سستی کرنا سے سستانا ، قبضہ کرنا سے قبضانا وغیرہ ۔

(ب) وہ افعال مرکب جن کا اردو متبادل ابھی تک نہیں بنایا گیا ہے اور انھیں کی تعداد بہت زیادہ ہے ۔ ان میں سے کچھ انگریزی اسما پر "کرنا" کے اضافے سے بنے ہیں جیسے:
مس کرنا (یاد کرنا) ، پالش کرنا (چمکانا) ، بور کرنا (بیزار کرنا) ، ہولڈ کرنا (رکنا ، ٹھہرنا ، پکڑنا) ، کِک کرنا (ٹھکرانا) ۔ کیش کرنا (بھنانا ، تڑانا) ، ایکٹنگ کرنا (بننا) ، اریسٹ کرنا (پکڑنا ، روکنا) ، اٹیچ کرنا (لگانا ، باندھنا) ، بلوک کرنا (روکنا) ، کیچ کرنا (گھٹنا) ،

چیک کرنا (پڑتالنا ، جانچنا ، روکنا) ، پلیس کرنا (رکھنا)، کنوے کرنا (پہنچانا ، لے جانا) ، ایڈریس کرنا (بولنا ، خطاب کرنا) ، ایڈمائر کرنا (سراہنا ، قدر کرنا) ، اٹینڈ کرنا (پہنچنا ، سننا ، شرکت کرنا) ، ایسیس کرنا (آلکنا ، تشخیص کرنا) ، پوسٹ کرنا (ڈاک میں خط ڈالنا ، کھتیانا) وغیرہ ۔

ان کثیر تعداد عربی اور فارسی کے دخیل الفاظ کی مدد سے تیار ہوتی ہے جن کی چار قسمیں ہیں :

مصالحت کرنا	صلح کرنا	ارقام کرنا	مرقوم کرنا ، رقم کرنا
اعانت کرنا	معاونت کرنا	تصور کرنا	متصور کرنا
عذر کرنا	معذرت کرنا	اطلاع کرنا	مطلع کرنا
مدد کرنا	امداد کرنا	اظہار کرنا	مظاہرہ کرنا
ہجرت کرنا	مہاجرت کرنا	قطع کرنا	منقطع کرنا
ذکر کرنا	تذکرہ کرنا	تقابل کرنا	مقابلہ کرنا
حفاظت کرنا	محافظت کرنا	نقش کرنا	منقش کرنا
ترک کرنا	متروک کرنا	خلاف کرنا	ملخص کرنا
تلخیص کرنا			
منع کرنا	ممنوع کرنا	فتح کرنا	مفتوح کرنا
تقسیم کرنا	منقسم کرنا	حصر کرنا	انحصار کرنا
قید کرنا	مقید کرنا	مرکوز کرنا	مرتکز کرنا
تنبیہ کرنا	متنبہ کرنا	تسخیر کرنا	مسخر کرنا
رد کرنا	مسترد کرنا	درج کرنا	مندرج کرنا
بحث کرنا	مباحثہ کرنا		

(ii) عربی فارسی کے مترادف لیکن ایک ہی گرامری حیثیت رکھنے والے الفاظ کے ساتھ "کرنا" کے اضافے سے مثلاً :

تعین کرنا   تقرر کرنا   تطبیق کرنا   مطابقت کرنا

نا خوش ، ناراض ،   غرور، گھمنڈ، موقوف کرنا   حیران ، متحیر ،

خفا کرنا   ناز، فخر کرنا   منحصر کرنا   دنگ کرنا

(iii) ایک لفظ کے پہلے "کا" اور دوسرے لفظ کے پہلے "کو" استعمال کرکے "کرنا" کے اضافے سے جیسے :

کا	کو
احساس کرنا	محسوس کرنا
انکشاف کرنا	منکشف کرنا
التوا کرنا	ملتوی کرنا
الحاق کرنا	ملحق کرنا
انتخاب کرنا	منتخب کرنا
انحصار کرنا	منحصر کرنا
خاتمہ کرنا	ختم کرنا
اتلاف کرنا	تلف کرنا
مطالبہ کرنا	طلب کرنا
اجرا کرنا	جاری کرنا
اخراج کرنا	خارج کرنا

(iv) ایک لفظ کے پہلے "کی" اور دوسرے لفظ کے پہلے "کو" استعمال کرکے "کرنا" کے اضافے سے جیسے :

کی	کو
ممانعت کرنا	ممنوع کرنا

تباہی کرنا	تباہ کرنا
تبدیل کرنا	تبدیل کرنا
تحلیل کرنا	حل کرنا
تردید کرنا	رد کرنا
تکمیل کرنا	مکمل کرنا

ان افعال مرکب سے جہاں ایک طرف اردو کو یہ فائدہ پہنچا ہے کہ اس کے ذخیرے میں بہت بڑا اضافہ ہوگیا ہے وہاں اسے نقصان بھی پہنچا ہے کہ اردو کے اتنے ہی ہم معنی مفرد اسمائے فعل غیر مستعمل اور بے کار ہو گئے ہیں - نیچے ان کی ایک مختصر سی فہرست دی جا رہی ہے اور ان کے برابر اردو کے وہ ہم معنی مفرد افعال بھی درج کروائے گئے ہیں :

آرام کرنا ، سستانا	اخذ کرنا ، لینا
آراستہ کرنا ،	اخراج کرنا ، نکالنا
آرائش کرنا ، سجانا	ادا کرنا ، دینا ، چکانا ، بولنا ، کہنا
آزاد کرنا ، چھوڑنا	ارادہ کرنا ، چاہنا
آشکار کرنا ، کھولنا ، دکھانا	ارتکاب کرنا ، کرنا
آغاز کرنا ، چھیڑنا	ارسال کرنا ، بھیج نا
آگاہ کرنا ، جتانا ، بتانا	ارشاد کرنا ، فرمانا ، کہنا ، بولنا
آلودہ کرنا ، سانا - بھرنا	ارقام کرنا - لکھنا
آماس کرنا - سوچنا	ازالہ کرنا - ہٹانا مٹانا
آمادہ کرنا - ماننا - منوانا	ازبر کرنا - رٹنا
آمیز کرنا آمیزش کرنا } ملانا	استصواب کرنا - پوچھنا استعارہ کرنا - مانگنا
آویزاں کرنا - لٹکانا	استعمال کرنا - برتنا

ابتدا کرنا - چھیڑنا - چلانا

اتحاد کرنا }
اتفاق کرنا } ملنا

اتمام کرنا ، نمٹانا

اثر کرنا ، پگھلانا ، نرمانا

اجتناب کرنا ، بچنا

اجرا کرنا ، نکالنا

احاطہ کرنا ، گھیرنا

اعادہ کرنا ، دہرانا

اعتراض کرنا ، ٹوکنا ، دلکھنا

اعتراف کرنا ، ماننا

اعتراض ، کترانا

افسوس کرنا ، پچھتانا

افشاں کرنا ، کھولنا

افطار کرنا ، کھانا

اقبال کرنا ، ماننا

اقدام کرنا ، کرنا، بڑھنا

التجا کرنا ، کہنا

التفات کرنا ، جھکنا

الحاق کرنا ، ملانا

الفت کرنا ، چاہنا

استغفار کرنا - بخشوانا

استفادہ کرنا - برتنا
استوار کرنا - جمانا

استوار کرنا ، جمانا

استیصال کرنا ، مٹانا

استحصال کرنا ، لوٹنا

اسیر کرنا ، پکڑنا ، باندھنا

اشارہ کرنا ، بتانا ، دکھانا

باز پرس کرنا

بازگشت کرنا

باطل کرنا ، توڑنا

بالا کرنا ، چڑھانا

بخل کرنا ، بخشنا

برپا کرنا ، روپنا

برخاست کرنا ، اٹھانا

برداشت کرنا ، سہنا
سہارنا ، جھیلنا ، بھگتنا

برطرف کرنا ، ہٹانا

برگشتہ کرنا ، پلٹنا
پھیرنا ، بھڑکانا ، ورغلانا

بسم اللہ کرنا ، چھیڑنا ، چلانا

بطلان کرنا ، جھٹلانا

بلند کرنا ، اٹھانا ، اچھانا

امتیاز کرنا ، پہچاننا

امید کرنا ، چاہنا

انتخاب کرنا، چھانٹنا ، چننا

انتظام کرنا ، چلانا

انتقال کرنا ، مرنا

انحراف کرنا ، پھر جانا

انحصار کرنا ، ٹکنا

اندازہ کرنا ، آنکنا ، جانچنا، بھانپنا

احتراز کرنا ، بچنا

احترام کرنا ، ماننا

احتیاط کرنا ، بچنا

احساس کرنا ، سمجھنا

احیا کرنا ، جلانا

اختلاف کرنا ، جھگڑنا ، لڑنا

اختیار کرنا ، اپنانا

پوشیدہ کرنا ، چھپانا، ڈھانک

پے کرنا ، کاٹنا

پیچ کرنا ، الجھنا

پیدا کرنا ، جننا ، بنانا ، کمانا ، لانا

بند کرنا ، روکنا ، بھیڑنا

بندوبست کرنا ، سنبھالنا

بیان کرنا ، کہنا

پاک کرنا ، دھونا ، چکانا نمٹانا

پختہ کرنا ، پکانا ، پٹانا

پُر کرنا ، بھرنا

پردہ کرنا ، چھپانا

پرستش کرنا ، پوجنا

اشاعت کرنا ، پھیلانا

اصرار کرنا ، اڑنا ، جمنا ، جتانا

اصلاح کرنا ، سدھارنا

اطاعت کرنا ، ماننا

اطلاع کرنا ، بتانا

اطمینان کرنا ، سمجھنا

اظہار کرنا ، بتانا ، کھولنا ، دکھانا

تذکرہ کرنا ، کہنا ، بتانا

تر کرنا ، بھگونا

ترتیب کرنا ، سدھانا ، سکھانا ، پالنا

تردید کرنا ، کاٹنا

پیروی کرنا ، ماننا

پیش کرنا ، دینا ، بڑھانا

پیش بینی کرنا ، بھانپنا ، اٹکلانا

پیشاب کرنا ، مُوتنا

پیمائش کرنا ، ناپنا

پیوند کرنا ، جوڑنا ، ملانا، گانٹھنا

پیوست کرنا ، بٹھانا ، جمانا

تاراج کرنا ، لوٹنا ، اجاڑنا

تامل کرنا ، ہچکچانا ، سوچنا ، رکنا

تباہ کرنا / تباہی کرنا } مٹانا ، بگاڑنا

تبدیل کرنا / تبدیلی کرنا } بدلنا

تبسم کرنا ، مسکرانا

تبلیغ کرنا ، پھیلانا

اندیشہ کرنا ، ڈرنا ، سوچنا

انسداد کرنا ، روکنا

انکار کرنا، مُکرنا ، جھٹلانا

ایجاد کرنا ، بنانا ، گھڑنا

بار کرنا، لادنا

بارش کرنا ، برسانا

ترک کرنا ، چھوڑنا

تسخیر کرنا ، جیتنا

تشخیص کرنا ، جانچنا

تصنیف کرنا ، لکھنا ، رچنا

تصور کرنا ، سمجھنا ، سوچنا

تطبیق کرنا ، ملانا

تعاقب کرنا ، کھدیڑنا

تعجب کرنا، چونکنا

تعریف کرنا ، سراہنا

تعلیم کرنا ، ماننا

تعمیر کرنا ، بنانا ، چننا

تفتیش کرنا ، کھوجنا

تفویض کرنا ، سونپنا

تعین کرنا ، رکھنا ، لگانا ، ٹھہرانا

تقابل کرنا ۔ ملانا

پُرسش کرنا ، پوچھنا

پروا کرنا ، پدیڑنا ، خطرانا

پرواز کرنا ، اڑنا

پرورش کرنا ، پالنا

پرہیز کرنا ، بچنا

پریشان کرنا ، ستانا

باز کرنا ، کھولنا
تمنا کرنا ، چاہنا
تمیز کرنا ، پہچاننا
تنبیہ کرنا ، ڈانٹنا ، جھڑکنا
جھاڑنا ، پھٹکارنا
تنصیف کرنا ، ادھیانا
تنقید کرنا ، پرکھنا
تنگ کرنا ، کسنا ، جکڑنا ،
ستانا
توبہ کرنا ، پچھتانا
توجہ کرنا ، جھکنا
توقع کرنا ، چاہنا
توقف کرنا ، ٹھہرنا ، رکنا
تیار کرنا ، بنانا
تیز کرنا ، اکسانا
تیغا کرنا ، چننا
ثابت کرنا ، جتانا ، ٹھہرانا
ثبت کرنا ، لکھنا
جادو کرنا ، باندھنا
جاری کرنا ، بہانا ، نکالنا ۔
چلانا، حیا کرنا
جلب کرنا ، سوکھنا ، پینا

پست کرنا ، گرانا
حاضر کرنا ، لانا ، دینا ، بڑھانا
حجت کرنا ، جھگڑنا ، الجھنا
حذف کرنا ، چھوڑنا
حرام کرنا ، روکنا
حرص کرنا ، للچانا
حرکت کرنا ، ہلنا ۔ کلبلانا
حساب کرنا ، گننا
حسد کرنا ، جلنا
حصر کرنا ، ٹکنا
حصہ کرنا ، بانٹنا ۔ پھانٹنا
حفاظت کرنا ، بچانا
حفظ کرنا ، رٹنا
حکایت کرنا، کہنا
حل کرنا ، کھولنا ، گلانا، پگھلانا
حلقہ کرنا ، گھیرنا
حلول کرنا ، گھسنا
حوالے کرنا ، دینا ، سونپنا
لجانا ، شرمانا ، جھینپنا
حیران کرنا ، چونکانا

تجربہ کرنا ، آزمانا ، جانچنا
تجاہل کرنا ، بدلنا
تجزیہ کرنا ،کھولنا ، ادھیڑنا
تجویز کرنا ، سمجھانا
تحریر کرنا ، لکھنا ، ٹانکنا
تحریف کرنا ، بدلنا
تحریک کرنا، اکسانا ، ابھارنا، چھیڑنا
تحقیر کرنا ، گھٹانا
تحقیق کرنا، کھوجنا
تحلیل کرنا ، گھلانا، گھولنا، گلانا، پگھلانا
تحمل کرنا، سہنا، سہارنا
تخفیف کرنا ، گھٹانا
تخم ریزی کرنا ، بونا
خضاب کرنا ، رنگنا
خطا کرنا ، چُوکنا
خطاب کرنا ، بولنا ، کہنا ، بتانا
خفیف کرنا ، جھینپانا
خلاص کرنا ، چھوڑنا
خم کرنا ، جھکانا ، موڑنا

تقاضا کرنا ، مانگنا ، چاہنا
تقریر کرنا ، بولنا
تقرر کرنا ، لگانا
تقسیم کرنا ، بانٹنا ، پھانٹنا
تکبر کرنا ، اکڑنا
تکذیب کرنا ، جھٹلانا
تکرار کرنا دہرانا ، جھگڑنا
تکلف کرنا ، بننا ، دکھانا
تکیہ کرنا ، ٹکنا
تلاش کرنا ، ڈھونڈنا
تلف کرنا ، مٹانا
تلفظ کرنا ، بولنا
تلقین کرنا ، سمجھانا
دماغ کرنا ، اکڑنا ، ابھرانا
دنگ کرنا ، چونکانا
دور کرنا ، ہٹانا
دورہ کرنا ، گھومنا ، پھرنا
دیدار کرنا ، دیکھنا ، ملنا
ذبح کرنا ، کاٹنا

خم کرنا ، جھکانا ، موڑنا
خمیر کرنا ، سڑانا
خواہش کرنا ، چاہنا ، مانگنا
خوش کرنا ، بہلانا
خوف کرنا ، ڈرنا
جستجو کرنا ، ڈھونڈنا
جعل کرنا ، گڑھنا ، بنانا
جفا کرنا ، ستانا
جلا کرنا ، چمکانا ، اُجالنا
جلب کرنا ، کھینچنا
جلوہ کرنا ، جھلکنا ، چمکنا، دکھنا
جمع کرنا ، جوڑنا ، سمیٹنا ، سکیڑنا ، ختم کرنا ، جنگوڑنا
جنبش کرنا ، ہلنا
جنگ کرنا ، لڑنا
جوش کرنا ، ابلنا
چاک کرنا ، پھاڑنا
چسپاں کرنا، چپکانا
حاصل کرنا ، لینا ، پانا
زیارت کرنا ، دیکھنا ، ملنا
زیر کرنا ، ہرانا ، گرانا ، پچھاڑنا

ذبح کرنا ، کاٹنا
ذخیرہ کرنا ، بچانا ، جوڑنا
ذمے کرنا ، سونپنا
راضی کرنا ، منانا
راغب کرنا ، لُبھانا
حیرت کرنا ، چونکنا
خارج کرنا ، نکالنا
خاک کرنا ، مٹانا
خاموش کرنا ، بجھانا ، چسپانا
خائف کرنا ، ڈرانا ، دہلانا
خبر کرنا ، بتانا
چکانا ، نبیڑنا ، نمٹانا
خجل کرنا ، جھینپنا
خراب کرنا ، بگاڑنا
خرچ کرنا ، اٹھانا
خُردہ کرنا ، بھنانا ، تڑانا
خروج کرنا ، نکلنا
خشک کرنا ، سکھانا ، پونچھنا
شرارت کرنا ، چھیڑنا
شرح کرنا ، کھولنا

سازش کرنا ، ملنا ، گٹھنا
ساقط کرنا ، ہٹانا ، گرانا
ساکت کرنا ، چپانا
ساکن کرنا ، بھیڑانا
سبک کرنا ، گھٹانا
ستائش کرنا، سراہنا
ستم کرنا ، ستانا
سخت کرنا ، اکڑانا ، تاننا، کسنا ، تانسنا
خون کرنا ، مار ڈالنا
خیال کرنا ، سوچنا
خیانت کرنا ، چرانا
خیرات کرنا ، بخشنا
خیرہ کرنا ، چندھیانا
داخل کرنا ، گھسانا
داغ کرنا ، بھوننا ، اکورنا
دائر کرنا ، چلانا
دراز کرنا ، بڑھانا ، پھیلانا
درج کرنا ، ٹانکنا
درخواست کرنا ، چاہنا ، مانگنا
درد کرنا ، دُکھنا
درست کرنا ، سدھانا، سنوارنا، سنبھالنا

شرط کرنا ، باندھنا
شرکت کرنا ، ملنا
شرم کرنا ، لجانا ، جھینپنا ، شرمانا
شرمسار یا شرمندہ کرنا ، جھینپانا
شروع کرنا ، چلانا ، چھیڑنا
شریک کرنا ، ملانا
شفاعت کرنا ، بخشوانا
شق کرنا ، پھاڑنا
رجوع کرنا ، پلٹنا
رحلت کرنا ، مرنا
رحم کرنا ، پگھلنا
رخ کرنا ، جھکنا
رخصت کرنا ، بھیجنا ، ہٹانا
رضا مند کرنا ، منانا
رفع کرنا ، مٹانا ، ہٹانا
رقت کرنا ، رونا
رقص کرنا ، ناچنا
رقم کرنا ، لکھنا
رغ کرنا ، کڑھنا
رندہ کرنا ، چھیلنا
روانہ کرنا ، بھیجنا

دریافت کرنا ، پوچھنا ، ڈھونڈنا	روایت کرنا ، کہنا
دریغ کرنا ، ٹالنا ، بچانا	روشن کرنا ، جلانا ، اجالنا ، چمکانا
دعا کرنا ، مانگنا	زاری کرنا ، رونا
دعوت کرنا ، بلانا ، کھلانا	زعم کرنا ، اکڑنا
دغا کرنا ، ٹھگنا	زنجیر کرنا ، باندھنا
دفع کرنا ، ٹالنا	زندگی کرنا ، جینا
دق کرنا ، ستانا	زندہ کرنا ، جِلانا
دلیل کرنا ، جھگڑنا، الجھنا، بحثنا	زیادتی کرنا ، دبانا
دم کرنا ، پھونکنا	زیادہ کرنا ، بڑھانا
طلوع کرنا ، نکلنا	غفلت کرنا ، بھونا
سختی کرنا ، دبانا ، جکڑنا	شکار کرنا ، پھانسنا
سر کرنا ، جیتنا	شگاف کرنا ، پھاڑنا
سرایت کرنا ، بِھدنا	شمار کرنا ، گننا ، ملانا
سرزنش کرنا ، جھڑکنا ، ڈانٹنا ، پھٹکارنا	شناخت کرنا ، پہچاننا
سفر کرنا ، گھومنا ، پھرنا، چلنا	شور کرنا ، چیخنا ، چلانا
سقوط کرنا ، اترنا ، گرنا ، مٹنا ، ہٹنا	شیون کرنا ، رونا
سلب کرنا ، نکالنا ، چھیننا، لینا	صاف کرنا ، نکھارنا ، جھاڑنا
سلطنت کرنا ، راجنا	صبر کرنا ، سہارنا ، تھمنا

سماجت کرنا ، اڑنا ، دبانا	صحیح کرنا ، سدھارنا
سوار کرنا ، چڑھانا	صدقے کرنا ، وارنا
سواری کرنا ، چڑھنا	صراحت کرنا ، کھولنا
سوال کرنا ، پوچھنا، مانگنا	صرف کرنا ، اٹھانا ، برتنا
سودا کرنا ، بیچنا ، بنجنا	صعود کرنا ، اٹھنا ، چڑھنا
سیاحت کرنا، گھومنا، پھرنا	صیقل کرنا ، مانجھنا ، رگڑنا ، چمکانا
سیاست کرنا ، ڈانٹنا	ضائع کرنا ، کھولنا ، بگاڑنا
سیر کرنا ، بھرنا ، کھلانا	ضبط کرنا ، روکنا ، سہارنا ، سہنا
سَیر کرنا ، پھرنا	ضد کرنا ، اڑنا
سیراب کرنا ، چھلکانا	ضم کرنا ، ملانا
شادی کرنا، بیاہنا	ضیافت کرنا ، کھلانا
شامل کرنا ، ملانا	طاری کرنا ، لادنا
شائع کرنا ، پھیلانا	طبع کرنا ، چھاپنا
شدت کرنا ، دبانا ، تاننا	طلب کرنا ، مانگنا ، چاہنا ، ڈھونڈنا
قطع کرنا ، کاٹنا	گشت کرنا ، پھرنا ، گھومنا
طمع کرنا ، للچانا	غُل کرنا ، چیخنا
طنز کرنا ، گودنا ، چھیڑنا	غلطی کرنا ، چوکنا
طے کرنا ، لپیٹنا ، پٹانا ، چکانا ، ٹھہرانا	غم کرنا ، کڑھنا
ظاہر کرنا ، کھولنا، دکھانا	غور کرنا ، سوچنا ، سمجھنا
ظلم کرنا ، ستانا	فارغ کرنا ، چھوڑنا ، چھڑانا ، نکالنا
ظہور کرنا ، دکھنا ، جھلکنا	فاش کرنا ، کھولنا
عاجز کرنا ، ہرانا ، ستانا	فتح کرنا ، جیتنا

عام کرنا ، پھیلانا
عائد کرنا ، لگانا، باندھنا
عبادت کرنا ، پوجنا
عبور کرنا ، گزرنا، پھلانگنا
عتاب کرنا ، بگڑنا
عرض کرنا ، کہنا
عزت کرنا ، ماننا
عزم کرنا ، چاہنا ،
عشق کرنا ، چاہنا
عطا کرنا ، بخشنا ، دینا
عفو کرنا ، بخشنا ، درگزر کرنا
عقد کرنا ، بیاہنا
عنایت کرنا ، دینا
عود کرنا ، پلٹنا
عوض کرنا ، بدلنا
عہد کرنا ، ٹھانا ، ٹھہرانا
غارت کرنا ، لوٹنا ، اجاڑنا
غائب کرنا ، اڑانا
قلب کرنا ، بدلنا ، الٹنا
قلعی کرنا ، پوتنا
قلم کرنا ، کاٹنا
قے کرنا ، آبکانا

فخر کرنا ، اترانا ، پھولنا
فدا کرنا ، وارنا
فرار کرنا ، بھاگنا
فراموش کرنا ، بھولنا ، بھلانا
فراہم کرنا ، جوڑنا ، جنگوڑنا
فرش کرنا ، بچھانا
فرض کرنا ، ماننا ، مان لینا
فریاد کرنا ، چیخنا ، چلانا
فریب کرنا ، ٹھگنا
فساد کرنا ، بگاڑنا ، جھگڑنا
فسخ کرنا ، توڑنا
فکر کرنا ، سوچنا
فنا کرنا ، مٹانا
فیصلہ کرنا ، چکانا ، نبیڑنا ، نمٹانا
قائم کرنا ، جمانا ، ٹھہرانا ، روپنا
قبض کرنا ، روکنا ، جکڑنا ، لینا
قبضہ کرنا ، ہتھیانا
قبول کرنا ، ماننا
گفتگو کرنا ، بولنا
گم کرنا ، گنوانا ، کھونا
گمان کرنا ، سوچنا ، سمجھنا
گمراہ کرنا ، بھٹکانا ، بہکانا

قیام کرنا، رکنا ، ٹھہرنا، رہنا
قید کرنا ، روکنا ، باندھنا
قیمہ کرنا ، کچلنا
کاشت کرنا ، جوتنا
کباب کرنا ، بھونکنا، سینکنا
کج کرنا ، پھرانا موڑنا
کجی کرنا ، مڑنا ، پھرنا
کسب کرنا ، کمانا
کشادہ کرنا ، چوڑا کرنا
کشتہ کرنا ، پھونکنا
کفایت کرنا ، پورنا
کلام کرنا ، بولنا
کم کرنا، کمی کرنا، گھٹانا
کنارہ کرنا، کترانا
کندہ کرنا ، کھودنا
کوتاہ کرنا ، گھٹانا
کوتاہی کرنا ، چوکنا
کوچ کرنا ، چلنا
گردان کرنا ، نپٹنا
گردش کرنا ، گھومنا
گرفت کرنا ، ٹوکنا ، پکڑنا
غرق کرنا ، ڈبونا
غرور کرنا ، اکڑنا ،

گناہ کرنا، بہکنا
گوارنا ، سہارنا ، قبول کرنا
گوش زد کرنا ، سنانا
لبریز کرنا ، بھرنا
لغزش کرنا ، ڈگمگانا ، پھسلنا
لکنت کرنا ، ہکلانا ، اٹکنا
لنگ کرنا ، لنگڑانا
ماتم کرنا ، پیٹنا
ماخوذ کرنا ، پکڑنا
مالش کرنا ، ملنا ، رگڑنا
مامور کرنا ، ٹھہرانا ، لگانا
مائل کرنا ، جھکانا
مباحثہ کرنا ، جھگڑنا
مبادلہ کرنا ، بدلنا
مبالغہ کرنا ، بڑھنا ، چڑھنا
مبتلا کرنا ، پھانسنا ، پھسانا
مبذول کرنا ، دینا
مبعوث کرنا ، ٹھہرانا ، لگانا
مبہوت کرنا
چکرانا، متحد کرنا
متحرک کرنا
قتل کرنا ، مار ڈالنا
قدر کرنا ، سراہنا

اترانا ، ابھرنا

غسل کرنا ، نہانا

غش کرنا ، مرجھانا

غصہ کرنا، چڑ چڑانا، تنکنا،

قضا کرنا

مجبور کرنا ، دبانا

محاصرہ کرنا ، گھیرنا

محافظت کرنا ، بچانا

محبت کرنا ، چاہنا

محدود کرنا ، گھیرنا

محروم کرنا، چھوڑنا، ترسانا

محسوب کرنا ، گننا

محسوس کرنا ، سمجھنا

محصور کرنا ، گھیرنا

محفوظ کرنا ، بچانا

محو کرنا ، مٹانا

مخاطب کرنا ، سنانا ، بتانا

مختصر کرنا ، گھٹانا

مخفی کرنا ، چھپانا

مخلوط کرنا ، ملانا

مداحی کرنا / مدح کرنا } سراہنا

گرفتار کرنا، پھانسنا ،

قرابت کرنا ، بیاہنا

قربانی کرنا ، وارنا ، اتارنا

روٹھنا ، مرنا ، چھوڑنا

مستجاب کرنا ، ماننا ، قبول کرنا

مستحکم کرنا ، جمانا

مسترد کرنا ، لوٹانا

مسح کرنا ، ملنا ، رگڑنا، پونچھنا

مسخ کرنا ، بدلنا ، بگاڑنا

مسخر کرنا ، جیتنا

مسدود کرنا ، روکنا

مشاہدہ کرنا ، دیکھنا

مشتعل کرنا ، بھڑکانا

مشتق کرنا ، نکالنا

مشرح کرنا ، کھولنا

مشروط کرنا ، باندھنا

مشغول کرنا ، لگانا

مشق کرنا ، دہرانا

مصالحت کرنا / صلح کرنا } بنانا

مضایقہ کرنا ، رکنا

متصور کرنا ، سمجھنا

پکڑنا

گرم کرنا ، تپانا

گرہ کرنا، لینا، ہتھیانا، اینٹھنا

گریز کرنا ، بھاگنا، بچنا

گزارش کرنا ، کہنا

مغلوب کرنا ، ہرانا ، گرانا، پچھاڑنا

مفاخرت کرنا ، اترانا، سہنا

مفتوح کرنا
فتح کرنا } کھولنا، ہرانا

مقابل کرنا، بھڑانا

مقابلہ کرنا ، بھڑنا ، ملانا

مقاطعہ کرنا ، چھوڑنا

مقام کرنا ، ٹھہرانا ، رکنا

مقرر کرنا ، باندھنا ، لگانا ، ٹھہرانا

مقلوب کرنا ، الٹنا

مقید کرنا ، باندھنا

مکر کرنا ، بننا ، ٹھگنا

ملاحظہ کرنا ، دیکھنا

ملاقات کرنا ، ملنا

ملال کرنا ، کڑھنا

متعین کرنا ، لگانا ، ٹھہرانا

متعلق کرنا
متمسک کرنا } چپکانا ، لگانا

متنبہ کرنا ، ڈانٹنا ، جھاڑنا
جھڑکنا ، چونکانا

مجادلہ کرنا ، جھگڑنا

منعقد کرنا ، روپنا

منفعل کرنا ، جھینپانا

منقسم کرنا ، بانٹنا

منقطع کرنا ، کاٹنا

منقلب کرنا ، پلٹانا

منکشف کرنا، کھولنا

منور کرنا ، چمکانا

منہدم کرنا ، گرانا ، ڈھانا

موازنہ کرنا ، ملانا

موافق کرنا ، ملانا

موخر کرنا ، ٹالنا

موسوم کرنا ، کہنا بولنا

موقوف کرنا ، ٹھہرانا ، ٹیکنا ، لگانا

مہاجرت کرنا ، نکلنا

ملائم کرنا ، نرمانا

ملتفت کرنا ، جھکانا

مذاق کرنا ، ہنسنا

مطابقت کرنا ، ملنا

مذاکرہ کرنا ، بولنا ، بخشنا

مراجعت کرنا ، پلٹنا

مراجعہ کرنا ، پہنچنا

مربوط کرنا ، ملانا

مرحمت کرنا ، دینا ، بخشنا

مرعوب کرنا ، ڈرانا

مرقوم کرنا، لکھنا

مرکب کرنا ، ملانا

مرکوز کرنا ، جمانا

مرمت کرنا ، گانٹھنا ، سنوارنا

مروج کرنا ، چلانا

مزاحمت کرنا ، روکنا

مزین کرنا ، سجانا

مستثنیٰ کرنا ، نکالنا ، نکال دینا

نصیحت کرنا ، سمجھانا

نظارہ کرنا ، دیکھنا

نظم کرنا ، پرونا

مہمان کرنا ، ٹھہرانا

مہیا کرنا ، جوڑنا ، سمیٹنا

مطابق کرنا ، ملانا

ملتوی کرنا ، ٹالنا

ملحق کرنا ، ملانا

مطالبہ کرنا ، چاہنا ، مانگنا

مطالعہ کرنا ، پڑھنا

مطلع کرنا ، بتانا

مطمئن کرنا ، سمجھانا

مظاہرہ کرنا ، دکھانا

معاشقہ کرنا ، چاہنا

معاف کرنا ، بخشنا

معدوم کرنا ، مٹانا

معزول کرنا ، اتارنا ، ہٹانا

معطل کرنا ، روکنا ، ٹھہرانا

معلوم کرنا، جاننا ، ڈھونڈنا ، کھولنا

معمور کرنا ، بھرنا

معین کرنا ، ٹھہرانا ، لگانا

مغفرت کرنا ، بخشنا

نوازش کرنا ، نوازنا ، تھپکنا

نوحہ کرنا ، رونا

نوش کرنا ، کھانا ، پینا

نعرہ کرنا ، ڈپکنا

نفرت کرنا ، ہٹنا ، گھینانا
بھاگنا

نفوذ کرنا ، گھسنا ، پہنچنا

نقش کرنا ، چھاپنا

نقل کرنا ، دہرانا ، کہنا

نکاح کرنا ، بیاہنا

میزبانی کرنا ، ٹھہرانا ،
کھلانا

ممانعت کرنا ، روکنا

مملو کرنا ، بھرنا

مناجات کرنا ، مانگنا

منتخب کرنا
انتخاب کرنا } چھانٹنا، چننا

منتشر کرنا ، بکھیرنا

منتقل کرنا ، بدلنا

منجلی کرنا ، چمکانا

منجمد کرنا ، جمانا

منحرف کرنا، بھٹکانا، پھرانا
ورغلانا ، پلٹانا

منحصر کرنا ، ٹیکنا ، لگانا

مندرج کرنا ، لکھنا

منسوب کرنا ، ملانا

منظم کرنا ، سنوارنا

نہی کرنا ، روکنا

وابستہ کرنا ، لگانا ، چپکانا ، باندھنا

واپس کرنا ، لوٹانا

وارد کرنا ، پہنچانا ، لگانا

وصل کرنا ، ملنا ، پہنچانا

واقف کرنا ، جتانا ، جانا

نابود کرنا ، مٹانا

نادم کرنا ، جھنپانا

ناخوش کرنا ، چڑانا

ناز کرنا ، اترانا ، سہانا
بھولنا ، پھولنا

نازل کرنا ، اتارنا

نافذ کرنا ، نکالنا ، چلانا

ناکام کرنا ، ہرانا

نالش کرنا ، چیخنا

نالہ کرنا ، رونا

نام کرنا ، دھیا

سخر کرنا ، کاٹنا

نذر کرنا ، دینا ، چڑھانا

نرم کرنا ، نرمانا

نزول کرنا، اترنا

منظور کرنا ، ماننا ، قبول کرنا	نشر کرنا ، پھیلانا
ورد کرنا ، رٹنا	ہجرت کرنا ، چھوڑنا ، جانا
ورم کرنا ، سوجنا	ہجوم کرنا ، گھرنا
وارد کرنا ، پہنچنا، آنا	ہدایت کرنا ، بتانا
وسواس کرنا ، ڈرنا، دھڑکنا	ہدیہ کرنا ، بیچنا
وسیع کرنا ، چوڑانا	ہراس کرنا ، ڈرنا
وصل کرنا ، ملنا	ہراساں کرنا ، ڈرانا
وصول کرنا ، لینا ، پانا	ہضم کرنا ، پچانا
وضع کرنا ، بنانا ، ڈھالنا	ہلاک کرنا ، مارنا
وعدہ کرنا ، ٹھہرانا	ہوس کرنا ، للچانا
نگاہ کرنا ، دیکھنا	واہ وا کرنا ، سراہنا
نمائش کرنا ، دکھانا	وجد کرنا ، جھومنا
نمو کرنا ، بڑھنا، اُگنا	وحشت کرنا ، بھاگنا
نمود کرنا ، نکلنا ، جھلکنا، دکھنا	وداع کرنا ، چھوڑنا ، بھیجنا
وفا کرنا / وفا داری کرنا } نباہنا	ہوش کرنا ، چونکنا ، چیتنا
وقف کرنا ، دے ڈالنا	یاد کرنا ، رٹنا ، پڑھنا
وہم کرنا ، ڈرنا	یقین کرنا ، ماننا
ویران کرنا ، اجاڑنا	یورش کرنا، جھپٹنا ، چڑھنا ، دھانا

اردو کے مندرجہ بالا کثیر تعداد مرکب افعال ابھی تک اپنی اصلی حالت میں بولے جا رہے ہیں اور جیسا کہ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں ۔ ان کے مترادف اردو کے مفرد افعال جو ان کے سامنے

لکھ دیے گئے ہیں ان کی وجہ سے غیر مستعمل ، بیکار اور کہیں کہیں نامانوس بھی ہوگئے ہیں جس سے فائدے کی جگہ نقصان پہنچا ہے ۔ اس نقصان کی تلافی اس طرح بھی ہو سکتی ہے کہ ان دخیل الفاظ سے جو اردو "کرنا" کے ساتھ استعمال ہو رہے ہیں اردو ہی کے وضعی مفرد افعال بنا کر اپنی بول چال رائج کر لیے جائیں ۔ اس طرح سے اردو زبان کے ذخیرۂ الفاظ میں غیر معمولی وسعت پیدا ہو جائے گی ، ان الفاظ کا بدیسی پن اور اجنبیت دور ہو جائے گی اور یہ گھل مل کر دیسی ماحول میں رچ بس جائیں گے ۔ چنانچہ اپنی اس تجویز کے تحت میں ان کی کچھ اردوائی ہوئی شکلیں اہلِ اردو کی خدمت میں بطور نمونہ پیش کر رہا ہوں جس کے ترک و اختیار اور ترمیم و اصلاح میں ہر ایک کو اپنی اپنی پسند اور طبعی میلان کے مطابق مکمل آزادی حاصل ہے ۔

آراستہ کرنا } آرانا
آرائش کرنا }

اردو کرنا ، اردوانا

ارسال کرنا ، ارسالنا ، رسلانا

آرزو کرنا ، آرزوانہ

آلودہ کرنا ، آلانا

آماس کرنا ، آماسنا

ارقام کرنا } رقانا
رقم کرنا }
مرقوم کرنا }

آمیز کرنا } آمیزنا
آمیزش کرنا }

استعمال کرنا ، عملانا

آویزاں کرنا ، آویزنا

افطار کرنا ، افطارنا

اجرانا } جریانا
جاری کرنا }

اقبال کرنا ، اقبالنا

اقدام کرنا ، اقدامنا

احاطہ کرنا ، حاتنا

انتظام کرنا ، ناظمانا

اندازہ کرنا ، اندازنا

تحریف کرنا ، تحریفنا

باطل کرنا } بطلانا
بطلان کرنا }

تحریک ، تحریکنا

پرستش کرنا ، پرستنا

تحقیر کرنا ، تحقیرنا

بیچ کرنا ، بیچنا

پیائش کرنا ، پیانا

تاراج کرنا ، تاراجنا

تبدیل کرنا / متبادلہ کرنا } بدلنا، تبدیل کرنا

تجویز کرنا ، تجویزنا

اخراج کرنا / خارج کرنا } خرجانا

تعاقب کرنا ، تعقبنا

تعریف کرنا ، تعریفنا ، عرفانا

تعظیم کرنا ، تعظیانا ، عظیانا

تعمیر کرنا ، تعمیرنا

تفتیش کرنا ، تفتیشنا

تفویض کرنا ، تفویضنا

تقریر کرنا ، تقریرنا

تقرر کرنا ، قرارنا

تقسیم کرنا ، قسمانا

تکذیب کرنا ، کذبانا

تلاش کرنا ، تلاشنا

تلف کرنا ، تلفنا

تلقین کرنا ، تلقیننا

تحقیق کرنا ، تحقیقنا

تحلیل کرنا ، تحلیلنا

تخفیف کرنا ، تخفیفنا

تردید کرنا ، تردیدنا

ترک کرنا ، ترکنا

تشخیص کرنا ، تشخیصانا ، شخصانا

انحصار کرنا / حصر کرنا } حصرانا

حلقہ کرنا ، حلقیانا

حلال کرنا ، حلانا

حلول کرنا ، حلونا

حوالے کرنا ، حوالنا

حیران کرنا ، حیرانا

خائف کرنا ، خوفیانا

خبر کرنا ، خبرانا

ختم کرنا ، ختمانا

خجل کرنا ، خجلانا

خردہ کرنا ، خردیانا

خشک کرنا ، خشکانا

خضاب کرنا ، خضبانا

خطاب کرنا ، خطبانا

تمیز کرنا ، تمیزنا	ختم کرنا ، ختانا
تنصیف کرنا ، تنصیفنا ، نصفانا	داخل کرنا ، دخلانا
تنقید کرنا ، نقدانا	داغ کرنا ، داغنا
جادو کرنا ، جادوانا	درج کرنا ، درجانا
جذب کرنا ، جذبانا	درجہ بندی کرنا ، درجیانا
جلب کرنا ، جلبنا	دم کرنا ، دمانا
جلوہ کرنا ، جلویانا	دورہ کرنا ، دوریانہ کرنا ، دوریانہ
جنبش کرنا ، جنبانا	راضی کرنا ، رضیانا
جنگ کرنا ، جنگنا	راغب کرنا ، رغبانا
جوش کرنا ، جوشنا	رحم کرنا ، رحمیانا
چاک کرنا ، چاکنا	رندہ کرنا ، رندیانا
تحریر کرنا ، تحریرنا	تطبیق کرنا ، تطبیقنا ، طبقانا
شامل کرنا ، شملانا	قبول کرنا ، قبولنا
شرط کرنا ، شرطانا	قتل کرنا ، قتلانا
شرم کرنا ، شرمانا	قدر کرنا ، قدرانا
شکار کرنا ، شکرانا	قربانی کرنا ، قربانانا
شگاف کرنا، شگافنا	قصد کرنا ، قصدانا
شمار کرنا ، شمارنا	قضا کرنا ، قضیانا
صدقے کرنا ، صدقانا	قلب کرنا ، قلبانا
صرف کرنا ، صرفنا	قلم کرنا ، قلمانا ، قلمیانا
صیقل کرنا ، صیقلانا	کاشت کرنا ، کشتیانا ، کشتانا
ضد کرنا ، ضدیانہ	کج کرنا ، کجیانا

طلب کرنا ، طلبنا

طنز کرنا ، طنزنا

ظلم کرنا ، ظلمانا

عام کرنا ، عامیانا

عبادت کرنا ، عبدیانا

عبور کرنا ، عبورنا، عبریانا

عربی کرنا ، عربیانا

عرض کرنا ، عرضیانا

عوض کرنا ، عوضیانا

عہد کرنا ، عہدیانا

غرق کرنا ، غرقانا

غسل کرنا، غسلانا

غصب کرنا ، غصبانا

غور کرنا ، غورنا

چسپاں کرنا ، چسپانا

حاصل کرنا ، حصلانا

حاضر کرنا ، حضرانا

حذف کرنا ، حذفانا

حرام کرنا ، حرمانا

حرص کرنا ، حرصانا

حفظ کرنا ، حفظانا

حکم کرنا ، حکمانا

کسب کرنا ، کسبنا ، کسبیانا

کشادہ کرنا ، کشادنا

کشتہ کرنا ، کشتیانا

کفایت کرنا ، کفیانا

کلام کرنا ، کلمیانا ، کلمانا

کم کرنا } کمیانا
کمی کرنا }

کنارہ کرنا ، کنریانا

گردان کرنا ، گردانا

گرم کرنا ، گرمیانا

گریز کرنا ، گریزنا

گزارش کرنا ، گزارنا ، گزرانہ

گم کرنا ، گمانا

گمان کرنا ، گمانا

لبریز کرنا ، لبریزنا

زاری کرنا ، زاریانا

زعم کرنا ، زعمانا

سازش کرنا ، سازنا

ستم کرنا ، ستمانا

سختی کرنا ، سختیانا

سلب کرنا ، سلبانا

سوال کرنا ، سوالنا

سیر کرنا ، سیرانا

مجبور کرنا ، جبرانا
محاصرہ کرنا ، حصارنا
محافظت کرنا ، حفظانا
محدود کرنا ، تحدیدنا
محروم کرنا، حرمانا
محسوب کرنا ، حسبانا
محسوس کرنا ، حسیانا
محصور کرنا ، حصرانا
محفوظ کرنا ، حفظانا
مخاطب کرنا ، خطبانا
مخفی کرنا ، مخفیانا
مسخر کرنا ، سخرانا
مشتعل کرنا ، اشتعالنا
مشتق کرنا ، اشتقاقنا
مشغول کرنا ، مشغلانا
مطابق کرنا ، تطبیقنا
مطالبہ کرنا ، طلبنا
معدوم کرنا ، عدمانا
فارسی کرنا ، فرسیانا
فخر کرنا ، فخرانا
فرض کرنا، فرضیانا
فریب کرنا ، فریبنا
فساد کرنا ، فسدانا
قائم کرنا ، قائمانا

معزول کرنا ، عزلانا
معطل کرنا ، عطلانا
مغلوب کرنا ، غلبانا
مقرر کرنا ، قرارنا
مقلوب کرنا ، قلبانا
منتشر کرنا ، نشرانا
منتقل کرنا ، نقلانا
منحصر کرنا ، حصرانا
مندرج کرنا ، درجانا
منسوب کرنا ، نسبانا
منظم کرنا ، ناظمانا
منقسم کرنا ، قسمانا
منقلب کرنا ، قلبانا
منکشف کرنا ، کشفانا
موازنہ کرنا ، میزانا ، وزنانا
موخر کرنا ، تاخیرنا
موسوم کرنا ، تسمیانا ، اسمانا
موقوف کرنا ، وقفیانا
ہوس کرنا ، ہوسیانا
لغزش کرنا، لغزانا
مامور کرنا ، مامورنا
مباحثہ کرنا ، بحثنا
مبذول کرنا ، بذلنا
مبعوث کرنا ، بعثنا
متحرک کرنا ، حرکانا

قبض کرنا ، قبضانا
قبضہ کرنا ، قبضیانا
مہاجرت کرنا ، ہجرانا
مہمان کرنا ، مہمانا
نادم کرنا ، ندمانا
نازل کرنا ، نزلانا
نافذ کرنا ، نفذانا ، نفاذنا
نالش کرنا ، نلشانا
نام کرنا ، نامیانا
نذر کرنا ، نذرانا
نرم کرنا ، نرمانا
نزول کرنا ، نزولنا ، نزلنا
نشر کرنا ، نشرانا
نظارہ کرنا، نظرانا
نظم کرنا ، نظمانا
نفرت کرنا ، نفرتنا
نفوذ کرنا ، نفوذنا
نقش کرنا ، نقشانا
نقل کرنا ، نقلانا
نمائش کرنا ، نمانا
یقین کرنا ، یقیناً

متحیر کرنا ، حیرانا
مجادلہ کرنا ، جدلنا
نمود کرنا ، نمودنا
نوازش کرنا ، نوازنا
نوش کرنا ، نوشنا
واصل کرنا، وصلانا
واقف کرنا ، وقفانا
وجد کرنا ، وجدانا
ورد کرنا ، وردانا
ورم کرنا ، ورمانا
ورود کرنا ، ورودنا
وسواس کرنا ، وسواسنا ، وسوسانا
وصول کرنا ، وصولنا
وفا کرنا ، وفیانا
وقف کرنا ، وقفانا
وہم کرنا ، وہمانا
ویران کرنا ، ویرانا
ہجرت کرنا ، ہجرانا ، ہجرانا
ہضم کرنا ، ہضمانا
ہلاک کرنا ، ہلکانا

(مطبوعہ : قومی زبان ، کراچی ، اگست ۱۹۸۵ء)

مسئلہ آغاز اردو

اردو داں طبقے میں اردو زبان کی پیدائش کے متعلق ایک تو یہ غلط خیال اشاعت پا گیا ہے کہ اردو کئی زبانوں سے مل کر بنی ہے - جن میں سے ایک عربی یا فارسی ضرور ہے اور دوسرا یہ خیال پھیل گیا ہے کہ اردو کا وطن اصلی دلی ہے - میں اس مقالے میں ان دونوں خیالات سے بحث کروں گا اور ان مقدمات پر روشنی ڈالوں گا - جو آغاز اردو کے سلسلے میں کتنے ہی نظریات کی اساس بنائے گئے ہیں - اس کے بعد اپنی تحقیق کا خلاصہ بھی مختصر طور پر پیش کروں گا - تاکہ اس مسئلے کے مثبت و منفی دونوں پہلو سامنے آ جائیں -

ان تمام نظریات کا جو پہلے خیال پر قائم کیے گئے ہیں - لب لباب یہ ہے کہ زبان اردو کا آغاز مسلمانوں کی آمد کے بعد ہوا اور اس کی وجہ دو مختلف زبانیں بولنے والی قوموں کے مابین کاروباری سہولت تھی کیونکہ باہمی افہام و تفہیم کے لیے ایک مشترک ذریعہ اظہار کی ضرورت محسوس کی گئی تھی اور ضرورت ایجاد کی ماں ہے - اس لیے اردو زبان ایجاد ہوئی اور چونکہ مسلمان ہمیشہ ہندوستان کے مغربی علاقوں میں ہی آتے رہے اس لیے یہیں اردو زبان کا نقش اول اُبھر سکتا تھا -

عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ ہماری تمام موجودہ زبانیں ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کے بعد ہی سر اٹھاتی ہیں - اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہندو تاریخ نویسی میں بہت کمزور واقع ہوا ہے - چنانچہ ہندوستان میں تاریخ نگاری کی باقاعدہ ابتدا مسلمانوں سے ہوتی ہے لیکن یہ خیال بھی اپنی منتہا کو پہنچ گیا ہے اور لوگ ہندوؤں کی کسی تاریخ کو صحیح نہیں گردانتے - حالانکہ تامل زبان کی تصنیفات کا سراغ قبل مسیح تک مل جاتا ہے لیکن ہم کو اس بات کے تسلیم کرنے میں

اب بھی تامل ہے ۔ بہر حال اتنا مان لینے میں کوئی قباحت نہیں ہے کہ شمالی ہندوستان کی جدید زبانیں چاہے کتنی ہی پرانی ہوں ۔ ان کا علم مسلمانوں کی آمد کے بعد ہی ہوتا ہے ۔ مسلمان حکمرانوں نے ان زبانوں کو نوازا ہے اور ان کے ادبا و شعرا کی سرپرستی فرمائی ہے جس سے ان کے فروغ و ارتقا میں کافی مدد ملی ہے لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ جدید زبانیں (جن میں اردو بھی شامل ہے) مسلمانوں کی آمد کے باعث پیدا ہوئی ہیں ۔

معلوم نہیں اس بات میں کس حد تک صداقت ہے کہ جس وقت مسلمان ہندوستان میں داخل ہوئے اس وقت موجودہ زبانیں اپنے موجودہ روپوں میں ڈھل رہی تھیں ۔ یہ بات میری سمجھ سے بالکل باہر ہے کہ یہ تمام زبانیں ایک ہی وقت میں اپنا چولا تبدیل کرتی ہیں اس بات میں تحقیق کی ابھی بہت گنجائش ہے ۔ اس کے باوجود اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ متعدد زبانوں میں تبدیلی ہیئت کا عمل ایک ہی وقت میں ظاہر ہوتا ہے اور وہ وقت وہی ہے جب کہ مسلمان ہندوستان کی سرحد پار کرتے ہیں تو اس سے یہ نتیجہ کب نکلتا ہے کہ مسلمانوں کا ورود کسی زبان کی پیدائش کا سبب بھی ہے اور وہ زبان بھی صرف اردو ہی تھی ۔ اگر مسلمان ایک مقام پر ایک زبان کو جنم دے سکتے تھے تو انھوں نے دوسرے مقامات پر دوسری زبانوں کو جنم کیوں نہیں دیا ۔ آخر جس اصول پر مغربی ہندوستان کے کسی ایک علاقے میں اردو زبان کی پیدائش ہو سکتی تھی ۔ اسی اصول پر بنگال اور آسام میں بھی کسی ایسی ہی کھچڑی زبان کا وجود میں آنا ضروری تھا اس لیے کہ مسلمان کو ایک دن وہاں بھی پہنچے تھے اور بحیثیت حکمران پہنچے تھے ۔ انھیں دیسی باشندوں کے ساتھ تعلقات قائم کرتے وقت ضرور ایسی ہی دقت پیش آئی ہوگی ۔ جیسی مغربی ہندوستان میں لاحق ہوئی تھی ۔

مسلمانوں سے بہت پہلے آریہ بھی ہندوستان میں آئے تھے اور وہ وہی ایرانی زبان ساتھ لائے تھے جس کی ارتقائی شکل مسلمانوں کی ہمرکابی میں دوبارہ ہندوستان میں داخل ہوئی ۔ اس وقت ہندوستان میں جو

دراوڑی زبانیں بولی جاتی تھیں اور جن سے ہماری جدید زبانوں نے جنم لیا ہے - اپنی صوتیات اور صرف و نحو میں قدیم ایرانی زبان سے بنیادی طور پر مختلف تھیں - اس وقت بھی دیسی بدیسی باشندوں کو اپنی سہولت کی خاطر ایک مشترک آلہ اظہار کی ضرورت پیش آئی ہوگی- لہذا ان مورخین اردو کے خیال کے مطابق قدیم ایرانی اور قدیم دراوڑی زبانوں کے میل سے کسی نئی زبان کا وجود میں آنا ناگزیر ہوگیا ہوگا - لیکن مجھے اس وقت کی کوئی ایسی طوال زبان نظر نہیں آتی بلکہ میں تو یہ دیکھتا ہوں کہ رفتہ رفتہ آریوں نے یہیں کی زبانیں سیکھنا شروع کر دیں - یہاں تک کہ چند نسلیں گذر جانے کے بعد پراکرتیں ہی ان کی مادری زبانیں بن گئیں اور ایرانی زبان کا لکھنا پڑھنا محض فیشن یا علمی فضیلت جتانے کا ایک ذریعہ بن گیا - رگ وید کی تصنیف اسی زمانے کی یادگار ہے جس میں دونوں قسم کی زبانیں (ایرانی اور دراوڑی یعنی پراکرت) اپنے اپنے پورے صوتی ، صرفی اور نحوی نظام کے ساتھ پہلو بہ پہلو نظر آتی ہیں -

میرا خیال یہ ہے کہ نئی زبان کی ضرورت دنیا کے کسی علاقے میں اتنی شدت سے اور اتنے وسیع پیمانے پر محسوس نہیں کی گئی ہوگی جتنی آج محسوس ہونی چاہیے کیونکہ وسائل آمد و رفت نے دو مقامات کا فاصلہ بہت کم کر دیا ہے اور اب زمین اس قدر سکڑ گئی ہے کہ دنیا کے بعید ترین اور مختلف اللسان ممالک بھی ہمسائے نظر آنے لگے ہیں - چنانچہ موجودہ زمانے میں ایسی کاروباری سہولت کے تحت جس کے متعلق ہماری زبان کے مؤرخین اتنا شور مچاتے چلے آ رہے ہیں - کچھ ذہین و طباع لوگوں نے یہ چاہا کہ ایک ایسی زبان بنائی جائے جس سے پوری دنیا کا کام چل سکے - اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے انھوں نے شبانہ روز کی کوشش کے بعد مختلف عالمی زبانوں کے مسالے سے ایک بین الاقوامی زبان اسپرانتو کا ڈھانچہ تیار کر لیا - لیکن جب اسے انگلی پکڑ کر چلانا چاہا - تو وہ ایک قدم بھی نہ اٹھا سکا اور زمین پر آ رہا کیونکہ وہ اس میں روح نہیں پھونک سکتے تھے - زبان ایک نامیاتی حقیقت ہے جو از خود پیدا ہو کر بڑھتی، پھیلتی ، پھولتی اور پھلتی رہتی

ہے - وہ شعوری کوششوں کی پیداوار نہیں ہوتی اور جو زبان شعوری کوششوں سے بنائی جاتی ہے وہ زندہ زبان نہیں ہوتی - یہی وجہ ہے کہ وہ آگے بڑھ بھی نہیں سکتی - اس لیے یہ خیال کہ ہندو مسلمانوں نے اپنی ضرورت کے تحت ایک نئی زبان بنائی یا شاہجہان کی چھاؤنی میں ڈھالی ، سرے سے غلط ہے -

دو زبانوں کے ملنے سے تیسری زبان کے پیدا ہونے کا نظریہ بالخصوص جب کہ ان میں سے ایک سامی (عربی) یا آریائی (فارسی) ہو اور دوسری دراوڑی (پیجا لوری ، تامل ، سندھی ، پنجابی وغیرہ) ہو اس قدر ناقابل فہم ہے کہ لسانیات میں اس پر غور کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا لطف کی بات یہ ہے کہ اس نظریے کی رو سے جب سامی (عربی) یا آریائی (فارسی) مغربی ہندوستان کی کسی دراوڑی زبان سے مخلوط ہوتی ہے تو ایک ہندوی زبان (اردو) ہی کو جنم دیتی ہے اس نظریے کی پیدائش میں لفظ (اردو) نے بھی بہت مدد پہنچائی ہے -کیونکہ اردو کے معنی لشکر یا چھاؤنی کے ہیں جس میں مختلف علاقوں کے فوجی مختلف زبانیں بولتے ہوئے ایک جگہ جمع ہو جاتے ہیں اور ان کو بھی باہمی تعلقات میں سہولت پیدا کرنے کی خاطر وہی ضرورت پیش آتی ہے - جس کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ اول اول مسلمان حملہ آوروں کو مغربی ہندوستان کے مختلف علاقوں میں پیش آئی تھی -

حقیقت یہ ہے کہ لفظ "اردو" کو ہماری زبان کی پیدائش سے کوئی تعلق نہیں - یہ زبان تو ہندوستان میں کم از کم صدیوں پیشتر سے رائج چلی آ رہی تھی - شاہجہان نے صرف یہ کیا کہ دہلی کے اس مقام کی رعایت سے جہاں یہ بولی جاتی تھی - اس کا نام "اردو" رکھ دیا حافظ محمود شیرانی نے بھی اپنی کتاب "پنجاب میں اردو" میں اس حقیقت کو تسلیم کیا ہے - یہی وجہ ہے کہ اسے شروع میں زبان اردو یا اردو کی زبان کہتے تھے - جیسا کہ میر امن نے "باغ و بہار" کے مقدمے میں لکھا ہے - اس کا مطلب صرف یہی ہے کہ یہ دہلی کے اس علاقے میں سنائی دیتی تھی جسے "اردو" یا "اردوئے معلیٰ کہتے تھے

اور یہ تفریق اس لیے ضروری تھی کہ قدیم شہر دہلی میں دوسری زبان (ہریانی) رائج تھی - اس پر میں آگے بحث کروں گا - ابھی مجھے آغاز اردو کے ان نظریات کو پرکھنا ہے - جن کا اوپر ذکر کیا جا چکا ہے - میں اس کی ابتدا دکن سے کرتا ہوں -

کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ ظہور اسلام سے قبل عرب لوگ بغرض تجارت ہندوستان آتے اور ساحل مالا بار پر اُترتے تھے - ظہور اسلام کے بعد اس صورت حال میں اگر کچھ تبدیلی ہوئی تو صرف یہ کہ عرب سوداگر مسلمان ہو گئے لیکن ان کی زبان عربی ہی رہی - چنانچہ ان تاجروں اور مقامی باشندوں کے میل جول میں سہولت کی خاطر عربی اور دکھنی زبان کی آمیزش سے ایک نئی زبان وجود میں آئی - جسے آج اردو کہتے ہیں - اس نظریے کے مدعی مولوی نصیر الدین ہاشمی ہیں جو اپنی کتاب "دکن میں اردو" میں اردو زبان کی روایت کے طور پر دکنی شعرا مصنفین کی تصانیف بھی پیش کرتے ہیں لیکن جب ہم اردو زبان کا تجزیہ کرتے ہیں - تو اس میں عربی کے چند دخیل الفاظ کے علاوہ عربی زبان کے صوتی ، صرفی یا نحوی کسی قسم کے اثرات نہیں ملتے - حالانکہ اس نظریے کی رو سے ان اثرات کی بڑی امید کی جا سکتی تھی ؛ بہ دکنی ادب میں بیجا پوری زبان کے نقوش ضرور ملتے ہیں لیکن یہ نقوش اردو زبان کے لیے بالکل اجنبی ہیں - ہاشمی صاحب دکنی ادب کے نمونے تو پیش کرتے ہیں لیکن دکن میں اس زبان کی روایت کو ثابت کرنے کے لیے اس کے بدلتے ہوئے روپ پیش نہیں کرتے حالانکہ ادب سے پیشتر زبان کے مختلف نمونوں کا وجود ضروری ہے - یہ کیسے مان لیا جائے کہ وہ جس زبان کا ادب پیش کر رہے ہیں اس میں ابتداہی سے ادبی سرمایہ جمع ہونے لگا تھا -

دکنی ادب کا آغاز علاؤ الدین خلجی کے حملے کے بعد ہوتا ہے حالانکہ اس کا ذخیرہ تو اس سے بہت پہلے سے جمع ہونا چاہیے تھا - کیونکہ عرب مسلمانوں کی ساحل مالا بار پر آمد و رفت صدیوں پیشتر سے جاری تھی - آٹھویں صدی عیسوی کے ہندو فلسفی شنکر آچاریہ کے نظریات پر

اسلام کا اثر نمایاں ہے ۔ خود اس کے وطن کا راجا بھی مسلمان ہو گیا تھا ۔ اگر ہم اس سلسلے میں مولوی صاحب سے اس زمانے کے ادب اور زبان کے نمونوں کا مطالبہ کریں تو کیا بے جا ہے ۔ لیکن مسلمانوں کے ساحل مالابار پر اس قدر گہرے اثرات کے زمانے میں جس زبان کی پیدائش کی بجا طور پر توقع کی جا سکتی ہے اس کے ثبوت میں ہاشمی صاحب ، علاؤ الدین خلجی کے عہد یعنی چار سو سال بعد کے زمانے کا ادب پیش کرتے ہیں ۔ تاریخی حقائق پر نظر ڈالیے تو معلوم ہو گا کہ دکنی ادب بیشتر حضرت خواجہ سید محمد گیسو دراز اور ان کے سلسلے کا مرہون منت ہے اور خواجہ صاحب کافی عمر پا کر دہلی سے ہجرت کر کے دکن گئے تھے ۔ علاؤ الدین خلجی کے حملہ دکن نے کتنے ہی بزرگوں کی ہجرت کے لیے راستہ صاف کر دیا تھا ۔ انھیں حالات کے تحت قدیم دکنی ادب کو لوگ قدیم دہلوی ادب کہتے ہیں اور صحیح کہتے ہیں ۔

سب سے آخر میں مجھے یہ کہنا ہے کہ اگر دکنی ادب کا لسانی تجزیہ کیا جائے ۔ تو اس میں ہند شمالی کی بہت سی زبانوں کا حصہ نظر آ جائے گا ۔ حافظ محمود شیرانی اسے پنجابی کہتے ہیں اور ڈاکٹر مسعود الحسن خاں پنجابی کے علاوہ اس میں ہریانی اور میواتی کا بھی سراغ لگاتے ہیں اور ان تمام زبانوں کا سنگیم ایک شہر دہلی ہے ۔ اس لحاظ سے بھی قدیم دکنی ادب قدیم دہلوی ادب ہی ٹھہرتا ہے ۔ میں اس ادب میں بیجا پوری زبان کے نقوش بھی دیکھتا ہوں لیکن یہ نقوش بہت کم ہیں ۔ زبان کا پورا ڈھانچہ دہلی میں تیار ہوا ہے خود ملا وجہی "سب رس" کی زبان کو "زبان ہندوستان" کہتے ہیں جس سے ان کی مراد زبان دہلوی ہے ۔ کیونکہ آج تک دکن والے شمالی ہندوستان کو ہندوستان ہی کہتے چلے آ رہے ہیں ۔ جوش ملیح آبادی کا شعر اس حقیقت پر شاہد ہے :

آ کر دکن میں ہم پہ یہ عقدہ کھلا کہ جوش
ہندوستاں میں رہتے ہیں ہندوستان سے دور

اب مولانا سلیمان ندوی کی تجویز پر غور کیجیے ۔ وہ اپنی کتاب "نقوش

سلیمانی" میں کہتے ہیں کہ محمد بن قاسم کے سندھ پر حملے کے باعث دو زبانوں کا ملاپ ہوا اور ان سے جو نئی زبان بنی وہ اردو تھی - میں پوچھتا ہوں کہ اگر عربی (کیونکہ محمد بن قاسم اور اس کے ہمراہیوں کی زبان عربی تھی) اور سندھ کی اس وقت کی مقامی بولی سے اردو بن گئی تو پھر موجودہ سندھی کا ماخذ کیا ہوگا اور اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ موجودہ سندھی بھی اس زبان کی بیٹی ہے جو اس وقت رائج تھی یا موجودہ سندھی ہی اس زمانے میں رائج تھی - تو پھر عربی اور سندھی ہی اردو کے دو عناصر ترکیبی قرار پاتے ہیں لیکن جب ہم اردو زبان کا تجزیہ کرتے ہیں تو اس پر عربی کا اثر صرف چند مستعار الفاظ اور اس کی لپی تک محدود ہے اور موجودہ سندھی اردو سے اس قدر مختلف ہے کہ دونوں میں کسی قریبی رشتے (بہناپے) کا گمان بھی نہیں ہو سکتا -

مولانا سلیمان ندوی سندھ میں اردو زبان کی روایت بھی ثابت نہیں کر سکے اور نہ یہی بتا سکے کہ اردو کیوں اور کس طرح سندھ سے باہر پھینکی گئی اور سندھ سے نکلتے وقت اس نے کس کس منزل میں قیام کیا - اس کے علاوہ محمد بن قاسم کا سندھ میں قیام نہایت مختصر بتایا جاتا ہے - اتنی قلیل مدت زبان سازی کے جملہ مراحل طے کرنے کے لیے کافی نہیں ہو سکتی۔ اگر یہ بھی تسلیم کر لیا جائے کہ محمد بن قاسم کی واپسی کے بعد کچھ مسلمان یہیں رہ بس گئے تو ان کی تعداد اتنی مختصر تھی کہ ان کے لیے ایک نئی زبان کا جنم ایک مضحکہ انگیز خیال معلوم ہوتا ہے - میں مولانا کے اس خیال کو محض ایک مفروضہ سمجھتا ہوں اور اسے نظریے کا درجہ اس لیے نہیں دیتا کہ اس کی بنیاد شواہد و دلائل کے بجائے ظن و قیاس پر قائم ہوئی ہے -

حافظ محمود شیرانی نے اپنی کتاب "پنجاب میں اردو" میں یہ نظریہ پیش کیا ہے کہ مسلمان ہندوستان میں سب سے پہلے پنجاب پر حملہ آور ہوئے اور یہیں بس گئے - بلکہ ان کے مسلسل حملوں اور اس علاقے میں سے گزرتے رہنے کا زمانہ دوسرے مقامات کی بہ نسبت بہت طویل رہا ہے - چنانچہ پنجاب میں دیسی (ہندو) اور بدیسی (مسلمان) کے تصادم اور میل ملاپ کے نتیجے میں ان کی زبانیں بھی شیر و شکر

ہوگئیں اور چونکہ اس علاقے میں آنے والے مسلمانوں کی مادری زبان فارسی تھی - اس لیے فارسی اور پنجابی کی ملاوٹ سے اس نئی زبان کا ہیولیٰ تیار ہوا جو آج اردو کے نام سے موسوم ہے - شیرانی اردو زبان کی روایت کے طور پر کچھ شعرا و مصنفین کا کلام بھی پیش کرتے ہیں -

شیرانی کے نظریے کے دو پہلو ہیں - تاریخی اور تجزیاتی - اس کے تاریخی پہلو میں وہی عام استدلال کہ اردو مسلمانوں کی آمد پر ضرورت کے تحت فارسی اور دیسی زبان کی آمیزش سے پیدا ہوئی شامل ہے - میں اس غلط فہمی کی تردید عمومی طور پر کر چکا ہوں - اب یہاں خصوصیت کے ساتھ ان کے بیانات پر بحث کروں گا - شیرانی کے نزدیک چونکہ مسلمان حکمران پنجاب سے دہلی کو جاتے رہے اس لیے وہ یہاں کی زبان بھی ساتھ ہی لیتے گئے - میں ان کی اس بات کو تسلیم کرتا ہوں کہ پنجاب سے دہلی جانے والے کوئی نہ کوئی زبان بولتے ہوئے ضرور گئے ہوں گے لیکن میرے نزدیک وہ پنجابی تھی اور یہ بالکل فطری بات ہے جس کے لیے کسی ثبوت کی ضرورت نہیں ہے جب شیرانی اس کو اردو بتاتے ہیں تو انھیں جانے والوں کی فہرست پیش کرکے نام بنام یہ ثابت کرنا تھا کہ ان کی مادری زبان اردو تھی - اسی تاریخی نقطۂ نظر سے وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ مسعود سعد سلمان نے ہندی میں بھی شاعری کی تھی اور ایک دیوان ہندی مرتب کیا تھا - جس کا ثبوت مختلف ذرائع سے ملتا ہے - چونکہ اس زمانے کے مسلمان ہندوستان کی ہر زبان کو ہندی (ہندوستان کی) کہتے تھے اس لیے شیرانی اس دیوان ہندی کو دیوان اردو فرض کر بیٹھے - حالانکہ اسی اصول کی رو سے اسے دیوان پنجابی بھی کہا جا سکتا ہے اور میرے نزدیک یہی حقیقت بھی تھی -

اردو زبان کی روایت کے سلسلے میں شیرانی کہتے ہیں کہ جو زبان پنجاب سے چلی تھی وہ دہلی ہوتی ہوئی دکن پہنچ گئی اور اس طرح وہ قدیم دکنی ادب کو اردوئے قدیم کے نمونے کے طور پر ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں - میں ان کی بیان کی ہوئی اس تاریخی حقیقت کو تو تسلیم کرتا ہوں کہ قدیم دکنی ادب دراصل قدیم دہلوی ادب ہے اور چونکہ

اس میں پنجابی زبان کے گہرے اثرات ملتے ہیں - اس لیے یہ قبول کرنے میں بھی کوئی تامل نہیں ہے کہ زبان نے پنجاب سے براہ دہلی دکن کو سفر کیا ہے لیکن میں ان کے اس خیال سے اختلاف کرتا ہوں کہ وہ زبان اردو تھی - جو لوگ قدیم دکنی ادب کو اردوئے قدیم کہتے ہیں وہ ایک غلط فہمی میں مبتلا ہیں ۔ اس ادب میں ہم کو پنجابی ، میواتی ، ہریانی اور بیجا پوری کے روپ تو ملتے ہیں اور نہیں ملتے تو اردو کے ۔ میرے نزدیک قدیم دکنی ادب جس زبان کی نمائندگی کرتا ہے وہ واضح طور پر اردو سے مختلف ہے -

شیرانی کے نظریے کا دوسرا پہلو تجزیاتی ہے انھوں نے برج بھاشا اور اردو زبان کا تجزیہ اور موازنہ کرکے مولانا آزاد کے اس خیال کی تردید کی ہے کہ اردو برج بھاشا سے نکلی اور میں اس باب میں اُن سے اتفاق کلی رکھتا ہوں لیکن انھوں نے اردو اور پنجابی کا موازنہ کرکے جو یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ اردو پنجابی سے نکلی ہے - اسے ماننے سے قاصر ہوں ۔ میرے نزدیک جو انداز فکر اشتقاق اردو کے متعلق مولانا آزاد نے اختیار کیا ہے - وہی حافظ محمود شیرانی نے بھی اپنا لیا ہے - مولانا آزاد کو اردو اور برج بھاشا کی بعض مشترک خصوصیات کی بنا پر یہ غلط فہمی ہوئی تھی کہ ان دونوں زبانوں میں ماں بیٹی کا رشتہ ہے لیکن دونوں کے اختلافات پر اُن کی نظر نہ گئی ۔ شیرانی نے بھی اردو اور پنجابی کی مشابہت پر یہ فیصلہ کر دیا کہ ان میں ماں بیٹی کا رشتہ ہے اور اختلافات کو کبھی قدیم دکنی ادب سے مثالیں دے کر اور کبھی یہ اعتراض کرکے کہ اردو والوں نے پنجابی کی بعض خصوصیات کو اردو سے نکال دیا ہے ، ٹالنے کی کوشش کی ہے لیکن اردو اور پنجابی کے اختلافات اتنی آسانی سے نہیں ٹالے جا سکتے اور نہ اُن کی مشترک خصوصیات پر ہی انھیں متحد الاصل قرار دیا جا سکتا ہے اس لیے کہ شیرانی نے جو باتیں مشترک بتائی ہیں ان میں سے کچھ تو دوسری معاصر زبانوں میں بھی ملتی ہیں اور کچھ قدیم پراکرتوں میں ملتی تھیں جن سے دونوں نے میراث پائی ہے -

سب سے پہلے میں شیرانی کی بیان کی ہوئی مشترک قدروں پر غور

کرتا ہوں ۔ مادے پر "نا" کا اضافہ کر کے مصدر بنانے کا قاعدہ نہ صرف اردو اور پنجابی میں ملتا ہے بلکہ مرہٹی میں بھی پایا جاتا ہے جیسے بھرنا ، اڑنا وغیرہ ۔ تذکیر و تانیث کے قواعد مرہٹی میں بھی وہی ہیں جو اردو اور پنجابی میں مشترک ہیں ۔ مثلاً اردو لڑکا ، لڑکی ، پنجابی کُڑا ، کُڑی ، مرہٹی ، مُلگا ، مُلگی ۔ علامت تانیث "ی" مرہٹی میں بھی ملتی ہے ۔ اسما و صفات و افعال مرہٹی میں بھی " آ " پر ختم ہوتے ہیں بلکہ " آ " کا خاتمہ تو ہمیں پراکرت میں بھی ملتا ہے ۔ علامت مستقبل "گ" نہ صرف اردو اور پنجابی ہی کی خصوصیت ہے ۔ بلکہ برج بھاشا اور تامل میں بھی ملتی ہے ۔ مادہ بطور اس ویدک کال سے آج تک پورے ہندوستان کی قدیم و جدید زبانوں میں یکساں طور پر مستعمل چلا آ رہا ہے ۔ کہیے اور لیجیے وغیرہ کے لاحقے پراکرتوں سے آئے ہیں ۔ لازم و متعدی اور متعدی بالواسطہ کے قاعدے بہت سی جدید زبانوں میں عام ہیں اور معروف و مجہول کا طریقہ بھی مشترک ہے ۔ چنانچہ مجہول کے لیے "جانا" کے رویوں کا استعمال برج بھاشا اودھی، مرہٹی وغیرہ بہت سی زبانوں میں ملتا ہے اور امدادی افعال بھی عام ہیں ۔ اردو "تھا" ملتانی مصدر " تھیونڑ " سے نہیں بلکہ سہارا شٹری پراکرت کے روپ اتھی ، تھی وغیرہ سے بنا ہے چنانچہ "تھا" اڑیا میں بھی ملتا ہے ۔ جنوبی مغربی بنگال میں دندانی غنی سے بدل گیا ہے ۔ وہاں اسے "تھا" بولتے ہیں اور ملتانی مصدر "تھیونڑ" پراکرت میں بھی "تھا" سے قطعی الگ ملتا ہے ۔ دراصل موجودہ زبانوں کے تمام قاعدے ہمیں پراکرتوں میں مل جاتے ہیں ۔ اس لیے ایک جدید زبان کو دوسری جدید زبان سے مشتق بتانا اصولی طور پر غلط ہے ۔

اب ذرا دونوں زبانوں کے اختلافات دیکھیے ۔ پنجابی کا غنی ن نہ صرف اردو تحریر بلکہ بول چال سے بھی غائب ہے ۔ اردو کا "س" پنجابی میں "ہ" بولا جاتا ہے ۔ جیسے اردو پیسا ، پنجابی پیہا ، اردو سسرا ، پنجابی سوہرا ، اردو چالیس ، پنجابی چالیہہ وغیرہ اردو کے غنی حروف پنجابی میں دندانی ہیں جیسے اردو ٹوٹ پنجابی تٹ، اردو ڈھکیل پنجابی دھکیل ، اردو میں "ب" اردو پنجابی میں "و" بولنے کا رجحان

ہے ۔جیسے اردو بال پنجابی وال، اردو بچھانا پنجابی وچھانا وغیرہ ۔ اردو کا ابتدائی الف پنجابی میں "ہ" بولا جاتا ہے ۔ جیسے اردو ایک پنجابی ہک ، اردو اور پنجابی ہور ، اردو ڑ کی جگہ پنجابی میں ڈ ملتی ہے جیسے اردو بڑا پنجابی وڈا، اردو چھوڑنا، پنجابی چھڈنا ، لفظ کی درمیانی ہ کو پنجابی میں ہمزہ کی طرح بولتے ہیں ۔ جیسے شہر=شیئر ۔ یہی حال گجراتی میں ہے ۔ اردو ڑھ کی آواز پنجابی سے غائب ہے ۔ اسی لیے گورمکھی تحریر میں ڑ کے نیچے چھوٹی سی ہ بنا کر اس آواز کو ظاہر کیا جاتا ہے ۔ پنجابی میں تشدید بہت زیادہ ہے ۔ اردو کا رجحان تسہیل کی طرف زیادہ ہے ۔ مثلاً اردو آٹھ پنجابی اٹھ ، لدو آگ ، پنجابی اگ ، اردو ہاتھ ، پنجابی ہتھ وغیرہ ۔ اردو میں جمع مؤنث آں ، یں ، اوں کے لاحقوں سے بنائی جاتی ہے اور پنجابی میں صرف آں سے جیسے اردو باتیں ، لڑکیاں ، کتابوں ، پنجابی باتاں ، کڑیاں ، کتاباں ۔

اردو اور پنجابی میں عوامل مختلف ہیں ۔ جیسے اردو کا کو ، سے ، میں ۔ پنجابی دا ، نوں ، تے ، وچ ۔ یہی حال ضمیروں کا ہے ۔ چنانچہ اردو مجھ ، تجھ ، ہم ، تم کی جگہ پنجابی میں اساں ، تے تسی ، تساں وغیرہ ملتی ہیں اردو کی ضمیر غائب ، یہ وہ ، اس ، اُس ، جس ، کِس ، اِن ، اُن ، جِن ، کِن کی جگہ پنجابی میں ایہہ ، اوہ ، جہ، کہہ ، انہاں ، اُنہاں ، جنہاں ، کنہاں ، تنہاں ، کاہ ، کاس وغیرہ مستعمل ہیں اور اردو ضمیر اضافی ہمارا ، تمھارا کی جگہ ساڈا ، اساں دا ، تہاڈا ، تساں دا وغیرہ استعمال ہوتی ہیں اردو حالیہ ناتمام مادے پر "تا" اور پنجابی حالیہ ناتمام مادے پر "دا" کے اضافے سے بنتا ہے جیسے اردو چلتا ، نکلتا ، کرتا ، پنجابی چلدا ، نکلدا ، کردا ۔ اردو حالیہ تمام صحیح الاواخر مادوں پر "آ" اور معلول الاواخر مادوں پر "یا" کے اضافے سے بنتا ہے ۔ لیکن پنجابی میں بلا استثنا ہر ایک پر "یا" کا لاحقہ بڑھاتے ہیں ۔ جیسے اردو مارا ، چلا ، سنا ، آیا ، بوئیا ، پنجابی ماریا ، چلیا ، سنیا ، آیا ، بویا وغیرہ اردو کی علامت فاعلی "نے" پنجابی میں سرے سے ملتی ہی نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ان اہم بنیادی اختلافات کی کوئی لسانی توجیہہ پیش نہیں کی جا سکتی ۔ زیادہ سے زیادہ پنجابی

خصوصیات کو قدیم دکنی ادب میں دکھایا جا سکتا ہے لیکن اس سے قبل اس ادب کو اردو کے قدیم ثابت کرنا ہوگا جو ناممکن ہے۔

اردو کو ملواں زبان سمجھ کر جو نظریات و مفروضات ہمارے یہاں قائم کیے گئے تھے ۔ میں فرداً فرداً ان سب کی تردید کر چکا ہوں اور اب صرف اس غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے کہ اردو کا وطن اصلی دہلی ہے یہ دعویٰ اول اول دلی والوں کی طرف سے کیا گیا تھا ۔ لیکن بعد میں دلی والوں کے اور بھی معتقد پیدا ہو گئے تھے ۔ اس غلط فہمی کی وجوہ یہ تھیں کہ دلی سلاطین مغلیہ کی راجدھانی رہی اردو ادب کو فروغ بھی دلی میں کافی ہوا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ شاہجہان نے اس زبان کا نام بھی دلی ہی کے ایک علاقے کی نسبت سے "اردو" رکھا ۔ اس طرح اردو زبان کے سلسلے میں لوگوں کو دلی ہی کی اہمیت نظر آئی اور وہ اسی کو اردو کی سرزبوم سمجھ بیٹھے ۔

دلی مسلمانوں کی آمد سے قبل بھی راجدھانی رہی تھی ۔ اگر اردو دہلی یا نواح دہلی میں پیدا ہو کر ہمیشہ سے وہاں کی زبان چلی آ رہی تھی ۔ تو ہمیں اس زمانے میں اس زبان کے نمونے ملنا چاہئیں ۔ شہاب الدین محمد غوری کے حملے کے وقت دلی میں پرتھوی راج کی حکومت تھی ۔ اسی کو غوری نے ترائن کی لڑائی میں ۱۱۹۲ء میں ہرایا تھا ۔ اس کا مشہور درباری شاعر چندر بروائی ایک نظم "پرتھی راج راسو" کا خالق کہا جاتا ہے ۔ بعض علما اس کے کچھ اجزا کو چندر بروائی کی تصنیف بتاتے ہیں ۔ لیکن شیرانی نے پوری نظم کو جعلی الحاق ثابت کرنے کی کوشش کی ہے ۔ اس کے باوجود اتنا ضرور ماننا پڑے گا کہ یہ اسی زمانے کے آس پاس کی زبان میں لکھی گئی ہے اس میں سنسکرت کے علاوہ کچھ فارسی، عربی کے الفاظ بھی پائے جاتے ہیں ۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تک دیسی زبانوں پر مسلمانوں کی زبان کے اثرات ظاہر ہونے لگے تھے ۔ چنانچہ ایسے ہی کچھ الفاظ کی فہرست مولانا آزاد نے بھی آب حیات میں دی ہے لیکن اس میں اردو کے آثار بالکل نہیں ملتے ۔ البتہ دیسی زبانوں میں سے برج بھاشا، راجستھانی

اور پنجابی کا اثر زیادہ ملتا ہے آپ بھی ملاحظہ کر لیجیے :

ڈھنک جنگی ہر سرت تٹ اون آوک مٹائے
تان اک تاہس تپ تپت تالی برہم لگائے

تالی کھلیتا برہم دکھ اک اسر اؤ بھنت
رکھ دیہہ چکھ سیس مکھ کرنا جس جپنت

تن رشی پچھیا تاہی کون کارن ات انگم
کون تھان تم نام کون دس کریا سنجگم

اس سے کچھ عرصہ قبل یعنی ۱۱۵۵ء کے قریب ایک اور شاعر نرپت نالھ نے "بیسل دیورا سو" نامی ایک نظم لکھی تھی ۔ لیکن اس پر بھی برج بھاشا راجستھانی کا اثر زیادہ ہے ۔ سنیے ۔

جب لگ سہیل آگے سور جب لگ گنگ بہے جل پور
جب لگ پرتھمی تی جگناتھ جانی راجا سر دیہ ہو ہاتھ

راس بھوں تو راؤ کو باجے پڑے پکھاوج بھیر
کر جوڑے نرپت کہے ابی چل راج کیجو اجمیر

چندر بروائی کا ہم عصر ایک اور شاعر جگنا یک گزرا ہے جو سہوبا کے راجا پرمال کے یہاں رہتا تھا ۔ اس نے آلھا نامی ایک طویل نظم لکھی تھی ۔ جو اب ناپید ہے ۔ آلھا آج بھی یورپی کے دیہات میں گائی جاتی ہے اور ممکن ہے کہ اس کے گانے کا طرز بھی قدیم ہو ۔ لیکن اس میں جگنا یک کا ایک بھی چھند نہیں ملتا ۔ کہتے ہیں کہ شارنگ دھر نامی شاعر نے بھی ایک نظم ہمیر راسو کے نام سے لکھی تھی ۔ جو ہمیر سنگھ والی رنتھمبور سے متعلق ہے ۔ یہ وہی ہمیر سنگھ ہے جو ۱۳۰۰ء کے قریب علاؤ الدین خلجی کے حملے کے وقت مارا گیا تھا اس نظم میں بھی اردو کے نقوش نہیں ملتے ۔ اس لیے اس کا نمونہ ترک کرتا ہوں ۔

اس سلسلے میں دلی کے شاعر حضرت امیر خسرو (متوفی ۱۳۲۵ء) کا نام بہت لیا جاتا ہے کہ وہ اردو کے پہلے شاعر تھے - چنانچہ ان سے بہت سی پہیلیاں "کہہ" کرنیاں وغیرہ بھی منسوب کر دی گئی ہیں۔ خالق باری بھی ان سے منسوب تھی لیکن حافظ محمود شیرانی نے اپنی تحقیق سے ثابت کر دیا ہے کہ خالق باری عالمگیری عہد کے ایک شاعر "خسرو" کی تصنیف ہے میرے نزدیک تمام منظومات اردو جو امیر خسرو سے منسوب ہیں ، الحاق ہیں کیا عجب جوان کا مصنف بھی وہی "خسرو" ہو جس نے خالق باری نظم کی تھی۔ . . امیر خسرو کے کلام کی قدیم ترین سند صرف ایک دوہرہ ہے جو ملا وجہی نے اپنی کتاب "سب رس" (سن تصنیف ۱۶۳۵ء) میں دیا ہے :

پنکھا ہو کر میں ڈلی ساتی تیرا چاؤ
سجہ جلتی جنم گیا تیسرے لیکھن باؤ

. . . . اسے کسی طرح بھی اردو نہیں کہا جا سکتا ۔ اس کا انداز بالکل قدیم دکنی ادب کا سا ہے ۔ امیر خسرو کے بعد عہد شاہجہانی تک پھر تو کسی دہلوی شاعر کا نام ہی نہیں آتا ۔

مدعا کہنے کا یہ ہے کہ شاہجہان سے قبل دلی میں اردو کا سراغ نہیں ملتا ۔ اردو زبان و ادب کی نشوونما میں البتہ دہلی کا بہت کچھ حصہ ہے لیکن وہ سب کا سب ۱۶۳۶ء کے بعد کا ہے - اس لیے یہ کہنا کہ اردو دہلی میں پیدا ہوئی ۔ تاریخی اعتبار سے بالکل غلط ہے - اس سے قطع نظر نہ صرف نواح دہلی بلکہ خود شہر دہلی میں اردو آج بھی عوام کی زبان نہیں ہے - اس کی وجہ یہ ہے کہ دہلی کی قدیم زبان ہریانی ہے - جس کا سلسلہ شمالی مغربی یو۔پی تک چلا گیا ہے اور جو پنجابی کی سگی بہن ہے ۔ "قومی زبان" کراچی بابت یکم و ۱۶ جولائی ۱۹۶۱ء کے شمارے میں ہاشمی فرید آبادی کا بیان پڑھیے تو میرے اس دعویٰ کی آپ کو مزید تصدیق و توثیق ہو جائے گی ۔ وہ کہتے ہیں " کاتب الحروف کا خاندان تین صدی سے نواح دہلی کا باشندہ ہے - لیکن وہاں کے دیسی کسان ، مالی ، امیر ہندوؤں کی اصلی بولی نہ بول سکتا تھا نہ پوری طرح سمجھ

سکتا تھا ۔ اسی طرح خاص شہر دہلی کے ہندو ، راج ، مزدور ، بنئیے اگرچہ بہاری اردو بولتے سمجھتے تھے۔ مگر ان کی گھریلو بولی بڑی مختلف اور مسلم اردو سے جدا گانہ چیز تھی" ۔ اس بیان سے بھی واضح ہوتا ہے کہ دہلی اور نواح دہلی کی اصلی اور قدیمی زبان اور ہے اور زبان اردو اور ہے چونکہ اردو دہلی میں باہر سے درآمد کی ہوئی زبان تھی اس لیے آج بھی عوام میں اس کا چلن نہیں ملتا ۔

اس سلسلے میں کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ دلی میں شاعری ولی اورنگ آبادی کی آمد کے بعد شروع ہوئی لیکن یہ غلط ہے ۔ آغاز اردو کے سلسلے میں نہ جانے لوگ کیوں ایسی غیر متعلق سی باتیں کرکے خلط مبحث کر دیا کرتے ہیں ۔ شاعر دہلی میں ولی سے قبل بھی موجود تھے لیکن وہ قدیم زبان دہلوی میں شعر کہتے تھے اور بیشتر غیر ثقہ اور سنجیدہ غیر قسم کی شاعری کرتے تھے ۔ ولی بھی اگرچہ قدیم زبان دہلوی کے شاعر تھے لیکن سنجیدہ و فہمیدہ شاعر تھے یہی وجہ ہے کہ جب یہ دہلی پہنچے تو لوگوں نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا اور ان کی وہ آؤ بھگت اور خاطر داری کی کہ ولی خود کہہ اٹھے :

دل ولی کالے لیا دلّی نے چھین
جا کہے کوئی محمد شاہ سوں

لوگوں نے محض اپنی کج فکری کی بنا پر اہل دہلی کی اس مہمان نوازی کو ان کے احساس کمتری پر محمول کیا اور یہ سمجھا کہ دہلی والوں کو شاعری ہی ولی نے سکھائی ۔ حالانکہ اسی زمانے میں دہلی کے میر مشاعرہ سراج الدین علی خان آرزو کی جگت استادی کا جو ڈنکا بج رہا تھا ۔ اس سے پورا شہر دہلی گونج رہا تھا ۔ اگر ولی اتنے ہی عظیم شاعر ہوتے اور دہلی والوں کو شعر گوئی میں اصلاح دینے کے قابل ہوتے تو شیخ سعد اللہ گلشن ان کی خدمت میں اپنا مشورہ مخلصانہ کیوں پیش کرتے ۔

عہد شاہجہانی میں راجدھانی بن جانے کے بعد دہلی میں جو لسانی انقلاب آیا اور جس کے نتیجے میں قدیم زبان دہلوی (ہریانی) کو ترک

کر کے جدید زبان دہلوی (اردو) کو اختیار کیا گیا اس کی جانب پہلا کھلا ہوا اشارہ شیخ سعد اللہ گلشن کے اسی مشورے میں ملتا ہے کہ "زبان دکھنی را گذاشتہ ریختہ را موافق اردوئے معلیٰ شاہجہان آباد موزوں بکنید" ۔

اس واقعے سے ظاہر ہے کہ اس وقت تک دلی والوں کی زبان بدل چکی تھی اور انھوں نے امیر خسرو ، شیخ بہاؤ الدین باجن اور ابوالفضل کی زبان دہلوی ۔ہریانی) کو چھوڑ کر شاہجہان کی نئی زبان (اردو) کو اپنا لیا تھا جسے اس بادشاہ نے دہلی کی قدیم زبان سے ممیز کرنے کے لیے زبان "اردوئے معلی" کا خطاب عطا کیا تھا اور جس کا معیار چند منتخبین روزگار کے محاورے پر قائم ہوا تھا ۔ اس کے متعلق حکیم احمد یکتا دستور الفصاحت کے مقدمے میں لکھتے ہیں ۔"تام ہمیں محاورۂ خاص باردوئے معلیٰ شہرت گرفت لیکن این زبان باشرڈ مذکورہ یافتہ نمی شود مگر در بعضے باشند ہائے شاہجہان آباد" ۔ خود انشاء اللہ خاں کے قول کے مطابق دہلی میں اردو زبان کی سند قلعہ معلی یا فصحا کے گھرانوں سے لی جاتی تھی ۔ میر حسن نے اپنے تذکرے میں حاتم کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس سے بھی دہلی کی قدیم و جدید دو زبانوں کا علم ہوتا ہے ۔ وہ لکھتے ہیں : "دو دیوان ترتیب دادہ ۔ یکے بہ زبان قدیم بہ طرز ایہام و دوم بہ زبان حالی ادائیہ" ۔ اسی بیان کا اعادہ حکیم سید شمس اللہ قادری نے اپنی کتاب "اردوئے قدیم" میں کیا ہے ۔ "ان کے دو دیوان تھے ۔ ایک قدیم اور دوسرا جدید زبان میں" ۔ ان تمام شواہد سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ زبان اردو دہلی کی قدیم زبان نہ تھی بلکہ دہلی میں اس کا داخلہ شاہجہان کے ساتھ ہوا ہے ۔

سطور بالا میں آغاز اردو کے متعلق میں نے ان دونوں قسم کے نظریات کی تردید کر دی ہے جن کا ذکر اس مقالے کی ابتدا میں کر چکا ہوں اب اس ذمہ داری کے پیش نظر جو بخلاف نظریات سے مجھ پر عائد ہوتی ہے یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ اس مسئلے کے مثبت پہلو پر بھی ایک سرسری سی نظر ڈال لوں تا کہ میری پیش کی ہوئی تصویر یک

رخی نہ رہ جائے۔

ہماری زبان ہمیشہ سے اسی ملک میں بولی جاتی رہی ہے۔ البتہ اس کا نام "اردو" عہد شاہجہانی میں رکھا گیا ہے۔ اس سے قبل اس زبان کا کیا نام تھا۔ اس کے متعلق مجھے اس وقت علم نہیں لیکن علمائے زبان برج بھاشا سے اسے ممیز کرنے کے لیے کھڑی بولی کہتے ہیں۔ ریختہ اس مکمل زبان کا نام کبھی بھی نہیں رہا۔ بلکہ صرف اس کی اس نظم کو ریختہ کہا گیا جس میں فارسی، عربی بحور کے ساتھ ان زبانوں کے الفاظ بھی شامل ہوتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اول اول ریختہ کا لفظ فن موسیقی کی ایک اصطلاح کے طور پر ایجاد ہوا۔ اس سے موسیقی کی وہ قسم مراد ہوتی تھی۔ جو ہندوستانی اور ایرانی موسیقی کی ملاوٹ سے بنتی تھی۔ پھر یہ لفظ ان اشعار کے لیے بھی بولا جانے لگا۔ جو ان مرکب سروں پر گائے جاتے تھے اور جن میں دیسی بولوں کے ساتھ فارسی عربی الفاظ بھی ملے ہوتے تھے۔ میں نے کبیر داس، رے داس، داد و دیال اور غریب داس وغیرہ بھگتوں کے ریختوں کے مخطوطات دیکھے ہیں جن میں یہی خصوصیت ملتی ہے جس کا ذکر میں نے اوپر کیا۔ اس سے میں اسی نتیجے پر پہنچا ہوں کہ لفظ ریختہ کو ہندو مسلمان دونوں انہیں معنوں میں استعمال کرتے تھے۔ میر تقی میر نے بھی اپنے تذکرے میں ریختے کی کئی قسمیں گنائی ہیں۔ یہ لفظ ادب اردو میں عہد غالب تک استعمال ہوتا رہا ہے لیکن اس کا اطلاق اردو نثر پر کبھی نہیں ہوا۔

دنیا کی کوئی زبان دو زبانوں کی ملاوٹ سے نہیں بنی۔ یہی بات اردو زبان کے باب میں بھی صحیح ہے جو اپنی دوسری معاصر زبانوں کی طرح پراکرت سے مشتق ہوئی ہے۔ بعض لوگ اسے شور سینی پراکرت سے ماخوذ بتاتے ہیں لیکن یہ بالکل غلط بات ہے۔ میں ہریانی، راجستھانی پنجابی اور گجراتی کو شور سینی سے مشتق سمجھتا ہوں لیکن اردو کا اس پراکرت سے کوئی علاقہ نہیں دیکھتا۔ ڈاکٹر شوکت سبز واری نے اپنی کتاب "اردو زبان کا ارتقا" میں اس نظریے کی اچھی طرح تردید کر دی ہے اس لیے اس بحث کا یہاں دہرانا تحصیل حاصل ہے البتہ خود ڈاکٹر

شوکت سبز واری اردو کو پالی سے متفرع بتاتے ہیں چونکہ یہ نظریہ بھی صحیح نہیں ہے اس لیے یہاں اس پر اظہار خیال ضروری ہے ۔

(۱) وہ کہتے ہیں کہ سنسکرت کی حرکات آ ے اور آو پراکرت میں آ اِ اور آ ءُ ہوتی ہیں اور پالی میں اے اور آو اردو اس باب میں پالی کی ہم نوا ہے ۔ اس میں آاِ اور آاءُ نہیں ہوتیں ۔ پالی پراکرت کی ہی ایک قسم ہے ۔ اس میں وہ تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں جو کسی پراکرت کو سنسکرت سے ممیز کرتی ہیں ۔ اس کی تفصیل ایک علیحدہ مقالے کی محتاج ہے اس لیے میں اس بحث کو ترک کرتا ہوں ۔

قدیم ہند یورپی زبان کے علما اس امر پر متفق ہیں کہ اے اور او قدیم آوازیں تھیں ۔ آ ے اور آو ان کی ارتقائی شکلیں ہیں ۔ خود رگ وید میں بھی ان کا تبادل ملتا ہے ۔ اب رہیں آاِ اور آاءُ کی آوازیں ۔ میں نے ان کو بھی رگ وید میں آ ے اور آو کے حروف علت سے لکھا ہوا دیکھا ہے جیسا کہ اس کی بحور و ارکان وغیرہ سے واضح ہوتا ہے ۔

اگر یہ بھی تسلیم نہ ہو تو پراتی شاکھیہ دیکھیے جس میں لکھا ہے کہ ویدک کے آ ے اور آو حروف کو آاِ اور آاءُ بولا اور پڑھا جاتا تھا ۔ اس طرح ویدک آ ے ، آو = اے ، آو = آاِ ، آاءُ ۔ اب رہی پراکرت تو اس میں سنسکرت آ ے ، آو کے مقابل اے اُو کی آوازیں بھی ملتی ہیں اور اَء ، اَءُ کی بھی ۔ اردو میں پراکرت کی اے ، او آوازیں بدستور موجود ہیں ۔ البتہ اءِ ، اءُ کی آوازیں آ ے ، آو ہو گئی ہیں لیکن یہ دور جدید کا رجحان ہے جو اردو کی معاصر زبانوں میں بھی ملتا ہے ۔ یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ بعض اوقات کسی زبان کی لپی اس کی بول چال کی آوازوں کو ظاہر کرنے میں خطا بھی کر جاتی ہے اس لیے زبان کی تحریری شکلوں کے ساتھ ساتھ تقریری آوازوں پر بھی نظر رکھنا ضروری ہے ۔

(۲) وہ کہتے ہیں کہ شور سینی میں سنسکرت ت پر جگہ د ہو جاتی ہے لیکن پالی میں وہ بدستور ت ہی رہتی ہے ۔ اردو میں

بھی ایسا ہی ہے۔ یہاں فاضل مصنف سے کچھ خلط مبحث ہو گیا ہے کیونکہ انھوں نے پہلے تو ایک عام بیان دے دیا ہے اور پھر مثال میں صرف حالیہ ناتمام پیش کیا ہے۔ غالباً ان کے ذہن میں سنسکرت کا حالیہ ناتمام ہی ہے اور وہ سنسکرت کرتی (وہ کرتا ہے)، چلتی (وہ چلتا ہے) کو حالیے سمجھتے ہیں جو پالی میں کرتی، چلتی، شور سینی میں کریدی، چلیدی، سہاراشٹری میں کرَ عِ، چلَ عِ اور اردو میں کرے، چلے ہوں گے۔ لیکن یہاں ان کو مغالطہ ہوا ہے۔ یہ فعل حال کے روپ ہیں، حالیے نہیں ہیں۔ اردو کے حالیہ ناتمام کرتا چلتا، پراکرات میں کرت، کرتا، چلت، چلتا کے متبادل روپوں میں نظر آتے ہیں اور ان کے یہی روپ ہیں ویدک و سنسکرت میں بھی ملتے ہیں۔ پنجابی میں انھیں کردا، چلدا بولتے ہیں اور یہ پراکرتوں کا فرق ہے کیونکہ پنجابی کا سلسلہ شور سینی سے ملتا ہے۔ جس میں دوسری پراکرتوں کی ت کی جگہ د پائی جاتی ہے۔ یہ کہنا کہ اردو میں پالی کی طرح سنسکرت کی ت ہر جگہ بدستور باقی رہتی ہے۔ کلیہ کے طور پر غلط ہے کیونکہ سنسکرت "کرتی" اردو میں "کرے" اور سنسکرت " اردو میں بھی کرتا" ہوتا ہے یعنی سنسکرت ت کی جگہ اردو میں کہیں ت ملتی ہے کہیں نہیں ملتی اور جب پالی میں بقول ڈاکٹر شوکت سبز واری سنسکرت کی پرت باقی رہتی ہے تو پھر اس کا اردو سے کیا تعلق ہو سکتا ہے۔

(۳) وہ کہتے ہیں کہ بعض لاحقے پالی اور اردو میں مشترک ہیں۔ مثلاً "وا" (والا) پالی میں بھی ہے جیسے گنوا (گن والا) اردو کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔ بھڑوا، پٹوا، پوروا، پچھوا۔

اس کے جواب میں عرض ہے کہ اذاً (تر ز) ، پراکرت اسم فاعل کا ایک لاحقہ تھا۔ جو نہ صرف اردو بلکہ قریب قریب تمام موجودہ زبانوں میں پایا جاتا ہے اس میں پالی کی کوئی

خصوصیت نہیں ہے یہ لاحقہ سنسکرت "دان" سے مخفف نہیں کیا گیا ۔ جیسا کہ انھوں نے اسی کتاب کے ، ص ۱۶۲ پر شبہ ظاہر کیا ہے بلکہ پراکرت کا اصلی لاحقہ ہے جو آریوں کے ہندوستان میں آنے سے پہلے بھی رائج تھا ۔

(۴) وہ کہتے ہیں کہ ظرفی لاحقہ "میں" سنسکرت "سمن" سے پالی میں ہوتا ہوا اردو میں آیا ہے ۔ یہ صحیح نہیں ہے ۔ اردو کا یہ ظرفی لاحقہ براہ راست مہاراشٹری پراکرت کے لاحقہ ظرفی "م" سے مشتق ہے جس پر پراکرت اور اردو کے عام رجحان کے مطابق صرف غُنّہ کا اضافہ ہوا ہے یہ لاحقہ ماگدھی میں بھی ملتا ہے ۔ ثبوت کے لیے "مدرا راکشس" میں کشپنک کا مکالمہ دیکھیے جو ماگدھی بول رہا ہے ہندی میں اس کا ابتدائی کسرہ بدستور باقی ہے جب کہ اردو میں اعراب کی طرف سے لاپروائی برتنے کے باعث لوگ اسے فتحہ سمجھنے لگے ہیں ۔ مہاراشٹری پراکرت کا یہ لاحقہ ہال کی مشہور کتاب "ست سئی" میں عام ہے ۔

(۵) وہ کہتے ہیں کہ ضمیر واحد متکلم "میں" پالی سے لی گئی ہے ۔ یہ درست نہیں ۔ اس کا ماخذ مہاراشٹری پراکرت کا مکتوبی روپ "مِ ءم" ہے ۔ جس پر حسب دستور صرف غنّہ کا اضافہ ہوا ہے ۔ چنانچہ "مِ ء ں" کی آواز آپ کو قنوج و فرخ آباد (یو ۔ پی) میں سننے کو مل جائے گی ۔ اردو میں "ءِ" سے اے ہو جانے پر "مِ ء ں" سے "میں" بن گیا ۔

(۶) وہ کہتے ہیں کہ "ہو" فعل معاون ایک مستقل اور آزاد مادہ ہے جو پہلوی میں بھی تھا۔ اور پالی میں بھی اردو میں اس کا وجود بتاتا ہے کہ اردو اور پالی مشترک الاخذ ہیں ۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ "ہو" کا مستقل اور آزاد مادہ مہاراشٹری پراکرت میں بھی ملتا ہے میں نے اس کی چار شکلیں ہُو ، ہو ، ہو اور ہوٗ مختلف مقامات پر دیکھی ہیں ۔ آپ اسے لکشمی

دھر کی کتاب "شُدْ بھاشا چندر کا" ہی میں ایک جگہ دیکھ لیجیے - اس مادے کو پالی اور پہلوی میں تلاش کرنے کی ضرورت نہیں ہے -

(۷) وہ کہتے ہیں کہ "تھا" اردھ ماگدھی "ہوتھا" سے مشتق ہے اور چونکہ اردھ ماگدھی ڈاکٹر سکسینہ کے خیال کے مطابق پالی سے بہت مشابہ ہے اس لیے اردو پالی سے مشتق ہوئی ہے - میں کہتا ہوں بھلا اس تکلف کی کیا ضرورت ہے کہ پہلے اردو "تھا" کے اشتقاق کے لیے اردھ ماگدھی کے "ہوتھا" کا جزو اول ساقط کیجیے اور پھر اردھ ماگدھی کو ڈاکٹر سکسینہ کی مدد سے پالی سے مشابہ کہیے یہ بالکل سیدھی سی بات ہے کہ اردو "تھا" مہاراشٹری فعل معاون حال "تھی" یا اتھی سے ماخوذ ہے۔"تھی" ہمارے یہاں حسب دستور مؤنث مانا گیا اس سے مذکر "تھا" بنا - لیکن یہ زمانہ حال کا روپ تھا - جسے ہم نے ماضی کے لیے استعمال کیا - پھر بھی یہ کوئی نئی بات نہیں ہے - اردو میں اکثر ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ ہم فعل حال بول کر ماضی مراد لیتے ہیں - بالکل یہی بات پراکرت میں تھی - بھاس کے مشہور ڈرامے "سوپن دا سودتا" میں ر دو شک راجہ کو کہانی سناتا ہے - "اتھی نٹری آجنّی نام - تہیں اہیا و سنی آنی اُ وَ ءِ تھانانی وَ تنتّی کل" داجین نام کی ایک نگری تھی - وہاں بہت سندر باولیاں تھیں) دوسری کہانی یوں سناتا ہے "اتھی نئرم برہم و تم نام - تہیں کل را آ کمپلُو نام" (برہم دت نام کا ایک نگر تھا وہاں کا مپل نام کا ایک راجا تھا) چنانچہ اردو میں ماضی کے لیے اس کا استعمال بھی پراکرت سے آیا ہے جنوبی مغربی بنگال میں حال اور ماضی دونوں کے لیے "ٹھا" استعمال ہوتا ہے - جو اردو "تھا" ہی کی ایک شکل ہے -

(۸) وہ بھنڈارکر کے حوالے سے کہتے ہیں کہ سنسکرت "کرتہ" کا روپ پالی کے ایک کتبے میں کیتَ ہے - اردو مصدر کرنا

کا ماضی "کیا" اسی "کت" کی وساطت سے بنا ہے - مجھے اس کتبے کے متعلق تو علم نہیں - البتہ اتنا جانتا ہوں کہ "دھم پد" میں سنسکرت "کرتہ" کا پالی روپ میں نے ہر جگہ کتَ (بفتحہ کاف) ہی دیکھا ہے - کِت (بکسرہ کاف) کہیں بھی نظر سے نہیں گزرا اور اگر "کت" کو احتراماً صحیح فرض کرکے اردو "کیا" کو اس سے مشتق مان بھی لوں تو پھر اسی اصول اور اسی اشتقاق کی روشنی میں برج بھاشا کے "کیو" اور پنجابی کے "کتیا" کو بھی اس سے ماخوذ سمجھنا پڑے گا - لیکن پالی کے ایک روپ سے اتنے لفظوں کا اشتقاق ناممکن ہے - بہرحال اس قسم کے اشتقاق میں ذہنی ورزش کی بڑی گنجائش رہتی ہے اور اپنے اپنے تخیل کو حقیقت بنا کر پیش کرنے کا بڑا موقع ملتا ہے - البتہ اسے لسانی استدلال نہیں کہہ سکتے -

(۹) وہ کہتے ہیں کہ سنسکرت کا دندانی ن پراکرت میں مخی ن ہو جاتا ہے - لیکن پالی میں اپنی اصلی حالت پر قائم رہتا ہے - اردو کا حال بھی یہی ہے - اس میں پراکرت اور سنسکرت کے مخی ن تک دندانی ن سے بدل گئے ہیں - اول تو یہ خیال کہ سنسکرت کے ہر دندانی ن کے مقابل پراکرت میں مخی ن ملتا ہے جیسا کہ ذروچی نے پراکرت پرکاش میں لکھا ہے غلط ہے - اس کی تردید میں بکثرت مثالیں دی جا سکتی ہیں - دوسرے یہ کہ اردو میں صرف ایک ہی ن (دندانی) ہے - اب چاہے پالی کا دندانی ن ہو - چاہے پراکرت کا مخی ن اردو میں دندانی ہی لکھا پڑھا جائے گا - اس صورت میں یہ کیونکر اندازہ ہو سکتا ہے کہ کسی لفظ میں پراکرت کا مخی ن دندانی بنا ہے یا پالی کا دندانی بدستور قائم رہا ہے - پھر یہ بات بھی موجودہ زبانوں میں صرف اردو ہی سے مخصوص نہیں ہے - بلکہ اس خصوصیت میں اردو کے ساتھ اور بھی زبانیں شامل ہیں - چنانچہ صوبہ متوسط کی مرہٹی، چھتیس گڑھی

اور تلگو میں بھی دندانی ن ہی ملتا ہے تو کیا یہ تمام زبانیں ہی پالی سے نکلی ہیں ۔

ڈاکٹر شوکت سبزواری نے اپنے اس نظریے کی حمایت میں کہ اردو پالی سے نکلی ہے ۔ جتنے دلائل اپنی کتاب "اردو زبان کا ارتقا" میں دیے ہیں ۔ میں نے سطور بالا میں ان سب کی فرداً فرداً تردید کر دی ہے ۔ البتہ اس سلسلے میں مجھے ایک آخری بات کہنا ہے ۔ فاضل مصنف نے اردو کو پالی سے مشتق ثابت کرنے کے لیے سنسکرت کو اساس مان کر استدلال کیا ہے ۔ وہ غالباً سنسکرت کو پراکرتوں کی ماں اور جدید زبانوں کی نانی سمجھتے ہیں ۔ اس لیے انھوں نے ہر جگہ اردو کے ہر لفظ کا سنسکرت کے کسی نہ کسی لفظ سے جوڑ ملانے کی کوشش کی ہے ۔ میرا موقف ان سے بالکل مختلف ہے ۔ میں پراکرتوں کو جو ہماری جدید زبانوں کی مائیں تھیں ۔ ہندوستان کی قدیم دراوڑی زبانیں سمجھتا ہوں اور ویدک و سنسکرت کو ایرانی اور دراوڑی زبانوں کا مرکب مانتا ہوں ۔ جن میں ہمارے الفاظ کے روپ کچھ کے کچھ ہوگئے ہیں ۔ ہماری زبانوں کے اشتقاق میں ان کو بطور معیار یا سند پیش کرنا میرے نزدیک صحیح نہیں ہے لیکن یہ بحث ایک جداگانہ تصنیف کی متقاضی ہے اس لیے میں نے اس کو نہیں چھیڑا ۔ البتہ قارئین سے صرف اتنی گذارش ہے کہ میرے جوابات کا اسلوب کچھ بھی ہو ان کو پڑھتے وقت اس بنیادی اختلاف کو ضرور مدنظر رکھیں اور یہ خیال نہ کر بیٹھیں کہ میں بھی سنسکرت کو جدید زبانوں کا ماخذ سمجھتا ہوں ۔

بہرحال میرے علم کی رو سے اردو زبان نہ شورسینی سے نکلی ہے نہ پالی سے بلکہ اس کا ماخذ مہاراشٹری پراکرت ہے ۔ آلِ ، اِلّ ، آل کے لاحقے ، مجھ تجھ کی ضمیریں ، تشدید کے مقابلے میں تسہیل کا رجحان ، دندانی حروف کے مقابلے میں مخی حروف کا زیادہ استعمال اور حروف علت کا حرکات میں بدل جانا ۔ یہ اور ان کے علاوہ اور بہت سی خصوصیات جو آج اردو زبان میں ملتی ہیں ۔ اسے مہاراشٹری پراکرت سے ہی ورثے میں ملی ہیں اور اس پراکرت کے نقوش میں نے رگ وید میں بھی دیکھے ہیں ۔

اردو کی اصل سرزبوم کے متعلق بھی اب تک جو کچھ کہا گیا ہے وہ بھی یکسر غلط ہے۔ مہاراشٹری پراکرت ملک مہاراشٹر میں بولی جاتی تھی۔ اس کے ثبوت میں اس پراکرت کی مشہور کتاب "ست سئی" پیش کی جا سکتی ہے جس میں پرتشٹھان (موجودہ پیٹھن) کے راجا ہال یا سات داہن یا مثالی داہن نے سات سو مشہور اشعار جمع کر دیے ہیں۔ گنا ڈھیہ شاعر نے اپنی مشہور کتاب "کتھا سرت سا گر" پیشاچی پراکرت میں لکھ کر اسی ادب نواز راجا کو نذر کی تھی۔ اردو اسی ملک مہاراشٹر کے مشرق علاقے میں پیدا ہوئی ہے اور مرہٹی کی سگی بہن ہے۔ چنانچہ اردو کی علامت فاعلی "نے" ہندوستان کی تمام زبانوں میں سے صرف ایک مرہٹی میں ملتی ہے بلکہ اردو اور مرہٹی میں اور بھی بہت سی باتیں مشترک ہیں جن کی تفصیل بخوف طوالت ترک کی جاتی ہے اس کے علاوہ صوبہ متوسط کی مرہٹی میں بھی ن اردو ہی کی طرح دندانی ہوگیا ہے۔ یہی خصوصیت چھتیس گڑھی اور تلگو میں بھی ملتی ہے اضلاع چھند واڑہ اور نر سنگھ پور کی کیٹانی بولی میں جس کے نمونے گریرسن نے لنگونسٹک سروے آف انڈیا میں بھی دیے ہیں مرہٹی اور اردو دونوں کے روپ پہلو بہ پہلو پائے جاتے ہیں۔ ان اضلاع سے کافی دور مشرق میں کنکر اور بستر کی ریاستوں میں ایک اور بولی بولی جاتی ہے جسے ہلبی کہتے ہیں۔ ہلبی ہلب لوگوں کی زبان ہے۔ کچھ ہلب لوگ بھنڈارا، چھند اور رائے پور کے اضلاع میں بھی ہیں۔ گریرسن کیٹانی اور ہلبی دونوں بولیوں پر ہندی کے اثرات بتاتے ہیں۔ کنکر اور بستر کی ریاستوں کے علاوہ رائے پور بھی، اڑیا کے علاقے سے ملا ہوا ہے۔ چنانچہ اردو "تھا" اڑیا میں بھی ملتا ہے۔ یہ چند موٹی موٹی باتیں میں نے صرف یہ دکھانے کے لیے لکھ دی ہیں کہ اردو کی جنم بھوم مشرق میں اڑیسہ سے اور جنوب میں تلنگانہ سے محدود ہے یہاں کی زبان کے متعلق گریرسن کا تو یہ خیال ہے کہ اس پر ہندی کا اثر ہے لیکن میرے نزدیک اصل میں اردو کا گھر یہی ہے۔

ایک بار یہ جان لینے کے بعد کہ اردو مشرق مہاراشٹر میں پیدا ہوئی یہ سمجھنا آسان ہو جاتا ہے کہ اردو نے مذہبی تحریکات کے ساتھ

شمالی ہندوستان کی جانب سفر کیا ہے جو آٹھویں صدی عیسوی سے دکن میں سر اٹھانے لگی ہیں - چنانچہ ان بھگتوں اور رہناؤں میں سے جنھوں نے اپنے اپنے عقیدے کی تبلیغ کے لیے شمال کی طرف یا ترا کی تلنگانہ کی تین مشہور اور قد آور شخصیتوں راماج (ولادت ۱۰۱۶ء) نمبارک اور بلبھ آچاریہ --- کے نام سب سے نمایاں ہیں - ان بھگتوں میں سے کچھ شمال کے طول طویل سفر کرکے واپس آتے رہے اور کچھ نے اپنی باقی ماندہ زندگی ہی شمالی ہندوستان بالخصوص بندرا بن میں گزار دی - اس طرح ان بھگتوں اور ان کے چیلوں نے شمالی ہندوستان کو اس مہاراشٹری زبان (اردو) سے روشناس کرایا -

جب اکبر بادشاہ تخت پر بیٹھا - تو جہاں دوسری ہندوستانی زبانوں کے ادیب و شاعر راجدھانی میں جمع ہوئے وہاں اردو کے شعرا مصنفین بھی آگرے پہنچے - یوں اردو یا کھڑی بولی کے قدم پہلی بار شمالی ہندوستان میں جم گئے اور جب اکبر نے قلعے میں مینا بازار قائم کیا - تو یہ زبان محل شاہی میں بھی باریاب ہوگئی - مینا بازار اکبر کی زندگی میں قائم رہا اور اکبر کے مرنے پر جب جہانگیر تخت نشین ہوا - تو اس نے بھی تازیست اپنے باپ کی اس رسم کو جاری رکھا - جیسا کہ تزک جہانگیری میں اس نے خود بیان کیا ہے - حرم شاہی میں اردو زبان کی پرورش اور فروغ کے لیے مینا بازار کی اہمیت بہت زیادہ ہے - اس کا صحیح اندازہ ہمیں اس وقت ہوتا ہے جب ہم اکبر کے پوتے شاہجہان کو پبلک سے اردو بولتے ہوئے سنتے ہیں - اس بات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جس وقت شاہجہان نے ۱۶۵۷ء میں آگرے سے راجدھانی دہلی کو منتقل کی ہے اس وقت تک اردو زبان پر اس کی بیگمات کو کس قدر مہارت حاصل ہو چکی ہوگی اور محل کے باہر عوام میں یہ زبان کس درجے پر فائز ہو چکی ہوگی چنانچہ دہلی پہنچنے پر جب وہاں بھی اردو کا چرچا ہوا تو اس کی سند کے لیے لوگ قلعہ معلیٰ کی طرف رجوع کرتے تھے یا ان منتخب روزگار فصحا کے گھرانوں کی طرف دیکھتے تھے جو راجدھانی بدل جانے پر آگرے سے نقل وطن کرکے نئی دہلی یا شاہجہان آباد یا اردوئے معلیٰ میں اقامت گزیں ہو گئے تھے -

ہر شخص جانتا ہے کہ عورتوں کی زبان مردوں کے مقابلے میں زیادہ کھری اور ٹکسالی ہوتی ہے - چنانچہ اس مغل شہنشاہ کی بیگمات بھی جو زبان اپنے ساتھ آگرے سے لائی تھیں وہ ٹکسالی اور معیاری اردو تھی جو اکبر اعظم کے مینا بازار کے ذریعے آگرے ہی میں حرم شاہی میں داخل ہو چکی تھی - اس طرح دو آبے میں اردو زبان کی پرورش اور فروغ کے سلسلے میں دو مغل بادشاہوں اکبر اور شاہجہان کا نام آتا ہے اور انھیں دونوں کا ذکر میرا من نے "باغ و بہار" کے مقدمے میں کیا ہے -

میر امن کوئی ماہر لسانیات نہ تھے اور نہ وہ اردو زبان کے مؤرخ ہی تھے - یہی وجہ ہے کہ انھوں نے فروغ اردو کی جگہ آغاز اردو کو اکبر و شاہجہان کے ناموں سے منسوب کر دیا - پھر بھی ان کی اس بصیرت کی داد دینا ضروری ہے کہ انھوں نے اردو کے سلسلے میں ان دونوں بادشاہوں کی اہمیت کا تذکرہ تو کر دیا - جب کہ عام مؤرخین اردو شاہجہان کو صرف لفظ "اردو" کی تشریح میں یاد کر لیتے ہیں لیکن اکبر کا نام تو سرے ہی سے حذف کر جاتے ہیں -

یہاں اردو زبان کے عہد بعہد نمونے پیش کرنے کی گنجائش نہیں ہے - اس لیے میں صرف دو نمونوں پر اکتفا کرتا ہوں میری اس وقت تک کی تحقیق کے مطابق کھڑی بولی (اردو) کا پہلا شاعر پٹیھن کا گیا نیشور (ولادت ۱۲۷۵ء) ہے کیونکہ اس سے پہلے کے کسی اور شاعر کا اردو کلام مجھے ابھی تک دستیاب نہیں ہو سکا ہے -

یہ حضرت امیر خسرو (متوفی ۱۳۲۵ء) کا ہم عصر ہے اس کے کلام کا نمونہ دیکھیے :

شاستروں میں تو نہیں رہا کچھ پران گاین مایا
بھید بدھی کا مارگ چلتا تن کا لکڑا کایا

کنڈلنی کو کھوب (خوب) چڑھا دے برہم رندھر کو جووے
چلتا ہے ہانی کے او ہر بولت سو ہی ہووے

حکم نورق کا گیا نیشور کوں تن کو اوپر جانا
سد گرو کی جہاں کرپا بھئی تہاں آپ ہی آپ پچھانا

کھڑی بولی کا پہلا نثر نگار عہد اکبری کا ایک مصنف گنگ برہم بھٹ ہے - اس نے ۱۵۷۰ء میں سولہ صفحے کی ایک کتاب "چند چھندو رنن کی مہما" کے نام سے لکھی تھی - اس کی نثر کا نمونہ یہ ہے -

"سدھ شری ۱۰۸ شری شری پات ساہ جی شری دل پت جی اکبر شاہ جی آم کاش (عام و خواص) میں تکھت (تخت) اوپر و راجان ہو رہے اور آم کاش بھرنے لگا ہے جس (جس) میں تمام امراؤ آئے آئے کرنش (کورنش) بجائے جو ہار کرکے اپنی اپنی بیٹھک پر بیٹھ جایا کریں اپنی اپنی مسل سے - جن کی بیٹھک نہیں سو ریسم کے رسے میں ریسم کی لوں میں پکڑ پکڑ کے کھڑے تاجیم (تعظیم) میں رہے" -

(مطبوعہ : ماہنامہ کاروان سرگودھا دسمبر ۱۹۶۸ء)

اردو کی زبان کا آغاز

اس خیال سے کہ شاید بعض اصحاب کو عنوان مقالہ کی ترکیب ہی نامانوس نظر آئے یہ وضاحت ضروری ہے کہ :

"اردو کی زبان" سے ہماری وہی قومی زبان مراد ہے۔ جسے ہم آج اردو یا اردو زبان یا زبان اردو کہتے ہیں اور زبان اردو فارسی کا مرکب اضافی ہے جس کا ترجمہ ہماری بول چال کے مطابق اردو کی زبان ہی ہو سکتا ہے۔ خود میر امن دہلوی نے اپنی کتاب "باغ و بہار" کے دیباچے میں کئی جگہ یہی ترجمہ کیا ہے۔ مثلاً "حقیقت اردو کی زبان کی بزرگوں کے منہ سے یوں سنی ہے "یا" ندان زبان اردو کی منجتے منجتے ایسی منجی کہ کسو شہر کی بولی اس سے ٹکر نہیں کھاتی"۔

اردو یا اردوئے معلیٰ کے متعلق اب تک مختلف کتب تاریخ کے حوالوں سے بہت کچھ کہا جا چکا ہے کہ ان الفاظ سے شاہی فرود گاہ یا چھاؤنی مراد ہوتی ہے جیسا کہ میر امن " باغ و بہار " کے دیباچے میں لکھتے ہیں :

"آخر امیر تیمور نے (جن کے گھرانے میں اب تک نام نہاد سلطنت کا چلا جاتا ہے) ہندوستان کو لیا۔ ان کے آنے اور رہنے سے لشکر کا بازار شہر میں داخل ہوا اس واسطے شہر کا بازار اردو کہلایا "۔

ہمیں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ عہد شاہجہانی میں اردو یا اردوئے معلیٰ دہلی کے ایک مخصوص علاقے کو کہتے تھے۔ چنانچہ آگے چل کر میر امن لکھتے ہیں :

"تب بادشاہ نے خوش ہو کر جشن فرمایا اور شہر کو اپنا دارالخلافہ بنایا تب سے شاہجہان آباد مشہور ہوا (اگرچہ دلی جدی ہے - وہ پرانا شہر اور یہ نیا شہر کہلاتا ہے) اور وہاں کے بازار کو اردوئے معلیٰ خطاب دیا۔

سراج الدین علی خان آرزو دہلی کے اسی علاقے میں بود و باش رکھتے تھے جیسا کہ وہ خود نوادر الالفاظ (مرتبہ ڈاکٹر سید عبداللہ شائع کردہ انجمن ترقی اردو ۱۹۵۱ء) کے صفحہ ۲۱۴ پر رقم طراز ہیں "لیکن چھنیل معلوم نیست کہ لغت کجاست ما مردم کہ از اہل ہندیم و در اردوئے معلا می باشیم نشنیدہ ایم"۔

اس لحاظ سے ہماری زبان وہ ہے جو دہلی کے ایک مخصوص علاقے میں بولی جاتی تھی جس میں آرزو جیسے جگت استاد اور دوسرے ادیب و شاعر بستے تھے - حکیم احمد علی یکتا نے اپنی کتاب دستور الفصاحت اور انشائے دریائے لطافت میں صاف لکھ دیا ہے کہ یہ زبان دہلی میں عام طور پر رائج نہیں تھی بلکہ مخصوص محلوں اور گھرانوں میں بولی جاتی تھی چنانچہ ان شواہد سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ عہد شاہجہانی میں دہلی کا ایک خاص علاقہ اردو یا اردوئے معلیٰ کہلاتا تھا جس میں عام زبان دہلوی سے مختلف ایک اور زبان رائج تھی جسے عام زبان سے متمیز کرنے کے لیے زبان اردو یا زبان اردوئے معلیٰ کہنے لگے اور اسی فارسی ترکیب کا ترجمہ زیب عنوان مقالہ کیا گیا ہے۔

اسی ضمن میں ایک بات اور بھی کہتا چلوں - ڈاکٹر مسعود حسن خاں نے اپنی کتاب "تاریخ زبان اردو" میں روہیل کھنڈ کی زبان کو معیاری قرار دیا ہے مجھے اس وقت اس نظریے پر بحث کرنا مقصود نہیں ہے بلکہ صرف یہ دکھانا مد نظر ہے کہ آج سے تقریباً ڈھائی سو سال قبل سراج الدین علی خاں آرزو (متوفی ۱۱۶۹ھ) جنھیں شعرائے متقدمین میں نمایاں مقام حاصل ہے اپنی کتاب نوادرالالفاظ میں ٹکسالی اردو کے متعلق اپنا قطعی فیصلہ سنا رہے ہیں - وہ لفظ گانڈر کے سلسلے میں لکھتے ہیں "آنچہ زبان زد مردم گوالیار و اکبر آباد کہ افصح السنہ

ہند است کا ہے باشد" ڈاکٹر سید عبداللہ بھی نوادرالالفاظ کے مقدمے میں تحریر فرماتے ہیں[1]:

"خان آرزو کے زمانے کی فصیح زبان اور بعد کی ٹکسالی زبان کا فرق اگر دیکھنا منظور ہو تو نوادرالالفاظ کے ان الفاظ کی فہرست بنا لیجیے جو فرہنگ آصفیہ اور نور اللغات میں نہیں ملتے۔ آرزو کے زمانے میں اور ان کے بعد زبان کی اصلاح اور حذف و ترک کا جو سلسلہ شروع ہوا اور کم و بیش آج تک جاری ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ نوادر کے بیسیوں الفاظ جنھیں آرزو نے فصیح قرار دیا تھا زبان کے ذخیرے سے نکل گئے ہیں"۔

معیاری زبان میں اس انقلاب کے آنے کی وجہ یہ ہے کہ سیاست کا مرکز آگرے سے اول دہلی کو اور بعد ازاں لکھنؤ کو منتقل ہوگیا تھا چنانچہ آگے چل کر دہلی و لکھنؤ کی سیاسی اہمیت کے پیش نظر لوگ زبان کی سند بھی وہیں سے لینے لگے اور یہ بھول گئے کہ ٹکسالی اردو صرف اکبر آباد کی ہے جس کے اُجڑنے پر ہی دہلی کا اردوئے معلیٰ آباد ہوا تھا۔ منشی سید احمد دہلوی مؤلف فرہنگ آصفیہ نے اپنے ایک مضمون "زبان کی تمیز اور اس کا فرق" میں اسی رجحان کی ترجمانی کی ہے کہ "جو شہر کسی بادشاہ کا مدت تک دارالحکومت رہا ہوگا اس کی زبان اور شہروں کی نسبت عمدہ اور زیادہ شائستہ خیال کی جائے گی اور ہر ایک مصنف یا شاعر یا فصیح اس شہر کی زبان کو قابل سند اور تقلید سمجھ کر وہاں کے باشندوں کی پیروی کرے گا اور جو وہ شہر کسی نواب یا وزیر یا رئیس یا جاگیردار کی گدی ہوگی اس کا چنداں اعتبار نہیں کیا جائے گا گو وہ شہر کتنی ہی ترقی کیوں نہ کرے" چنانچہ ایسے ہی خیالات نے استناد زبان اردو کے متعلق لوگوں کی توجہ آگرے سے ہٹا کر اول دہلی اور پھر لکھنؤ کی طرف منعطف کرائی ہے۔ آج اکبر آباد اور دہلی و لکھنؤ کی زبان میں جو فرق پایا جاتا ہے اس

۱۔ ملا وجہی "سب رس" میں انہیں چاتران گوالیار لکھتے ہیں۔

کی واحد وجہ یہ ہے کہ دہلوی اردو میں رفتہ رفتہ پربانی اور لکھنوی اردو میں آہستہ آہستہ اودھی کے اثرات نفوذ پاتے چلے گئے۔ لیکن اکبر آبادی اردو میں کوئی فرق نہیں آیا اور وہ اپنی جگہ بالکل اسی طرح بولی جا رہی ہے جس طرح آرزو کے زمانے میں بولی جاتی تھی چنانچہ نوادرالالفاظ کے کثیر تعداد الفاظ جو زبان کے ذخیرے سے نکل گئے اور فرہنگ آصفیہ میں نہیں ملتے آج بھی اکبر آبادی اردو میں بے تکان بولے سمجھے جاتے ہیں۔

بہرحال یہ ایک جملہ معترضہ تھا - اب میں اسی زبان کے آغاز کی طرف آتا ہوں جسے عام طور پر عہد شاہجہانی کی پیداوار بھی سمجھا جاتا ہے ۔ اس سلسلے میں یہ امر ذہن‌نشین رہنا چاہیے کہ شاہجہان ۱۶۴۷ء میں آگرہ چھوڑ کر دہلی پہنچا ہے اس لیے اردو یا اردوئے معلیٰ کا سنگ بنیاد اسی سن میں رکھا گیا ہوگا۔ چنانچہ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہماری زبان عہد شاہجہانی کی اسی چھاؤنی میں پیدا ہوئی ہے ان کے خیال کے مطابق بھی اس کی داغ بیل ۱۶۴۷ء سے قبل نہیں پڑ سکتی تھی لیکن سترھویں صدی عیسوی کے اواخر اور اٹھارویں صدی عیسوی کے اوائل میں ہمیں اردو کے ادیبوں اور شاعروں کی خاصی تعداد نظر آنے لگتی ہے بلکہ پنڈت برجموہن د تاتریہ کیفی تو عہد شاہجہانی ہی کے چندر بھان برہمن کی غزل "خدا نے کس شہر اندر ہمن کو لائے ڈالا ہے" کو اردو کی پہلی غزل کہتے ہیں - چنانچہ جب اس مفروضے کو اس حقیقت کے پہلو بہ پہلو رکھ کر دیکھتے ہیں تو وہ خیال جو زبان کی پیدائش سے ادب کی شروعات تک کے زمانے کو یوں چشم زدن میں طے کرا دیتا ہے حد درجہ مضحکہ انگیز نظر آنے لگتا ہے کیونکہ زبان کبھی اس تیزی سے نہیں بنتی جس تیزی سے ٹکسال میں سکّے ڈھالے جاتے ہیں ۔

اردو زبان کی پیدائش کے متعلق آج تک جتنے نظریے دیسی اور بدیسی محققین نے پیش کیے ہیں (اور ان کی تعداد کچھ کم نہیں ہے) ان سب کا لب لباب یہ ہے کہ ہماری زبان ان غیر ملکیوں کی بدولت پیدا

ہوئی ہے جنھوں نے تاریخ کے کسی نہ کسی عہد میں سرزمین ہند کو اپنے ورود سے نوازا ہے یعنی یہاں پہنچنے پر جب ان کا سابقہ مقامی باشندوں سے پڑا تو ان کی آبائی زبان نے یہاں کی مقامی بولیوں سے مل کر ایک تیسری زبان کو جنم دیا جسے ہم آج اردو کہتے ہیں اور یا پھر تنہا انہیں کی زبان سے یہ زبان از خود یوں پیدا ہو گئی جیسے عام قانون قدرت کے مطابق ایک نسل سے دوسری نسل جنم لیتی رہتی ہے ۔

ان تمام نظریات کو آسانی کے ساتھ تین درجوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے ۔ سامی ، مسلم آریائی اور آریائی ۔ چونکہ ہند جنوبی سے عرب سوداگروں کے تجارتی تعلقات قبل ظہور اسلام ہی سے استوار ہو چکے تھے اور اس علاقے میں ان کی آمد و رفت عرصہ دراز تک قائم رہی لہٰذا سامی نظریے کی رو سے عربی اور دکن کی مقامی بولی کی آمیزش سے جو زبان پیدا ہوئی اسے اردو کہتے ہیں ۔ اس نظریے کے مدعی مولانا نصیر الدین ہاشمی ہیں ۔ اسی سے ملتا جلتا دوسرا نظریہ مولانا سلیمان ندوی کا ہے کہ محمد بن قاسم اور اس کے ہمراہیوں نے ۷۱۲ء میں سندھ پر حملہ کیا تھا لہٰذا ان کا خیال ہے کہ ان لوگوں کی عربی نے سندھ کی مقامی بولی سے مل کر اردو کی داغ بیل ڈالی ۔ مسلم آریائی درجے میں صرف حافظ محمود شیرانی کا نظریہ شامل ہے ۔ ان کا خیال ہے کہ محمود غزنوی اور اس کے بعد شہاب الدین محمد غوری کی فتوحات کے باعث ایرانی مسلمان پہلے پہل پنجاب میں آباد ہوئے جہاں ان کی مادری زبان فارسی اور پنجاب کی مقامی زبان کے میل ملاپ سے اردو زبان وجود میں آئی ۔ ان تینوں محققین میں سے مولانا سلیمان ندوی تو اردوئے قدیم کا کوئی نمونہ ہی پیش نہیں کرتے البتہ مولانا ہاشمی اور حافظ شیرانی دونوں کے دونوں دکنی ادب کو اردوئے قدیم بتاتے ہیں اور ایک نمونے سے دو نظریے ثابت کرنا چاہتے ہیں ۔

دراصل مندرجہ بالا سامی اور مسلم آریائی دونوں نظریات ایک ہی نقطۂ نظر کی پیداوار ہیں جس کے مطابق اردو کا آغاز ہندوستان میں مسلمانوں کے داخلے کے لگ بھگ ہوتا ہے لیکن اس کی تردید میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ دو زبانوں کے میل سے دنیا میں آج تک کبھی اور

کہیں کوئی ایسی زبان پیدا نہیں ہوسکی جو اردو کی طرح مکمل، منضبط، جامع اور توانا ہو اور اردو ہی کی طرح لاکھوں کروڑوں انسانوں کی ضروریات زندگی کو پورا کرنے والی بھی ہو۔ اس کے باوجود اگر حاکم و محکوم کی کاروباری سہولت کی خاطر ہندوستان کی دیسی اور مسلمانوں کی بدیسی بولیوں کے میل ملاپ سے مغربی ہندوستان میں کسی تیسری زبان کا پیدا ہو جانا ناگزیر ہی ہوگیا تھا تو پھر جب مسلمان ہندوستان کے مشرق علاقوں میں بھی بطور فاتح پہنچے تھے وہاں اردو جیسی ہی کوئی اور زبان کیوں پیدا نہیں ہوئی حالانکہ حاکم و محکوم کے تعلقات وہاں بھی قائم ہوئے تھے اور ان کی زبانوں میں بھی اسی قدر اختلاف ملتا تھا۔

ان نظریات کی حمایت میں جس دکنی ادب کو اردوئے قدیم کا نمونہ بنا کر پیش کیا جاتا ہے اس کے متعلق بھی چند معروضات ضروری ہیں:

۱ - دکن میں مسلمانوں کی آمد کو آٹھویں صدی عیسوی کے بعد تک ملتوی نہیں کیا جا سکتا اور دکنی ادب کو پندرھویں صدی عیسوی سے قبل نہیں لے جا سکتے۔ یوں دونوں تاریخوں کے درمیان چھ سو سال کی طویل مدت بالکل خالی گزر جاتی ہے جس کا کوئی لسانی نمونہ ابھی تک پیش نہیں کیا گیا ہے۔ ایسی صورت میں دکن کے مسلم تاجروں اور درویشوں وغیرہ کی آمد اور دکنی ادب کے آغاز میں براہ راست کوئی منطقی یا تاریخی تعلق قائم نہیں ہوتا اور اسی لیے اس ادب کو ان کے لسانی اثرات کا نتیجہ بھی نہیں مانا جا سکتا۔

۲ - جیسا کہ حافظ محمود شیرانی کا اصرار ہے تاریخی شواہد سے یہ تو ثابت ہے کہ سلاطین دہلی کی فتوحات کے ساتھ ساتھ لسانی لہریں دکن کی طرف جاتی رہی ہیں اور لسانی تجزیہ بھی یہ بتاتا ہے کہ دکنی ادب میں ہند شمالی کی پنجابی اور ہریانی کے گہرے اثرات ہیں۔ اس لیے دکنی ادب پنجابی اور ہریانی سے بہت قریب ہے لیکن پنجابی اور ہریانی کے ساتھ ساتھ دکنی ادب

بھی اردو سے بنیادی طور پر اتنا ہی مختلف ہے جتنی مختلف کوئی دو آزاد زبانیں ہو سکتی ہیں (دیکھیے میرا مقالہ "اردوئے قدیم" مطبوعہ "نقوش" لاہور بابت ماہ اکتوبر ۶۲ء) اور جب کہ لسانی تجزیے کی رو سے دکنی ادب کو اردوئے قدیم ہی تسلیم نہیں کیا جا سکتا تو اس کی بنیاد پر آغاز اردو کا جو نظریہ بھی تعمیر کیا جائے گا درست نہیں ہوگا۔

۳ - ہندوستان کی دو معاصر زبانوں میں اتنا اختلاف نہیں ملتا جتنا چینی اور عربی یا یونانی اور انڈونیشی میں ۔ ایسی صورت میں اگر ان کے اشتقاق کی بنیاد صرف ان کی مشابہت پر ہی رکھی جائے گی تو کوئی سی بھی دو ہمسایہ زبانوں کو بڑی آسانی سے ماں بیٹی ثابت کیا جا سکتا ہے لیکن لسانیات میں دو زبانوں کے بنیادی اختلافات بھی ان کی مشابہت سے کچھ کم اہم نہیں ہوتے اس لیے بعض محققین کا محض جزوی مشابہت کی بنا پر دو زبانوں میں ماں بیٹی کا رشتہ قائم کر دینا درست نہیں ہے ۔

۴ - اردو کی معاصر زبانوں میں سے کسی ایک زبان میں بھی اس قدر بنیادی اور طوفانی انقلاب کا ثبوت نہیں ملتا جو اسے قدیم و جدید کے ایسے ہی دو حصوں میں تقسیم کر دے جیسے دو حصے اردو والے اردو زبان کے ثابت کرنا چاہتے ہیں اس لیے قدیم اردو اور جدید اردو کی یہ مفروضہ تقسیم قابل قبول نہیں ہو سکتی ۔

(۵) دکنی ادب کو اس لیے بھی اردوئے قدیم نہیں مانا جا سکتا کہ اس کے عہد سے بہت پہلے مرہٹہ دیس کے شاعروں ــــ نام دیو اور گیانیشور (معاصر حضرت امیر خسرو) کے یہاں اسی اردو کے نمونے ملتے ہیں جو آج بولی جا رہی ہے جب کہ دکنی ادب آج اردو کے بڑے بڑے عالموں کی سمجھ میں بھی پوری طرح نہیں آتا ۔ اس کے علاوہ آج کی اردو کے جلوے عہد اکبری کے شاعروں اور نثر نگاروں کے یہاں بھی نظر آتے ہیں ۔ اب

یہ بات دوسری ہے کہ دیوناگری ابھی میں قلم بند ہونے کے باعث یہ نمونے عام اردو داں طبقے کی نگاہوں سے ابھی تک اوجھل رہے ہیں لیکن اس سے یہ حقیقت نہیں جھٹلائی جا سکتی کہ آج کی اردو کا سراغ دکنی ادب سے بھی بہت پہلے مل جاتا ہے۔

ان حضرات کے علاوہ جن کے نظریات کا اُوپر ذکر کیا گیا محققین کی ایک بہت بڑی جماعت اردو کے آغاز کو ظہور اسلام سے بہت پہلے ورود آریہ کے وقت تک لے جاتی ہے۔ ان لوگوں کا خیال ہے کہ اردو ایک آریائی زبان ہے جو ہندوستان کی ایک قدیم زبان پراکرت سے نکلی ہے اور پراکرت یا تو سنسکرت سے ابھری ہے یا اس کی کسی ایسی معاصر بولی سے مشتق ہوئی ہے جو سنسکرت کی ہی طرح خالص آریائی تھی کیونکہ آریہ ہندوستان میں بدفعات آئے تھے اور مختلف بولیاں بولتے ہوئے داخل ہوئے تھے جو سب کی سب قدیم ایرانی زبان کی بیٹیاں تھیں یہ خالص آریائی نظریہ ہے۔

اس خیال کی ابتدا تیسری صدی عیسوی سے ہوئی جب کہ درروچی نے پراکرت زبان کی پہلی گرامر "پراکرت پرکاش" لکھی اور ایک آزاد زبان کے قواعد لکھنے کے بجائے ایسے اصول وضع کیے جن کی مدد سے ریاضی کی سی قطعیت کے ساتھ سنسکرت کے حروف بدل بدل کر پراکرت کے الفاظ ڈھالے جا سکیں۔ اس کے مقلدین میں چنڈ، ہیم چندر، سنگھ راجا، مارکنڈے اور لکشمی دھر کے نام نمایاں ہیں اور زمانہ حال کے محققین کا سربراہ انیسویں صدی عیسوی کا مستشرق جان بیمز ہے جس کے ہم خیالوں میں گریرسن، پلیٹس، کیلاگ اور سنیتی کمار چٹرجی وغیرہ بہت سوں کے نام آتے ہیں۔

دوسری طرف مستشرقین آریوں کی قدیم زبان سنسکرت کو قدیم ہند یورپی کی ایک شاخ بتاتے ہیں اور قدیم ہند یورپی زبان سنسکرت کی طرح ایرانی کی بھی ماں ہے لیکن ان لوگوں سے بھی بہت پہلے سراج الدین علی خاں آرزو نے نوادرالالفاظ میں جا بجا یہ اشارہ کیا ہے کہ سنسکرت

اور فارسی اصلاً ایک ہیں اور اسے "توافق لسانین" کا نام دیا ہے اور آرزو ہی کی صدائے بازگشت ماضی قریب میں مولانا محمد حسین آزاد کی کتاب سخندان پارس میں بھی سنائی دیتی ہے - غالباً یہی وجہ ہے کہ جس طرح ایک زمانے میں اردو کو فارسی کی بیٹی سمجھا اور کہا جاتا تھا اسی طرح آج اسے سنسکرت کی گود میں ڈال دیا گیا ہے لیکن اس آریائی نظریے کی تردید میں بھی چند معروضات قابل غور ہیں -

۱ - برصغیر پاک و ہند کی موجودہ معاصر زبانیں ایک دوسرے سے اس قدر واضح اور بنیادی اختلافات رکھتی ہیں کہ انھیں کسی ایک ماخذ سے مشتق نہیں کیا جا سکتا - ایسی صورت میں تنہا سنسکرت کو ان سب کا واحد مشترک سرچشمہ ماننا درست نہیں ہے -

(۲) اگر تمام موجودہ زبانیں آریائی ہیں تو ایرانی سے انھیں مکمل طور پر مشابہ ہونا چاہیے لیکن میں دیکھتا ہوں کہ ہندوستانی اور قدیم ایرانی زبان میں بہت سے بنیادی اختلافات ملتے ہیں جن میں سے چند یہ ہیں :

(الف) ہندوستانی میں قدیم ایرانی کی مندرجہ ذیل آوازیں نہیں ملتیں -
مفرد : خ ، ز ، ژ ، حنکی ش ، فمی ش ، غ ، ف ، و ، ہ ، ری ، ز ری -

مرکب : خو یا ہو ، زن ، خش ، تر ، در ، ست ، سپ ، شک ، فش وغیرہ -

(ب) قدیم ایرانی میں مندرجہ ذیل ہندوستانی آوازیں نہیں ملتیں -
لفی : ٹ ، ڈ ، ڑ ، ن (نڑ) -

مہاپران : کھ ، گھ ، چھ ، جھ ، ٹھ ، ڈھ ، ڑھ ، تھ ، دھ ، رھ ، لھ ، مھ ، نھ ، پھ ، بھ -

(ج) ہندوستانی تشدید قدیم ایرانی زبان کے لیے بالکل غیر ہے -

(د) قدیم ایرانی میں صرف خارجی سندھی پائی جاتی ہے یعنی دو الفاظ کے ملنے پر آخری اور پہلے صرف علت کا ادغام ہو جاتا ہے لیکن ہندوستانی میں داخلی سندھی کا بھی چلن ہے۔

(ہ) قدیم ایرانی الفاظ میں دو حروف علت یکے بعد دیگرے نہیں آ سکتے تھے۔ لیکن ہندوستانی الفاظ میں مسلسل پانچ پانچ حروف علت تک مل جاتے ہیں بلکہ بعض بعض الفاظ میں تو حروف علت کے سوا حرف صحیح آتا بھی نہیں ہے۔

(و) قدیم ایرانی میں اس کے نام نہاد مہاپران (خ، غ، ف) نہ ایک رکن کے دونوں جانب آ سکتے تھے نہ ایک لفظ کے آخر اور دوسرے لفظ کی ابتدا میں جمع ہو سکتے تھے لیکن ہندوستانی میں ایسی کوئی پابندی نہیں ہے۔

(ز) ایک ہندوستانی لفظ میں زیادہ سے زیادہ تین رکن ہوتے ہیں اس لیے سندھی کی صورت میں حروف علت کو مختصر کر کے ارکان کی تعداد گھٹا دی جاتی ہے لیکن قدیم ایرانی میں یہ قید نہیں تھی۔

(ح) قدیم ایرانی میں تین عدد واحد، تثنیہ اور جمع پائے جاتے تھے لیکن ہندوستانی تثنیہ سے بالکل خالی ہے جس میں عہد قدیم سے آج تک کبھی اور کہیں تثنیہ کا سراغ نہیں ملتا۔

(ط) قدیم ایرانی میں اسما کی دو تصریفیں ہوتی تھیں اور ہندوستانی میں صرف ایک ہوتی ہے۔

(ی) قدیم ایرانی میں صفت کے تین درجے (تفضیل نفسی، تفضیل بعض اور تفضیل کل) ہوتے تھے لیکن ہندوستانی میں صفت کے درجے کا تصور ہی نہیں ہے۔

(ک) قدیم ایرانی افعال میں دو پد (سنسکرت کے آتمنے پد اور پرسمے پد) ہوتے تھے لیکن ہندوستانی میں ایسی کوئی تقسیم نہیں ہے۔

(ل) قدیم ایرانی فعل میں پانچ زمانے ہوتے تھے لیکن ہندوستانی میں صرف تین زمانے ہوتے ہیں ۔

(م) قدیم ایرانی میں فعل کی بہت سی گردانیں رائج تھیں لیکن ہندوستانی میں صرف ایک ہی گردان ہوتی ہے ۔

(ن) ان تمام باتوں کے علاوہ قدیم ایرانی اور ہندوستانی کے ضمائر عواماں ، اسما ، افعال ، سوابق اور لواحق وغیرہ قطعی جُدا جُدا ہیں ۔

ان بنیادی اختلافات کی موجودگی میں ہند و پاک کی موجودہ زبانوں کو آریائی تسلیم نہیں کیا جا سکتا ۔

(۳) پراکرت کے گرامر نویسوں نے اپنے ہر اصول میں مستثنیات دیے ہیں یعنی انھوں نے ایک اصول کی رو سے چند سنسکرت الفاظ کو پراکرت میں ڈھال دیا لیکن ان کے ساتھ ہی پراکرت کے کچھ ایسے الفاظ بھی لکھ دیے جن پر اس اصول کا اطلاق نہیں ہوتا ۔ اب اگر ان کے عقیدے کے مطابق تمام پراکرتیں سنسکرت سے ہی ڈھالی گئی ہیں تو یہ مستثنیات کیونکہ اور کہاں سے آ گئے ؟

۴ ۔ پراکرت کے تمام گرامر نویس لفظ کی تین قسمیں بتاتے ہیں ۔ تت سم ، تدبھو اور دیسی ۔ ان میں تت سم وہ الفاظ ہیں جو صرف سنسکرت میں پائے جاتے ہیں ۔ تدبھو وہ الفاظ ہیں جو سنسکرت کے تت سم الفاظ سے بگڑ کر بنے ہیں اور کتابی پراکرت میں ملتے ہیں ۔ ان کے علاوہ پراکرت میں دیسی الفاظ بھی ملتے ہیں جو سنسکرت کے لیے قطعی غیر ہیں ۔ چنانچہ یہ گرامر نویس اپنی اپنی کتابوں میں جا بجا دیسی الفاظ کی نشان دہی کرتے ہیں بلکہ ہیم چندر اور دھن پال نے تو "دیسی نام مالا" اور "پائیہ لچھی" کے نام سے دیسی الفاظ کی دو مستقل فرہنگیں بھی تحریر کر دی ہیں ۔ اب آریائی نظریے کے حامیوں

کے ذمے اس سوال کا جواب باقی ہے کہ اگر پراکرتیں سنسکرت سے ہی پیدا ہوئی ہیں تو یہ الفاظ جو سنسکرت کے لیے غیر ہیں پراکرت زبانوں میں کہاں سے آ گئے ؟

۵ - تمام محققین متفق ہیں کہ ویدک زبان سے ہی سنسکرت زبان تراشی گئی ہے اور سنسکرت میں ویدک اسما پر بہت کچھ اضافہ ہوا ہے لیکن یہ اسما ویدک کے مادوں سے نہیں بنے ہیں - میں تمام محققین سے پوچھتا ہوں کہ اگر ہند شمالی میں کوئی دیسی یعنی دراوڑی زبان باقی نہیں رہی تھی تو پھر سنسکرت اسما کی یہ بڑھی ہوئی تعداد کن زبانوں سے مستعار لی گئی ہے ؟

۶ - زبان کی فطرت یہ ہے کہ جب تک اس کے بولنے والوں میں دو نفر بھی بچ رہیں گے وہ اس علاقے سے کبھی فنا نہیں ہو سکتی - ایسی صورت میں یہ کیسے مان لیا جائے کہ آریوں کی آمد پر ہند شمالی میں جو دراوڑی زبانیں بولی جا رہی تھیں وہ بالکل فنا ہو گئیں اور ان کی جگہ صرف ایک ویدک زبان (سنسکرت کی قدیم شکل) ملک کے طول و عرض میں رائج ہو گئی کیونکہ نہ عقل اس بات کو تسلیم کرتی ہے کہ فاتحین مفتوحین کو بالکل نیست و نابود کر دیتے ہیں اور نہ تاریخ ہند سے ہی ایسی کوئی شہادت ملتی ہے کہ آریوں نے ہند کے قدیم باسیوں کو تہ تیغ کرکے ہند شمالی کو ان سے بالکل پاک کر دیا تھا -

۷ - اگر قدیم ایرانی اور ویدک (ویدوں کی زبان) اصلاً ایک ہی زبان کے دو روپ ہیں تو دونوں کو ایک دوسرے کے قالب میں مکمل طور پر ڈھل جانا چاہیے لیکن جب تک رگ وید کے کسی پورے بھجن کو کاملاً اوستا کی زبان میں منتقل نہیں کیا جاتا دونوں زبانوں کی جزوی مشابہت پر محققین کا یہ دعویٰ کہ دونوں میں مکمل مماثلت ہے قابل قبول نہیں ہو سکتا -

۸ - اگر ویدک اور قدیم ایرانی مماثل زبانیں ہیں تو اوستائی گرامر کی مدد سے آج تک رگ وید کی مکمل تشریح کیوں نہیں ہو سکی

اور مستشرقین اپنی کوششوں کے باوجود اس کے کافی حصے کو سمجھنے سے قاصر کیوں رہ گئے ؟

مندرجہ بالا اعتراضات اور معروضات کی روشنی میں نہ صرف اردو بلکہ برصغیر پاک و بھارت کی کسی موجودہ زبان کو بھی آریائی تسلیم نہیں کیا جا سکتا خصوصاً اس صورت میں کہ خود رگ وید میں فارسی الفاظ کے پہلو بہ پہلو مختلف ہندوستانی زبانوں کے ہزاروں الفاظ موجود ہیں ہم ویدک کال میں اردو کا وجود تسلیم کرنے پر مجبور ہیں۔ البتہ اس مقام پر آریائی نظریے کے مدعی یہ کہہ سکتے ہیں کہ رگ وید میں اردو الفاظ کی موجودگی سے اردو کا ویدک زبان سے اشتقاق ثابت ہوتا ہے لیکن میں اس کے جواب میں یہ عرض کروں گا کہ اردو اور ایرانی زبان کے بنیادی (صوتی ، صرف و نحوی) اختلافات کے باوجود جن کا ذکر اوپر کیا گیا رگ وید میں ان زبانوں کی مخصوص آوازوں کو چھوڑ کر (جن کے لیے خاص اصول برتے گئے ہیں) تمام مشترک آوازوں کو قلم بند کرنے کے لیے یکساں اصول کام میں لائے گئے ہیں۔ چنانچہ ایک طرف رگ وید میں اگر اردو الفاظ کا وجود اس کو ویدک زبان سے مشتق ثابت کرنے کے لیے کافی سمجھا جا سکتا ہے تو دوسری طرف اسی اصول کی روشنی میں ویدک سے ایرانی زبان کا اشتقاق بھی لازم آتا ہے اور یہ بات تاریخی و لسانی دونوں اعتبار سے نہایت مضحکہ انگیز ہوگی اس لیے اس حقیقت کو تسلیم کیے بغیر چارہ ہی نہیں ہے کہ اردو اپنی معاصر زبانوں کی طرح آریوں کی آمد سے قبل بھی ہندوستان میں رائج تھی یہی وجہ ہے کہ ایرانی الفاظ کے ساتھ ساتھ جہاں دوسری رائج الوقت دیسی زبانوں کے الفاظ حروف بدل بدل کر رگ وید کے بھجنوں میں داخل کیے گئے وہاں اردو الفاظ کو بھی ان میں بار مل گیا۔

رگ وید ایک ایسی کتاب ہے جس کی تسریح کی کوششیں ہزاروں سال سے ہوتی چلی آ رہی ہیں لیکن آج تک اس کی مکمل اور صحیح تشریح نہیں ہو پائی ہے ۔ اس سلسلے میں دیسی شارح یا سک منی (تقریباً ۵۰۰ ق م) کا نام سرفہرست آتا ہے جس نے رگ وید کے چند اجزا کی شرح لکھنے کی کوشش کی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ یا سک ہی رگ وید کا

پہلا شارح نہیں ہے اس لیے کہ اس کی شرح سے چند دوسرے شارحین کے نام بھی ہم تک پہنچے ہیں جو اس سے بیشتر گزر چکے ہیں لیکن ان کی تشریحات زمانے کی دست برد سے محفوظ نہیں رہ سکیں البتہ ان کے متعلق تھوڑی بہت معلومات ہم کو یاسک کی شرح ہی سے حاصل ہوئی ہیں۔ ان میں سے کوتس نامی ایک شارح نے تو رگ وید کو بالکل ہی مہمل قرار دے دیا ہے اور سہملات رگ وید کی مثال میں چند الفاظ بھی لکھے ہیں جیسے امبک، یاد وبگن، جاربائی، کانکا، وغیرہ۔ یاسک نے اپنی شرح میں رگ وید کے اہمال سے تو انکار کیا ہے البتہ ایک ایک لفظ کے اشتقاق میں کتنی ہی متبادل تجویزیں پیش کرنے کے بعد اسے بھی کچھ الفاظ کا مطلب سمجھنے میں اپنی نارسائی کا اعتراف کرنا پڑا اور کوتس کے سہملات کی فہرست میں چند اور الفاظ مثلاً دروی ہُوسی، ورتی، دمونا، جاتیہ، آنثار، جاگر وک وغیرہ کا اضافہ کرتے ہی بنا۔ نارسائی اور کم فہمی کا یہ سلسلہ اس وقت سے آج تک برابر جاری ہے جو دیسی اور بدیسی شارحین کے یہاں دیکھا جا سکتا ہے۔

تشریح رگ وید میں ان دقتوں اور دشواریوں کے دو خاص اسباب ہیں۔ اول یہ کہ اس ایک کتاب میں دو سو سے اوپر شاعروں کے بھجن شامل ہیں اور یہ شعرا ہندوستان کے مختلف علاقوں کے رہنے بسنے والے تھے بلکہ ان میں سے کچھ تو ایک ہی خاندان کی تین تین پشتوں سے تعلق رکھتے تھے۔ مکان و زماں کے اس تفاوت کے ساتھ انہوں نے اپنے بھجنوں میں ایرانی زبان کے علاوہ اپنے اپنے علاقوں کی رائج الوقت زبانیں بھی استعمال کی ہیں اور یوں رگ وید میں اتنی زبانوں کے نمونے جمع ہوگئے ہیں کہ اس کا مکمل طور پر سمجھ لینا کسی ایک شخص کے بس کی بات نہیں رہی۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے شارحین جگہ جگہ الکتے اور قدم قدم پر لڑکھڑاتے ہیں اور آخر میں یہ اعلان کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ ہم فلاں لفظ، فلاں مرکب، فلاں پد اور فلاں سوکت کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔

دیسی شارحین ویدک زبان کو دیوبانی ماننے کے باعث کبھی یہ تصور بھی نہیں کر سکے کہ اس پاک اور مقدس زبان میں آریوں کی

آبائی زبان قدیم ایرانی کے ساتھ ساتھ ان شودروں کی ناپاک اور اپ بھرنشٹ زبانوں کا پٹ بھی شامل ہو سکتا ہے جن کے کانوں میں اسی رگ وید کے الفاظ سن لینے پر گرم کرکے سیسہ پلا دیا جاتا تھا اور مستشرقین بھی مفروضہ قدیم ہند یورپی زبان سے اپنے فطری تعلق خاطر کی بنا پر رگ وید کے دیسی جزو اس لیے اچھی طرح دھیان نہیں دے سکے کہ یورپی زبانوں پر یونانی و لاطینی کے اثرات کے باعث انہیں ویدک زبان کے صرف اسی جزو پر سے زیادہ دلچسپی رہی جو ان یورپی زبانوں میں بھی پایا جاتا ہے غرض رگ وید کی تشریح میں اس کی لسانی بوقلمونی ہمیشہ سے سد راہ رہی ہے جس سے بعض بعض مقامات پر یہ الجھن بھی پیدا ہو جاتی ہے کہ دو زبانوں کے ہم آواز لفظوں کو دیکھ کر ان کے اشتقاق اور معنوی اختلاف کے باوجود بعض محققین ایک زبان کو دوسری سے مشتق سمجھنے لگتے ہیں بلکہ اس الجھن میں ہمیشہ پراکرت ہی کو سنسکرت سے مستخرج کیا جاتا ہے یعنی محققین کی کم فہمی کا نزلہ ہمیشہ ہندوستانی (دراوڑی) زبان پر گرتا ہے -

مثال کے طور پر بعض لوگ "ہم" (پراکرت "امھ) کو سنسکرت "اہم" (معنی "میں) سے یہ کہہ کر نکالتے ہیں کہ سنسکرت لفظ کا الف گر گیا ہے (حالانکہ سنسکرت لفظ "اہم" کا تلفظ اوستا میں "ازم" اور فارسی قدیم میں " اوم " ہوتا ہے) اور پھر وہ ضرورت اور وہ وجہ بھی نہیں بتاتے جو اس کے سقوط کا جواز بن سکے اس لیے کہ اردو ہندی والے لفظوں کے ابتدائی الف کا تلفظ بالکل اسی سہولت کے ساتھ کرتے چلے آ رہے ہیں جس آسانی سے درمیانی یا آخری الف کو بولتے رہتے ہیں یعنی وہ لوگ ابتدائی الف کے تلفظ پر پوری طرح قادر ہیں ۔ اس کے علاوہ یہ مسلمہ اس ہے کہ زبانوں سے آوازیں اس طرح کبھی نہیں اترتیں جس طرح کاغذ سے حرف مٹائے ، اڑائے کاٹے یا بگاڑے جاتے ہیں لیکن یہ لوگ جس آسانی سے سنسکرت لفظوں کے حروف گرا کر اردو ہندی لفظ بنا لیتے ہیں اس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ ان کے نزدیک السانوں کی زبانیں کاغذی صفحات سے زیادہ نہیں کہ ان پر سے جب چاہا حرف چھیل دیا ۔

رگ وید کی تشریحی دشواری کا دوسرا سبب اس کی کتابت کا وہ اصول ہے جسے لسانیات میں تبادل حروف کا نام دیا گیا ہے اور یہ سبب پہلے سے بھی زیادہ اہم ہے۔ بعض اوقات رگ وید میں دو مختلف التلفظ اور مختلف المعنی الفاظ ایک ہی مکتوبی شکل میں نظر آتے ہیں۔ مثلاً اس میں ایک لفظ "دکش" ملتا ہے جس کا ایک مقام پر ایرانی تلفظ "دش" (عبادت کرنا) ہے اور دوسرے مقام پر ہندوستانی تلفظ لاکھ (سو ہزار) ہے۔ اب یہ بات کہ کسی مقام پر یہ لفظ اردو کا ہے یا فارسی کا اور اس کا صحیح صحیح تلفظ کیا ہے صرف سیاق و سباق کو دیکھ کر ہی طے کی جا سکتی ہے یا مثلاً ایک مقام پر ویدک "مرگ" جسے کلاسیکی سنسکرت میں عام طور پر ہرن کے معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے فارسی لفظ "مرغ" (اسی سے مرغزار بنا ہے) کی مکتوبی شکل ہے لیکن دوسرے مقام پر فارسی لفظ "مرگ" (موت) کی۔ اب شارحین کی بے بسی دیکھیے کہ موت کے مفہوم میں جہاں اس کے خوف کا بیان ہوا ہے وہ لوگ "مرگ" کے معنی "شیر" لکھ کر تشریح کی خانہ پری کر دیتے ہیں۔ چنانچہ "مرگون بھیمو کچرو گرشٹھا" کی تشریح یوں کرتے ہیں کہ اے اندر دیوتا! تو مرگ (شیر) کی طرح بھیم (خوفناک) ہے، کچر (بد راہ) ہے اور گر (پہاڑ) + شٹھا (ستا، رہنے والا) یعنی پہاڑ کا باسی ہے۔

اس کے برعکس بعض اوقات ایک ہی لفظ کے دو مقامات پر دو مکتوبی روپ نظر آتے ہیں۔ مثلاً لفظ "اوک" (گھر) کہ دوسرے مقام پر "اوس" لکھا ہوا ہے " اوسایشواں" (اوکائے اسپاں)۔ اے اندر! گھوڑوں کو گھر میں کرکے یا اوسائے پدوتے رُدر سرل" (اوکائے پرورے ردر سرل)۔ اے رُدر گھر کی پرورش کے لیے مہربانی کر یا لفظ شوشُجان (بڑھتا ہوا) کہ دوسرے مقام پر "توتجان" کے روپ میں دکھائی پڑتا ہے یا توکم (تخم) اور توچم یا شوشٹھ (= اوستا سوشت = فارسی جدید زاوشت بمعنی توی) اور یوشٹھ یا یکش (= فارسی دش بمعنی عبادت کرنا) اور وکش یا اسم (= پراکرت اسھ بمعنی پانی) اور امبھ یا ہمُوو (پارہ اور ہمُرو یا بوتی (دوشی، دوشیزہ) اور ہمُوشا (دوشا) یا رج (توڑنا) اورتج وغیرہ۔

غرض ان دشواریوں کے پیش نظر رگ وید کے مطالعے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ اس کے متن پر غور کیا جائے اور سیاق و سباق کی مدد سے الفاظ کے تلفظ اور اشتقاق کا سراغ لگایا جائے۔ جب تک اس کے ایک ایک لفظ کو اس کے اپنے مقام پر نہیں دیکھا جائے گا ہم اس کو سمجھنے سے قاصر رہیں گے اس لیے ذیل میں چند اردو الفاظ کے مقابل میں ویدک الفاظ سوکت کے حوالے سمیت پیش کیے جاتے ہیں تاکہ متن پڑھ کر میرے خیال کی تائید میں آسانی ہو۔

(۱) رگ وید میں اردو کے بعض الفاظ کی نشاندہی بعض حرف ر ری سے کی گئی ہے یعنی اس حرف کو صرف یہ دکھانے کے لیے استعمال کیا گیا ہے کہ یہ لفظ خالص دراوڑی ہے کیونکہ تلفظ میں اس کی آواز بالکل نہیں نکلتی مثلاً:

رری=زبر	اردو	رگ وید	سوکت (منڈل، انواک اور سوکت کے نمبر)
	ناتے	نرتے	۱-۱۵-۹
	کپڑے	کرپتے	۱-۱۶-۸
	گھنا	گھرنا	۱-۱۰-۲
	گھنے	گھرنے	۱-۲۰-۵
	گھنی	گھرنی	۲-۲۳-۶
	گھنیر (گھنیری)	گھرنیر	۶-۱۶-۳۸
	بکرے	ورشنے	۱-۱۱-۷
	بکری	ورشنی	۱-۳-۳

ایرانی الفاظ میں رری ایرانی ر کی قائم مقام ہے مثلاً ویدک مرگ= ایرانی مرغ (ہرن) اور مرگ (موت)۔ ویدک سرکم= ایرانی چرخم (چکر)۔

گھیرا ۔ دائرہ)=لاطینی Circum =یونانی Kirkon ویدک ہَرَتی=فارسی زرد (سیڑھی) وغیرہ ۔

(۲) اردو کے مہاپران بعض بعض مقامات پر ویدک الپ پران سے لکھے گئے ہیں ۔ مثلاً

بھ=ویدک و	بھکنا	ورشنا	۱-۱٦-۳
	بھاپ	وَرِپس	۱-۱۱-۷
مبھ=ویدک م	سنبھال (سنبھالتا ہے)	سمارت	۱-۱۰-۳، ۱-۱-۲-٦
پھ=ویدک پ	پھانسا (پھندا)	پاشا	۱-٦-۱، ۲-۲۷-۱٦
	پھر (دوبارہ)	پر	۱-۱۰-٦
	پھانٹا(منقسم)	پرانچھ	۱۰-۱۳۵-۳
	پھیپھڑا	پھُرو	۱-۱۰-۱
	پھرسا (ایک ہتھیار)	پَرشو	۷-۳۰-۱-۲۱
	پھول	پوت	۱-۱-۳، ۱-۳-٦؛ ۱-۰۲-۲
ٹھ=ویدک ت	(ا) ٹھنڈا	اتندرا (جو ٹھنڈا نہ ہو)	۸-۲-۱۸، ۱-۲-۱۲-۸
تھ=ویدک ت	تھر تھراتا	ترتریتی (تھرتھراتا ہے)	٦-۳۷-۱۷
کھ=ویدک ک	بِکھ (بکھرنا)	وکرت	۱-۱٦۳-۱۵
	کھیل	کریل	۳-۳-۹
ڑھ=ویدک ر	چڑھاؤ	چراد	۷-۸۸-۳
	چڑھ	چرتی (چڑھتی ہیں)	۳-۱۵-۸

بھ=ویدک پ بھر (بھرنا) برن ۳-۱۸-۱۰

اسی طرح ایرانی کے حروف خ، غ اور ف جنھیں مستشرقین قدیم ہند یورپی کے سہاپران کہتے ہیں رگ وید میں الپ پرانوں سے تحریر ہوئے ہیں۔ مثلاً

	ایرانی	رگ وید	سوکت
خ=ویدک ک	خُمب (خُم)	کُمبھ	۱۰-۱۶۰-۱ ، ۲-۱۷-۱
	خردش	کردش	۶-۲۳-۱ ، ۶-۶-۱
	خاستہ (اٹھا ہوا)	کاشٹھا	۲-۸-۱
	خرامیم (ہم چلیں)	کرامیم	۶-۱۰۵-۱
	(جل) خرام	(ددھ) کرام	۱-۱۰۱-۱۰
	خرد (عقل)	کرتو	۱۰ ، ۹-۶۸-۱
	خرد مند	کرتو منت	۳-۲۳-۱
خ=ویدک س	خواجہ	سو آیو	۸-۱۳-۱
	خواجہ	سو آدھیو	۵-۳-۱
	خواہر	سو سارم	۳-۱۲۷-۱۰
	خوئید (پسینہ)	سوئید	۲-۱۳-۱
	خور (خورشید)	سور	۸-۱۳-۱
	خار (کانٹا)	سارم	۱۱-۱۳-۱۰
	خون	سون (بیٹا)	۱۰-۱۳۲-۱ ، ۳ ، ۱۱-۶
	خدا	سودھا	۱-۱۴۷-۲ ، ۱۰-۱۲۹-۵

	فارسی	رگ وید	سوکت
خ = ویدک ش	خشک	شُشک	۶ - ۱۳ -۲، ۴ - ۴ - ۴
	ساخم واخی (ہم آواز ہو کر)	سا کم واشی	۲-۸-۱
غ = ویدک گ	بغ (دیوتا)	بھگم	۳-۸۹-۱
	یُوغ (جوا)	یُگ	۳-۱۰۱-۱۰
	مرغ ، (ہرن)	مرِگ	۷-۱۰۵-۱
غ = ویدک ہ	دوغ (دوہنا)	دُہ	۸-۸-۸
	داغ (جلانا)	دَہ	۱۲-۱۰۳-۱۰
	میغ (بادل)	مِہ	۶-۱۳-۱
	آدوغ (ڈکار ، چڑھنا)	آرُہ	۲-۱۰۰-۱
ف = ویدک پ	درفش (جھنڈا)	در پسا	۳-۴-۱
	طوفان	گوپام	۸-۱-۱
	فرود	چروتا	۳-۳۵-۱
	فرخو (بہت سی شاخوں والا درخت)	پرتھو	۷-۱۳-۲
	فرشتہ	پرشٹھا	۳-۷۲-۶
	نیفتہ (نیچے گرایا ہوا)	نیپُتا	- ۱۰ ، ۵- ۳۲-۱۰ ۹-۳۴
	فشنگ (خوبصورت)	پشنگ	۳ -۱۴ -۱ ، ۲-۲۴ -۱
	فرزند	پرنیت	۳-۱۳-۹

(۳) اردو کے سماپرانوں کو رگ وید میں الپ پران پر صفیریوں اور ی کے اضافے سے بھی لکھا گیا ہے۔ مثلاً

	اردو	رگ وید	سوکت
س	ہم (قدیم اسم	اسم اسمان	۱ - ۳-۶
	چاؤ (قدیم ہمارا)		۱-۳-۲، ۱ -۳-۶
	سہا (قدیم نہا ،	سنا تو	۱-۱۵-۱۱
	نہانا)	(نہانے والا)	
	ٹھیراؤ (مضبوط ، دیر پا)	ستھراو	۱-۸-۳
	تھن	ستن	۱-۲۳-۵
نمی ش	بھٹی	بھرشٹی	۱-۱۳-۷
	لاٹھی (اشٹھی	رشٹی	۱-۷-۱
	نکھر (نکھرنا)	نشکرت	۱-۱-۲، ۱-۳-۳
	بکھر (بکھرنا)	وشکرت	۱-۷- ۴، ۱-۱-۲
حنکی ش	چھتّن جماع کرنا۔ اسی سے لفظ چھنال بنا ہے	ششن	۱-۱۰۵-۸
	زتّن (قدیم آعذ ، کھانا ، غذا	اشن	۱-۲۲-۸
	سرگون اشنو	(موت کی نذر)	۱-۲۳-۹
	ٹھنڈا	شجہندر.شچندرا	۱-۲۳-۱ ، ۱-۲۲ -۱۰، ۱-۶-۳
	اُتھا!	در شچا	۱-۱۰-۱

	اردو	رگ وید	سوکت
	ساتھی (ستّھی)	شَجی	۵-۱۶-۱
	چھوڑ (چھوڑنا)	شچوت	۳-۱۳-۱
اضافہ ی	بچّہ (بچھلی)	متسیہ	۲-۳-۱
	جُجھ (لڑائی)	یُدھیہ	۲-۱۰-۱
	مجھا (رہن ماجا، سہیا ، سہیم مجھ کو)		۱-۶-۱

(۳) اردو کے مہاپرانوں کو ویدک میں مفرد صفیروں سے بھی لکھا گیا ہے۔ مثلاً

کھ=س	اخروٹ (اکھروٹ)	اُسْرج	۵-۱۶-۱ ،۳-۱۶-۱
"	کھیچ	مش	۷-۱۶-۱
"	بھک (بھکنا ، کھانا)	بھست (کھاتی ہیں)	۴-۵-۴
جھ=س	سمجھتے	سماستے	۸-۲۲-۱
کھ=کش	سیکھ	سیکش	۱۱-۶۰-۷
"	لاکھوں	(کشم)	۷-۱۳-۱
چھ=کش	چھُرا	کشرا	۲-۲۳-۱
"	اچھا	اکشا	۴-۱۳-۵-۸
جھ=کش	ان جھاڑ (بےخار)	انرکشر	۴-۴۱-۱ ،۶-۸-۱ ، ۵-۴-۱
	جھڑنا	کشرن	۱-۱۷-۱
کھ=غ ش	سکھانا	سور شاتا	۶ ،۷ - ۱۳ - ۱ ۳ - ۲۳

	اردو	رگ وید	سوکت
چھ = حنکی ش	چھریا (بکری)	شریا	۲-۱۸-۱
	چھڑیاں	شریام	۹-۲۱-۱
	باچھڑی (بچھڑی)	باشری	۱-۲۰-۳
	بچھڑا	باشرا	۲-۷-۱

(۵) اردو کے مہاپرانوں کو ویدک کی دیوناگری لپی میں الپ پرانوں پر ہائے ہوز کے اضافے سے بھی ظاہر کیا گیا ہے - مثلاً

کھ = گ + ہ	گھر	گرہ	۳-۱۱-۵
	گھریا (کٹھالی)	گرہیا	۵-۱۸-۱
	جانگھ	جنگہے (جانگھوں سے)	۶-۱۸-۱
جھ = ج + ہ	جھوم (جھومنا)	جہوم	۱-۲-۱
	جھیل	جہیل	۲-۶-۱
بھ = ب + ہ	جیبھ (زبان)	جہوم	۱-۵۰-۳
	بھرت (نام ہے)	وربہت	
مھ = م + ہ	میں (قدیم مھیں۔ انندر)	مہکنی	۱۷-۲۱-۱
	ہمیں (قدیم انھیں)	اہمیم	۲-۹-۱
دھ = د + ہ	اِدھر	اِہتر	۲-۹-۱

(۶) اردو کے مہاپران رگ وید میں دوسرے مہاپرانوں سے بھی لکھے گئے ہیں - مثلاً

تھ = دھ	ساتھی (سنگھی)	سدھری	۳-۱۶-۱
	ان تھک	اَن دَھس	۲-۳-۱ ، ۱-۳۵-۶ ، ۲-۱۰-۱

	اردو	رگ وید	شوکت
مبھ = م + بھ	چوم (قدیم) چومبھ	شُنبھ	١-٢١-١
	سنبھلانا (قدیم سمبھلانا)	سمبھرا	٥-٥٥-٨
	سنبھل (قدیم سمبھل)	سنبھرت	٢-١٠-١
	تھم (قدیم تھمبھ)	ستمبھ	٢-١٢-٢
	کھم (قدیم کھمبھ)	سکمبھ	٤-١٦٠-١

(٧) اردو کے سہاپرانوں پر رگ وید میں جو کچھ بیتی ہے اس کا کچھ اندازہ مندرجہ بالا مثالوں سے ہو جاتا ہے لیکن ایرانی زبان میں خ ، غ ، ف کے علاوہ جن کا ذکر اوپر گزر چکا ہے دوسرے سہاپرانوں کے فقدان کے باعث اس قسم کی مثالیں نہیں مل سکتیں۔ البتہ رگ وید میں اس کے برعکس تمام زبانوں کے الپ پرانوں کو بھی بعض مقامات پر سہاپرانوں سے تحریر کیا گیا ہے۔ چنانچہ اس باب میں اردو اور فارسی دونوں کے الفاظ کے ساتھ رگ وید میں یکساں سلوک ہوا ہے اس کی مثالیں ذیل میں درج کی جاتی ہیں :

(الف)

ت = تھ	برت (حجمبان کا گھڑ)	دوتھ	١-٨٥-١
د = دھ	ڈاکو	دھاسم (متی)	١-٢١-١ ،٥-١١-١
ڈ = دھ	ڈے	دھے ہ	٣-١٨-١ ،١٨-٥٣-٣ ،١٨-٥٣-١
ل = دھ	مَل (مل دے)	سِ دھ	٥-٢-١٠
ل = دھ	بادلا	واوردھ	١-٢١-١ ،٩-٢٣-١
ل = دھ	بَجل	ددھ	١-١٠١-١٠
ل = دھ	بلبلانا	ودو دھان	٢-١٠-١

	اردو	رگ وید	سوکت
ل=شٹھ	منگل (بہبود)	منہشٹم	۱-۱۰-۱
ل=شٹھ	باڈل (بہت آنے جانے والا)	واہشٹھو	۱-۲۹-۲-۶
ل=شٹھ	بیل	وہشٹھا ، وہشٹھان	۱-۱۸-۱ ،۱-۲۰-۱
(ب)	ایرانی	رگ وید	سوکت
	دیدہ (آنکھ)	دھیتیو	۹-۴۰-۱
د=دھ	سپرد	سپردھ	۱۳-۵۵-۸
	داغ	دھکش (جلا دے)	۳ - ۳ - ۳
	وا وار	دادھار	۶-۵-۶۷-۱
	گردد (لڑھکتا ہے)	گردھ	۳-۳۳-۱۰
	دم (پھونکنا)	دھمتو (پھونکنے والے)	۱-۱۳-۱
	درمان	دھرمان	۱-۳-۱
	میدہ	میدھم	۶-۲۲-۱
د=تھ	بید	دیتھ	۷-۱۶-۱
ت=تھ	ستا (ستاون ، کھڑا ہونا)	ستھا	
	ستور (بیل)	ستھورم	۳-۱۰-۱
ت=ٹھ	ستا (ستاون)	شٹھا	۲-۱۵۳-۱
	خاستہ	کاشٹھا	۲-۸-۱

ب = بھ	آب (چمک)	آبھا	۱-۹-۷
	بغ	بھگ	۱۰-۳۳-۳
	ابر	ابھر	۱-۱۳-۶
	ُخمب (ُخم)	کمبُھ	۱-۱۷-۲، ۱-۱۶-۱۰
	براز (چمکتا)	بھراج	۱-۳۵-۳
	برگ	بھرگ	۳-۶۲-۱۰
	ببر	ببھرو (بادامی)	۲-۳۳-۳
	ببرد (وہ لے جاتا ہے)	ببھرتی	۱-۲-۱-۳

یہ مقام ان محققین کے لیے قابل غور ہے جن کے خیال کے مطابق ہماری بھاشائیں سنسکرت سے حروف بدل بدل کر تراشی گئی ہیں۔ ایرانی زبان میں مہاپرانوں کے فقدان کے باوجود رگ وید میں ایرانی الفاظ کو مہاپرانوں سے تحریر کیا گیا ہے جس سے اچھی طرح ثابت ہو جاتا ہے کہ ویدک زبان کی وہ آوازیں جو آج عام طور پر مراد لی جاتی ہیں۔ قطعی غلط اور ناقابل اعتبار ہیں اور یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ جن زبانوں اور آوازوں کو اس میں قلم بند کیا گیا ہے وہ اس کی تصنیف کے زمانے میں پیشتر سے رائج تھیں اس لیے ویدک زبان یا اس کی بیٹی کلاسیکی سنسکرت سے کسی دیسی یا بدیسی یعنی ہندوستانی یا ایرانی زبان کا اشتقاق درست نہیں مانا جا سکتا۔

(۸) اُردو کے فحی حروف ویدک میں دندانی سے لکھے گئے ہیں۔ مثلاً

اُردو	رگ وید	سوکت
ٹھنڈ ، تنڈتے	(ٹھنڈی ہوتی ہے)	۱-۲۰۰-۵
مونڈھ (سر)	مور دھانم	۳-۲-۶
چڑھیں	شردھیم	۱-۱۷-۳

اردو	رگ وید	سوکت
چڑھائے	شرد ھائے	١-١٦-٦
آٹھا	ورتھا	١-١١-٦
بیٹھا	ویدھا	١-١١-٣ ، ١-١-٢١-١٧
،،	ویدھو	١-٢٣-٥
بٹھانا	ود ھاتی (وہ بٹھاتا ہے)	١-١٧-٥
گھٹا (بادل)	گھرتا	١-٢٣-٣ ، ٧-٦٠-٣
بٹ (بل)	ورت	٣-٣٠-٢
کپٹ (کینہ)	سمبرج	٢-٣٥-٦
بھیڑا	بُھرو	١-١٠-١
چھت (چھپر)	شل	١-١٦٣-١٥ ، ١٠-١٢٨-٥
لٹایا	نھایا	١-١٥-١٢
اٹا (بالا خانہ)	اچا	١-١٦-٣ ، ١-١٥-١١
سٹا (نزدیک)	سچا	٣-٥-١١ ، ٣-٣٢-٣
سُمڑ (سڑنا)	سُچ	٣-٣١-٨
ساتھی انڈا (انڈے کا ساتھی)	سدھر بنچا (سدھری + انچا)	١-١٦-٣
	سوبھم (س + انبھم = اچھے انڈے والا)	٦-١٥-١٠
ڈر	در	١٠-١٠-٣
ڈول	درون	١٠-١٠١-٧

اردو	رگ وید	سوکت
ٹھنڈا	شچندر	۱-۶-۳
گھوڑا	گھورم	۲-۱۲-۵
	گھورا نام (گھوڑوں کا)	۱-۲۳-۵
کپڑا	کپا	۳-۲-۱۵-۱
اڑان	اران	۳-۵-۷-۳
نبڑ (ختم ہونا)	نورت	۱-۱۶-۷
سونڈ	شونر	۶-۵۷-۶
سکڑا	سسر	۱۰-۱۰۱-۸
اکڑا	اکرت	۱-۱۱-۷
بڑھ	رد دھ	۶-۳۳-۱۰۰، ۱-۲-۸
بے بڑھا	وش پردھسو	۱-۲۳-۹

ایرانی میں مہاپرانوں کی طرح فحی حروف بھی غائب ہیں اس لیے اس زبان سے اس قسم کی مثالیں نہیں مل سکتیں لیکن رگ وید میں صرف یہی نہیں ہوا ہے بلکہ اس کے برعکس دندانی حروف کو بھی خواہ مخواہ جا بجا فحی بنا دیا گیا ہے اور اس باب میں اردو اور فارسی زبان کی کوئی تخصیص نہیں ہے ۔ چنانچہ رگ وید کے دیسی الفاظ میں ٹ ، ڈ اور ل کا تبادل عام ملتا ہے جیسے اپٹے=اپلے ، کاٹ=کال ، وٹ=بل ، سڑ=سرل وغیرہ اور ایرانی الفاظ میں حرف ز فحی بن جاتا ہے جیسے ایاس اور اپاٹ یا راج اور راٹ وغیرہ ۔

ذیل میں دونوں زبانوں سے مزید چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں :

(الف)

اردو	رگ وید	سوکت
منگل	سنہشٹم	۱-۱۰-۱
کیل	وہشٹھا ، وہشٹھان	۱-۲۰-۱، ۱-۱۸-۱۰

(ب)

ایرانی	رگ وید	سوکت
مشت	مشٹی	۱-۳-۱
زاوشت (قوی)	شوشٹھ	۱-۱۳-۱۱، ۱-۱۳-۴
"	یوشٹھ	۱-۱۸۹-۴، ۱-۶-۳
است (ہے)	اشٹ	۱۰-۱۲۶-۱
فرشتہ	پرشٹھا	۶-۲۷-۳

(و) ان مثالوں سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ رگ وید میں دیسی اور بدیسی دونوں زبانوں کے الفاظ کو حروف بدل کر تحریر کیا گیا ہے کیونکہ عقل اس بات کو تسلیم نہیں کرتی کہ اس میں ہندوستانی آوازیں تو بدستور قائم رکھی گئی ہوں اور صرف ایرانی الفاظ کے حرف بدل دیے گئے ہوں ۔ اب میں ایسے ہی کچھ اور تبادل پیش کرتا ہوں جو اردو اور ایرانی الفاظ کی کتابت میں مشترک ملتے ہیں یہ الفاظ میرے اس خیال کو مزید تقویت بخشتے ہیں کہ ویدک میں رائج الوقت دراوڑی اور ایرانی زبانوں کے الفاظ یکجا کر دیے گئے ہیں :

	اردو	رگ وید	سوکت
ل=ویدک د			
	بَھلا (قدیم بھلّا، اچھا)	بھدرا	۱-۹-۵
	لاکھوں	دکشم	۱-۱۳-۴، ۱-۱۰-۲، ۱-۱۳-۷
	اردو	ویدنب	سوکت
ل=ویدک د	لکھ ہی	دکش ہی	۱-۱۵-۲
	ایرانی		
ل=ویدک ر	بلواوے	برواوبے	۱-۶-۷
ل=ویدک د	کاکل	کاکُد	۶-۵-۷-۲

	رسالہ (فوج)	رشادا	۳۰-۱۳-۱
	رسالک	رشادش	۳۰-۸-۱
	ولولہ	ودونا	۳-۱۰-۱
	گوسالہ	بو سادو	۱-۱۵-۱۰
ر=ویدک ل	پُر	پُل	
		پُل کامنو	۵-۲۴-۳-۲
		(خواہشات	
		سے پُر)	

اردو

ل=ویدک ت	چاول	چاروت	۶-۲۴-۱
	چیل	چیتی	۸-۱۳-۱
	چیلا	چیتا	۷-۱۵-۱
	اکیلی	اچھتی	۸-۱۶-۱
	پھول	پوت	۶-۳-۱ ، ۳-۱-۱
	پربل	پربھرت	۱-۲۳-۱
	کونپل کوبلیا	سوپتیا	۷-۱۲-۱ ، ۳-۱۰-۱
	ساون جل	سموت سر	۱-۲۱-۱ ، ۵-۱۶-۱

ایرانی

ل=ویدک ت	سال (برس)	سانم	۱۱-۲۴-۱
	"	سات	ہندی نرکتی نیکھنٹگ کانڈ، ص ۲ے کو ہند پریس کلکتہ ۱۹۱۵ء

اردو

ل=ویدک دھ	بلاؤ	ودھاو	١-٢١-١
	باولے	واوردھے	٨ - ٣-١ ، -١-١٠-١
	سکھلاتا	سیشدھاتی	٨-٨-١-٧

ایرانی

ل=ویدک دھ	لرز (لرزیدن)	دھرج	١-٢٣-١
	لرزمان	دھرش مان	٣-١٠-١

اردو

ل=وینک ن	پلک	ہنس	
		ہنس پتے (پلک گرتے) چشم زدن میں	٥-١٠-١
	لٹایا	نچایا	١٢-١٥-١
	پل (پلنا)	بن	١١-١٣-١

ایرانی

ل=وینک ن	ارل	ارن	٩-١٢-١ ، ٣-١-١
	ولولہ	ودونا	٣ -١٠-١

اردو

ر=وینک ن	گہرا	گہنم	١-١٢٩-١٠
	رینگتی	نینگ نتی	٨-٢٢-١

چ=ویدک ت

اٹکن=اچکن	٢-١٠-١
ستھ=سچ	٢-١٨-١

اردو

سر (کنڈا)	ترن (سکند)	٧-٢٣٤١ ،٦-٩-٢٢-١
بکری	ورشنی	٢-٨٥-١
بکرا	ورشنو	٢-٧-١
بکرے	ورشنے	٧-١١-١
بکری	ورشنی	٣-٣-١٠
بھر (بھرنا)	پرن	٣-١٨-١٠

ایرانی

اوروا	اُرُنَم (سرخ)	٦-٩-١ ،٩-٢-١
راستی	ناستیا (دیوتا)	٣-٧=١ ک١-١-١٧-١
گور	کشون	١-١٢-١

اردو

ک=ویدک س	اجکڑا (جو جکڑا اجسر)		٣-١٨٩-١ ،٨-٢٥-٢
	ہوا نہ ہو	(بے روک)	٣-١٨٥-١٠
	پھسکڑا (پھیلاؤ)	پر سرسرے (پھیلا)	٥-٢٥-٢
	کال (وقت)	سار	٦-٢١-١
	کونپل کوپلیا	سوپتیا	٧-١٢-١ ،٣-١٠-١

ایرانی

کنیزک	کنی بس	٦-٨٦-٩
بے باکان	وداسان	٩-٢٣-١
کہسار	سوعارو	٧-١٢-آ
آہک	آیس	٧-١٣-آ

اردو

ک=ویدک ی کونج (کونجنا)	ُینج	۱-۲-۳
بگلا (ایک پرند)	ویونا	۱-۲۲-۶ ، ۱-۱۳-۸

ایرانی

گونی (تھیلا)	یونی (رحم مادر)	۱-۲۱-۱
شیر گام	(تویش یاما)	۱-۲۳-۲
گام	یام	۱-۲۳-۳
نگار	نیان	۱-۲۲-۸

اردو

ج=ویدک ی جد کبھوں (جب کبھی)	یچد ھوم	۱-۱۳-۳
یچ	ذیریہ	۱-۱۵-۱۰
جلد (جب)	یتّہ	۱-۸-۳، ۱-۲۰-۶
جا (جانا) (جاون)	یادنٗ	۱-۹-۲
گج پھاڑ (ہاتھی کو پھاڑنے والا)	گیس پھانو	۱-۱۳-۷

ایرانی

جادو داں	یاتو دھام	۷-۱۰۳-۲۳
ّجو (غلّہ)	ّیو	۱-۱۷-۲
جام	یام	۱-۲۳-۸ ، ۱-۲۳-۱۰
ّجلد (جلدی)	ینده	۱-۱۸-۱
جوان	یُوانا	۷-۶۲-۵ ، ۱-۱۶-۵
خواجہ	سوآیو	۱-۱۲-۸

اردو

س=ویدک ش	سور (پیر)	شور	۱-۱۱-۶
	سونا (خالی، سنسان)	شونے	۱۰-۳۷-۶
	سنگات (ساتھ)	شرنگاد	۱-۲۱-۱
	سونڈ	شونر	۶-۵۷-۶
	پھرسا	پرشو	۷-۳-۱۰۱-۲
	پھانسا	پاشا	۱-۶-۱، ۲-۲۷-۱۶

ایرانی

	رسن (رسی)	رشن	۱-۲۲-۶
	سر	رشر	۱-۱۷-۲
	سرو	شرد	۶-۳۷-۱۷
	آسمان	اشمن	۲-۱۲-۲

اردو

س=ویدک ت	اساوری	رتاوری	۱-۱۶۰-۱
	سر (کنڈا)	ترن (سکند)	۱-۲۲-۶
	سرکنڈا	ترنسکند	۱-۲۳-۷

ایرانی

	پسر	پتر	۱۰-۱۳-۷

اردو

س=ویدک چ	چاندی	سانسی	۲-۵۹-۶
	چالیا (چلا)	سادھیا	۱-۱۲-۸، ۲-۳-۲۳-۳

	چمک	سنش	۸-۸-۳۸-۲ (دیسی تقسیم کے مطابق)
ایرانی			
	چمن	سمن	۱-۹-۵
	چرخ	سرکم	۸-۸-۳۵-۲ (دیسی تقسیم کے مطابق)
	چاند (جبڑا)	سانو	۱-۳-۳، ۱-۱۱-۵
	چمچہ	چمسم	۱-۲۲-۵، ۱-۴-۳، ۱-۱۰-۴
	چستی	سوستی	۱-۱۴-۵
	پرچم	پرسیم	ہندی ترکش (نیگھنٹگ کانڈ حصہ اول، ص ۹۳ کلکتہ ۱۹۱۵ء
اردو			
ر=ویدک د	بھرن (بارش کی)	وردن	۱-۲۱-۱
	برت (حجان کا گھر)	ودتھ	۱-۱۱-۷
	رستو (رہزن)	دیر	۱-۱۰-۳، ۲-۲، ۱۹-۱
ایرانی			
	خورند (کھائیں)	سورنت	۸-۶-۹-۵-۵-۲-۱-۲
	پرورے	پروتے (پرورش کے لیے)	۸-۸-۲۷-۱ (دیسی تقسیم کے مطابق)
	گور	تود	۲-۲-۱۹-۱

اردو

ب=ویدک پ	بکری	پرشنی	١-١٠ ، ١-٨٥-٦
	بڑ (بڑا)	بر	٨-٦-١٣-١

ایرانی

آب	آپ (اوستا آپ)	
شب	کشپ	١-٩-١
پر (اوپر)	پرہ	١-١١-٧

رگ وید کے مندرجہ بالا الفاظ کی تعداد اس بات کا کافی ثبوت ہے کہ آریوں نے اپنی آبائی زبان (قدیم ایرانی) کے الفاظ کے پہلو بہ پہلو ہماری زبان کے بھی بہت سے الفاظ اپنے بھجنوں میں داخل کر لیے ہیں لیکن ان کو کتابت کے خاص اصولوں کے تحت قلم بند کیا ہے جس کے باعث ظاہربیں نگاہیں ان تک پہنچنے سے قاصر رہ جاتی ہیں یہی وجہ ہے کہ ہندوستانی لسانیات کے محققین آلٹے اس زبان (ویدک و سنسکرت) کی مکتوبی شکلوں سے ہماری بھاشا (بول چال کی زبان) کی آوازیں مشتق کرنے کی سعی لاحاصل میں لگے ہوئے ہیں۔

رگ وید ہندوستان کی وہ قدیم ترین اور آریوں کی وہ پہلی کتاب ہے جو ہم تک پہنچی ہے چنانچہ اس میں اردو الفاظ کی موجودگی یہ ثابت کر رہی ہے کہ ہماری زبان ویدک کال کے بھی پہلے سے اس علاقے میں بھاشا کے طور پر کام میں آ رہی ہے۔ ان الفاظ سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ ہماری بول چال کی آوازوں میں ہزاروں سال سے آج تک زیر زبر پیش کا بھی فرق نہیں آیا ہے اور اس طرح اردو کے ماخذ اور اشتقاق سے متعلق اب تک کی تمام غلط فہمیاں زائل اور تمام نظریات از خود باطل ہو جاتے ہیں۔

کسی زبان کا اشتقاق دکھانے کے لیے یہ ضروری ہوتا ہے کہ اس کے الفاظ کا تجزیہ کرکے ان مادوں کا سراغ لگایا جائے جن سے مختلف

الفاظ بنائے گئے ہیں لیکن اردو زبان کے محققین جب اس کا اشتقاق دکھانے بیٹھتے ہیں تو ہر اردو لفظ کے مقابل سنسکرت زبان کا کوئی نہ کوئی لفظ پیش کرکے یہ سمجھ لیتے ہیں کہ اس کے اشتقاق کا حق ادا ہو گیا درآنحالیکہ اس قسم کی کوشش کا ہماری زبان کے اشتقاق سے نہیں بلکہ اس کی تاریخ سے تعلق ہے یعنی اس بات سے صرف یہ ثابت کیا جا سکتا ہے کہ ہماری زبان آج کی نہیں بلکہ بہت پرانی ہے جس کے الفاظ سے مشابہ الفاظ اس برصغیر کی ایک قدیم زبان سنسکرت میں بھی پائے جاتے ہیں چنانچہ میں نے بھی اردو الفاظ کے مقابل میں جو رگ وید کے الفاظ سطور بالا میں پیش کیے ہیں اس سے یہی ثابت کرنا چاہا ہے کہ ہماری زبان نہایت طویل العمر ہے اور اس کی تاریخ ہندوستان میں آریوں کی آمد سے قبل تک پہنچتی ہے لیکن جو لوگ اردو زبان کے اشتقاق پر کام کرنا چاہتے ہیں انہیں لازم ہے کہ وہ اپنے ذہن کو سنسکرت کے طلسم سے نکال کر اردو الفاظ کا تجزیہ کریں اور اس کے مادوں، سابقوں اور لاحقوں وغیرہ کا آزادانہ طور پر سراغ لگائیں کہ اردو کا اشتقاق ابھی تک تحقیق کا منتظر ہے۔

(مطبوعہ: نقوش، لاہور، جنوری ۱۹۶۳ء)

اردو زبان کا سفر

آج دنیا میں جتنی زبانیں نظر آتی ہیں ان میں سے ہر ایک کا ایک مخصوص علاقہ ہے جس میں وہ بولی اور سمجھی جاتی ہے یہی وجہ ہے کہ جہاں کسی زبان کا ذکر آیا اور ذہن فوراً اس کے علاقے کی جانب منتقل ہوا یعنی جس طرح ہمارے لیے کسی انسانی جماعت کا تصور کسی مخصوص خطہ ارض کے بغیر دشوار ہے اسی طرح ہم زبان پر بھی اس کی جنم بھوم سے ہٹ کر سوچنے کے عادی نہیں ہیں ۔ زبان انسان سے اور انسان اپنے وطن سے وابستہ و موسوم ہوتا ہے چنانچہ زمین سے وابستگی زبان کو نہ صرف مقامی امتیازات بخشتی ہے بلکہ اس کے تصور میں بھی قیام و دوام کا رنگ بھر دیتی ہے لیکن غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ زبان مکان میں نہیں مکین کی نوک زبان پر رہتی ہے اور مکین جس قدر ایک جگہ رہ پڑنے کا خواہشمند ہوتا ہے اسی قدر سفر پر بھی قادر و مجبور ہو جاتا ہے ۔ زبان جو قیام و حضر میں اس کی دمساز ہوتی ہے سفر میں بھی اس کے ہم رکاب رہتی ہے اور آفتاب کے نت نئے طلوع دیکھتی ہے ۔

انسانی سفر کے مختلف اغراض و اسباب ہوتے ہیں ۔ کبھی کسی خاص عقیدے کے پیرو کسی تیرتھ یا زیارت گاہ کا سفر کرتے ہیں یا کسی عقیدے کی تبلیغ کے لیے کچھ بزرگ ہستیاں کسی دوسرے علاقے کا رخ کرتی اور اپنے گرد عقیدت مندوں کی خاصی تعداد جمع کر لیتی ہیں مثلاً گجرات کے ناگر برہمن جو برج کے علاقے سے دوارکا پوری کی جانب منتقل ہوئے ۔ ہند جنوبی کے متعدد سادھو اور بھگت شنکر آچاریہ، راماغ ، نمبادتیہ ، بیھ آچاریہ وغیرہ جنھوں نے ہند شمالی کا سفر کیا اور جن میں سے بہت سے وہیں اپنے چیلوں سمیت آباد بھی ہو گئے ۔

بعض اوقات سیاسی محرکات بھی سفر کا باعث بن جاتے ہیں ۔مثلاً مسلمانوں کی ہندوستان پر تاخت و تاز جس کے ساتھ ساتھ ایرانیوں کی ایک بہت بڑی تعداد ہمالیہ کو عبور کرکے ہندوستان میں آ بسی یا علاؤالدین خلجی کے دکن اور گجرات پر حملے جن کے نتیجے میں ہند شمالی کی کافی آبادی فتوحات کے پیچھے پیچھے جنوب کو منتقل ہو گئی جس میں حضرت خواجہ سید محمد گیسو دراز اور ان کے مریدوں اور عقیدتمندوں کی خاصی تعداد شامل ہے ۔ کبھی سفر تجارت کی غرض سے بھی کیا جاتا ہے اور سوداگر کاروان درکاروان دوسرے ملکوں اور علاقوں کی منڈیوں میں جا پہنچتے ہیں ۔ دور حاضر میں راجستھان کے مارواڑیوں کے سفر اس کی مثال میں پیش کیے جا سکتے ہیں ۔ بعض اوقات اقتصادی حالات بھی انسانی آبادی کو سفر پر مجبور کر دیتے ہیں ۔ آریوں کا وسط ایشیا سے نکلنا اور جپسیوں کا ہندوستان سے یورپ جا پہنچنا ایسے ہی اسباب کا نتیجہ تھا ۔ ۱۹۴۷ء کے بعد مسلمانوں کا بھارتی علاقوں سے نکل کر پاکستان میں در آنا نقل آبادی کی ایک عجیب و غریب صورت ہے جو مذہبی ، سیاسی اور اقتصادی وغیرہ چند در چند وجوہ کی بنا پر ہماری آنکھوں کے سامنے پیش آئی ہے ۔

مندرجہ بالا تمام صورتوں میں جب کبھی انسانی آبادی ایک علاقے سے دوسرے علاقے کو منتقل ہوئی ہے تو اپنی زبان بھی اپنے ساتھ ہی لے گئی ہے ۔ آریوں نے قدیم ہند یورپی زبان یونان ، ایران اور ہندوستان میں پھیلائی ۔ پھر مسلمانوں کے ذریعے فارسی دوبارہ ہندوستان میں داخل ہوئی ۔ دکن کے بھگت اپنی اپنی زبانیں لے کر شمال کی طرف بڑھے ۔ ناگر برہمن برج بھاشا لے کر گجرات پہنچے ۔ دہلی والے ہریانی ، پنجابی میواتی وغیرہ بولتے ہوئے دکن جا نکلے ۔ شاہجہان کے ساتھ اردو بھی آگرے سے دلی کو گئی اور ۱۹۴۷ء کے بعد بھارت سے مسلمان اردو لے کر پاکستان میں داخل ہوئے ۔ زبان کی اس نقل و حرکت پر جن محققین کی نظر نہیں پہنچی انہوں نے بعض زبانوں کے وطن اصلی کے متعلق غلط مفروضے قائم کر لیے مثلاً کچھ لوگوں نے اوستا کی زبان کو قدیم باختری کہہ دیا حالانکہ اس کا وطن شمالی مغربی ایران یعنی آذربائیجان بھی ہو

سکتا ہے ۔ بعض لوگوں نے اردو کا وطن یو ۔ پی اور بعض نے دہلی ٹھہرایا ۔ ان غلط فہمیوں کی وجہ یہ ہے کہ جس مقام پر لوگوں کو کسی زبان کی جھلک دکھائی دیتی ہے وہ اسی کو اس زبان کی سرزبوم سمجھ بیٹھتے ہیں حالانکہ وہ اس زبان کے سفر کی ایک منزل ہوتی ہے ۔

جس طرح انسان سفر کرنے سے کچھ نہ کچھ سیکھتا ہے اور اس کی عادات و اطوار میں تبدیلی آ جاتی ہے یعنی جس طرح سفر کے بعد انسان ذہنی و جذباتی طور پر کچھ نہ کچھ بدل جاتا ہے اسی طرح جب زبان ایک مقام سے دوسرے مقام کو سفر کرتی ہے اور اس کا وہاں کی مقامی زبان سے سابقہ پڑتا ہے تو دونوں ایک دوسرے سے بہت کچھ حاصل کرتی ہیں اور اس لین دین کے سبب دونوں اپنی اپنی جگہ کچھ نہ کچھ تبدیل ہو جاتی ہیں مثلاً قدیم ہند یورپی زبان آریوں کے ساتھ یونان پہنچ کر قدیم یونانی کہلائی ، ایران میں داخل ہو کر قدیم ایرانی (اوستائی) کے نام سے موسوم ہوئی اور ہندوستان میں آ کر ویدک و سنسکرت بنی اور اس طرح اس نے ہر ملک کی مقامی بولیوں کے اثرات قبول کیے ۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ان ممالک کی تینوں زبانیں متحدالاصل ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے بہت کچھ مختلف ہو گئیں چنانچہ جہاں ان کی مشابہت ان کے مشترک ماخذ پر دلالت کرتی ہے وہاں ان کے اختلافات مقامی بولیوں کے اثرات کی غمازی بھی کر رہے ہیں ۔ اسی طرح گجرات کے ناگر برہمنوں کی زبان میں برج بھاشا اور گجراتی دونوں کے نقوش ملتے ہیں اور قدیم دکنی ادب میں پنجابی ہریانی اور میواتی روپوں کے ساتھ ساتھ بیجاپوری ٹھاٹھ بھی نظر آتا ہے ۔ ان شواہد کی موجودگی میں مجھے یہاں صرف اتنا ہی کہنا ہے کہ جو مغربی یا مشرق محققین ان سفر کرنے والی زبانوں کے اختلافات کے اسباب مختلف جغرافیائی حالات اور امتداد زمانہ میں تلاش کرتے ہیں وہ اس حقیقت کو نظر انداز کر رہے ہیں کہ زبانیں مرور ایام سے نہیں بدلتیں ۔ نہ دو زبانوں کے تصادم سے تیسری زبان پیدا ہوتی ہے بلکہ ایک زبان دوسری زبان کے میل جول سے کچھ تغیرات قبول کر لیا کرتی ہے ۔

اردو زبان کی تاریخ پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے ابتدا سے آج تک ایک بہت طویل سفر کیا ہے اور اس برصغیر کے مختلف علاقوں میں جہاں جہاں اس نے اپنا پڑاؤ ڈالا وہاں وہاں نہ صرف اپنی یادگاریں چھوڑیں بلکہ مقامی زبانوں کے اثرات لیتی ہوئی آگے بڑھتی رہی ہے۔ مزاج اور ساخت کے اعتبار سے اس کا ٹھاٹھ جو کچھ ہو اور ہندوستان میں مسلمانوں کے داخلے سے قبل یہ کہیں بھی پروان چڑھی ہو اور کسی لپی میں لکھی جاتی رہی ہو ہم لوگ (مسلمان) پہلی بار عہد اکبری میں اس سے متعارف ہوتے ہیں جیسا کہ میر امن نے باغ و بہار کے مقدمے میں بھی لکھا ہے۔ اس لحاظ سے اکبر کی راجدھانی اکبر آباد (آگرہ) اردو زبان کے سفر کی پہلی جانی پہچانی منزل ٹھہرتی ہے جس سے یہ رفتہ رفتہ تمام یو۔ پی میں پھیلتی چلی گئی اور لوگ یو۔ پی کو اردو کی مرزبوم سمجھنے لگے۔

اس میں شک نہیں کہ عہد اکبری سے مسلمانوں میں اردو بولنے اور لکھنے پڑھنے کا رواج شروع ہو جاتا ہے لیکن یہ رواج آج بھی صرف جنوبی مغربی یو۔ پی یعنی آگرہ کمشنری تک ہی محدود ہے۔ یو۔ پی کے دوسرے علاقوں میں وہاں کی مقامی بولیاں ہندوؤں کی طرح مسلمانوں کی بھی یومیہ ضروریات پوری کر رہی ہیں اور صرف آگرہ کمشنری کے مسلمانوں میں مادری زبان کے طور پر بولی جاتی ہے۔ مشرقی یو۔ پی کے مسلمانوں میں اودھی اور جونپوری اور شمالی یو۔ پی کے مسلمانوں میں روہیلی اور ہریانی وغیرہ کا چلن ہے۔ میرٹھ، مظفر نگر اور سہارن پور کے اضلاع کو جو خالص ہریانی کے علاقے میں واقع ہیں لوگ غلطی سے کھڑی بولی کا علاقہ کہہ دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ اردو کا چلن یو۔ پی کے تمام شہروں میں ہو گیا ہے اور دیوناگری اور فارسی لپی دونوں کی تحریروں میں عام طور پر استعمال ہوتی ہے لیکن دیہات میں اور شہروں میں ہندوؤں کے یہاں برج بھاشا ہی بولی جاتی ہے۔ برج بھاشا ریاست گوالیار کے علاوہ یو۔ پی کے مغرب میں آگرے سے لے کر مشرق میں کانپور اور شمال میں متھرا تک چلی جاتی ہے۔ اس طرح اگرچہ جنوبی مغربی یو۔ پی میں دونوں زبانیں یعنی برج بھاشا اور اردو بولی

جاتی ہیں لیکن یہ علاقہ اصل میں برج بھاشا کا ہے جس کا سکہ شہری اور دیہی آبادی میں یکساں طور پر چل رہا ہے جب کہ اردو صرف مسلمانوں اور بعض شہری ہندوؤں تک محدود ہے ۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا غالباً غلط نہ ہو گا کہ اردو جنوبی مغربی یو ۔ پی میں باہر سے آئی ہے ۔

اردو ادب کے مورخین نے دہلی اور لکھنؤ کے جو دبستان قائم کیے ہیں اس کے متعلق تو میں آگے عرض کروں گا کہ ان کی اس حدبندی کے کیا وجوہ ہیں اور وہ کون سے نمایاں عناصر ہیں جن کی بنا پر اردو ادب کو دو واضح حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے البتہ یہاں ایک قابلِ غور نکتہ یہ ہے کہ اگر عہد شاہجہانی کے بعد ادب اردو کا پہلا دبستان دہلی میں قائم کیا جا سکتا ہے تو عہدِ اکبری سے عہدِ شاہجہانی تک کے اکبر آباد میں اس پہلے سے بھی پہلے ایک دبستان قائم کرنا لازمی ہے کیونکہ دبستان دہلی کے اساتذہ متقدمین کی پہلی کھیپ اکبر آباد سے ہی دہلی کو منتقل ہوئی تھی اور دہلی کی محفلوں میں اکبر آبادی شعرا کے خونِ جگر نے ہی پہلی بار جوت جگائی تھی ۔ ہماری بے خبری اور لاعلمی نے قدما کی کوششوں کا فخر و اعزاز دہلی کو تو بخش دیا لیکن اس اکبر آباد کی روایات کو یکسر فراموش کر دیا جس نے ان کی شاعری کو پروان چڑھایا اور انھیں اس قابل بنایا کہ دہلی جا کر وہاں والوں کو اردو سکھائیں اور ان کے کلام پر اصلاح دیں ۔

جب شاہجہان نے سیاسی مصالح کے تحت آگرہ چھوڑنا اور دہلی کو مستقل طور پر راجدھانی بنانا طے کیا تو قدیم شہر سے الگ ایک نئے شہر کی بنیاد ڈالی جسے شاہجہان آباد کہتے ہیں ۔ ۱۶۴۷ء میں آگرے سے پایہ تخت دہلی کو منتقل ہوا تو شاہجہان کے ساتھ کافی آبادی دہلی پہنچی اور اس علاقے میں آباد ہوئی جسے اردوئے معلیٰ یا چھاؤنی کہتے ہیں ۔ یہ آبادی اپنے منہ میں وہی زبان آگرے سے لے کر گئی تھی ، جسے بعد میں زبان اردوئے معلیٰ ، زبانِ اردو ، اردو کی زبان یا محض اردو کہنے سے اب اس زبان کا سکہ نہ صرف اردوئے معلیٰ میں ہی چلتا تھا بلکہ علاقتِ شاہی میں بھی اسے کافی مقبولیت حاصل ہو چکی تھی رفتہ رفتہ

اس کی ہر دل عزیزی بڑھتی رہی اور شاہی سرپرستی میں اس کو دن دونی رات چوگنی شہرت و وسعت نصیب ہوتی چلی گئی - آنے والے زمانے میں لوگ دہلی کی سیاسی اہمیت سے دھوکا کھا کر اس کی پہلی منزل (اکبر آباد) کو بھول بسر گئے اور دہلی ہی کو اس کی اصل سرزبوم سمجھ بیٹھے چنانچہ لوگ آج تک اسی مغالطے میں مبتلا ہیں کہ اردو کا وطن دہلی ہے حالانکہ دہلی ہریانے میں واقع ہے - نواحی دیہات کا تو ذکر کیا خود اس شہر کے نچلے طبقوں اور ہندوؤں میں آج تک ہریانی بولی جا رہی ہے - اردو دہلی میں اس وقت بھی صرف پڑھے لکھے مسلمانوں کی مادری زبان ہے -

سلاطین مغلیہ کے اقبال میں گھن لگا تو حکومت و دولت نے منہ موڑ لیا - اردو کے ادیبوں اور شاعروں نے دہلی میں گزارے کی صورت نہ دیکھ کر چاروں طرف نظر دوڑائی تو لکھنؤ میں ہن برستا دکھائی دیا - رفتہ رفتہ یہ لوگ وطن چھوڑ چھوڑ کر اودھ کی راجدھانی میں جا بسے اور یوں سلاطین اودھ کی قدردانی ، سرپرستی اور خوش ذوقی نے لکھنؤ کو بھی اردو زبان کا مرکز بنا دیا چنانچہ دہلی کی طرح جب لکھنؤ میں بھی اردو کے سر پر سلاطین اودھ نے دست شفقت رکھا اور اسے اپنی عنایات سے نوازا تو اس علاقے میں بھی اس کا طوطی بولنے لگا - البتہ دہلی کی طرح کسی نے لکھنؤ کو اردو کا وطن نہیں ٹھہرایا - اس کی وجہ یہ تھی کہ دہلی اور لکھنؤ دونوں آخر تک حکومتوں کی راجدھانی رہے - جس طرح دہلی کے بعد آگرے کی راجدھانی ختم ہو گئی اگر اسی طرح لکھنؤ کی راجدھانی سے قبل دہلی کا پایۂ تخت بھی ختم ہو جاتا تو یقین تھا کہ لوگ دہلی کی لسانی اہمیت کو بھی اسی طرح فراموش کر دیتے جس طرح اکبر آباد کی خدمات کو بھول گئے -

دہلی اور لکھنؤ دونوں مقامات پر اردو زبان کو یہ شاہی سرپرستی ۱۸۵۷ء تک حاصل رہی - ان سلطنتوں کے خاتمے سے قبل اگرچہ انگریزوں نے اردو کو سرکاری و دفتری زبان قرار دے دیا تھا لیکن حقیقت میں ان کا یہ اقدام منافقت پر مبنی تھا - وہ اس پردے میں انگریزی کو عوام پر مسلط کرنا چاہتے تھے - آخر وہ اپنے اس منصوبے

میں کامیاب ہو گئے اور اردو کے بہانے انگریزی راج دربار میں سنگھاسن پر کچھ اس طرح ڈٹ کر بیٹھ گئی کہ اس برصغیر کو آزاد ہونے بھی کئی برس بیت چکے ہیں لیکن محبانِ وطن اور فدایانِ اردو کی ہزار کوششیں اسے اس جگہ سے ایک انچ بھی نہیں ہٹا سکیں۔ انگریزوں کی اس ناپاک کوشش کے باوجود اس وقت تک اردو ملک کے طول و عرض میں اس درجہ پھیل چکی تھی کہ اب اسے مزید کسی شاہی سرپرستی کی احتیاج نہیں رہی تھی بلکہ اس کا مرکز لاہور میں بھی قائم ہو چکا تھا چنانچہ ۱۸۵۷ء کے بعد سے لاہور میں اردو زبان و ادب کے فروغ کی کوششیں نمایاں طور پر سامنے آنے لگی ہیں جن کا سلسلہ ۱۹۴۷ء کے بعد کی کہیں زیادہ زور دار اور مؤثر تحریکوں سے آ ملتا ہے۔

غرض قیامِ پاکستان سے قبل تاریخ کی روشنی میں ہمیں تین مقامات ایسے نظر آتے ہیں جو اردو زبان کے سفر کی تین نمایاں منزلیں ہیں لیکن ادب اردو کے مورخین صرف دو دبستان دہلی اور لکھنؤ قرار دیتے ہیں۔ بعض ہوشمند ادیب اردو ادب کی اس تقسیم کے بھی قائل نہیں ہیں وجہ یہ ہے کہ فنی سطح پر دونوں مقامات میں کوئی فرق نہیں ملتا یعنی لکھنؤ والوں نے کوئی ایسے تجربے نہیں کیے جنہیں اردو ادب میں اضافہ کہا جا سکے یا جنہیں دہلی کے مقابلے میں ایجادی و اختراعی کوششوں کے طور پر پیش کیا جا سکے۔ دونوں مقامات پر چند متروکات متنازع فیہ سمجھے جاتے ہیں لیکن یہ صرف ذاتی پسندیدگی و ناپسندیدگی کی بات ہے اس لیے نہ یہ مسئلہ ہی کوئی اتنا اہم ہے اور نہ ان متروکات کی تعداد ہی وقیع ہے جو دبستان سازی کی وجہ جواز بن سکے۔ دہلوی شعرا کی امرد پرستی اور لکھنوی شعرا کی طوائف پرستی کو بھی بنیادی درجہ نہیں دیا جا سکتا کیونکہ یہ رجحانات دونوں مقامات پر مخلوط نظر آتے ہیں۔ آخر میں بعض اختلافات روزمرہ محاورہ کے آتے ہیں مثلاً لکھنوی اور دہلوی شعرا بعض اسماء، لفظ، قلم، سانس، فکر، موتی وغیرہ کی جنس میں اختلاف کرتے ہیں۔ دہلوی ادیب لکھنوی محاورہ "نوکری کرنا پڑی" کی جگہ نوکری کرنی پڑی بولتے ہیں دہلوی حضرات لکھنوی مصرع "اذاں کا ان کے خوش آوازوں میں ہے آوازہ" کو "اذاں کا ان کی خوش آوازوں میں

طباطبائی نظم طباطبائی علی حیدر اور علی حیدر نظم طباطبائی ہے آوازہ" پڑھنا صحیح سمجھتے ہیں اور علی حیدر نظم طباطبائی "شرح دیوانِ غالب" میں نحوی اصول پر لکھنوی محاورے کو صحیح ثابت کرتے ہیں ۔ یا لکھنؤ والے دہلوی "کہا کر" کی جگہ "کہا کے" کو ترجیح دیتے ہیں اور دہلی کے خلاف جمع مونث کو بھی بلا استثنا مذکر استعمال کرتے ہیں مثلاً اس کی وجہ ، اس کے وجوہ (دہلوی اردو ۔ اس کی وجوہ) وغیرہ — غرض دہلوی اور لکھنوی دبستانوں کے فرق کا زیادہ تر دارومدار لسانی اختلافات پر ہے ۔

ایسے اختلافات کا ہر زبان کے سفر کی مختلف منزلوں میں پیدا ہو جانا بالکل معمولی سی بات ہے چنانچہ اکبر آباد میں جو تاریخ کی رو سے اردو زبان کی پہلی منزل ہے آج بھی اردو کے کچھ ایسے الفاظ و محاورات ملتے ہیں جن سے دہلوی اور لکھنوی حضرات بے خبر رہ گئے مثلاً ڈونکنا (بجار کا گونج دار آواز پیدا کرنا) ۔ دروونا (موٹا موٹا دلنا)۔ جھوراانا (گائے بھینس کا مارنے کے لیے سر ہلانا)۔ ٹھاٹھا (مضبوط ۔ تگڑا) جھوٹا (پینگ) کسیا (چمڑا رنگنے والا چیز) بھینبھنا ، (غبارہ) ۔ لاحقہ "دیسی" جیسے جھٹ دیسی ۔ پھٹ دیسی (فوراً) ۔ ایلون پہ (کثرت سے جوش پر) ایلواں (بکثرت) سیل پڑ جانا (بھاری اور سست ہو جانا) چھار چھار ہو جانا (ریزہ ریزہ ہو جانا) ۔ ایک ایک یا دو دو پانی ہونا (مقابلہ ہونا ۔ ایک ایک یا دو دو ہاتھ ہونا) وغیرہ ۔

جب اردو آگرے سے سفر کرکے دہلی پہنچی تو وہاں کی مقامی زبان ہریانی کی بہت سی خصوصیات اس میں داخل ہو گئیں جیسے آوے جاوے (اردو آئے جائے) ۔ آنے ہے جانے ہے (اردو آتا ہے جاتا ہے) تئیں (اردو آپ ۔ راجستھانی تانیں) ۔ ٹک (ذرا) ۔ لاحقہ "او" جو برج بھاشا میں بھی ملتا ہے اور قدیم دکنی ادب میں بھی پایا جاتا ہے جیسے کبھو ، کسو وغیرہ ۔ اردو میں اس کی جگہ تاکیدی لاحقہ "ای" مستعمل ہے جیسے کبھی ، کسی ۔ ہریانی اور راجستھانی کیجیے —(اردو کیجیے) ۔ دیجے (اردو دیجیے) ۔ دیکھ (اردو (دیکھ کر یا دیکھ کے)۔ سن (اردو سن کر یا سن کر) ۔ کہوں (اردو کہیں) ۔ کہوانا (اردو کہلوانا) ۔

اردو کی علامتِ فاعلی کا غیاب جیسے :

ع رات ہم ہجر کی دولت سے مزہ لوٹا ہے

جس پاس (اردو جس کے پاس) مثلاً غالب ۔

جس پاس روزہ کھول کے کھانے کو کچھ نہ ہو
روزہ اگر نہ کھائے تو ناچار کیا کرے

جمع مونث آتیاں جاتیاں (اردو آنے والیاں - جانے والیاں) - جد ، تد (اردو جب ، تب) وغیرہ - ان کے علاوہ بہت سے ہریانی زبان کے الفاظ اردو میں داخل ہو گئے ہیں جنھیں فرہنگ آصفیہ میں دیکھا جا سکتا ہے ۔

لکھنؤ میں اردو کا مرکز قائم ہونے اور زبان کے اس قدر فروغ کے باوجود لکھنؤ کے عوام آج بھی اودھی بولتے سنائی دیتے ہیں اور ان میں مسلمان بھی شامل ہیں ۔ چونکہ لکھنؤ اودھی زبان کے علاقے میں واقع ہے یہاں کے لوگوں پر اودھی کا اتنا زیادہ اثر ہے کہ لکھنؤ والوں نے اردو میں بھی اودھی لہجہ داخل کر دیا ہے چنانچہ اس زبان میں جو اندراج حرکت کا چلن ہمیشہ سے چلا آ رہا ہے وہ لکھنؤ والوں کی بدولت اردو میں بھی آ پہنچا ہے اور اس کے ذخیرے میں بنیان کے ساتھ بنیائن ، ادوان کے ساتھ ادوائن ، اجوان کے ساتھ اجوائن اور ہائے ہائے کے ساتھ ہے ہے اور بنی ہے جیسے ان گنت الفاظ کا اضافہ ہو گیا ہے ۔ ان کے علاوہ جس طرح دہلی میں ہریانی کے کثیر تعداد روپ اردو میں داخل ہوئے اسی طرح لکھنؤ میں بھی اودھی کے متعدد بول ہماری زبان کو مل گئے جنھیں نوراللغات میں تلاش کیا جا سکتا ہے ۔

۱۹۴۷ء کے بعد اردو بولنے والوں کی ایک بڑی تعداد بھارت سے مغربی پاکستان چلی آئی ہے جہاں اردو کا سابقہ بہت سی مقامی بولیوں سے پڑ گیا ہے چنانچہ جس طرح یہ زبان قیام پاکستان سے قبل اپنے سفر کی ہر منزل پر مقامی زبان سے متاثر ہوتی چلی آ رہی ہے اب پاکستان کی علاقائی زبانوں کے میل سے بھی کچھ نہ کچھ اثرات ضرور قبول کرے

گی ۔ کم از کم اس کی وہ صورت باقی نہیں رہ سکے گی جو دہلی یا لکھنؤ میں رہ چکی ہے اور یہ بات اس کے حق میں نیک فال ہو گی ۔ کیونکہ جہاں زبان دوسری ہمسایہ زبانوں سے متاثر ہو کر بدلتی جاتی ہے وہاں اس عمل سے اس کے ذخیرۂ الفاظ و اسالیب میں بھی اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے اور یہی اضافہ اس کے فروغ و وسعت کا ضامن ہوتا ہے ۔

اردو زبان کو لوگ بیشتر ادبی نقطۂ نظر سے دیکھتے چلے آ رہے ہیں چنانچہ ان لوگوں نے جنہوں نے اردو زبان کے بارے میں کچھ لکھا ہے لیکن حقیقت میں جن کا میدان ادب تھا کچھ ایسے غلط خیالات ہمارے یہاں پھیلا دیے ہیں جن کا زبان کے مزاج سے کوئی تعلق نہیں مثلاً ان کا کہنا ہے کہ زبان کے جو الفاظ زبان پر آسانی سے رواں ہو جاتے ہیں وہ باقی رہتے ہیں اور جن کے تلفظ میں کچھ دقت یا ثقالت ہوتی ہے وہ ترک کر دیے جاتے ہیں ۔ اس قسم کی باتیں بالعموم دوسری زبان کے رویوں کے متعلق کہی جاتی ہیں لیکن میں نے کسی کو یہ کہتے نہیں سنا کہ اس کی مادری زبان کا فلاں لفظ ثقیل ہے نہ کبھی کسی نے یہ شکایت کی کہ ہمیں اپنی زبان کے فلاں لفظ کے تلفظ میں سخت دقت پیش آتی ہے اور نہ کسی نے آج تک اپنی زبان کے الفاظ کو حسین اور بھونڈے یا مکروہ دو قسم کے گروہوں میں یوں تقسیم کیا ہے جیسے ہمارے ادیب تقسیم کرتے چلے آ رہے ہیں ۔ زبان کا تعلق عوام سے ہوتا ہے اور وہ ان کی یومیہ ضروریات کو پورا کرنے کی ذمہ دار ہوتی ہے ۔ لہٰذا جب تک زبان ان کی ضروریات کی کفالت کرتی رہتی ہے انہیں نہ کسی لفظ میں ثقالت محسوس ہوتی ہے نہ کسی لفظ سے کراہت ہی آتی ہے ۔

اس سلسلے میں بعض ادیبوں نے یہ نکتہ بھی پیدا کیا ہے کہ ملک کے طبعی حالات ، آب و ہوا کے اثرات اور بولنے والوں کا پیشہ ورانہ ماحول یا معمول زندگی بھی کسی زبان کو اکھڑ اور اجڈ بنانے کے ذمہ دار ہوتے ہیں اور دال چپاتی کھانے والے اور میدانوں میں بآسائش و بفراغت زندگی بسر کرنے والے حسین و نرم و نازک زبان کے مالک ہوتے ہیں لیکن یہ بات بھی ان کی پہلی بات کی طرح غلط ہے اور حقائق

سے ثابت نہیں ہوتی - یہ بالکل صحیح ہے کہ تہذیب ہمیشہ پرسکون ماحول میں پروان چڑھتی ہے لیکن زبان کی ساخت اور مزاج کا اس قسم کی باتوں سے کوئی تعلق نہیں -

ترک و اختیار ہمارے ادب اور ادیبوں کا ایک ایسا معمول ہے جس سے کوئی دور خالی نہیں رہا لیکن کسی زبان میں اس قسم کی ذاتی پسندیدگی اور ناپسندیدگی اور ترجیحی سلوک کی مثال نہیں ملتی مثلاً اردو کے بعض ادیبوں نے مت کی جگہ نہ اور تلک کی جگہ تک کے الفاظ اختیار کر لیے ہیں لیکن عوام میں اب بھی مت اور تلک بے تکان بولے جا رہے ہیں اور ظاہر ہے کہ زبان کے معاملے میں ادیب غیر مستند اور عوام مستند مانے جائیں گے کہ زبان ایک جمہوری نظام ہے جس میں ادب کی آمریت کام نہیں دیتی اور ادیب اپنے امتناعی احکامات اور تاکیدوں سے کسی لفظ کے ترک یا اختیار کرنے پر عوام کو مجبور نہیں کر سکتے کیونکہ ہمارے ادیب تلفظ کی سہولت کو انتخاب الفاظ کا معیار بناتے ہیں لیکن عوام اپنی کاروباری سہولت پر اس کا مدار رکھتے ہیں -

اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ زبان میں الفاظ ترک نہیں کیے جاتے لیکن اس کے لیے ادب اور زبان میں دو مختلف عمل نظر آتے ہیں - ادب میں ترک الفاظ حسن ذوق یا ذاتی ناپسندیدگی کا نتیجہ ہوتا ہے اور زبان میں ایک لفظ صرف اس وقت متروک ہو جاتا ہے جب دوسری زبان کا کوئی ہم معنی لفظ اختیار کرکے بولنے والے اسے برتر مقام عطا کر دیتے ہیں مثلاً فارسی زبان کا لفظ دکان اسی ترجیحی رجحان کے باعث ہمارے یہاں اس قدر رواج پاگیا ہے کہ اب ہمیں اپنی زبان میں اس کے مترادف لفظ کا علم بھی نہیں رہا اور ہم پنجابی کے "ہٹی" (قدیم اٹ) کو جوہاٹ (قدیم آٹ معنی بازار) سے یائے نسبتی کے ساتھ بنایا گیا تھا قطعاً فراموش کر چکے ہیں لیکن یہ لفظ "پھلٹی" (آگرے میں پھول والوں کا ایک بازار جو پھول اور اٹ سے بنا ہے) آج تک چلا آ رہا ہے -

اس برصغیر کی تمام زبانوں میں نہ صرف بہت سے صوتی ، صرفی اور نحوی اصول مشترک ملتے ہیں بلکہ الفاظ کی بھی ایک کثیر تعداد مشترک

پائی جاتی ہے ۔ اس لحاظ سے اردو زبان جیسے جیسے پاکستان کی دوسری علاقائی زبانوں کے قریب آتی جائے گی یہ قدر مشترک ہماری زبان میں زیادہ مستحکم ہوتی جائے گی بلکہ اردو میں بہت سے مروجہ فارسی عربی الفاظ کے قدیم مترادفات اس میل جول سے از سرنو ابھر آئیں گے اور یوں اردو کا ایک بہت بڑا حصہ جسے ہم قریب قریب کھو بیٹھے ہیں دوبارہ حاصل ہو جائے گا ۔

دنیا کی ہر زبان میں کچھ نہ کچھ حصہ دوسری زبانوں کا بھی ملتا ہے اور زبانوں کا یہ لین دین ہر دور میں دیکھا جا سکتا ہے ۔ زبانوں کی نشو و نما اور فروغ میں اس عمل کا بہت بڑا ہاتھ ہوتا ہے ۔ اس کی مثال میں آج کی انگریزی زبان پیش کی جا سکتی ہے جس کی وسعت و ثروت میں نہ صرف یورپ کی قریب قریب تمام زبانوں کا حصہ ہے بلکہ اس برصغیر کی دراوڑی زبانوں نے بھی اس کی جمع جتھا بڑھانے میں کچھ نہ کچھ مدد دی ہے ۔ اسی طرح پاکستانی اردو میں بھی دوسری علاقائی زبانوں کے نہ صرف بہت سے الفاظ داخل ہو جائیں گے بلکہ بہت سے اسالیب بھی غیر شعوری طور پر چلے آئیں گے ۔ اس عمل میں عربی فارسی کے لاتعداد الفاظ جو آج اردو کے قدیم الفاظ کی جگہ جمے بیٹھے ہیں رفتہ رفتہ ان دیسی الفاظ کو بھی اپنے برابر جگہ دینے پر مجبور ہو جائیں گے ۔

اردو زبان کے مصلحین کی ہمیشہ سے یہ کوشش رہی ہے کہ خالص اردو الفاظ کو ترک کر کے ان کی جگہ عربی فارسی الفاظ کو اختیار کیا جائے چنانچہ حاتم و ناسخ وغیرہ جتنے بھی ادیب اصلاح زبان کے لیے اٹھے انہوں نے جہاں ایک طرف ان زبانوں سے اردو کے دامن کو بہت کچھ مالا مال کیا وہاں دوسری طرف انہوں نے زبان کا اسی قدر خضہ استعمال سے خارج بھی کر دیا اور اس طرح ان لوگوں کی کوششوں نے اردو زبان کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا ۔ آج کل کے ادیب اور زبان کے بہی خواہ قدما کی اس غلطی سے سبق لے کر اگر مستعار الفاظ کے ساتھ اس قسم کا ترجیحی سلوک نہیں کریں گے اور نئے الفاظ کے ساتھ ساتھ پرانے الفاظ و اسالیب کو بھی کام میں لاتے رہیں گے تو یقین ہے کہ

تھوڑے ہی عرصے بعد اردو زبان حیرت انگیز ترقی کرے گی اور انھیں قدما کی طرح اردو کی خود ساختہ کم مائگی کا رسمی رونا نہیں رونا پڑے گا۔

دوسری زبانوں کے میل جول سے کچھ نہ کچھ متغیر ہو جانا ہر زبان کا مقدر ہے لہٰذا پاکستان میں بس جانے کے بعد اردو زبان کا بدلنا بھی ناگزیر ہو گیا ہے۔ کوئی چاہے یا نہ چاہے پاکستان میں نہ دہلوی اردو باقی رہے گی نہ لکھنوی بلکہ اس کی جگہ یہاں لاہوری اردو ہوگی یا کراچوی اور اگر اسے اسلام آباد کی شفقت اور سرپرستی نصیب ہوگئی تو پھر اسلام آبادی محاورہ ہی اردو کا معیار بن جائے گا جس کے سامنے ان دونوں میں سے ایک بھی مستند نہیں ٹھہرے گی لیکن ہر صورت میں مقامی اثرات کا نفوذ پا جانا اور اردو کا کچھ نہ کچھ بدل جانا بالکل مسلم ہے جسے زبان کا مزاج داں ایک فطری عمل سمجھتا ہے۔ البتہ ادبی زاویہ نظر رکھنے والے اس کی تبدیلی سے گھبراتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ زبان آوازوں کا ایک متحرک زندہ اور نامیاتی نظام ہوتا ہے اور ادب زبان کی ایک جامد شکل ہونے کی حیثیت سے حرکت و عمل سے بیر رکھتا ہے۔

دوسری طرف جو لوگ تبدیلی سے یہ مراد لیتے ہیں کہ اردو زبان میں مقامی الفاظ و محاورات و اسالیب کوشش کر کرکے داخل کر دیے جائیں یا جو اس کی ہر تبدیلی کو یہ سمجھ کر قبول کرنا چاہتے ہیں کہ زبان کا تغیر ہی اس کے ثبات کا ضامن ہے انھیں بھی یہ سمجھ لینا چاہیے کہ وہ ایک غیر فطری عمل کی حمایت کر رہے ہیں اور ایک ایسی مصنوعی زبان کی داغ بیل ڈالنا چاہتے ہیں جو نہ عوام کے کام آ سکتی ہے نہ خواص کے۔ زبان کی وہ تبدیلی جو دوسری زبان کے میل جول سے اس میں راہ پاتی ہے سطحی ہوتی ہے۔ اس کا زبان کے بنیادی ڈھانچے سے تعلق نہیں ہوتا۔ مثلاً ''لشکارے مارنا'' کا محاورہ اردو میں بے تکلف داخل کیا جا سکتا ہے کہ اس کا زبان کے صوتی، صرفی یا نحوی اصولوں سے کوئی تصادم نہیں ہوتا لیکن ''میں نے گھر جانا ہے'' میں علامت فاعلی ''نے'' کا استعمال اس کے نحوی اصول سے ٹکراتا ہے اور اس لیے

اردو زبان اسے قبول نہیں کر سکتی - اردو میں "نے" کا استعمال صرف فعل متعدی کے حالیہ تمام (ماضی مطلق) کے سامنے مشروط و مخصوص ہے جو ہمیشہ معناً مجہول ہوتا ہے اور مفعول سے مطابقت رکھتا ہے - چونکہ اس حالیے سے جملے مجہولی طور پر بنائے جاتے ہیں اس لیے فاعل کو آلی حالت میں رکھا جاتا ہے - مثلاً میں نے کھانا کھایا - میں نے روٹی کھائی وغیرہ -

ہر درخت جڑ ، پینڈ ، ڈالی ، ٹہنی ، جھونٹروں ، پتوں اور پھول پھل کے مجموعے سے عبارت ہوتا ہے لیکن ان میں سے کچھ اجزا ایسے ہیں جن کے بغیر اس کی شناخت ناممکن ہے - بالکل یہی کیفیت زبان کی ہے کہ اس کے درخت میں کچھ اجزا اصولی اور بنیادی حیثیت رکھتے ہیں جن کے بغیر زبان کی نہ صرف تمیز جاتی رہتی ہے بلکہ خود اس کا وجود ہی ختم ہو جاتا ہے - یہی زبان کا ٹھاٹھ کہلاتا ہے جو اسے دوسری زبان سے ممتاز کرتا ہے چنانچہ زبان میں صرف وہی تبدیلیاں قابل قبول ہو سکتی ہیں جو اس کے بنیادی اصولوں سے متعرض نہ ہوں اور اگر اردو زبان میں ایسی تبدیلیوں کو بھی پروانگی دے دی جائے گی جن سے اس کا بنیادی ڈھانچہ ہی متزلزل ہو جائے تو پھر وہ کوئی اور ہی زبان ہو جائے گی اردو نہیں رہے گی - اس لیے اردو زبان کی تبدیلیوں کو قبول کرتے وقت یہ دیکھنا ضروری ہے کہ ان سے اس کی فطرت تو مجروح نہیں ہوتی یہی وہ نازک مقام ہے جہاں اردو کے ہر بہی خواہ کو اعتدال و احتیاط سے کام لینا ہے -

(مطبوعہ : نقوش ، لاہور ، جون ۱۹۶۳ء)

اُردو اور مسلمان

یہ حقیقت اب مسلم ہو چکی ہے کہ پاکستان کی قومی زبان اردو اسی برصغیر (پاک و بھارت) میں بولی جانے والی سینکڑوں زبانوں میں سے ایک ممتاز اور اہم زبان ہے لیکن میرے کچھ ہم قوم ایسے بھی ہیں جو یہ کہہ کر اردو کی اہمیت سے انکار کرتے ہیں کہ ہمارے مغربی ممالک سے بڑھتے ہوئے تعلقات کے پیش نظر بین الاقوامی سطح پر اس کی جگہ انگریزی ہی مفید مطلب ہو سکتی ہے ، یا اردو زبان میں انگریزی کی سی وسعت نہیں ہے ، یا پاکستان میں بہت کم افراد ایسے ہیں جن کی مادری زبان اردو ہے اور کثیر تعداد باشندے یومیہ زندگی میں دوسری زبانیں استعمال کرتے ہیں - دراصل یہ دلیلیں ان لوگوں کی طرف سے پیش کی جاتی ہیں اور اردو کو اس کا صحیح منصب دلانے میں وہ لوگ سنگ راہ بنے ہوئے ہیں جو ذاتی مفاد سے بلند ہو کر قومی سطح پر سوچنے کے عادی نہیں ہیں - ان لوگوں کے یہ اعتراضات عذر لنگ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے اور ان کے وقتاً فوقتاً جواب بھی دیے جا چکے ہیں اس لیے اور اس خیال سے بھی کہ اس مقالے کا موضوع اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ اس وقت علاقائی اور قومی زبان کے باہمی تعلق یا اردو زبان کے وسیع حلقہ اثر یا اس کی ہمہ گیر صلاحیت اور توانائی و ثروت پر کچھ کہا جائے ، متذکرہ بالا مٹھی بھر افراد اور ان کی بودی دلیلوں کو نظر انداز کرکے صرف حامیان اردو کی اس کثیر تعداد اور اردو زبان سے اس کی گہری وابستگی و شیفتگی کا ذکر زیادہ ضروری معلوم ہوتا ہے جو اسے یومیہ زندگی میں اپنا اوڑھنا بچھونا بنائے ہوئے ہے اور جس میں خصوصیت کے ساتھ نہ صرف پاکستانی بلکہ بھارتی مسلمان بھی شامل ہیں -

یہاں ان لوگوں کا تو ذکر ہی چھوڑیے جن کی مادری زبان اردو ہے کیونکہ مادری زبان سے تو ہر ایک کو پیار ہوتا ہے اور یہ کوئی غیر معمولی نہیں بلکہ عام اور فطری سی بات ہے - حیرت تو دراصل اس وقت ہوتی ہے جب ایک ایسا شخص جس کی مادری زبان اردو سے مختلف ہے ، اردو کی نہ صرف حمایت کرتا ہے بلکہ اس کی حمایت میں اپنا تن من دھن سب کچھ قربان کر دینے پر تل جاتا ہے - اردو زبان کی تاریخ میں ایسے بزرگوں کے نام ملتے ہیں جنھوں نے اپنی اردو پرستی میں کافی جوش اور جذبے کا مظاہرہ کیا ہے - ان میں بانی پاکستان یعنی قائداعظم محمد علی جناح ؒ کا نام نامی سرفہرست ہے جنھوں نے تمام پاکستان پر یہ اعلان فرمایا تھا کہ پاکستان کی قومی زبان اردو ہوگی حالانکہ اردو ان کی مادری زبان نہ تھی ، لہذا اردو کے سلسلے میں مادری زبان کا سوال اٹھانا ہی بے محل اور بے سود ہے - البتہ یہ سراغ لگانا ضروری ہے کہ ان بزرگوں کے اس جذبے کے اصل محرکات کیا تھے اور اس قوت ایمانی کے پس پشت کون سے عوامل کار فرما تھے جس کے باعث وہ اردو کی حمایت میں ہمیشہ سینہ سپر رہے ؟

آج پاکستانی مسلمان اردو زبان کا جس والہانہ جوش و خروش سے خیر مقدم کرتے ہیں اور اردو پرستی کے موقع بہ موقع جو مظاہرے کرتے رہتے ہیں ، ایک عام تماشائی انہیں دیکھ کر دنگ رہ جاتا ہے کہ مسلمان عربی فارسی کے بجائے ایک ایسی زبان سے اپنی گہری دلچسپی اور شدید لگاؤ کا اظہار کیوں کر رہے ہیں جو مسلمہ طور پر اسی سرزمین کی پیداوار ہے اور جس کا عرب یا ایران سے کوئی تعلق نہیں - عربی زبان ہمیں اس لیے عزیز ہے کہ اس میں ہماری مقدس کتاب (قرآن شریف) نازل ہوئی ہے جو ہماری تمام قوتوں کا سرچشمہ ، ہدایات کا منبع اور ہمارا مکمل ضابطہ حیات ہے ، یعنی عربی ہماری مذہبی زبان ہے اور مذہب ہم مسلمانوں کے لیے اتنا ہی ضروری ہے جتنا زندہ رہنے کے لیے سانس لینا ناگزیر ہوتا ہے - عربی کے بعد فارسی زبان سے ہمارا شغف بھی اس لیے سمجھ میں آ جاتا ہے کہ ہماری ہزاروں سال کی تہذیب و ثقافت اس زبان میں محفوظ ہے جسے چھوڑ بیٹھنا نہ ہمارے بس کی بات

ہے اور نہ ہمارے لیے مفید ہی ہے ، لیکن اردو زبان سے ہماری محبت کا راز آسانی سے سمجھ میں نہیں آتا ، یہاں غیروں کا تو ذکر ہی کیا ، خود بہت سے مسلمان بھی جنھیں اردو زبان سے بے حد محبت ہے ، اپنی اس محبت کی وجہ نہیں سمجھ پاتے ۔

غالباً کچھ ایسی ہی صورت در پیش تھی جو بعض مسلمانوں نے اردو زبان کو "فارسی کی بیٹی" کہہ کر اپنی اردو پرستی کی توجیہ کرنا چاہی ۔ زبان اردو کے مسلم مؤرخین میں سے حافظ محمود شیرانی نے فارسی اور پنجابی کے میل سے اردو کی پیدائش پر استدلال کیا ۔ مولانا نصیر الدین ہاشمی نے عرب سوداگروں کی عربی اور دکنی زبان کی آمیزش سے اردو کی تخلیق ثابت کرنے کی کوشش کی اور مولانا سلیمان ندوی نے محمد بن قاسم اور اس کے ساتھیوں کی عربی اور سندھی زبان کے اختلاط سے اردو کا استخراج و اشتقاق دکھایا ۔ اس میں شک نہیں کہ علم زبان کی رو سے دو زبانوں کے میل سے کسی تیسری زبان کی پیدائش کا نظریہ ناقابل قبول ہے اور اس لیے ان مؤرخین کے دلائل اردو زبان کی پیدائش اور اس کی اصل کا سراغ لگانے میں کامیاب نہیں ہو سکے لیکن ان سے اتنا بخوبی ثابت ہو جاتا ہے کہ ان مسلمان مؤرخین کو اردو زبان سے والہانہ محبت تھی اور اپنی اس محبت کا سبب تلاش کرنے کے لیے وہ سخت بے چین رہے ہیں ، البتہ اس سبب کا سراغ لگانے کے لیے ہمیں ذرا پیچھے ہٹ کر ماضی کی تاریخ کا مطالعہ کرنا پڑے گا ۔

ظہور اسلام کے آس پاس عرب سوداگروں کی دکن میں آمد و رفت اور دیسی باشندوں سے میل ملاپ تاریخ ہند کا ایک بہت معمولی سا واقعہ ہے کیونکہ اس کے نتیجے میں دکن کی کوئی ایک مسلمان ریاست بھی قائم نہیں ہو سکی تھی ۔ دکن کی جو مسلم ریاستیں ہمیں آنے والے زمانے میں دکھائی دیتی ہیں وہ سب کی سب شمالی ہند پر مسلمانوں کے تسلط کے نتیجے میں قائم ہوئی تھیں ۔ اسی طرح سندھ پر محمد بن قاسم کا حملہ اور اس کا سندھ میں قیام تاریخ ہند کا ایک ایسا ہی واقعہ تھا جیسے کسی بڑے سے تالاب میں ایک چھوٹا سا کنکر پھینک دیا جائے اور اس کی پیدا کی ہوئی چند کمزور سی لہریں تھوڑی دور پر

جا کر مٹ جائیں ۔ صحیح معنوں میں تاریخ ہند کا وہ عظیم الشان واقعہ جس نے آگے چل کر یہاں کی سیاست میں ایک انقلاب برپا کر دیا، ہندوستان پر مسلمانوں کے وہ حملے تھے جو درۂ خیبر کے راستے سے کیے گئے تھے ۔ ان کی باقاعدہ ابتدا محمود غزنوی کے وقت سے اور ان کی اہمیت کا احساس ترائن کی لڑائی (۱۱۹۲ء) سے ہوتا ہے کیونکہ اسی لڑائی میں شہاب الدین غوری نے دہلی کے راجا پرتھوی راج کو شکست دے کر مسلمانوں کی مرکزی حکومت قائم کی تھی اور جب ہم پرتھوی راج کے درباری بھاٹ چندبردائی کی نظم "پرتھی راج راسو" میں عربی فارسی الفاظ کی خاصی تعداد دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تک دیسی زبانوں میں مسلمانوں کی لائی ہوئی عربی فارسی زبانوں کے اثرات کا نفوذ شروع ہو چکا تھا ۔

اس زمانے کو جس میں دہلی کی اسلامی حکومت قائم ہوئی ہے، ہندی زبان کے مؤرخین "راسو کال" کے نام سے یاد کرتے ہیں اور دیسی زبانوں کی ایسی کتنی ہی رزمیہ نظموں (پرتھی راج راسو، ہمیر راسو، بیسل دیو وغیرہ) کا تذکرہ کرتے ہیں جنھیں راسو کہا جاتا ہے جن میں عربی فارسی الفاظ بھی استعمال کیے گئے ہیں ۔ اگرچہ حکومت کی سرکاری زبان فارسی تھی لیکن ہندو مسلم میل ملاپ کے باعث دیسی اور بدیسی زبانوں نے ایک دوسرے پر اپنے اپنے اثرات ڈالنے شروع کر دیے تھے ۔ یہ درست ہے کہ دیسی زبانوں پر سرکاری زبان کے اثرات ان اثرات سے کہیں زیادہ اور کہیں گہرے تھے جو انھوں نے فارسی زبان پر ڈالے لیکن دہلی کی مسلم حکومت کے زمانے میں بھی فارسی زبان خالص نہیں رہ سکی ۔ جیسا کہ فیروز شاہ تغلق کی خود نوشت تاریخ کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے ۔

یہی حال اس عہد کی دوسری فارسی تاریخوں اور تذکروں کا بھی ہے ۔ آنے والے زمانوں میں جیسے جیسے مسلمانوں کا قیام طویل ہوتا گیا، ان کی فارسی زبان میں سرکاری پشت پناہی کے باوجود دیسی الفاظ کی تعداد بھی بڑھتی چلی گئی اور اب اس اختلاط و آمیزش کا صحیح صحیح

اندازہ لگانے کے لیے بھرپور تحقیق کی ضرورت ہے جو یہ بتا سکے کہ مسلمانوں کے دور حکومت میں ہندوستان کی دیسی زبانوں نے فارسی زبان پر کون کون سے اور کس قدر اثرات مرتسم کیے ہیں اگر ایران والے اسی زبان کو ہندوستانی فارسی کہیں تو تعجب نہیں ہونا چاہیے لیکن یہ بات موجودہ مبحث سے خارج ہے اس لیے میں صرف انھی اثرات کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو دیسی زبانوں نے فارسی یا عربی سے قبول کیے ہیں ۔

مسلمانوں کے اس ابتدائی دور حکومت میں بھی فارسی زبان کے اثرات دور دور تک کے علاقوں کی زبانوں پر پڑ رہے تھے اور شمالی ہندوستان سے نکل کر جنوب میں دکن اور مشرق میں بہار و بنگال تک پہنچ رہے تھے ۔ ان کا اندازہ ان علاقوں کے اس زمانے کے ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات سے لگایا جا سکتا ہے جو مختلف دیسی زبانوں میں ہو رہی تھیں اور جن میں عربی فارسی کے کثیر الاستعمال الفاظ برابر راہ پا رہے تھے ۔ اس سے کچھ آگے چل کر جب بھگتی کال شروع ہوتا ہے اور بھگتوں اور سنتوں کی کھیپ کی کھیپ تبلیغی میدان میں اترتی ہے تو ان کے بھجنوں میں عربی فارسی الفاظ بھی کھیپوں میں ہی نظر آنے لگتے ہیں ۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ بھجن عوامی تبلیغ کا ذریعہ تھے اور عوامی زبانوں میں عربی فارسی الفاظ کی درآمد کا خاص سبب حکمران طبقے کا اتباع تھا ۔ پھر یہ کہ دفتری زبان فارسی تھی اور سرکاری ملازمت صرف انھی لوگوں کو مل سکتی تھی جو فارسی کی تعلیم پائے تھے ، اس لیے عام لوگوں میں بھی فارسی کی تعلیم کا چرچا شروع ہو گیا تھا ۔

فارسی زبان کے اثر و نفوذ کو بڑھانے میں بعض سرکاری تحریکات نے بھی مدد پہنچائی ہے ۔ سکندر لودھی کے زمانے میں راجا ٹوڈرمل نے ایک شاہی فرمان جاری کرایا تھا جس کی رو سے تمام سرکاری ملازمین کے لیے فارسی کی سند لازمی قرار دی گئی تھی ۔ اسی ٹوڈرمل نے اکبر بادشاہ کے دور حکومت میں وزیر مال کی حیثیت سے اسی قسم کا فرمان شاہی ایک بار پھر جاری کرایا ۔ ظاہر ہے کہ فارسی تعلیم کی اس شرط و قید کے باعث دیسی زبانوں پر فارسی زبان کا اثر بہت زیادہ ہو گیا

ہوگا اور ان میں عربی فارسی کے کثیر تعداد الفاظ داخل ہو گئے ہوں گے۔ دوسری طرف مسلمان بھی ہندوستان میں اب نووارد نہیں رہے تھے اور دیسی زبان بولنے والوں کے ساتھ ساتھ یہاں ان کی بھی کتنی ہی پشتیں گزر چکی تھیں، لہذا وہ بھی جس جس علاقے میں آباد تھے وہیں کی علاقائی زبانیں اپنا چکے تھے اور ان میں عربی فارسی الفاظ ملا ملا کر بولتے تھے۔ یہی نہیں بلکہ انھوں نے ان زبانوں کو فارسی لپی میں لکھنا بھی شروع کر دیا تھا۔ چنانچہ ملک محمد جائسی نے اپنی مشہور مثنوی پدماوت کا مسودہ جس کی زبان پوربی ہے، فارسی لپی ہی میں تحریر کیا تھا جسے بعد میں دیوناگری لپی میں منتقل کیا گیا۔ اسی طرح دکن کا بیجا پوری ادب بھی فارسی لپی میں ہی جمع کیا گیا ہے جس میں مسلمانوں کے اثر سے عربی فارسی الفاظ کی کثیر تعداد پائی جاتی ہے۔

مقصد کہنے کا یہ ہے کہ مسلمان جہاں جہاں آباد ہوئے انھوں نے وہیں کی زبان کو اپنایا اور اسے فارسی لپی میں قلم بند کیا لیکن اس میں دخیل الفاظ کا استعمال کچھ تو اس وجہ سے کیا گیا کہ سرکاری اور دفتری زبان فارسی تھی جس کے کثیر تعداد الفاظ عوام کی زبانوں پر جاری ہو چکے تھے اور کچھ اس وجہ سے بھی ہوا کہ فارسی اس زمانے کی عام علمی اور ثقافتی زبان بھی بنی ہوئی تھی۔ خصوصیت کے ساتھ مسلمانوں کے علوم و معارف کا تو واحد مخزن فارسی زبان ہی تھی۔ لیکن فارسی کے کثیر تعداد الفاظ کو دیسی زبانوں میں درآمد کرنے کے متعلق گریرسن نے انسائکلوپیڈیا برٹانیکا کے گیارھویں ایڈیشن کی تیرھویں جلد کے صفحہ ۴۷۹ پر ہندوستانی زبان کے سلسلے میں لکھا ہے کہ یہ کام مسلمانوں سے زیادہ ہندوؤں نے کیا اور اس سے ان کا مقصد اپنے مسلمان آقاؤں کو خوش کرنا تھا اور یہ بات بھی اپنے اندر کافی وزن رکھتی ہے کیونکہ ہم پچھلی صدی میں بھی اسی قسم کا رجحان پاتے ہیں جس کے تحت اردو زبان تو اردو زبان، خود اردو ادب میں بھی کتنے ہی ثقیل اور نامانوس الفاظ انگریزی زبان سے درآمد کیے گئے اور ایک عام انگریزی دان سے تو ہم آج تک اسی قسم کی اردو سنتے چلے آ رہے ہیں جسے آدھا تیتر آدھا بٹیر کہا جا سکتا ہے۔ اسلامی دور حکومت میں

کایستھ لوگوں نے دوسری قوموں سے کہیں بڑھ چڑھ کر فارسی زبان کی تعلیم حاصل کی اور سرکاری عہدوں پر فائز ہوئے۔ ان کی فارسی دانی آج تک ہر کہ و مہ کی تفریح طبع کا سامان فراہم کرتی ہے اور ان کی زبان کی کچھ ایسی مثالیں دست یاب ہوتی ہیں جیسے مصرعہ: "یک و نیم (ڈیوڑھی) میں بیٹھے (ہویت بیتے) ہیں غنچی (کلی یعنی حقہ)" یا "رات والدۂ ہرسہائے نے روغن زرد (گھی) کھچڑی میں یا قدر (اس قدر) افتادہ کردہو (ڈال دیا) کہ چاورن (چاولوں) کو (کا) من کل وجوہ غرقاب ہوئے گئو (ہو گیا)"۔ دیسی اور فارسی زبان کی ملاوٹ کا یہ ایک ادنیٰ سا نمونہ ہے۔

بہرحال میں نے ابھی تک دیسی زبانوں پر فارسی زبان کے اثرات کا حال مستعار الفاظ کی حد تک بیان کیا ہے لیکن اس میں اردو زبان کی کوئی تخصیص نہیں ہے کیونکہ عربی فارسی کے الفاظ اپنا لینے میں وہ بھی دوسری زبانوں کی ہمسر ہے اور محض اتنی سی بات سے مسلمانوں کا اردو زبان سے کوئی خصوصی تعلق ظاہر نہیں ہوتا، اس لیے اب میں تاریخ ہند سے ایسے واقعات پیش کرنا چاہتا ہوں جن کے باعث اردو زبان ہندوستانی مسلمانوں سے ہمیشہ کے لیے وابستہ ہوگئی، لیکن اس خصوصی تعلق کا حال بیان کرنے سے پہلے اس حقیقت کا انکشاف ضروری ہے کہ ہندوستانی زبانیں کسی نہ کسی طبقے یا جماعت سے ماضی میں بھی مخصوص رہی ہیں اور آج بھی مخصوص چلی آ رہی ہیں۔ اس سلسلے میں ہندوؤں کے راجا رام چندر جی اور متھرا کے کرشن جی کے متعلق ہندوستان میں جو ادب جمع ہوا اس کا بیان فائدے سے خالی نہ ہوگا۔

اول الذکر ادب کی ابتدا دکن میں بارھویں صدی عیسوی میں ہوئی تھی کیونکہ اس کا بانی راماج نامی کانجی ورم کا رہنے والا ایک برہمن عالم تھا لیکن اس نے جو کچھ لکھا وہ سنسکرت زبان میں لکھا اور صرف برہمنوں کے لیے لکھا۔ شمالی ہندوستان میں اس کی تعلیم کو رامانند کی بدولت پندرھویں صدی عیسوی کے اوائل میں فروغ ملا جس نے دیسی زبان میں تبلیغ شروع کی اور جس کے بارہ چیلے مختلف نیچی ذاتوں سے تعلق رکھتے تھے۔ لیکن جب تلسی داس (۱۵۳۲ء لغایت ۱۶۲۳ء) کا

زمانہ آیا جن کا سلسلہ عقیدت سات واسطوں سے رامانند تک پہنچتا تھا تو انھوں نے پوربی (اودھی) زبان میں "رام چرت مانس" لکھ کر اس عقیدے کی بڑی اشاعت کی۔ بہ قول گریرسن (بحوالہ امپیریل گزیٹیر آف انڈیا جلد دوم۔ باب "ورنا کیولر لٹریچر") ہندوستان میں ان کو اس قدر مقبولیت حاصل ہوئی کہ ان کی تقلید میں پوربی زبان رام بھگتی کے لیے مخصوص ہو گئی اور ان کے بعد شمالی ہندوستان میں جتنی بھی رزمیہ شاعری ہوئی وہ اودھی زبان میں ہی تخلیق کی گئی۔

شمالی ہندوستان میں رام بھگتی کے مقابل جس عقیدے کو شہرت اور قبول عام حاصل ہوا، وہ کرشن بھگتی تھی۔ اس عقیدے کی ابتدا اگرچہ سنسکرت زبان کی کتاب مہابھارت کے رزمیے سے ہوتی ہے لیکن اسے عمومیت اور شہرت تلنگانہ کے برہمن بلبھ آچاریہ کی بدولت نصیب ہوئی جو سولھویں صدی عیسوی کے اوائل میں دکن سے آکر متھرا کے قریب بندرابن میں آباد ہو گئے تھے۔ ان کے چار چیلوں اور ان کے بیٹے بٹھل ناتھ کے چار چیلوں کو ملا کر اشٹ چھاپ (آٹھ انگوٹھیاں) کہتے ہیں جنھوں نے برج بھاشا کی نظم و نثر میں کرشن بھگتی سے متعلق ادب کا وافر ذخیرہ فراہم کیا۔ ان میں آگرے کے ایک نابینا شاعر سور داس کا نام سب سے نمایاں ہے جنھوں نے کرشن بھگتی پر برج بھاشا میں ہزاروں اشعار کہہ ڈالے۔ ان کے مجموعۂ کلام کا نام "سور ساگر" اور اس کی زبان خالص اور معیاری برج بھاشا ہے۔ وہ دن ہے اور آج کا دن ہے کہ برج بھاشا کرشن بھگتی کے لیے مخصوص چلی آ رہی ہے۔ چنانچہ جس طرح اودھی زبان میں کرشن جی سے متعلق کوئی تحریر نہیں ملتی اسی طرح برج بھاشا کی غنائی شاعری میں رام بھگتی کے عقیدے کا فقدان ہے اور اس تخصیص میں کچھ ایسی شدت نظر آتی ہے کہ میواڑ کی راج کماری میرا بائی نے بھی جب کرشن بھگتی پر شاعری کی تو راجستھانی (ڈنگل) کو چھوڑ کر برج بھاشا (پنگل) ہی کو اپنے خیالات کے اظہار کا وسیلہ ٹھہرایا۔

ان واقعات سے یہ بات اچھی طرح ثابت ہو جاتی ہے کہ ہندوستانی زبانیں بعض مذہبی جماعتوں سے مختص چلی آ رہی ہیں اور اس کی ابتدا اگر

پیش تر سے نہیں تو کم از کم عہد مغلیہ سے ضرور ہوگئی تھی ، چنانچہ تلسی داس اور سور داس جن کی بدولت اودھی زبان رام بھگتوں اور برج بھاشا کرشن بھگتوں سے مخصوص ہوگئی ، دونوں کے دونوں اکبر کے دور حکومت میں گزرے ہیں - یہی زمانہ تھا جس میں مسلمانوں نے بھی اپنے لیے دیسی زبانوں میں سے ایک زبان کا انتخاب کر لیا اور وہ کھڑی بولی تھی جس نے آگے چل کر شاہ جہان کے زمانے میں اردو کا نام پایا - اکبری دربار میں جہاں فارسی زبان کے ادیبوں اور شاعروں کے علاوہ دیسی زبانوں میں سے اودھی اور برج بھاشا کے ادیب و شاعر نظر آتے ہیں ، وہیں کھڑی بولی کی نظم اور نثر لکھنے والے بھی عنایت خسروانہ سے سرفراز ہوتے ہیں - اس دربار میں گنگ برہم بھٹ جیسے ہندوؤں کے علاوہ جنھوں نے کھڑی بولی کی نظم و نثر میں طبع آزمائی کی اور اپنی تخلیقات میں عربی فارسی کے کثیر تعداد الفاظ استعمال کیے ، عالم اور عبدالرحیم خان خاناں جیسے مسلمان شاعر بھی موجود تھے جو برج بھاشا کے ساتھ ساتھ کھڑی بولی میں بھی شاعری کرتے تھے - ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عہد اکبری میں ہی اردو زبان کا داخلہ قلعۂ شاہی میں ہو چکا تھا - جیسا کہ صفیر بلگرامی نے بھی تذکرۂ جلوۂ خضر میں لکھا ہے -

یہ صحیح ہے کہ اکبر جیسا وسیع القلب حکمران اپنی رعایا کے ہر طبقے کے احساسات کی قدر کرتا تھا اور مختلف بولیوں کے شعرا و ادبا کو انعامات سے نوازتا تھا لیکن قرائن و شواہد کے سہارے یہ بات بھی وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ دیسی زبانوں میں سے جس زبان پر شاہی نظر انتخاب پڑی وہ اردو ہی تھی - اس کا ٹھوس ثبوت یہ ہے کہ اکبر کا پوتا شاہ جہان بہت اچھی اردو جانتا تھا اور اس کے باوجود کہ سرکاری زبان فارسی تھی ، پبلک کے آدمیوں سے اردو میں بات چیت کیا کرتا تھا اس کے علاوہ اپنی نظر بندی کے زمانے میں اس نے خفیہ طور پر داراشکوہ کو جو خط روانہ کیا تھا اور پکڑا گیا تھا وہ بھی اردو میں ہی لکھا تھا - اردو زبان کی تاریخ میں شہر آگرہ کو خاص اہمیت اور اولیت حاصل ہے - جب تک آگرہ مغلوں کی راج دھانی رہا ہے ،

اس میں اردو زبان کے چرچوں کا اندازہ اسی بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ جب ۱۶۴۸ء میں پایہ تخت دہلی کو منتقل ہوا اور وہاں پرانے شہر کے باہر آگرے سے جانے والوں کا محلہ آباد ہوا تو ان لوگوں کی زبان کو جو اس محلے میں عام طور پر بولی جاتی تھی اور جو یقیناً آگرے کی زبان تھی اور یہیں سے ان لوگوں کے ساتھ دہلی پہنچی تھی ، دہلی کے پرانے شہر کی زبان (قدیم دہلوی) سے ممتاز و ممیز کرنے کے لیے زبان اردوئے معلیٰ (زبان اردو محلہ) کا نام دیا گیا ۔

اس بات کا مزید ثبوت کہ اردو زبان کو عہد اکبری میں ہی قلعہ شاہی میں بار مل گیا تھا ، آنے والے زمانے کے واقعات سے ہوب ملتا ہے کہ وہ بیگمات ، شہزادیاں او شہزادے جو شاہ جہان کے ساتھ آگرے سے دہلی جا کر آباد ہوئے ، آگرے کی وہ معیاری اردو بھی اپنے ساتھ لے گئے تھے جس کی سند کے لیے دہلوی ادبا و شعرا نے ہمیشہ قلعہ معلیٰ کی طرف رجوع کیا ہے ۔ اگر شاہی قلعے کی زبان اردو کی جگہ وہی فارسی ہوتی جو باضابطہ طور پر ۱۸۳۲ء میں اپنی سرکاری حیثیت سے معزول ہوئی ہے تو اس کے باسیوں کو اردو زبان میں مستند ماننا بے معنی تھا اور اگر اردو وہی زبان تھی جو دہلی کے پرانے شہر میں بولی جاتی تھی تو پھر تو قلعہ والوں نے بھی یہ وہیں سے سیکھی ہوگی ۔ ایسی صورت میں بھی دہلی کے پرانے خاندانوں کی طرف رجوع کرنے کے بجائے نئے سیکھتڑ اہالیان قلعہ سے سند لینا سمجھ میں نہیں آتا ۔ لامحالہ بات یہیں آکر ٹھہرتی ہے کہ دہلوی شعرا اس لیے قلعے سے اردو کی سند لیتے تھے کہ یہ اہل قلعہ کی مادری زبان بن چکی تھی اور اس لیے مادری زبان بن چکی تھی کہ وہ اسے آگرے ہی سے اپنے ساتھ دہلی لائے تھے ۔ چنانچہ اس حال میں کہ اردو زبان کو عہد اکبری میں ہی شاہی سرپرستی حاصل ہو چکی تھی ، اہلامیان ہند کا اسے اپنا لینا بالکل فطری تھا کیونکہ اول تو عوام مذہبی اختلاف کے ہوتے ساتے حکمران کی زبان کو سر آنکھوں پر رکھتے ہیں ، پھر سلاطین مغلیہ تو مسلمان تھے اس لیے مسلمان رعایا کے لیے یہ درجہ اولیٰ واجب الاتباع تھے خود تاریخ سے ثابت ہے کہ سلطنت مغلیہ کا چراغ گل ہوتے ہوتے اردو

کو ہندوستان کے تمام مسلمان اپنا چکے تھے اور دہلی سے باہر لکھنؤ، حیدر آباد، کلکتہ، مرشد آباد، ڈھاکہ اور لاہور میں اس کے مرکز قائم ہو چکے تھے -

یہاں اردو زبان پر مسلمانوں کے اثرات اور احسانات کا تذکرہ بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ایک بار اس کو منتخب کر لینے کے بعد ہم نے اسے مکمل طور پر اپنانے کی کوشش کی اور اس سے کسی قسم کی مغایرت روا نہیں رکھی - چنانچہ پہلی چیز جو اس زبان کو عطا کی گئی وہ فارسی لپی تھی جسے ہمارے بزرگ اپنے ساتھ ایران سے لے کر ہندوستان آئے تھے - اس سے پیش تر یہ زبان ہندوستان کی دیو ناگری لپی میں لکھی جاتی تھی - اس تبدیلی کے باعث اس میں سنسکرت کے مصنوعی الفاظ کی درآمد رک گئی اور اگرچہ آج بھی اس میں سنسکرت کے کچھ الفاظ پائے جاتے ہیں لیکن جس تیزی اور کثرت سے یہ الفاظ دیو ناگری لپی میں لکھی جانے والی کھڑی بولی (جسے ہندی کہتے ہیں) کو آج کل گراں بار بنا رہے ہیں اور زبان کو عوام سے دور کرتے چلے جا رہے ہیں، ہماری زبان میں اس کے مضر اثرات بالکل ختم ہو گئے اور اس رجحان سے نجات مل گئی جو عام فہم زبان کو مصنوعی اور ناقابل فہم بنانے والا تھا - اس کا ثبوت آج کل آل انڈیا ریڈیو سے نشر ہونے والی تقریروں اور خبروں کی ثقیل اور بھونڈی زبان سے مل جاتا ہے جس سے نہ صرف مسلمان بلکہ خود وہاں کے ہندو عوام بھی سخت بے زار ہیں اور وہ اپنے ریڈیو کے بجائے ریڈیو پاکستان سننا زیادہ پسند کرتے ہیں -

اس زبان کو قرآنی حروف کا لباس عطا کر دینے سے دوسرا فائدہ یہ پہنچا کہ ہندوستان میں جہاں جہاں مسلمان بستے تھے وہ اپنے علاقے کی مقامی بولی بولتے ہوئے بھی اردو زبان کو اپنی تحریر کے لیے استعمال کرنے لگے کیونکہ عربی لپی سے مسلمانوں کی عقیدت بالکل فطری تھی - اس سے زبان کا دائرہ اثر اس قدر وسیع ہوا کہ اس برصغیر کے گوشے گوشے میں اس کی آوازیں سنائی دینے لگیں اور پشاور سے ڈھاکا اور کشمیر سے راس کماری تک اس کے بولنے اور سمجھنے والے پیدا ہو گئے - چنانچہ اردو

کی نشر و اشاعت میں اسلامیانِ ہند کی کوششوں کو جتنا دخل ہے اس نے اردو زبان کا کوئی مؤرخ انکار نہیں کر سکتا اور نہ اس حقیقت کو چھپا سکتا ہے کہ سلطنت مغلیہ کے زوال پر مسلمانوں ہی کے ہاتھوں اطراف ہند میں اردو زبان کے مختلف مرکز قائم ہوئے جن سے رفتہ رفتہ ترویج اردو کی صوبجاتی تحریکوں نے جنم لیا اور کل ہند انجمن ترقی اردو کے علاوہ متعدد چھوٹے چھوٹے اداروں کا قیام عمل میں آیا۔

لپی کی تبدیلی سے تیسرا فائدہ اس زبان کو یہ پہنچا کہ جب تک یہ دیوناگری میں قلم بند ہوتی رہی ہمالیہ کی فصیل کو پار کرنے کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتی تھی لیکن فارسی لپی میں منتقل ہونے کی دیر تھی کہ اسے ہندوستان کی سرحدوں کو پھلانگ کر ایران و عربستان کی زبانوں اور ان کے بولنے والوں سے تعارف و ملاقات کا موقع بھی ہاتھ آ گیا۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ دیوناگری کے حصار آہنی میں قید رہنے والی زبان کو مسلمانوں کی بدولت آزادی نصیب ہوئی اور اسے وہ پر پرواز مل گئے جن کے زور پر وہ آج دنیا کی زبانوں میں تیسرے نمبر پر شمار ہونے لگی ہے۔ چنانچہ ہندوستان سے باہر اردو کی ترویج و اشاعت بھی اس کی قرآنی لپی ہی کا اعجاز تھا جس کے احسان سے یہ زبان تا قیام قیامت سبک دوش نہیں ہو سکتی۔ آج پاک و بھارت میں کس کو اس حقیقت سے تاب انکار ہے کہ دیس باہر اردو زبان کے پرچار میں فارسی لپی کا براہ راست اور ہندوستانی مسلمانوں کا بالواسطہ ہاتھ رہا ہے؟

لپی کے ساتھ ساتھ ہم نے اس زبان کو، جو پہلے کھڑی بولی کہلاتی تھی اور آج بھی ماہرین زبان اسے اسی نام سے یاد کرتے ہیں، ۱۶۴۲ء سے دہلی کے نو آباد علاقے (اردو معلیٰ) کی نسبت سے ایک نیا نام "اردو" بھی عطا کر دیا اور اس طرح اسے پورے طور پر اپنانے کی مضبوط بنیاد ڈال دی۔ چنانچہ آنے والے زمانے میں عام مسلمانوں کو اس کے قدیم نام سے جو جھجک اور اجنبیت محسوس ہوئی اس کا خدشہ اس نئے نام کی بدولت بالکل دور ہو گیا بلکہ انھیں اس سے مکمل طور پر

اپنائیت کا احساس ہوا اور اس احساس نے آگے چل کر اس زبان کے فروغ اور ترقی میں بہت بڑی حد تک معاونت کی۔

میں ابھی کہہ آیا ہوں کہ دیسی زبانوں پر عربی فارسی زبانوں کے براہ راست اثرات اسی وقت سے شروع ہو گئے تھے جس وقت مسلمانوں نے ہندوستان میں قدم رکھا تھا اور اس کی عام صورت یہ تھی کہ ان زبانوں میں رفتہ رفتہ عربی فارسی کے الفاظ غیر شعوری طور پر داخل ہونے لگے جن کے وجود کا علم ہمیں اس وقت کے دیسی ادب کی ورق گردانی سے ہوتا ہے۔ چنانچہ ان اثرات کو قبول کرنے میں اردو زبان بھی اپنی دوسری معاصر زبانوں کی برابر کی شریک تھی۔ لیکن جب مسلمانوں نے اس زبان کو اپنے لیے چن لیا تو اس میں دخیل الفاظ کا حصہ بھی زیادہ ہوگیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اب تک یہ زبان دیسی باشندوں کی ضروریات ہی پوری کر رہی تھی اور اب اسے مسلمانوں کی ضرورتیں بھی پوری کرنی پڑ گئیں جو دیسی باشندوں سے مختلف مذہب رکھتے تھے اور جن کا کام اب "آرتی" اور "سندھیا" جیسے الفاظ سے نہیں چل سکتا تھا، کیونکہ یہ لوگ اپنا ایک جداگانہ مذہبی نظام اور ایک مخصوص فلسفہ حیات لے کر آئے تھے اور اپنے خیالات کو ظاہر کرنے کے لیے خاص خاص الفاظ اور اسالیب بیان کے ساتھ ساتھ مذہبی رسوم و عبادات وغیرہ کے لیے توحید، صوم و صلواۃ یا نماز اور روزہ جیسی کثیر تعداد اصطلاحات کا ذخیرہ بھی رکھتے تھے جسے انہوں نے اردو زبان میں بجنسہ منتقل کر دیا۔ اس سے جہاں اردو بولنے والے مسلمانوں کو اپنی مذہبی تعلیم و تبلیغ میں مدد ملی، وہاں اردو زبان کا دامن بھی وسیع ہوگیا۔

اس کے علاوہ مسلمانوں کی اپنی سماجی زندگی کا ایک خاص نہج تھا اور زندگی کے کچھ رسوم و رواج اور کچھ تقاضے بھی تھے۔ پیدائش، شادی اور موت کی تقریبات، ختنہ، عقیقہ اور نذر نیاز کے طریقے اور باہمی دید و باز دید اور نشست و برخاست کے قرینے تھے۔ وہ بعض ایسے کھانے کھاتے آئے تھے، بعض ایسے لباس پہنتے آئے تھے اور بعض ایسی اشیا (ظروف اور فرنیچر وغیرہ) استعمال کرتے آئے تھے جن کی وضع قطع

اور جن کے نام ہندوستان کے لیے بالکل نئے تھے بعض ایسے قصے اور بعض ایسے واقعات کی یادیں تھیں جو ان کے ماضی اور وطن قدیم سے متعلق تھے اور جن سے اردو زبان اب تک بالکل ناآشنا تھی ، اس لیے ان کے یہ سب نام اور یہ سب تلمیحات انھیں جوں کی توں اس زبان کے سپرد کرنا پڑیں تا کہ وہ ان کی یومیہ زندگی کی بھرپور کفالت کر سکے اور ان کے خواب و بیداری کی مکمل طور پر امین بن جائے۔ آخر یہ کیونکر ممکن ہے کہ انسان جو زبان بولے اس میں خواب نہ دیکھے اور جس زبان میں اظہار خیال کرے اسے اپنے راز نہ سونپے ۔ یہی وجہ تھی کہ مسلمانوں نے اپنی ظاہری اور باطنی اور انفرادی و اجتماعی زندگی کے ہر پہلو کی عکاسی اور ترجمانی کی اہل بنانے کے لیے اردو زبان کو عربی فارسی کے کثیر تعداد الفاظ ، اصطلاحات ، محاورات اور اسالیب بیان عطا کر دیے ۔

یہ بات صرف اُردو زبان تک ہی ختم نہیں ہوئی بلکہ ان کوششوں کا سلسلہ اُردو ادب تک بھی پہنچا اور وہ اس طرح کہ فارسی کا تمام عروض اُردو میں منتقل کر لیا گیا ۔ فارسی زبان کی تمام بحریں اُردو نظم میں استعمال کی گئیں ۔ فارسی کی مختلف اصناف شعر مثلاً غزل ، قصیدہ ، مثنوی ، رباعی وغیرہ کا اضافہ کیا گیا ۔ شعری تنقید کا انداز مستعار لیا گیا اور خوبی و خامی کو پرکھنے کے لیے وہی پیمانے اُردو میں ڈھالے گئے جو فارسی میں رائج تھے ۔ اس کے علاوہ اصلاح زبان اُردو کی جو کوششیں آج تک اساتذہ اُردو نے کی ہیں ان میں دیسی الفاظ کو گھٹانے اور عربی فارسی الفاظ رائج کرنے پر پوری قوت صرف کی گئی ہے اور فارسی محاورات کا ترجمہ کرنے کی کوشش تو بہت سے شاعروں نے کی ہے ، یہاں تک کہ ایران و عرب کے جغرافیائی مناظر اور تاریخی خصوصیات و تلمیحات کے علاوہ فارسی زبان کا لب و لہجہ بھی اُردو میں داخل کر دیا ہے ۔ دوسری طرف اُردو زبان کے بہت سے الفاظ میں عربی فارسی کی آوازیں پیدا کر دی ہیں اور بہت سے دیسی الفاظ کو عربی فارسی کا بدیسی روپ دے دیا ہے بلکہ اُردو الفاظ کو عربی فارسی الفاظ سے مشتق کرنے کی بھی شعوری کوششیں کی ہیں ۔ ان تمام کوششوں کے

باعث بعض پارکھوں کے نزدیک اُردو ادب میں کہیں کہیں بد نمائی، تصنع اور غیر فطری پن کے نقائص بھی پیدا ہوگئے ہیں اور لسانیات کے طالب علموں کے لیے بہت سے اُلجھنوں کے اسباب مہیا ہوگئے ہیں، لیکن یہ سب کچھ اُردو کو اس برصغیر میں عربی فارسی کی حقیقی جانشین بنانے کے لیے کیا گیا ہے کیوں کہ مسلمانوں کو ان زبانوں سے پیار ہے۔

اب تک بات اُردو میں عربی فارسی کے مستعار الفاظ اور ان کے عروض تک ہی محدود تھی، جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے اُردو زبان کو اپنانے کے لیے اس پر عربی فارسی کا مختلف پہلوؤں سے عکس ڈالنے کی کوشش کی ہے، لیکن اس سلسلے میں جو سب سے بڑا کام انھوں نے کیا ہے وہ یہ ہے کہ اپنا قریب قریب پورا مذہبی سرمایہ اس زبان میں منتقل کر دیا۔ متعدد مسلمان عالموں نے کلام پاک کا اُردو میں ترجمہ کیا ہے، حدیثوں کی قریب قریب تمام مستند کتابیں عربی فارسی سے اُردو میں پہنچ چکی ہیں۔ تفسیر اور فقہ کی کثیر تعداد کتابوں کے ترجمے ہو چکے ہیں۔ سیرت پاک کے علاوہ بزرگانِ دین کی سوانح عمریاں اور مسلمانوں کی تاریخیں نہ صرف ترجمہ ہوئی ہیں بلکہ خود اُردو میں بھی نئے سرے سے لکھی گئی ہیں اور اسلامی فلسفے اور معارف و علوم پر بھی تراجم اور طبع زاد اُردو کتابوں کی کوئی کمی نہیں ہے۔ چنانچہ اس قدر وافر مذہبی سرمائے کا وجود یہ ثابت کرتا ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں نے اُردو زبان کو اپنے لیے منتخب کرکے اپنی پوری کی پوری متاعِ عزیز اسے سونپ دی ہے۔

جس طرح مذہب ہر اس شخص کا ہوتا ہے جو اسے مانتا ہے، اسی طرح زبان بھی ہر اس شخص کی ہوتی ہے جو اسے بولتا ہے، اس لیے میرے مندرجہ بالا بیان کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ اُردو صرف مسلمانوں ہی کی زبان ہے اور کسی دوسرے کو اس کے بولنے کا حق نہیں ہے۔ نہ میری مراد یہ ہے کہ اُردو کے فروغ و اشاعت میں صرف مسلمانوں نے ہی کام کیا ہے اور دوسری قوموں نے اس سلسلے میں کچھ نہیں کیا۔ تاریخ ہند بتاتی ہے کہ مسلمانوں کی آمد سے پہلے اس زبان کو غیر مسلم ہی

پال پوس رہے تھے اور اُردو زبان و ادب کی تاریخ میں مسلمانوں کی آمد کے بعد بھی غیر مسلموں کے شان دار کارنامے جلی حروف سے لکھے ہوئے ہیں ۔ ان شواہد کی روشنی میں یہ کہنا بالکل درست ہے کہ اُردو زبان تمام قوموں کی متفقہ کوششوں سے پروان چڑھی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ مسلمانوں کی کوششیں تمام قوموں سے بڑھی ہوئی ہیں جس کی وجہ یہ تھی کہ کسی دوسری قوم نے اس زبان کو من حیث القوم نہیں اپنایا کیوں کہ ان کے پاس وسیلۂ اظہار کے لیے دوسری دیسی زبانیں بھی موجود تھیں جنھیں انھوں نے وقتاً فوقتاً استعمال بھی کیا ہے ، لیکن مسلمانوں نے من حیث القوم ہندوستان کی سینکڑوں زبانوں میں سے صرف اسی ایک زبان پر قناعت کی اور اسے اپنی پوری جمع جتھا سپرد کرکے اپنے خیالات کے اظہار کا واحد ، بھرپور اور موثر وسیلہ بنا لیا ۔

مندرجہ بالا حقائق کی روشنی میں یہ بات واضح ہے کہ اس برصغیر میں آردو کسی کی مادری زبان ہو یا نہ ہو ، یہ ہر مسلمان کی مذہبی اور ثقافتی زبان ضرور ہے اور عربی و فارسی کے بعد اسلامیان ہند کی واحد ترجمان ہے - یہی وجہ ہے کہ پاکستانی مسلمان اس زبان کی حق تلفی پر جذباتی ہو جاتا ہے اور اس کا جذباتی ہونا بالکل حق بجانب ہے کیوں کہ آردو اس کے بزرگوں کی عزیز ترین کمائی ہے جسے سینچتے ، پروان چڑھاتے اور دیس بہ دیس نشر و اشاعت کرتے انھیں صدیاں گزری ہیں اور وہ اپنے بزرگوں کی اس مقدس میراث کا جائز وارث ہے ۔

(مطبوعہ صحیفہ لاہور اپریل ۱۹۶۶ء)

اردو بولی کا دیس

ہر دیس کی بولی الگ ہوتی ہے اور ہر بولی کا ایک الگ دیس ہوتا ہے بولی ایک سماجی عمل ہے اور انسانی سماج کسی نہ کسی علاقے میں بستا ہے اس لیے ہر بولی اپنا ایک وطن رکھتی ہے ۔ گھر سب سے چھوٹی سماجی اکائی اور بولی با معنی آوازوں کا سب سے چھوٹا نظام ہے ۔ اس لیے ایک گھر کئی گھروں میں تقسیم نہیں ہو سکتا اور ایک بولی کئی بولیوں میں نہیں بٹ سکتی ۔ کسی بولی کی مزید ذیلی بولی (ڈائلیکٹ) جیسی مغربی تقسیم کا تصور ہی غلط ہے ۔ جس طرح کئی گھروں کو ملا کر محلہ بنتا ہے ۔ اسی طرح کئی بولیوں کا ایک خاندان بنتا ہے ۔ ہندوستان میں شور سینی ، مہاراشٹری یا ماگدھی بولیاں نہیں ۔ بولیوں کے خاندان ہیں ۔ ان میں سے ہر خاندان میں کئی کئی بولیاں شامل ہیں جیسے شور سینی میں پنجابی ،گجراتی ، راجستھانی وغیرہ ۔ مہاراشٹری میں مرہٹی ،کونکنی ، برج بھاشا اردو وغیرہ ۔ ماگدھی میں بنگالی ، آسامی ، بہاری ، اڑیا وغیرہ ۔

بولی کا دیس صوبے ، ضلعے اور تحصیل میں بانٹا نہیں جا سکتا ۔ میرٹھ ۔ مظفر نگر اور سہارن پور ، یو پی کے ضلعے ہیں ۔ لیکن ہریانی کے علاقے میں ہیں ۔ لکھنؤ یو ۔ پی کے بیچ میں واقع ہے لیکن اودھی کے دیس میں ہے ۔ سرگودھا ، جہلم ، ملتان ، سب کے سب قدیم پنجاب کے صوبے میں ہیں ۔ لیکن بالترتیب ، لہندی ، پوٹھواری اور ملتانی کے علاقے میں آباد ہیں ۔ اس لیے اردو کو پورے یو ۔ پی کی اور پنجابی کو پورے پنجاب کی بولی سمجھنا غلطی ہے ۔ یہی پہلی غلطی ہے جس سے دوسری غلطی پیدا ہوتی ہے اور لوگ ایک بولی کو کئی بولیوں میں بانٹنے لگتے ہیں ۔ یہ تو وثوق کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ ابتداء میں

دیسوں کی تقسیم بولیوں کے لحاظ سے ہوتی تھی - البتہ یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ لسانی تقسیم سماجی لحاظ سے بنیادی اور فطری ہے اور ایک تمدنی اکائی کی نشاندہی کرتی ہے -

بولی صرف آوازوں کا مجموعہ ہی نہیں ہوتی - اس میں آوازوں کے معنی بھی شامل ہوتے ہیں اور معنویت پر ہی انسانی تمدن کا دارومدار ہے - جس طرح ہر بولی کا ایک الگ دیس ہوتا ہے - اسی طرح اس کا تمدن بھی الگ ہوتا ہے - اس دیس میں وہی تمدن سانس لیتا ہے - مثلاً اردو کا تمدن انگریزی کے تمدن سے مختلف ہے - عربی کا تمدن جاپانی تمدن سے جدا ہے - ہم پاکستان میں انگریزی کی بالادستی کے اس لیے مخالف نہیں ہیں کہ اس کی آوازیں ہمیں اردو کی آوازوں سے زیادہ ثقیل یا کرخت لگتی ہیں - ہمیں اس کی بالادستی اس لیے نا پسند ہے کہ اس کا مغربی تمدن اردو کے مشرق تمدن سے ٹکراتا ہے - اکبر الہ آبادی جیسے ہمارے بزرگوں کو بھی انگریزی کی آوازوں سے کوئی بیر نہیں تھا - انگریزی کے جلو میں جو معاشرت اب آ گئی ہے وہ اس کو نقصان دہ سمجھتے تھے اور انگریزی کی مخالفت محض اس لیے کرتے تھے کہ انہیں سویوں کے عوض کیک پسند نہ تھا -

بولی ہزاروں سال بیتنے پر بھی نہیں بدلتی لیکن بارہ کوس چلیے تو بدل جاتی ہے - یہی وجہ ہے کہ بولیاں لوہے ، پتھر کے زمانے سے نہیں اپنے علاقے سے نام پاتی ہیں - ان کی تقسیم زمانی نہیں مکانی ہوتی ہے - لوگ غلطی سے اس مکانی تقسیم کو زمانی سمجھ لیتے ہیں - محققین کہتے ہیں کہ ہندوستان کی موجودہ بولیاں ان پراکرتوں کی بیٹیاں ہیں جو کسی زمانے میں یہاں بولی جاتی تھیں - ان کے نزدیک ہر بولی کی پراکرت ماں تھی - جیسے پنجابی کی ماں پنجابی پراکرت - گجراتی کی ماں گجراتی پراکرت - بنگالی کی ماں بنگالی پراکرت وغیرہ - کوئی بولی ایسی نہیں ہے جس کی ماں پراکرت نہ ہو اور کوئی پراکرت ماں ایسی نہیں تھی جس کی بیٹی آج موجود نہ ہو - میں کہتا ہوں کہ یہی بولیاں جو آج کل بھاشائیں کہلاتی ہیں کل پراکرتیں کہلاتی تھیں - نام بدل جانے سے

اصلیت نہیں بدلتی - اسد اللہ خان کہیے یا غالب - بات ایک ہی ہے - واجد علی شاہ اور اختر ایک ہی شخص کے دو نام ہیں - دھن پت رائے اور پریم چند سے اردو کا ایک ہی افسانہ نگار مراد ہے - پراکرت کے گرامر نویسوں کے دیے ہوئے تبادلِ حروف کی رو سے اپ بھرنش (ایک بولی کا نام ہے) کا بول اوپٹھو بن جاتا ہے - لیکن ڈاکٹر مسعود حسن خان اور ڈاکٹر شوکت سبزواری کی کتابیں دیکھیے تو دونوں ناموں کو دو الگ بولیاں سمجھ رہے ہیں -

بولی کوئی انسان نہیں کہ جوڑا کھائے - حمل زچگی کے دُکھ بھرے اور بچے دے - اپنے سو سال پورے کرے اور مر جائے - ایسا ہوتا تو سو سال بعد ہر بولی ایک بچی جنتی اور مرمٹتی - اس سے زیادہ عمر ہوتی تو کئی کئی بچیاں دیتی - دکنی - (بیجا پوری) بولی جسے اردو کا قدیم روپ کہا جاتا ہے - اب تک زندہ نہ رہتی اور کئی اور بچیاں جن کو کبھی کی مٹ چکی ہوتی - کچھ بولیاں بانجھ پن بھی نکل جاتیں تب بھی ایک ہندوستان میں زمانی و مکانی دونوں تقسیموں سے ہزاروں لاکھوں بولیاں نظر آتیں - ان کی جنت کو اس سر زمین پر جگہ بھی نہ ملتی - ہندوستان کی تاریخ بھی بولیوں کی اس مفروضہ نسل کشی سے خالی نہ ہوتی اور کبھی کسی ایک بچی کے جنم کا حال تو کہتی -

بولی سانپ بھی نہیں کہ —— کینچلی جھاڑتی پھرے - اس میں چھلکا تو ہوتا نہیں - گودا ہی گودا ہوتا ہے - دوسری بولی کے بول لینے کو بولی کا بدلنا نہیں کہتے - بولی کی تبدیلی بنیادی ڈھانچے کی تبدیلی کہلاتی ہے - یہ نا ممکن ہے کہ اردو کا بنیادی ڈھانچہ بدل جائے اور پھر بھی اردو ہی کہلائے - اگر دکنی بولی ہی (قدیم) اردو ہے تو ہماری بولی اردو نہیں ہے اور اگر یہ اردو ہے تو وہ اردو نہیں ہے - دونوں کے بنیادی ڈھانچے اس حد تک مختلف ہیں - جب کوئی بولی اپنی نو آبادی بساتی ہے تو اس پر مقامی اثرات ضرور پڑتے ہیں لیکن اسے پوری تو کیا جزوی تبدیلی بھی نہیں کہہ سکتے - یہ محض اثر پذیری ہوتی ہے اور اسی اثر پذیری کے باعث کسی نو آبادی کی بولی کو

معیاری نہیں مانتے ۔ سند و معیار کے لیے اس کے مرکز کی طرف رجوع کرتے ہیں ۔ ٹکسالی بولی اس کے اصلی دیس کی ہوتی ہے ۔ کھری اردو بھی لاہور ۔ لکھنؤ ۔ دہلی کی نہیں ہو سکتی ۔ اپنی ہی جنم بھوم کی ہوگی ۔ اس لیے سب سے پہلے اس کے دیس کا سراغ لگانا ضروری ہے ۔

بولیاں لمبے لمبے سفر کرتی رہتی ہیں اور بیچ بیچ میں نئے نئے پڑاؤ ڈالتی اور چھاؤنیاں چھاتی چلی جاتی ہیں ۔ جب انسانوں کی ایک بڑی جماعت کسی وجہ سے دوسرے مقام کو منتقل ہوتی ہے تو ان کی بولی بھی ساتھ ساتھ جاتی ہے اور دوسری بولی کے علاقے میں ڈیرا ڈال دیتی ہے ۔ وسط ہند میں کھڑی بولی کے کتنے ہی چھوٹے چھوٹے علاقے بسے ہوئے ہیں ۔ برج بھاشا نواح متھرا سے برہمنوں کے ساتھ گجرات جابسی ۔ راجستھانی بولی ۔ یو ۔ پی کے شمالی پہاڑی علاقے میں جا پہنچی ۔ اردو نے پچھلی صدی تک آگرہ ۔ دہلی ۔ لکھنؤ ۔ کلکتہ ۔ مرشد آباد ۔ حیدر آباد اور لاہور میں بستیاں بسائیں ۔ قیام پاکستان کے بعد کراچی میں بھی چھاؤنی چھالی لیکن بولی جہاں جاتی ہے وہاں کی مقامی بولی کے اثرات بھی قبول کرتی ہے ۔ رگ وید کی سغدی بولی ۔ ہندوستان کی مختلف بھاشاؤں سے متاثر ہے ۔ لاطینی ۔ آریائی نسل سے ہے ۔ لیکن اس میں ٹ ۔ ڈ ڑ کی مقامی آوازیں داخل ہوگئی ہیں ۔ گجرات کی برج بھاشا پر گجراتی کا اثر ہے ۔ مختلف مقامات کی اردو برج بھاشا ۔ ہریانی ۔ اودھی اور پنجابی وغیرہ سے متاثر ہے اور اب کراچی میں اس پر گجراتی اور مکرانی کا بھی اثر پڑ رہا ہے ۔ چنانچہ کسی بولی کی اصل اور تاریخ کے سلسلے میں یہ دو باتیں اہم ہوتی ہیں کہ وہ سفر بھی کرتی ہے اور جہاں پہنچتی ہے وہاں کے اثرات بھی قبول کرتی ہے ۔

بولی اور دیس کا گہرا تعلق ہر بولی کے نام سے ظاہر ہے جو ہمیشہ نسبتی ہوتی ہے جیسے یونان کی یونانی ۔ اطالیہ کی اطالوی ۔ فرانس کی فرانسیسی ، ہسپانیہ کی ہسپانوی ۔ ایران کی ایرانی ۔ عرب کی عربی ۔ مصر کی مصری وغیرہ ۔ خود اس برصغیر کی بولیوں کا بھی یہی حال ہے ۔ مثلاً شورسین کی شورسینی ۔ مگدھ کی ماگدھی ۔ مہاراشٹر کی مہاراشٹری ۔

یا پھر موجودہ بولیوں میں پنجاب کی پنجابی - گجرات کی گجراتی - سندھ کی سندھی - مرہٹواڑہ کی مرہٹی - برج کی برج بھاشا - اردو (دہلی کے محلے) کی زبان آردو وغیرہ - جب بولی اور دیس کا تعلق اس قدر گہرا ہے کہ دیس کے بغیر نہ اس کا نام ممکن ہے نہ تصور تو پھر سنسکرت کو زبان کیوں کر مانا جائے کہ نہ اس کا کوئی دیس پہلے تھا نہ آج کل ملتا ہے - نہ یہ پہلے کسی علاقے میں بولی جاتی تھی نہ کہیں آج بولی جاتی ہے - اس لیے تو میں کہتا ہوں کہ یہ بولی نہیں تھی - صرف قدیم تحریر ہے اور اس تحریر میں جو بولیاں محفوظ ہیں وہ آج بھی بولی جا رہی ہیں کیوں کہ آج تک دنیا کی کسی بولی کا انتقال نہیں ہوا ہے - اب ان بولیوں کو سمجھنا اور پہچاننا مقصود ہو تو اس طرز تحریر کے اصول دریافت کیجیے جن کے تحت اس میں آوازیں قلم بند کی گئی ہیں -

کچھ لوگ بولیوں کو ثقیل اور سبک - فصیح اور غیر فصیح - سڈول اور بھدی - مہذب اور گنوارو - کرخت اور نرم جیسی قسموں میں بانٹتے ہیں - یہ سہین قسم کے لوگ ہیں اور ادیب کہلاتے ہیں - لکھنے پڑھنے والے انہیں مستند مانتے اور ان سے بولی کی سند لیتے ہیں - حالاں کہ بولی کے متعلق غیر مستند باتیں بھی لوگ کرتے ہیں - ایک کی بولی دوسرے کو ثقیل - غیر فصیح - بھدی - گنوارو اور کرخت لگتی ہے لیکن بولنے والے کے لیے سبک - فصیح - سڈول - مہذب اور نرم ہوتی ہے - اپنی ادا اور اپنی بولی ہر ایک کو عزیز ہے - ہیولیٰ کو بعض ادیب ثقیل سمجھا کریں - عربوں کے لیے سبک بول ہے - رڑکنا کو اردو داں غیر فصیح کہا کریں - پنجابیوں کے نزدیک نہایت فصیح ہے - یہ ذاتی پسند و نا پسند کی بات ہے - کوئی فطری اصول نہیں ہے - ادیب ذاتی پسند کی باتیں کرتے ہیں اور ادب پسندوں کا ڈھیر ہوتا ہے - زبان کا طالب علم عام چلن کی بات کرتا ہے اور بولی عوامی رجحان پیش کرتی ہے - ادب مٹھی بھر خواص کو سامنے رکھتا ہے - بولی عوام کے جم غفیر کا ساتھ دیتی ہے - غرض یہ ہے کہ ادب میں امروں کا اور بولی میں جمہور کا سکہ چلتا ہے -

ادب شہروں میں پلتا ہے۔ بولی دیہات میں پھلتی ہے۔ میں آج کل سرگودھا میں رہتا ہوں اور میرے گھر میں اردو بولی جاتی ہے۔ یہاں کچھ لوگوں کے گھروں میں بھی اردو کا چلن ہے۔ کچھ گھروں میں پنجابی کے بول سنائی دیتے ہیں۔ بہت سوں کے یہاں لہندی کا راج ہے۔ بعض پہاڑی بولتے ہیں۔ کچھ پشتو میں بات کرتے ہیں۔ بازاروں میں اردو بھی چلتی ہے اور پنجابی اور لہندی بھی بہت سے ہریانی بولتے ہیں۔ خال خال کشمیری بھی سننے میں آ جاتی ہے۔ کہیں کہیں چند بے بس لوگ انگریزی بھی بول اٹھتے ہیں۔ اس رنگا رنگ ماحول میں سرگودھا شہر کو کسی ایک بولی کا مرکز ٹھہرانا دشوار ہے۔ یہی حال ہر شہر کا ہے۔ اس لیے بولی کی سند شہر سے نہیں دیہات سے لی جاتی ہے۔ بولی کا اصل دیس دیہات میں ہوتا ہے اور دیہات سے ہی طے کیا جا سکتا ہے۔ میرے لاکھ اردو بولنے کے باوجود سرگودھا اردو کے نہیں لہندی کے علاقے میں آباد مانا جائے گا۔

گریرسن نے اردو کو برج بھاشا اور پنجابی کے درمیان کی بولی بتایا۔ مولانا محمد حسین آزاد نے اسے برج باسی کہا۔ حافظ محمود شیرانی نے اردو کا وطن پنجاب۔ مولانا سلیمان ندوی نے سندھ اور مولانا نصیر الدین ہاشمی نے دکن بتایا۔ لیکن اردو کا چلن ان علاقوں کے دیہات میں کہیں نہیں ملتا۔ بعض لوگ دہلی کو اردو کی جنم بھوم بتاتے ہیں۔ لیکن دہلی کے دیہات میں ہریانی کا چلن ہے۔ خود دہلی شہر میں بھی کرخنداری بولی جاتی ہے۔ جو ہریانی سے اپنا رشتہ ظاہر کر رہی ہے۔ پنجاب والے یو۔ پی کو اردو کا گھر سمجھتے ہیں اور یو۔ پی والے بھی اسی زعم میں مبتلا ہیں۔ لیکن اردو یو۔ پی کے بھی شہروں تک محدود ہے اور وہ بھی پورے شہروں میں نہیں بلکہ بیشتر مسلمانوں کے گھروں میں بولی جاتی ہے۔ ایک یو۔ پی کے دیہات میں کتنی ہی بولیاں ملتی ہیں۔ میرٹھ، مظفر نگر، سہارن پور کے ضلعوں میں ہریانی کا راج ہے جنوبی مغربی یو۔ پی کے دیہات میں فرخ آباد تک برج بھاشا اور اس کے مشرق میں کانپور تک قنوجی بولی جاتی ہے۔ کانپور سے آگے پوربی یا اودھی کا علاقہ آ جاتا ہے۔ لکھنؤ کا شہر اسی

علاقے میں آباد ہے - مشرق میں بنارس سے آگے پھر بھوج پوری کا دیس شروع ہو جاتا ہے اور جنوب میں جھانسی ، ہمیر پور ، باندہ کے اضلاع میں بندیلی بولی جاتی ہے - غرض اس صوبے کے دیہات میں کتنی ہی بولیاں رائج ہیں اور رائج نہیں ہے تو ایک اردو چنانچہ اردو کا علاقہ نہ برج مانا جا سکتا ہے - نہ پنجاب ، نہ سندھ نہ دکن نہ دہلی نہ یو - پی یہ ان علاقوں میں سے کسی کے دیہات میں نہیں چلتی -

بولی بے دھرم ہوتی ہے - بے گھر - نہیں ہوتی - عربی عرب کی ہے لیکن مسلمان نہیں - انگریزی انگلستان کی ہے لیکن عیسائی نہیں - فارسی ایران کی ہے لیکن آتش پرست نہیں - روسی روس کی ہے لیکن کافر نہیں - اسی طرح اردو ہندوستان کی ہے لیکن ہندو یا مسلمان نہیں - مختلف دھرم والے ایک ہی بولی بولتے ہیں اور ایک دھرم والے کتنی ہی بولیاں استعمال کرتے ہیں - اس لیے بولیوں کو دھرم کی بنیاد پر نہیں بانٹا جا سکتا - دھرم اس کا ہوتا ہے جو مانے - بولی اس کی ہوتی ہے جو بولے - لیکن نہ دھرم کسی کی جا گیر ہوتا ہے - نہ بولی - بعض دھرم والے کسی ایک بولی کو اپنا بھی لیتے ہیں جیسے ہندوستان میں بودھوں نے پالی - برہمنوں نے سنسکرت - رام بھگتوں نے اودھی - کرشن بھگتوں نے برج بھاشا - سکھوں نے پنجابی اور مسلمانوں نے اردو کو اپنا لیا - اس کا یہ مطلب نہیں کہ دوسرے ان کو استعمال نہیں کرتے یا استعمال کریں تو ان کی تخلیقات کو اس بولی سے باہر قرار دے دیا جائے- چنانچہ یہ درست ہے کہ ہند اسلامی ثقافت اردو میں ملتی ہے - لیکن یہ غلط ہے کہ اردو میں صرف ہند اسلامی ثقافت ملتی ہے -

ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد سے پہلے اردو بولی کا جو ادب جمع ہوا ہے کچھ لوگ اسے اردو نہیں مانتے گویا دریائے سندھ کی دھار کا جتنا حصہ لداخ سے پہلے پہلے تبت میں واقع ہے وہ سندھ نہیں کچھ اور ہے یا مشرقی پاکستان کی سرحد میں داخل ہونے سے پہلے گنگا اور برہم پتر کے دریا گنگا اور برہم پتر نہیں ہیں یا جو سورج اب ارض پاک پر طلوع ہوتا ہے وہ سورج ہے اور جو قیام پاکستان سے پہلے اس سرزمین

پر چمکتا تھا وہ سورج نہیں تھا ۔ اگر ظہور اسلام سے پہلے کا ادب عربی ادب کا اہم جزو ہے اور ایران میں مسلمانوں کے داخلے سے قبل جمع ہونے والا ادب ادبیات ایران میں شمار ہو سکتا ہے تو مسلمانوں کے ہندوستان میں آنے سے پہلے جو اردو ادب جمع ہوا ہے وہ بھی اردو ادب ہے ۔ ایک ادب دوسرے ادب کا اثر ضرور قبول کرتا ہے ۔ لیکن یہ اثر ادبی ہوتا ہے مذہبی نہیں ہوتا ۔ اردو اور فارسی کے ملاپ پر اردو عروض کی جگہ فارسی عروض کے رواج کو اسلامی فتح قرار دینے سے نہ تو اسلام کی کوئی خدمت سرانجام پا سکتی ہے اور نہ اردو کی ۔ ایرانی عروض ایرانی بولی کا عروض ہے ۔ مذہب اسلام کا عروض نہیں ہے ۔ آج کی اردو میں آزاد اور معرا نظموں اور سونیٹ اور کینٹو جیسی اصناف شاعری کو عیسائیت کا نہیں انگریزی زبان و ادب کا اثر کہا جائے گا ۔ اردو تنقید کا انداز بھی جو دیسی سے ایرانی اور ایرانی سے مغربی ہوگیا ۔ ہندوانہ ۔ اسلامی یا مسیحی نہیں کہا جا سکتا ۔ ہندوستانی عجمی اور مغربی کہلائے گا ۔

بعض لوگوں کی اس خواہش کے باوجود کہ اردو ہندوستان میں مسلمانوں کے آنے کے بعد پیدا ہو اردو کی پیدائش مسلمانوں کی آمد تک ملتوی نہیں ہو سکتی ۔ جس طرح عربی ظہور اسلام سے شروع نہیں ہوئی اور ایرانی کا آغاز مسلمانوں کی فتح ایران سے نہیں ہوا ، اسی طرح اردو کی پیدائش نے بھی ہند میں مسلمانوں کے ورود کا انتظار نہیں کیا تحقیق مراد اندیشی۔ ذاتی عقیدت یا کسی مصلحت کا نام نہیں ہے ۔ علمی مسائل مصلحت کوشیوں سے حل نہیں ہو سکتے اور اردو زبان کمزور سہاروں سے پروان نہیں چڑھ سکتی ۔ حقائق سے آنکھیں چار کرنا بہادری اور حقائق کو تسلیم کرنا ہی دیانت داری ہے ۔

اردو بولی کے متعلق اب تک جو تحقیق ہوئی ہے اس میں ان گنت اُلجھنیں اس لیے پیدا ہوئی ہیں کہ آج تک اس کے دیس کا سراغ نہیں لگایا جا سکا اور لوگ ہیں کہ اس میں ہر بولی کے آثار پا رہے ہیں اور ہر بولی میں اس کا سراغ لگا رہے ہیں ۔ وجہ یہ ہے کہ بولی کی مرکزیت دیس سے ہوتی ہے اور اردو کا دیس ابھی تک آنکھوں سے اوجھل ہے ۔

اب محققوں کو کھلی چھٹی ہے کہ جو چاہیں اردو میں ثابت کر دیں - ہریانی کے بول چاندنا (اردو اجالا) کو اردو کہہ دیں یا پنجابی کے چانننا کو - چاہیں تو پرانٹھا کو پراؤنٹھا اور پرونٹھا سب کو اردو بتا دیں - ایدھر ، اودھر ، کیدھر ، جیدھر ، کو ٹکسالی اردو قرار دے دیں اور دریائے لطافت میں انشا نے اس بارے میں جو کچھ کہا ہے اس کو جھٹلا دیں - انہیں ان جسارتوں سے کون روک سکتا ہے - اگر اردو بولی ہے (اور یقیناً ہے) تو اس کا دیس بھی ہونا چاہیے اور دیس بھی دیہات میں شہروں کے حوالے سے کسی بولی کے دیس کا تعین نہ ہوا ہے نہ ہو سکتا ہے - لہٰذا اردو کا بھی دیس ڈھونڈنے کے لیے ہمیں قصبوں اور شہروں سے نکل کر دیہات کی طرف رخ کرنا چاہیے -

میں پھر اسی بات کی طرف پلٹ کر آتا ہوں کہ ہر بولی کا دیس ہوتا ہے جس سے وہ منسوب و موسوم ہوتی ہے - خود لفظ "اردو" جو آج کل ہماری بولی کے لیے استعمال ہو رہا ہے - اس علاقے کا نام ہے جو شاہجہان بادشاہ نے آگرے سے راج دھانی اٹھاتے وقت دہلی میں پرانے شہر کے باہر بسایا تھا - اسی لیے زبان اردو یعنی علاقہ اردو کی زبان کہا جاتا تھا - لیکن یہ نام نیا ہے - اس کا پرانا نام کھڑی بولی ہے جو آج صرف محققوں کے حلقے میں ہی محدود ہے - یہ لوگ علی العموم یہی کہتے ہیں کہ ہماری بولی کو برج بھاشا کے مقابلے میں کھڑی بولی کا نام دیا گیا ہے اور اس کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ اس کا لہجہ برج بھاشا کے مقابلے میں کھڑا کھڑا سا ہے یعنی اردو کے بیشتر اسما و صفات و افعال کا خاتمہ " آ" اور برج بھاشا میں "او" ہوتا ہے جیسے اردو گھوڑا ، بھلا ، جانا ، برج بھاشا گھوڑو ، بھلو ، جانو - لیکن اردو کا سا لہجہ ، پنجابی سرہٹی اور دوسری زبانوں کا بھی ہے - ان میں سے کسی ایک کو بھی یہ نام نہیں دیا گیا اور اگر دوسری زبان کے مقابلے پر یہ نام رکھا گیا ہے تو دونوں کے ناموں میں ربط باہم ہونا چاہیے تھا - اردو کو کھڑی بولی کہا گیا تو برج بھاشا کو پڑی بولی کہتے لیکن آج تک کسی نے برج بھاشا کو پڑی بولی نہیں کہا - اس لیے کھڑی بولی کی یہ تشریح قابل قبول نہیں - لامحالہ اس نام

کو بھی دوسری بولیوں کے ناموں کی طرح نسبتی ماننا پڑے گا۔

جس طرح پنجابی اور سندھی وغیرہ بولیوں کے ناموں میں یائے نسبتی لگی ہوئی ہے اسی طرح کھڑی بولی میں بھی یائے تانیث نہیں یائے نسبتی ہے اور اس کا مطلب ہے علاقہ' کھڑ کی بولی کھڑ کا بول کھنڈ اور کھونڈ کا مخفف ہے۔ چنانچہ کھڑی بولی کا مطلب ہوا کھڑ، کھنڈیا کھونڈ کی (کھنڈی کھونڈی) اور کھنڈیا کھونڈ ہندوستان کے اس علاقے کو کہتے ہیں۔ جو صوبہ اڑیسا کے مغرب میں واقع ہے۔ اس علاقے میں آج جو بولی بولی جا رہی ہے۔ اسے بھی کھڑی یا کھڑیا کہتے ہیں۔ صوبہ متوسط میں اس بولی کے اور بھی چھوٹے چھوٹے علاقے ہیں جن میں مہا دیو پہاڑی کے آس پاس کا علاقہ کافی وسیع ہے۔ اردو میں آوازوں کی بدلائی کے جو اصول جاری ہیں۔ ان کی رو سے کھونڈ اور گونڈ ایک ہی بول کے دو روپ ہیں۔ یہ حقیقت اس بات سے بھی ظاہر ہوتی ہے کہ علاقہ، کھونڈ کو گونڈیانا یا گونڈوانا بھی کہتے ہیں۔ ان تمام باتوں سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ علاقہ ہندوستان کی قدیم نسل گونڈ کا مسکن ہے اور اس کی بولی کھڑی بولی کہلاتی ہے۔ قیاس غالب یہ ہے کہ یہی اردو کا اصلی دیس ہے جس میں وہ ہزاروں سال سے بولی جا رہی ہے۔ چنانچہ اردو کے معیار و سند کے لیے اسی علاقے کی بول چال کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔

(مطبوعہ: اوراق، لاہور، جنوری ۱۹۶۷ء)

اردوئے قدیم

کامل وثوق اور قطعیت کے ساتھ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ہمارے یہاں دکنی ادب کو اردوئے قدیم کہنے کی رسم کا آغاز کب سے ہوا۔ البتہ اس ضمن میں چند بزرگوں کی کوششیں ضرور سامنے ہیں جن کی بدولت اس نے کافی فروغ پایا ہے۔ ان میں بابائے اردو مولانا عبدالحق مرحوم و مغفور کا نام سرفہرست آتا ہے جو اپنی زندگی بھر دکنی زبان کی کتابوں کا سراغ لگا لگا کر ضروری مقدمات، حواشی اور فرہنگوں کے ساتھ انہیں مرتب کرتے اور انجمن ترقی اردو کی طرف سے شائع کرتے رہے اور اس خیال کو تقویت پہنچاتے رہے کہ یہ کتابیں اردوئے قدیم کے نمونے ہیں۔ مولانا نصیر الدین ہاشمی نے اپنی کتاب "دکن میں اردو" میں اس خیال کو نظریے کی حیثیت دے کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ اردو زبان کا آغاز ہی دکن سے ہوا ہے لیکن حافظ محمود شیرانی نے آغاز اردو کا سلسلہ سرزمین پنجاب سے قائم کیا۔ اس کا استدلال یہ تھا کہ دکنی ادب میں پنجابی زبان کی کثیر تعداد میں خصوصیات ملتی ہیں اور چونکہ یہ ادب اردو زبان کا نقش اول تھا اس لیے پنجابی زبان کو اردو کا سرچشمہ سمجھنا چاہیے۔ اس طرح شیرانی مرحوم نے مولانا نصیر الدین ہاشمی کے نظریے پر ایک گراں قدر اضافہ کیا۔ اس سلسلے کی آخری کڑی ڈاکٹر مسعود حسن خاں کی تحقیق ہے جو انہوں نے اپنی کتاب "تاریخ زبان اردو" میں تفصیل کے ساتھ پیش کی ہے۔ انہوں نے شیرانی کے نظریے سے اختلاف کرتے ہوئے اردو کی سرزمین پنجاب کے بجائے دہلی و نواح دہلی ثابت کرنے کی کوشش کی اور دکنی ادب میں پنجابی کے علاوہ ہریانی اور میواتی وغیرہ کچھ اور بولیوں کا بھی سراغ لگایا لیکن شیرانی کی اس بات سے وہ بھی انکار نہیں کر سکے کہ دکنی ادب پر پنجابی کی بھی چھاپ گہری ہے۔ اس سلسلے میں حکیم

سید شمس اللہ قادری کی کتاب کا ذکر بھی ضروری ہے جس میں انھوں نے دکنی نظم و نثر کے نمونے جمع کر دیے ہیں اور جس کا نام ہی انھوں نے "اردوئے قدیم" رکھا ہے۔

غرض آج تک تحقیق زبان اردو کی جتنی کوششیں ہوئی ہیں ان سے ہم کسی صحیح اور قطعی نتیجے پر نہیں پہنچ سکے ہیں۔ آغاز اردو کے تمام نظریات میں مجھے شیرانی کا استدلال نہایت معقول اور منطقی نظر آتا ہے لیکن آخر میں وہ بھی ہمیں جس منزل پر پہنچاتے ہیں وہ اردو کی منزل مقصود نہیں بلکہ اس کے لیے ایک اجنبی مقام ہے۔ یعنی ان کا یہ کہنا کہ اردو پنجابی سے نکلی ہے۔ دونوں زبانوں کے کثیر تعداد بنیادی اختلافات کے پیش نظر قابل قبول نہیں ہے۔ میرے نزدیک اس باب میں شیرانی کی سی منطقی بصیرت کے ناکام ہو جانے کی صرف ایک ہی وجہ ہے اور وہ یہ کہ دوسروں کی طرح ان کے نظریے کی بنیادیں بھی جس مقدمے پر استوار کی گئی ہیں وہ بدیہی نہیں نظری ہے۔ اگر وہ پنجابی اور اردو کے تعلق پر غور کرنے سے قبل دکنی اور اردو کا بھی لسانی، تقابل کر لیتے تو یہ صورت پیش نہ آتی۔ دکنی کو اردوئے قدیم مان لینے کا واحد منطقی نتیجہ یہی ہو سکتا تھا کہ اردو پنجابی سے نکلی ہے کیونکہ دکنی ادب اردو اور پنجابی کے درمیان ایک مضبوط پل کا کام دیتا ہے ـــــ لطف کی بات یہ ہے کہ ایک طرف تو ہمارے محققین شیرانی کے نظریے پر معترض ہیں اور پنجابی اور اردو کو ماں بیٹی تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہیں لیکن دوسری طرف دکنی ادب کو اردوئے قدیم بھی مانے بیٹھے ہیں اور جب ان کی توجہ اس فرو گزاشت کی طرف مبذول کرائی جاتی ہے تو کوئی دلیل دیے یا لیے بغیر یہ کہہ کر منہ بند کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ ہم کسی فرد واحد کی رائے کو تسلیم نہیں کر سکتے۔ میرے نزدیک یہ نقطۂ نظر جو ماقال کی جگہ من قال کو اہمیت دیتا ہے۔ تحقیق کا صریح مخالف اور تقلید کا غاشیہ بردار ہے اسی لیے کہ تحقیق ہمیشہ فرد واحد کی تنہا آواز ہوتی ہے۔

میں اردو کے تمام محققین کا دل سے احترام کرتا ہوں اور ان کی کوششوں کو سراہتا ہوں لیکن یہ احترام اختلاف رائے کا مانع نہیں جو

اردو کے ایک طالب علم کی حیثیت سے میرا حق ہے چنانچہ مجھے یہ کہنے میں مطلق تامل نہیں ہے کہ قدیم دکنی ادب جسے آج تک غلطی سے اردوئے قدیم سمجھا جا رہا ہے ایک جداگانہ دکنی زبان کا نمونہ ہے جو اردو سے بنیادی طور پر مختلف ہے۔ اس کا لسانی تجزیہ کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ اس میں ایک تو شورسینی زمرے کی زبانوں پنجابی، ہریانی، میواتی، راجستھانی اور گجراتی کے روپ ملتے ہیں جس کی وجہ یہ ہے۔ کہ مسلمانوں کی سیاسی فتوحات اور تبلیغی تحریکات کے ساتھ ساتھ دہلی سے پنجابی اور ہریانی وغیرہ مسلسل دکن کو سفر کرتی رہی ہیں۔ دوسری طرف دکن کے بیجا پوری نقوش مقامی اثرات کی غمازی کر رہے ہیں کیونکہ بیجا پور مہاراشٹری پراکرت کے علاقے میں واقع ہے اور یوں یہ زبان شورسینی اور مہاراشٹری پراکرتوں کا آمیزہ بن کر رہ گئی ہے۔ چنانچہ اس کے بعض آثار اردو سے بھی مشابہ ہیں کیونکہ اردو زبانوں کے مہاراشٹری زمرے سے تعلق رکھتی ہے —اور اسی جزوی مشابہت کی بنا پر لوگ اسے غلطی سے اردوئے قدیم کہنے لگے دونوں کی اس مشابہت کی تفصیل و توجیہہ یہ ہے:

(۱) دکنی اور اردو دونوں ہی ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد سے قبل یہاں کی مقامی لپیوں میں لکھی جاتی تھیں۔ مجھے دکنی کے متعلق تو صحیح و قطعی علم نہیں ہے۔ البتہ اردو کی بابت کہہ سکتا ہوں کہ اس کے نہایت قدیم نمونے دیوناگری لپی میں پائے جاتے ہیں۔ مسلمانوں کی آمد پر جہاں ہندو پاک کی اور زبانیں فارسی لپی میں منتقل ہوئیں وہاں اردو اور دکنی نے بھی اپنا لباس تبدیل کر ڈالا اور اب جو دونوں ایک ہی لپی میں نظر آئیں تو لوگوں کو یہ گمان گزرا کہ ان میں کوئی براہ راست رشتہ بھی ہے۔

(۲) مسلمانوں کی آمد سے قبل تمام دیسی زبانوں میں نظم گوئی کے لیے دیسی اوزان و بحور کا استعمال ہوتا تھا لیکن جب اس برصغیر میں مسلمانوں کے ساتھ ساتھ ان کی زبان فارسی کا بھی عمل دخل شروع ہوا تو اردو اور دکنی دونوں کی نظم فارسی

عروض کے سانچے میں ڈھل گئی اور یوں لوگوں کو دونوں میں مشابہت کا ایک دوسرا پہلو بھی نظر پڑا چنانچہ وہ خیال جو لپی کی پہلی قدر مشترک سے پیدا ہوا تھا اس دوسری خصوصیت سے اور زور پکڑ گیا ۔

صوری مشابہت کی ان دونوں خصوصیات سے قطع نظر جنھیں مطالعہ لسانی میں کوئی اہمیت اس لیے نہیں دی جا سکتی کہ یہ ایک خاص وقت (مسلمانوں کی آمد) کے بعد ان زبانوں میں پیدا ہوئی ہیں ان میں کچھ ایسی باتیں بھی مشترک نظر آتی ہیں جو واقعی اپنی جگہ بنیادی اور اہم ہیں ۔ مثلاً

(۱) دکنی اور اردو میں اسما و صفات و افعال کا خاتمہ "آ" پر ہوتا ہے لیکن یہ بات ان زبانوں کے علاوہ پنجابی اور ہریانی میں بھی ملتی ہے یعنی یہ خصوصیت مہاراشٹری اور شورسینی دونوں ہی پراکرتوں میں پائی جاتی ہے اس لیے خاتمہ الفاظ دونوں کو متحد الاصل ثابت کرنے کے لیے دلیل محکم نہیں بن سکتا ۔

(۲) دکنی کے کثیر تعداد لغات جوں کے توں یا قدرے تغیر کے ساتھ اردو میں بھی ملتے ہیں ۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ اردو اور پنجابی یا ہریانی وغیرہ میں بھی بہت سے الفاظ مشترک ہیں ۔ چنانچہ جب ایسے الفاظ جو دہلی سے دکن پہنچے ہیں اردو میں بھی نظر آتے ہیں تو دکنی پر اردوئے قدیم کا دھوکا ہونے لگتا ہے ۔ اس قدر مشترک کی دوسری وجہ یہ ہے کہ اردو بھی مہاراشٹری پراکرت سے پیدا ہوئی ہے اس لیے اس کے بہت سے الفاظ اس علاقے کی دوسری زبانوں میں بھی ملتے ہیں ۔ اس لحاظ سے ان کا دکنی کے مقامی بیجا پوری جزو میں بھی نظر آ جانا ایک فطری بات ہے ۔ مثلاً مہاراشٹری پراکرت کا اسم فاعل جو مصدر پر "آر" کے اضافے سے بنتا تھا آج اردو ، مرہٹی اور دکنی تینوں زبانوں میں مشترک پایا

جاتا ہے - اردو اور دکنی میں اس کا روپ ہائے حشوی کے اندراج کے باعث "آر" سے "ہار" ہو گیا ہے لیکن مرہٹی میں قدیم روپ اب تک بدستور چلا آ رہا ہے جیسے مثلاً مرہٹی مرنار، ہونار=اردو دکنی مرنہار، ہونہار لیکن دکنی میں جو شورسینی اور مہاراشٹری کی آمیزش ہوئی ہے اس کے نتیجے میں یہ زبان کچھ ایسے روپ بھی پیش کرتی ہے جیسے مشنہار (ڈالنے والا)، اچھنہار (ہونے والا) جن میں مُشنا اور اچھنا پنجابی ہریانی وغیرہ کے الفاظ ہیں اور "ہار" (قدیم "آر") کا لاحقہ خالص مہاراشٹری پراکرت کا ہے - اردو زبان میں اس قسم کے مخلوط روپ سرے سے ناپید ہیں -

(۳) دکنی کے کثیر تعداد الفاظ کے مہاپران اردو ہی کی طرح الپ پر ان سے بدل گئے ہیں - مثلاً راک (راکھ)، باندیا (باندھا)، سکی (سکھی)، بج (بجھ)، منج (مجھ)، سات (ساتھ)، ہات (ہاتھ)، کچ (کچھ)، سُک (سُکھ)، مُک (مُکھ) وغیرہ - یہ بات کچھ حد تک دوسری زبانوں میں بھی ملتی ہے کیونکہ عہد قدیم میں ہندوستان کی سبھی زبانیں ایرانی تلفظ سے متأثر ہوئی ہیں البتہ فارسی لپی میں لکھی جانے والی زبانوں اردو اور دکنی میں لپی کے باعث یہ اشتراک ذرا زیادہ نمایاں نظر آتا ہے لیکن غور سے دیکھا جائے تو دکنی میں یہ لَے اردو سے کہیں زیادہ بڑھی ہوئی ہے -

(۴) مہاراشٹری لہجے کی وہ خصوصیت جس میں حروف علت دب کر مختصر ہو جاتے ہیں آج اردو، مرہٹی اور دکنی تینوں زبانوں میں ملتی ہے لیکن اس باب میں بھی دکنی اردو سے کہیں آگے بڑھی ہوئی ہے یہی وجہ ہے کہ اس میں بہتر (بہیتر)، مٹھا (میٹھا)، دکھے (دیکھے) جیسے روپ بکثرت ملتے ہیں جو اردو میں اب تک طویل حروف علت کے ساتھ نظر آتے ہیں -

مندرجہ بالا مشترک خصوصیات سے قطع نظر جن کے باعث اردو اور دکنی میں کسی قریبی رشتے یا تعلق کا گمان ہو سکتا ہے - دونوں میں

ایسے کثیر تعداد بنیادی اختلافات ملتے ہیں جو ان کو دو الگ زبانیں ثابت کرنے کے لیے کافی و شافی ہو سکتے ہیں۔

چنانچہ ذیل میں دونوں زبانوں کے چند موٹے موٹے اختلافات پیش کیے جاتے ہیں جو سید شمس اللہ قادری کی کتاب "اردوئے قدیم" کے سرسری مطالعے سے سامنے آ گئے ہیں۔

۱۔ اُردو اور دکنی کی ضمیریں مختلف ہیں:

اُردو	دکنی
ہم	ہمن (برج بھاشا ہمن) ، ہمنا
تو	توں (پنجابی)
تم	تمن (برج بھاشا) ، تمنا
یہ	یُو (ہریانی) ، یے ، اِسے (پنجابی)
وہ	وو (ہریانی) ، اَو (پنجابی)
اُس	تِس (ہریانی)
جُو	جِے
آپ	آپن ، آپیں
میرا	مُنو

(۲) اردو کی علامت فاعلی "نے" دکنی میں نہیں ملتی بلکہ یہ خصوصیت تو حیدر آبادی زبان میں بھی آج تک چلی آ رہی ہے۔ "نے" بعض قدیم دہلوی شاعروں کے یہاں بھی غائب ہے۔ مثلاً کسی شاعر کا مصرع ہے۔ رات ہم ہجر کی دولت سے مزہ لوٹا ہے۔ یہ دہلوی محاورے کا اثر ہے کیونکہ دہلی کی ہریانی زبان میں بھی "نے" کا استعمال نہیں ہوتا۔

(۳) اردو کے قوی روپ کے اسما کی جمع مؤنث فاعلی کا لاحقہ "آں" دکنی میں مذکر و مؤنث دونوں اسما کی جمع کے لیے مستعمل

ہے - مثلاً آنکھ سے انکھیاں ، جنس سے جنساں ، پھول سے پھولاں ، چمن سے چمناں وغیرہ بلکہ اس لاحقے کا استعمال علامت اضافت اور معاون فعل تک جا پہنچا ہے ۔ مثلاً معراج کیاں نشانیاں (معراج العاشقین)۔ ۔ ۔ ۔"دیا سب کو نادر جو تھیاں نعمتاں (قصہ ملکہ مصر از عاجز) ۔

(۴) اردو میں صفت مؤنث غیر منصرف ہوتی ہے لیکن دکنی میں موصوف کے مطابق آتی ہے - مثلاً اردو لال مرچ ، لال مرچیں ، کالی مرچ ، کالی مرچیں — دکنی اتیاں میریاں باتاں (معراج العاشقین) ۔

(۵) اردو اور دکنی میں عوامل و لواحق بھی مختلف ہیں ۔ مثلاً

اردو	دکنی
سے	تے ، تھے ، تھیں (پنجابی= برج بھاشا تے = گجراتی، ملتانی تھیں) سو (برج بھاشا = پنجابی اوں) سیں (برج بھاشا) ستے ، سیتی ، ستیں ، توں
تک، تلک	لگ ، تلگ
پہ (پر)	پو
میں	ماں ، موں (مرہٹی) ، منے ، منیں
کو	کوں (برج بھاشا ، راجستھانی وغیرہ)
کا ، کی ، کے	کیرا ، کیری
سا (مانند)	سارا - ہمن ہمنے

(۶) دکنی میں حصر و تخصیص کے لیے لفظ کے آخر میں چ، ہیچ، ایچ (=پراکرت ایچ) کا اضافہ ہو جاتا ہے جیسے ویسا سے ویساچ، اکیلا سے اکیلاچ اور اکیلا ہیچ، اپنا سے اپناچ اور اپنا ہیچ، ایک سے ایکیچ وجود سے وجودیچ ("سب رس") - یہ لاحقہ اردو میں نہیں ملتا بلکہ اس کی جگہ لاحقہ "ہی" (پراکرت ای) لگایا جاتا ہے جیسے اب (= قدیم ابھ) سے ابھی (=ابھ+ ای)، کس سے کسی (=کس+ ای) وغیرہ -

(۷) اردو اور دکنی کے کچھ متعلقات فعل اور صفات وغیرہ بھی مختلف ہیں - مثلاً

اردو	دکنی
پاس	کن، کنے (راجستھانی، ہریانی)، نیڑے (پنجابی)
آگے	اگل (غالباً مرہٹی)، اگن، آگو (برج بھاشا)، انگیں، انگھے
نیچے	تل (پنجابی)
اوپر	اپر، اپرال (مرہٹی)
کبھی	کدھی، کدھیں (ہریانی)
یہاں، وہاں، جہاں، کہاں	یاں، واں، جاں، کاں (ہریانی)
نہ	نا، نکو
نہیں	نیں (=پنجابی نئیں
اتنا، جتنا، کتنا وغیرہ	اِتا، ایتا، جِتا، جیتا، کِتا، کیتا وغیرہ، کِتک، کیتک (مرہٹی، برج بھاشا)

(۸) دکنی میں اردو عطفیہ "اور" کی جگہ پنجابی کا "ہور" ملتا ہے -

(۹) اردو کے مادہ "ہو" (ہونا) کی جگہ دکنی میں گجراتی (شورسینی پراکرت) کا "اچھ" ملتا ہے۔ چنانچہ اردو ہو=دکنی اچھو اردو ہوں=دکنی اچھوں وغیرہ۔

(۱۰) اردو کے بہت سے مادے دکنی میں برج بھاشا اور گجراتی وغیرہ کی طرح اشباع حرکت کے ساتھ مستعمل ہیں۔ مثلاً

لگنا=دکنی لاگنا، اردو چکھنا=دکنی چاکھنا وغیرہ۔

(۱۱) اردو کا حالیہ تمام مادے پر " آ " لگانے سے اور دکنی کا حالیہ تمام پنجابی کی طرح مادے پر "یا" بڑھانے سے بنتا ہے جیسے اردو کہا، دکنی کہیا، اردو دیکھا، دکنی دیکھیا، اردو پکڑا، دکنی پکڑیا وغیرہ۔ اس کے علاوہ پنجابی حالیوں کے دوسرے روپ کیتا (=اردو کیا)، لیتا (=اردو لیا) بھی دکنی میں عام ہیں۔ دکنی میں بعض ایسے روپ بھی ملتے ہیں جو معلول الاواخر مادوں پر لاحقہ حالیہ اضافہ کرنے سے قبل ایک کسرہ (زیر) بڑھا کر بنائے گئے ہیں جیسے آئیا، کھائیا (اردو آیا، کھایا) وغیرہ۔ ایسے روپ گروگرنتھ صاحب کی گورمکھی تحریر میں عام ہیں لیکن اردو میں سرے سے ناپید ہیں۔

مثال میں غواصی کے طوطی نامے کا ایک شعر درج کیا جاتا ہے:

وہ چوراں سو تم ہیں خدا ناگہاں
لے کر آئیا کھینچ تمنا یہاں

(۱۲) اردو علامت معطوفہ "کے" یا "کر" کی جگہ دکنی میں "کو" ملتی ہے جیسے اردو سن کے، دکنی سن کو، اردو کرکے، دکنی کر کو، اردو ہوکر، دکنی ہوکو، اردو دے کر، دکنی دے کو، اردو لے کر، دکنی لے کو اردو سمجھا کے (کر)، دکنی سمجھا کو وغیرہ۔

(۱۳) اردو معاون فعل حال "ہے" کی جگہ دکنی میں "اچھے" (مرہٹی) اور "اچھے" (گجراتی) کے روپ ملتے ہیں اور اردو معاون فعل ماضی "تھا" کے ساتھ ساتھ "اتھا" کا روپ بھی بکثرت مستعمل ہے جب کہ "اہے" اور "اتھا" اردو میں کسی عہد میں نظر نہیں آتے۔

(۱۴) اردو میں صرف ایک لاحقہ مستقبل "گا" ملتا ہے لیکن دکنی میں پنجابی علامت مستقبل "سے" بھی مستعمل ہے جیسے اردو ہوگا، دکنی ہوسے؛ اردو کرے گا، دکنی کرسے وغیرہ۔

(۱۵) اردو میں صرف ایک علامت مصدر "نا" مادے پر اضافہ کی جاتی ہے۔ لیکن دکنی میں پنجابی کی طرح دو مصدر لاحقے "ان" اور "نا" مستعمل ہیں جیسے اردو کرنا، دکنی کرن، کرنا، اردو بھرنا، دکنی بھرن، بھرنا، دکنی کے یہ دونوں لاحقے مرہٹی میں بھی عام ہیں۔

(۱۶) دکنی میں شورسینی زمرے کی زبانوں کے ایسے بہت سے مصادر مستعمل ہیں جن سے اردو زبان قطعی نا آشنا ہے۔ مثلاً سٹنا (ڈالنا، پھینکنا، پنجابی)، کڑنا (نکلنا، پنجابی)، بینا (بیٹھنا= گجراتی بیسوں)، دسنا (نظر آنا، گجراتی دسوں چنانچہ شورسینی پراکرت دی سدی بمعنی وہ نظر آتا ہے)، گھالنا (ڈالنا، برباںی، راجستھانی)، لانا (لگانا، پنجابی وغیرہ)، لڑنا (کاٹنا، پنجابی)، لوڑنا (طلب کرنا، پنجابی)، نسنا (بھاگنا، پنجابی، ملتانی وغیرہ)۔

(۱۷) برج بھاشا، اودھی، پنجابی، گجراتی اور مرہٹی کی طرح دکنی میں بھی معلول الاواخر مادوں پر حالیہ ناتمام یا مصدر کا لاحقہ لگانے سے قبل ُ (پیش) کا اضافہ بھی کر دیا جاتا ہے جیسے ہوونا، دھووتا، پیونا، کیاونا وغیرہ لیکن اردو معلول الاواخر مادوں پر پیش یا زیر لگانے کا کوئی رجحان کسی عہد

میں کہیں نظر نہیں آتا ۔

(۱۸) دکنی میں بعض بعض نہایت قدیم روپ بھی پائے جاتے ہیں جو اردو والوں کے لیے بالکل اجنبی ، نامانوس اور ناقابل فہم ہیں ۔ مثلاً بھاڑ (ٹکڑا ، حصہ) ، بھاڑ (پہاڑ) ، دھک (دہک ، آنچ) ، دھکنا (دہکنا ، آگ کا روشن ہونا) ، اندھا را (اندھیرا) ، بھو (بہت) ، دھانا (دھیانا ، یاد کرنا ، نام لینا) ، دھات (طریقہ ، طرح) ، بھار (باہر) ، دھن (معشوقہ) ، کدھن (سمت ، طرف) وغیرہ ۔ بعض ایسے الفاظ ہیں جو دوسری زبانوں میں اب بھی ملتے ہیں ۔ مثلاً واویلا (پنجابی ویلا بمعنی فارغ) ، ویس (غالباً گجراتی بمعنی ون) ، ویہر (برج بھاشا بیہر بمعنی وقت) ، مون (مرہٹی بمعنی من) ، دوجا (برج بھاشا اور پنجابی بمعنی دوسرا) ، ایگیارہ (بنگلی بمعنی گیارہ) ، تروار (برج بھاشا بمعنی تلوار) ، تیں (پربانی تئیں=راجستھانی تائیں) ، ماپنا (پنجابی بمعنی ناپنا) ، منجھار (درمیان) وغیرہ ۔ نزیک اور زیاستی کو میں نے یو ۔ پی کے عوام سے نجیک اور جیاستی سنا ہے اور بھگتوں کے کلام میں بھی یہ روپ دیکھے ہیں ، دیک (دیکھ) ، اوک (بہت) ، پرت (غالباً پریت) ، باج (بغیر) ، پکڑ (دھیان ، یاد) ، ککر ، انگنا ، یک وغیرہ بہت سے ایسے اجنبی لفظ ہیں جن سے کان آشنا نہیں ہیں اور نہ یہ اردو زبان میں لکھے بولے جاتے ہیں ۔

(۱۹) اردو اور دکنی کی نحوی ترتیب میں بھی اختلاف ملتا ہے ۔ مثلاً :

دکنی (معراج العاشقین)	اردو
اللہ محمد باتاں کرنے عشق کوں بلائے	اللہ محمد نے باتیں کرنے (کے لیے) عشق کو بلایا
حضرت دودھ پئے ہور عرض کیے	حضرت نے دودھ پیا اور عرض کیا

مندرجہ بالا اختلافات میں نے صرف "اردوئے قدیم" میں دیے ہوئے نمونوں سے اخذ کیے ہیں ۔ اگر اس ادب کا بغور مطالعہ کیا جائے تو مجھے یقین ہے کہ ابھی اور بھی بہت سے اختلافات سامنے آ جائیں گے ۔ بہرحال اس لسانی تجزیے کے بعد یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ اردو اور دکنی دو مختلف زبانیں ہیں ۔ خود شعرائے دکن اپنی زبان کو دکنی زبان کہہ رہے ہیں ملا وجہی "سب رس" کے دیباچے میں اپنی کتاب کی زبان کو زبان ہندوستان (مراد ہند شمالی یعنی دہلی کی زبان یا ہریانی) کا نام دیتے ہیں لیکن ہمارے محقق ہیں کہ اردو کو دکن کی بیٹی ثابت کر رہے ہیں ۔ جو لوگ زبانوں کے مزاج اور ان کی نشو و نما کو اچھی طرح سمجھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ کسی زبان کے روپ بدلنے کے لیے اتنا قلیل زمانہ جتنا سلاطین بیجا پور کو گزرا ہے قطعاً ناکافی ہے ۔ برصغیر کی موجودہ زبانوں کی عمریں صدیوں کی نہیں ہزاروں سال کی ہیں ۔ یہ ویدک کال میں بھی اسی صوتیات اور صرف و نحو کے اصولوں کے ساتھ بولی جاتی تھیں جو آج ہمارے سامنے موجود ہیں ۔

ایسے ہی لوگوں نے جو زبانوں کی عمروں کو انسانوں کی عمروں سے کچھ تھوڑا سا ہی بڑھا ہوا سمجھتے ہیں اردو کو خواہ مخواہ کمسن اور نوعمر بنا رکھا ہے ۔ ان کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ جس زمانے میں شعرائے دکن اپنے مربی اور سرپرست بادشاہوں سے خلعت و انعام پا رہے تھے اس زمانے میں بھی اردو زبان کا وہی انداز اور وہی کینڈا تھا جو آج پایا جاتا ہے ۔ اردو زبان عمر میں اپنی کسی معاصر زبان سے چھوٹی نہیں ہے اور نہ ذخیرۂ الفاظ و اسالیب ہی میں کسی سے پیچھے ہے ۔ اس کو ناقص اور ادھورا بتانے والے وہ حضرات ہیں جو اس زبان میں پوری دسترس نہیں رکھتے اور یا وہ لوگ ہیں جنھیں کسی دوسری زبان کی چاٹ پڑی ہوئی ہے ۔ اندریں حالات میرے نزدیک دکنی ادب کو اردوئے قدیم کہنا نہ صرف غلط فہمی بلکہ غلطی ہے ۔

(مطبوعہ ، نقوش ، لاہور ، اکتوبر ۱۹۶۲ء)

ہماری قومی زبان

قومیں قومی زبان سے پہچانی جاتی ہیں اور قومیں بھانت بھانت کی ہوتی ہیں - ایک قوم نسل سے بنتی ہے - جیسے آریا، دراوڑ، ترک منگول - ان سب کی زبانیں بھی الگ الگ ہیں - پراتی یونانی ، لاطینی ، اوستائی، ویدک اور سنسکرت زبانیں آریائی اور ہندوستان (پاک اور بھارت) کی زبانیں دراوڑی ہیں - ایک قوم دھندے والوں کی ہوتی ہے - جیسے جلا ہے ، دھوبی ، راج ، نائی ، ان کی زبانیں ، لہجے اصطلاحیں بات چیت کے ڈھنگ سب کچھ دوسروں سے الگ ہوتا ہے - ایک قوم مذہب والوں کی ہوتی ہے - جیسے ہندو ، عیسائی ، یہودی ، مسلمان ، ہندوستانی کرشن بھگتوں کی مذہبی زبان اودھی (پوربی) اور سکھوں کی مذہبی زبان پنجابی ہے - ایک قوم ملک سے بنتی ہے جیسے روسی ، چینی ، فرنگی ، فرانسیسی اور ان کی زبانیں بھی الگ الگ ہیں اسی طرح پاکستانی قوم کی زبان بھی دوسری قوموں سے الگ ہونا چاہیے -

قومی زبان کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ اسے زیادہ سے زیادہ دیس باسی سمجھتے ہوں اور ہمارے ہاں وہ زبان اردو ہے - تاریخ بتاتی ہے کہ دیسی زبانوں میں سے اردو ہی وہ اکیلی زبان تھی جسے اکبر کے راج میں اس کے محل والوں نے اپنا لیا تھا، جسے شاہ جہان نے ہندوستان کے کونے کونے تک پہنچا دیا تھا اور جسے ۱۸۳۲ء میں انگریزوں نے فارسی کی جگہ سرکاری زبان بھی بنا دیا تھا - یہی زبان آج اس پورے برصغیر کی لمبائی چوڑائی میں سب زبانوں سے زیادہ بولی جاتی ہے اور پاکستان کی سب سے بڑی آبادی اسے بولتی سمجھتی ہے - اس لیے ایک یہی زبان ایسی ہے جسے پاکستان کی قومی زبان بننے کا حق پہنچتا ہے -

پاکستانی قومیت مسلم قومیت ہی کا دوسرا نام ہے - اس برصغیر کی مسلم قوم نے ہی اپنے لیے ایک الگ ملک کی مانگ کی تھی جس میں

ہندوستان کی اور کوئی قوم اس کے ساتھ نہیں تھی اور پاکستان بننے سے بہت پہلے ہندوستانی مسلمان اردو زبان کو قومی زبان کا درجہ دے چکے تھے جن میں سے کچھ کی یہ مادری زبان تھی اور کچھ کی اپنائی ہوئی تھی ۔ مسلمان چاہے بنگال کا ہوتا چاہے سرحدی صوبے کا ، کشمیری ہوتا یا مدراسی اپنے دیس میں تو اپنی مادری زبان بولتا تھا پر دوسرے علاقے کے مسلمان سے اردو میں ہی بات چیت کیا کرتا تھا اور مسلمانوں کے تمام قومی کام اردو میں ہی ہوتے تھے ۔ یعنی اردو زبان کی قومی حیثیت نظریہ پاکستان کا ایک حصہ تھی اس لیے آج جو لوگ اردو کو اس کے قومی درجے سے دور رکھنے کے جتن کر رہے ہیں ، وہ نظریہ پاکستان کو بھول گئے ہیں ۔

اردو زبان بہت مظلوم ہے ۔ ہندو اسے مسلمانوں کی زبان سمجھتے تھے ۔ اس لیے انھوں نے اردو ہندی کا جھگڑا کھڑا کر دیا تھا ۔ جو ہندو مسلم جھگڑے ہی کا ایک حصہ تھا ۔ پاکستان بننے پر بھارت میں ہندی کو رانی اور اردو کو باندی بنا دیا گیا جس سے ہندوؤں کا مطلب یہ تھا کہ جب مسلمانوں نے اپنا گھر الگ کر لیا تو اپنی زبان کو بھی وہی سنبھالیں ۔ پر پاکستان نے بھی اردو سے کچھ اچھا برتاؤ نہیں کیا۔ ڈھاکے میں جب قائداعظم نے فرمایا کہ پاکستان کی قومی زبان اردو ہوگی تو وہ پاکستانی مسلمان ہی تھے جنھوں نے ان کی بات کاٹی اور قائداعظم کے بعد جو تھوڑی بہت ہمدردی اس سے دکھائی بھی گئی وہ آج تک زبانی داخلے سے آگے نہیں بڑھی ۔ بھارت میں مسلمانوں پر اب تک اسی لیے ظلم ڈھائے جا رہے ہیں اور ان کے بچے ہندی پڑھنے پر اسی لیے مجبور کر دیے گئے ہیں کہ انھوں نے ایک ایسے پاکستان کی مانگ کی تھی جس میں انھیں اپنے قومی کلچر اور قومی زبان کے بچاؤ کی پوری آس تھی ۔ کیا پاکستانی مسلمانوں کی طرف سے بھارتی مسلمانوں کی قربانیوں کا یہی بدلہ ہو سکتا تھا کہ ہم اردو کو اس کی اصلی جگہ دینے میں ٹال مٹول کرتے رہیں ۔

قومی زبان قومی کلچر کی امین ہوتی ہے ۔ یہ اس کی دوسری بڑی خصوصیت ہے جو اسے دیسی بدیسی زبانوں سے الگ کرتی ہے ۔ سب

جانتے ہیں کہ اس برصغیر کے مسلمانوں کا کلچر دوسری قوموں کے کلچر سے الگ رہا ہے جو مذہبی طور طریقوں کے سوا کھانے پینے، پہنے اوڑھنے اٹھنے بیٹھنے اور طرح طرح کی ریت رسموں میں بڑی آسانی سے پہچانا جا سکتا ہے - ۱۹۴۷ء تک یہی ہند اسلامی کلچر کہلاتا تھا اور آج اسی کو پاکستانی کلچر کہتے ہیں اور جیسا یہ کلچر اردو زبان میں سمویا ہوا ملتا ہے - ویسا دوسری زبان میں نہیں ملتا اور مسلمانوں کا جتنا مذہبی ادب اس میں موجود ہے - اتنا اور کوئی زبان پیش نہیں کر سکتی - اس نظر سے بھی پاکستان کی قومی زبان بننے کا جو حق اردو کو پہنچتا ہے- وہ کسی علاقائی زبان کو بھی نہیں پہنچتا اور انگریزی تو سات سمندر پار کا کلچر اٹھائے پھرتی ہے جو ہمارے کلچر سے قدم قدم پر ٹکراتا ہے - ایسی حالت میں انگریزی کو اردو کی جگہ بٹھائے رکھنے کا مطلب یہ ہے کہ ہم اپنے بزرگوں کی اس کمائی کو ملیا میٹ کرنے پر تلے ہوئے ہیں جو پاکستانی کلچر کے روپ میں ہم تک پہنچی ہے -

زبان نری کھوکھلی آوازوں کا مجموعہ نہیں ہوتی - اس میں پوری قوم کا کلچر سانس لیتا ہے اور کلچر قوم قوم کا الگ الگ ہوتا ہے - جب پاکستانی بچوں کو کچی عمر سے زبردستی انگریزی پڑھائی جاتی ہے تو وہ انجانے میں اس کا کلچر اپنائے اور اپنے کلچر سے دور ہوتے چلے جاتے ہیں - یہاں تک کہ ان کا سوچ بچار ہی اپنے دیس باسیوں کے سوچ بچار سے الگ ہو جاتا ہے اور وہ اپنے ہی دیس میں بدیسی بن جاتے ہیں - یہ اسی زبردستی کا پھل ہے کہ ہمارے یہاں نقالی کا کام بہت ہو رہا ہے - ہم مغرب والوں کی ہر بات اور ہر سوچ جو انگریزی سے ہم تک پہنچتا ہے اس کی بھلائی برائی پرکھے بنا ہی اپنائے چلے جاتے ہیں - بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ ہم اپنے ملک اور اپنی قوم کے حالات سامنے رکھ کر کوئی کام کی بات آپ بھی سوچیں - تحقیق اور کھوج کو پیچھے ڈال کر نقالی اور ریس پر اکڑنا کوئی ہم سے سیکھ لے -

کتنے ہی سال بیت گئے - اردو پاکستان کی قومی زبان مانی جا چکی ہے - پر اس جگہ ابھی تک انگریزی ہی براجمان ہے - اس ڈھیل ڈھال

ہے کچھ لوگوں کو موقع مل رہا ہے کہ وہ اردو میں کیڑے ڈالیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اردو بہت چھوٹی زبان ہے جس میں ہر سوچ ظاہر کرنے کے لیے لفظ نہیں ملتے ۔ یہ لوگ نہیں جانتے کہ اردو بھی بھری پری زبان ہے جو آسانی سے ہر سوچ ظاہر کر سکتی ہے۔ اگر کسی کو کسی سوچ کے لیے لفظ نہیں ملتا تو یہ اردو کی نہیں اس کی اپنی کمی ہے اسے چاہیے کہ وہ اپنی کمی کو اردو کے سرتھوپنے کی جگہ محنت کرکے اردو سیکھے ۔ رہی چھوٹی اور بڑی زبان کی بات تو جو نہیں جانتے وہ جان لیں کہ یونیسکو کی رپورٹ کے مطابق اردو دنیا کی تیسری بڑی زبان ہے۔

کبھی یہ لوگ کہتے ہیں کہ اردو میں علمی اصطلاحیں نہیں ملتیں اور انگریزی میں ان کا خزانہ رکھا ہوا ہے ۔ انہیں جان لینا چاہیے کہ اردو میں بھی اصطلاحوں کا بہت بڑا ذخیرہ موجود ہے جس کو جمع کرنے کا کام ۱۸۰۰ء سے ترجموں کے ساتھ ساتھ شروع ہوا تھا ۔ اس کے بعد دہلی کالج سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ اور انجمن ترقی اردو نے بہت سی اصطلاحیں تیار کیں اور عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد نے تو اتنی اصطلاحیں جمع کیں کہ وہاں ایم اے تک سبھی مضمون اردو میں پڑھائے جانے لگے ۔ پاکستان بننے پر آفیشل لینگویج کمیٹی لاہور نے ترامی ہزار اصطلاحات بنا ڈالیں ۔ پنجاب یونیورسٹی لاہور، زرعی یونیورسٹی فیصل آباد، کراچی یونیورسٹی اور اردو اکیڈمی لاہور کی تیار کی ہوئی بہت سی اصطلاحیں چھپ چکی ہیں ۔ اردو اکیڈمی لاہور نے ایک بہت بڑی کتاب "قاموس الاصطلاحات" بھی چھاپی ہے ۔ جس میں سب علوم کی اصطلاحیں اکٹھی کر دی گئی ہیں ۔

انگریز قوم نے یونانی، لاطینی اور دوسری زبانوں سے اصطلاحیں لے کر اپنی زبان کی کمی پوری کی ہے پر یہ زبانیں نہیں اپنائیں اسی طرح ہم بھی ضرورت پڑنے پر انگریزی سے اصطلاحیں لے سکتے ہیں ۔ اس کے لیے پوری کی پوری زبان لے لینے کی کوئی تک نہیں ہے ۔ ایک گرہ ململ کی کمی پر بیس گز کا پورا تھان مول لے لینا پاگل پن ہے ۔ پھر علمی اصطلاحوں کی ضرورت ان مٹھی بھر لوگوں کو پڑتی ہے جو اعلیٰ تعلیم چاہتے ہیں ۔ یا جو تحقیق کے کام میں لگے ہوتے ہیں ۔ ملک کی پوری آبادی کو اصطلاحوں

کی ضرورت نہیں ہے - اس لیے گنتی کے لوگوں کی ضرورت کو آڑ بنا کر پوری قوم کے منہ میں انگریزی ٹھونس دینے کی منطق سمجھ میں نہیں آتی -

کبھی یہ لوگ کہتے ہیں کہ انگریزی بین الاقوامی زبان ہے - اس کو قومی درجہ سے ہٹا کر ہم مغرب کی بڑھی ہوئی قوموں سے الگ ہو جائیں گے - یہ ان لوگوں کا ایک اور وہم ہے کیونکہ بین الاقوامی زبان کی گدی تو ابھی تک سونی پڑی ہے جس پر بیٹھنے کے لیے انگریزی روسی ، چینی فرانسیسی جیسی زبانوں میں لگا تار رسہ کشی ہو رہی ہے اور یہ بات بھی ماننے والی نہیں ہے کہ انگریزی کو قومی زبان کے درجے سے ہٹا کر ہم مغرب کی قوموں سے کٹ جائیں گے اور آگے نہیں بڑھ سکیں گے - کیونکہ جاپانی ، روسی ، چینی ، جرمن اور فرانسیسی دنیا کی کسی بڑھی ہوئی قوم سے پیچھے نہیں ہیں - ان قوموں نے اپنی اپنی قومی زبانوں میں ہی سب علم پڑھ کر ترقی کی ہے اور آج بھی ان کے یہاں قومی زبانوں میں تعلیم دی جا رہی ہے - ان میں سے ایک چینی قوم کی ہی مثال لے لیجیے جس کی عمر پاکستان قوم کی عمر سے زیادہ نہیں ہے - ہم انگریزی زبان کے سہارے بائیس سال میں ایک غبارہ بھی نہیں بنا سکے اور چینیوں نے اپنی چینی زبان سے ایٹم بم ، ہائیڈروجن بم یہاں تک کہ سیارہ بھی بنا ڈالا -

کہنے کا نچوڑ یہ ہے کہ آج اردو کے خلاف جتنی باتیں کہی جا رہی ہیں ان میں سے ایک بھی ایسی نہیں ہے جسے عقل مانتی ہو یا جسے تجربے سے ذرا سا بھی لگاؤ ہو - یہ اردو کو اس کی جگہ سے الگ اور انگریزی کو ہمارے سروں پر سوار رکھنے کے رنگین بہانے ہیں - ایسا لگتا ہے کہ لوگ جان بوجھ کر انجان اور سوچ سمجھ کر بھولے بنتے ہیں جس سے سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے یعنی اردو کی جگہ انگریزی رہ جائے اور پوری قوم بھی مان جائے کہ ہاں اسی میں ہمارا بھلا ہے - ایک کہاوت ہے کہ سوتے کو تو جگایا جا سکتا ہے ، پر جاگتے کو کون جگائے - یہ لوگ اپنے جی میں اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ اردو کے آگے انگریزی کا پلڑا بہت ہلکا ہے پر ان کا فائدہ انگریزی

میں ہے اس لیے انگریزی کے گن گاتے اور اردو میں کھوٹ نکالتے ہیں اور یوں اپنے فائدے کے لیے قوم کو دھوکا دے رہے ہیں -

انگریزی کے حامی انگریز کے ہتھکنڈے سے یہی کام لے رہے ہیں اور پاکستانیوں ہی میں پھوٹ ڈلوا رہے ہیں - یہی لوگ جگہ جگہ دوسروں کی زبان سے کہلوا رہے ہیں کہ اردو کو قومی درجہ دے دینے سے علاقائی زبانوں کی ترقی میں رکاوٹ ہوگی جب کہ یہ بات بھی دوسری باتوں کی طرح کھوٹی اور بودی ہے ، کیونکہ علاقائی اور قومی دونوں زبانوں کے کام الگ الگ ہیں - علاقائی زبانیں اپنے اپنے دیس میں بولی سمجھی جاتی ہیں - پر جب ایک دیس کا دوسرے دیس سے کام پڑتا ہے تو دونوں کی علاقائی زبانیں بے بس ہو جاتی ہیں کیونکہ ایک دیس کی زبان دوسرے دیس میں نہیں سمجھی جا سکتی - اس گھڑی کسی ایسی تیسری زبان کی ضرورت پڑتی ہے جو دونوں میں ناتا جوڑ سکے اور دونوں دیسوں کے ملے جلے کام کر سکے اور یہ کام قومی زبان کا ہوتا ہے -

خالی یہی نہیں کہ قومی اور علاقائی زبانوں کے میں جول سے قومی کاروبار آسانی سے چلتا ہے خود ان دونوں کو بھی ایک دوسرے سے ہوکنہ ملتی ہے- دونوں ایک دوسرے سے الفاظ اور بات چیت کے ڈھنگ لے لے کر اپنا اپنا ذخیرہ بڑھاتی ہیں قومی زبان علاقائی زبان کے چھینٹوں سے مقامی رنگ میں رنگ جاتی ہے اور علاقائی زبان میں قومی زبان کے ذریعے قومی کلچر حل ہو جاتا ہے - پر ہمارے یہاں علاقائی زبانوں کا جھنڈا اٹھانے والوں کی بات چیت سنیے تو یوں لگتا ہے جیسے قومی زبانیں اور علاقائی زبانیں دو تلواریں ہیں جو ایک میان میں نہیں رہ سکتیں - آخر دونوں قسم کی زبانیں دنیا کے دوسرے ملکوں میں بھی تو پائی جاتی ہیں - چین، روس ، برطانیہ ، امریکہ ، فرانس کونسا ملک ہے جہاں قومی اور علاقائی زبانیں الگ الگ نہیں ہیں اور جہاں دونوں ملکی ترقی کے لیے مل جل کر کام نہیں کر رہی ہیں - پھر پاکستان میں ہی وہ کونسی انوکھی بات ہے کہ اردو کو سرکاری زبان بنا دینے سے علاقائی زبانوں کو فائدے کی جگہ الٹا نقصان ہو جائے گا -

کچھ لوگوں کی یہ مانگ کہ بچوں کی ابتدائی تعلیم ان کی مادری یا علاقائی زبان میں ہونا چاہیے ، بالکل ٹھیک ہے اور اس سے کوئی سمجھ دار آدمی انکار نہیں کر سکتا - پر یہ مانگ وقت سے بہت پہلے کر دی گئی ہے - کیونکہ یہ اس وقت پوری ہو سکتی ہے جب پاکستان میں زبانوں کی درجہ بندی ٹھیک ہو جائے - اس وقت تو قومی اور سرکاری زبان کی جگہ انگریزی ڈٹی ہوئی ہے اور اردو خود ایک علاقائی زبان بن کر رہ گئی ہے انگریزی ہٹے تو اردو اپنی جگہ پہنچے اور علاقائی زبانیں بھی اپنی اپنی کرسی پر آ کر بیٹھیں - اس لیے ان لوگوں کو اس وقت اردو کے خلاف شور مچانے کی جگہ انگریزی سے قومی اور سرکاری زبان کی گدی خالی کرانا چاہیے -

(مطبوعہ : سیپ کراچی ، شمارہ ۱۹)

اردو اور علاقائی زبانوں کا تعاون

زبان جب تک اپنے علاقے میں بولی جاتی ہے علاقائی زبان کہلاتی ہے لیکن جیسے ہی کسی برادری سے وابستہ ہو کر باہر نکلتی ہے تو قومی زبان بن جاتی ہے اور انسانی برادریاں سیاسی ، تجارتی ، مذہبی کئی قسم کی ہوتی ہیں - آریاؤں کی آریائی ، ایرانیوں کی ایرانی اور انگریزوں کی انگریزی نے ہندوستان کا سفر سیاسی سطح پر کیا اور سیاسی برادریوں کی زبانیں بن کر ملک کے گوشے گوشے میں پہنچیں - ہندوستان کی مارواڑی زبان نے بیوپاریوں کے وسیلے سے دور دراز علاقوں میں ڈیرے ڈالے - اودھی، برج بھاشا ، پنجابی اور اردو نے رام بھگتوں، کرشن بھگتوں ، سکھوں اور مسلمانوں کی مذہبی برادریوں کی زبان بن کر برصغیر میں جا بجا اپنی چھاؤنیاں چھائیں - پاکستان میں مسلمانوں کی مذہبی برادری ہی سیاسی برادری بھی بن گئی ہے اس لیے ان کی مذہبی زبان اردو کو سیاسی منصب بھی مل گیا ہے اور اب وہ اپنی دہری حیثیت سے ملک کے گوشے گوشے میں پہنچ رہی ہے -

زبان جب دوسرے لسانی علاقے میں پہنچتی ہے تو علاقائی زبان کے اثرات بھی قبول کرتی ہے جس سے اس کا ایک علاقائی محاورہ بن جاتا ہے انگریزی زبان جب برطانیہ سے چل کر امریکہ پہنچی تو وہاں کی علاقائی زبانوں کے اثرات قبول کرکے امریکی انگریزی کہلائی ، برطانوی دور حکومت میں اس کا جو محاورہ ہندوستان میں رائج ہوا - اس کو ہندوستانی انگلش کا نام دیا گیا جس میں گرامر کے اصول ، اسلوب اور روایات و تلمیحات کے علاوہ تقریباً ایک ہزار الفاظ یہاں کی علاقائی زبانوں سے مستعار لیے گئے ہیں - ہندوستان میں کچھ لوگوں کے اثر سے جو کسی وقت ایران

سے آئے تھے فارسی کا جو ہیولیٰ تیار ہوا اس نے سبک ہندی کا نام پایا۔ اس سے بہت پہلے آریوں کی زبان پر ہندوستان کی علاقائی زبانوں کے جو اثرات پڑے تھے ان کو تمام علمائے زبان نے تسلیم کیا ہے۔ یہ اثرات ویدوں برہمنوں اور اپ نشدھوں میں کم ہیں لیکن سنسکرت رزمیوں مہا بھارت اور رامائن تک پہنچتے پہنچتے ان کی تعداد بہت بڑھ گئی ہے اسی لیے آریائی زبان کے اس محاورے کو ہند آریائی کہتے ہیں اور بجا کہتے ہیں۔

اردو نے بھی اس برصغیر کے طول و عرض میں سفر کیا ہے۔ آگرے میں برج بھاشا سے متاثر ہو کر اس کا جو علاقائی محاورہ رائج ہوا وہ اکبر آبادی اردو کہلایا۔ ۱۶۴۷ء سے شاہ جہان کا پایہ تخت منتقل ہونے پر دہلی میں رائج ہوئی تو وہاں کی علاقائی زبان ہریانی کا اثر قبول کرکے دہلوی اردو کہلائی۔ دہلی کے اُجڑنے پر لکھنؤ پہنچی تو اودھی کی آمیزش سے لکھنوی اردو بن گئی۔ حیدر آباد (دکن) میں دکنی کے زیرِ اثر اس کا حیدر آبادی محاورہ چالو ہوا۔ لاہور میں پنجابی سے مل کر لاہوری اردو کہلائی۔ غرض علاقائی زبانوں سے مل مل کر اردو کے علاقائی محاورے بنتے چلے گئے جنھیں کچھ لوگ غلط فہمی کی بنا پر اردو ادب کے اکبر آبادی، دہلوی اور لکھنوی دبستان کہنے لگے۔ پاکستان میں بھی علاقائی زبانوں کے میل ملاپ سے اردو کے مختلف محاورے تیار ہو رہے ہیں۔ لاہوری اردو کا محاورہ پچھلی صدی میں ہی بن چکا تھا اب کراچوی اردو، سرگودھوی اردو، اسلام آبادی اردو، پشاوری اردو، ملتانی اردو، حیدر آبادی یعنی سندھی اردو اور ڈھکی اردو جیسے اس کے الگ الگ ہیولے بن رہے ہیں جن کے پختہ اور واضح روپ کچھ وقت گزرنے کے بعد سامنے آ جائیں گے۔

تصویر کا دوسرا رخ یہ ہے کہ علاقائی زبانیں بھی قومی زبان کے اثرات جذب کرتی ہیں۔ پاک و بھارت کی علاقائی زبانوں پر انگریزی زبان نے جو اثرات ڈالے ہیں ان میں نہ صرف الفاظ بلکہ صرف و نحوی اصول اسلوب بیان روزمرہ و محاورات تشبیہات و استعارات تلمیحات و روایات کتنی ہی باتیں شامل ہیں۔ انگریزی سے پہلے بالکل ایسے ہی اثرات فارسی زبان ڈال چکی تھی جو آج بھی اس برصغیر کی

تمام زبانوں میں صاف نظر آ رہے ہیں اور اس سے بھی پیشتر آریوں کی آمد پر ان کی آبائی زبان نے بھی ہندوستان کی علاقائی زبانوں کو اسی طرح متأثر کیا تھا - اگرچہ آج اتنے قدیم اثرات کی نشان دہی ذرا مشکل ہوگئی ہے اور وہ عام لوگوں کو انھیں زبانوں کا جزو معلوم ہو رہے ہیں - لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ یہ نقوش بھی تعداد میں اتنے ہی زیادہ ہمہ گیر اور بنیادی تھے - جتنے فارسی اور اس کے بعد انگریزی نے ان زبانوں پر مرتسم کیے ہیں - اردو زبان نے بھی اپنے سفر میں علاقائی زبانوں کو جو کچھ دیا ہے اس کا صحیح اندازہ برج بھاشا ہریانی اودھی ، دکنی اور لاہوری پنجابی کی تحریر و تقریر کا تجزیہ کرکے لگایا جا سکتا ہے -

زبانوں کے باہمی لین دین سے ان کے اختلافات گھٹتے ہیں اور مشابہت بڑھ جاتی ہے - اس کا ایک طرف تو یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ زبانوں کا تشخص دشوار اور ان کی شناخت میں غلط فہمی پیدا ہو جاتی ہے - چنانچہ اس حادثے سے دھوکا کھا کر علمائے مغرب نے زبان سے زبان کی پیدائش کا اصول بنا ڈالا اور آریوں کی ویدک و سنسکرت کے ساتھ ساتھ ہندوستان کی علاقائی زبانوں کو بھی ہند آریائی کہنا شروع کر دیا - علمائے مشرق بھی اس غلط فہمی کی بنا پر عرصہ تک اردو زبان کو فارسی کی بیٹی سمجھتے رہے - اسی مغالطے میں مولانا محمد حسین آزاد نے اسے برج بھاشا کی - شیرانی نے پنجابی کی اور مولانا نصیر الدین ہاشمی نے دکنی کی بیٹی قرار دے دیا اور اگر یہی انداز نظر قائم رہا تو پاکستان میں اردو اور علاقائی زبانوں کے میل جول سے جب درمیانی فاصلہ کم ہو جائے گا تو لوگ اردو کا ماخذ پشتو ، پنھواری ، لہندی ، کشمیری، بلوچی ، سندھی، براہوی ، مکرانی ، گجراتی اور بنگالی میں ڈھونڈنے کی پھر غلطی کریں گے -

دوسری طرف زبانوں کے قریب آ جانے سے ان کے بولنے والے بھی قریب آ جاتے ہیں اور آپس میں یگانگت اور اخوت محسوس کرنے لگتے ہیں یوں بھی اردو اور پاکستان کی علاقائی زبانیں اصلاً دراوڑی اور اپنی

ابتدائی سطح پر ایک ہیں اور لغات و قواعد کا بہت بڑا مشترک ذخیرہ رکھتی ہیں - ان کی جڑیں اسی سرزمین کی گہرائیوں میں اتری ہوئی ہیں جو کسی نہ کسی سطح پر پہنچ کر باہم پیوست ہو جاتی ہیں- پھر جیسے جیسے اردو میں علاقائی زبانوں کے اثرات جذب ہوں گے اور علاقائی زبانیں اردو کے اثرات قبول کریں گی - یہ ایک دوسرے سے اور بھی قریب ہو جائیں گی اور ان کے بولنے والوں کے اتحاد میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا -

ہر زبان اپنا ایک مخصوص کلچر رکھتی ہے اس لیے ملک میں جتنی زبانیں رائج ہوتی ہیں اتنے ہی ان کے کلچر ہوتے ہیں - لیکن قومی کلچر ان تمام کلچروں کا مجموعہ نہیں بلکہ ان کا ست یا نچوڑ ہوتا ہے - یہ ایک ایسا آئینہ ہوتا ہے - جس میں تمام علاقائی کلچروں کا عکس دیکھا جا سکتا ہے اور اس قومی کلچر کی واحد نمائندہ قومی زبان ہوتی ہے - پاکستان میں یہ حق اردو زبان کو حاصل ہے اور وہی پاکستانی کلچر کی نمائندگی کرنے والی ہے - چنانچہ اردو اور علاقائی زبانوں میں مغائرت کم ہونے، ان کے ادب کا درمیانی فاصلہ گھٹ جانے اور لسانی بنیادوں پر قومی شعور کے پرورش پانے کے ساتھ ساتھ پاکستانی کلچر کے خد و خال یوماً فیوماً ابھرتے چلے آئیں گے اور اردو زبان میں وہ خصوصیات جھلکنے لگیں گی جنہیں پاکستانی قومیت کا طرۂ امتیاز کہا جا سکے گا - لیکن قومی شعور کی نشو و نما اور قومی کلچر کی تشکیل و تکمیل میں وقت لگتا ہے -

اس سلسلے میں بعض لوگوں کی خواہش ہے کہ پاکستان میں اردو زبان پر علاقائی زبانوں کا پرچھانواں تک نہ پڑے - بلکہ یہاں اس کا وہی محاورہ رائج ہو جائے جس نے کبھی اکبر آباد ، دہلی یا لکھنؤ میں تکمیل پائی تھی - یہ لوگ اردو کے انہیں علاقائی روپوں کو متحجر کر کے محفوظ رکھنا چاہتے ہیں اور زبان کے فطری رجحان پر روک لگانے کے غیر فطری عمل کو اردو کی خیر خواہی تصور کرتے ہیں - دوسری طرف وہ لوگ ہیں جو یہ چاہتے ہیں کہ علاقائی زبانوں کی زیادہ سے زیادہ خصوصیات اردو زبان میں داخل کر دی جائیں اور اسے ان سب کا حاصل

جمع بنا دیا جائے ۔ یہ لوگ اردو زبان کو ایسا روپ دینے پر مصر ہیں جو عوام کی ضروریات پوری کرنے کے بجائے ان کی خواہشات پوری کرنے کے لیے تشکیل پائے اور دو قالبوں میں ایک روح کی بجائے ایک قالب میں دو روحیں اتار دینے ہی کو زبانوں کا میل جول سمجھتے ہیں ۔

یہ دونوں انتہا پسند گروہ اپنی خواہش پرستی میں زبانوں کی اس فطرت کو بالکل نظر انداز کر رہے ہیں کہ نہ کوئی خالص اور بے میل زبان قومی زبان کے فرائض انجام دے سکتی ہے اور نہ علاقائی زبان کی غیر متوازن ملاوٹ سے اس درجے پر قائم رہ سکتی ہے اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ قومی اور علاقائی زبانوں میں ہمیشہ سے لین دین ہوتا آیا ہے اور ہمیشہ جاری رہے گا اور اس حقیقت سے بھی مفر نہیں ہے کہ اس کی ایک خاص رفتار اور ایک حد ہوتی ہے یہ نہ چند افراد کے روکے رکتا ہے نہ بڑھانے سے بڑھ سکتا ہے کیونکہ زبان کا چلن مٹھی بھر خواص کی خواہش کا تابع نہیں عوام کی ضروریات کا پابند ہوتا ہے اور عوام اپنا کام چلانے کے لیے زبان استعمال کرتے ہیں وہ اس میں دوسری زبان کا پٹ بھی ملاتے ہیں لیکن صرف اتنا ہی پٹ ملاتے ہیں جتنا ان کی ضرورت کا تقاضا ہوتا ہے چنانچہ اردو زبان کو علاقائی زبانوں سے بچانے یا اس میں ضرورت سے زیادہ علاقائی زبانوں کی خصوصیات بھرنے کی کوششوں کا اول تو کامیاب ہونا ہی مشکل ہے اور اگر یہ کوششیں کسی وجہ سے کامیاب ہوگئیں تو اردو زبان قومی سطح سے گر کر علاقائی سطح پر آجائے گی اور پھر ہمیں قومی ضرورتوں کے لیے کوئی اور زبان تلاش کرنا پڑے گی ۔

(مطبوعہ : اردو زبان ، سرگودھا نومبر ۱۹۶۷ء)

ہماری قومی اور علاقائی زبانیں

طوفان فرو ہو جانے کے بعد جب حضرت نوح علیہ السلام کشتی سے نکلے تو دوسرے جانداروں کے علاوہ ان کے ہمراہ تین بیٹے بھی تھے۔ سام، حام اور یافث ۔ اس وقت یہ لوگ ایک ہی زبان بولتے تھے۔ توریت میں لکھا ہے کہ "تمام روئے زمین پر ایک ہی زبان اور ایک ہی بولی تھی اور ایسا ہوا کہ مشرق کی طرف سفر کرتے کرتے ان کو ملک سنعار میں ایک میدان ملا اور وہ وہاں بس گئے اور انہوں نے آپس میں کہا ۔ آؤ ہم اینٹیں بنائیں اور ان کو آگ میں خوب پکائیں سو انہوں نے پتھر کی جگہ اینٹ سے اور چونے کی جگہ گارے سے کام لیا ۔ پھر وہ کہنے لگے کہ آؤ ہم اپنے واسطے ایک شہر اور ایک برج جس کی چوٹی آسمان تک پہنچے، بنائیں اور یہاں اپنا نام کریں ۔ ایسا نہ ہو کہ ہم تمام روئے زمین پر پراگندہ ہو جائیں اور خداوند اس شہر اور اس برج کو جسے بنی آدم بنانے لگے دیکھنے کو اترا اور خداوند نے کہا ۔ دیکھو یہ لوگ سب ایک ہیں اور ان سبھوں کی ایک ہی زبان ہے ۔ وہ جو یہ کرنے لگے ہیں تو اب کچھ بھی جس کا وہ ارادہ کریں ان سے باقی نہ چھوٹے گا ۔ سو آؤ ہم وہاں جا کر ان کی زبان میں اختلاف ڈالیں تاکہ وہ ایک دوسرے کی بات سمجھ نہ سکیں ۔ پس خداوند نے ان کو وہاں سے تمام روئے زمین پر پراگندہ کیا ۔ سو وہ اس شہر کے بنانے سے باز آئے اس لیے اس کا نام بابل ہوا ۔ کیونکہ خداوند نے وہاں ساری زمین کی زبان میں اختلاف ڈالا اور وہاں سے خداوند نے ان کو تمام روئے زمین پر پراگندہ کیا ۔ (کتاب پیدائش ۱۱-۱ تا ۹)

یہ اقتباس ذرا طویل ہے لیکن اس سے کئی مفید مطلب باتیں دریافت ہوتی ہیں ۔

پہلی بات یہ ہے کہ زبان انسانوں میں اتحاد کا نہایت کامیاب ذریعہ ہے ۔ اس سے انکار ناممکن ہے کہ اتحاد میں برکت ہوتی ہے ۔ متحد ہو کر انسان چاہے جتنے مشکل کام کا ارادہ کریں اسے پورا کر سکتے ہیں ۔ کیونکہ ایک زبان بولنے والوں میں جتنی یگانگت ، محبت اور قربت کا احساس ہوتا ہے وہ دو الگ الگ زبانیں بولنے والوں کے درمیان نہیں ملتا ۔ یہ ایک قدرتی سی بات ہے اور اس میں کسی کے برا ماننے کی کوئی وجہ نہیں ہے ۔ جب تک انسان ایک دوسرے کی بات نہ سمجھ لیں ۔ وہ ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں بھی شریک نہیں ہو سکتے اور محبت دکھ سکھ میں شرکت سے ہی پیدا ہوتی اور بڑھتی ہے ۔

قومی زبان کانفرنس کے بار بار انعقاد کی وجہ بھی یہی ہے کہ لوگوں کو قومی سطح پر ایک زبان اپنانے کے فوائد سے نہ صرف آگاہ کیا جائے بلکہ اس باہمی محبت اور یگانگت کا عملی تجربہ بھی کرا دیا جائے جو اس کے نتیجہ میں پیدا ہوتی ہے ۔ توریت بتاتی ہے کہ جب تک اولاد نوح ؑ ایک زبان بولتی رہی اس میں باہمی اتحاد باقی رہا ۔ اسی اتحاد کی بدولت اس نے شہر بابل آباد کرنے کا ارادہ کیا اور اس میں ایک ایسا مینار اٹھانا چاہا جس کی بلندی اس کے اتحاد کی قوت سے مناسبت رکھتی ہے ۔ اسی طرح پاکستان کی ترقی کے امکانات بھی ہمارے قومی اتحاد اور یک جہتی میں مضمر ہیں اور قومی اتحاد کا فروغ قومی زبان کے فروغ سے وابستہ ہے ۔

دوسری بات جو توریت کے اس بیان سے دریافت ہوئی یہ ہے کہ جہاں انسان بہت سی مختلف زبانیں بولتے ہیں وہاں ان میں ایک ایسی زبان بھی ہوئی ہے جس کی مدد سے وہ ایک دوسرے کی زبان سمجھ لیتے ہیں اور مختلف زبانیں بولتے ہوئے بھی آپس میں گفتگو کرنے پر قدرت رکھتے ہیں ۔ گویا یہ زبان مختلف زبانوں میں رابطے کا کام دیتی ہے اور رابطے کی زبان کہلاتی ہے ۔ توریت کے اس بیان سے کہ خداوند نے وہاں ساری زمین کی زبان میں اختلاف ڈالا جہاں یہ معلوم ہوتا ہے کہ لوگ اپنے اپنے تشخص اور امتیاز کی خاطر مختلف زبانیں بولنے لگے جو

ان کے یہاں بہت پہلے وضع ہو چکی تھیں - وہاں یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ انھوں نے رابطے کی وہ زبان ہی ترک کر دی جس کی بدولت وہ اس وقت تک متحد اور ایک دوسرے کے رنج و راحت میں شریک چلے آ رہے تھے -

اس بیان سے تیسری بات یہ معلوم ہوئی کہ قوم مختلف گروہوں اور قبیلوں کے ملنے سے بنتی ہے اور مختلف گروہوں اور قبیلوں کی زبانیں بھی مختلف ہوتی ہیں - البتہ ساری قوم کی ایک زبان ہوتی ہے - جسے قومی زبان کہتے ہیں - ہر قبیلہ اور ہر گروہ اپنے اپنے دائرے میں اپنی اپنی زبان بولتا ہے جسے قبائلی یا گروہی یا علاقائی زبان کہتے ہیں اور پھر یہ سب کے سب ایک ایسی زبان بھی استعمال کرتے ہیں جسے پوری قوم یعنی تمام قبیلوں اور گروہوں کی مجموعی تعداد نے مرکزی حیثیت دے رکھی ہے - تعمیر بابل کے وقت اولاد نوحؑ میں قومی زبان کو اہمیت حاصل تھی - لیکن اس منصوبہ کی تکمیل سے پہلے ہی وہ لوگ اسے چھوڑ کر ایک سے زیادہ قبائلی گروہی یا علاقائی زبانوں پر زور دے بیٹھے جس سے ان میں اختلافات ابھر آئے اور وہ اتحاد اور مرکزیت سے محروم ہوکر منزل مقصود کی راہ سے بھٹک گئے -

غرض توریت کے اس بیان سے مختلف علاقائی زبانوں کے پہلو بہ پہلو ایک ایسی زبان کا وجود بھی ثابت ہے جو دو مختلف زبانوں کے درمیان رابطے کا کام دیتی ہے - جس کی بدولت دو مختلف زبانیں بولنے والے ایک دوسرے کی بات سمجھتے اور دکھ سکھ میں شریک ہوتے ہیں اور جس کے وسیلے سے قبائل اور گروہ قومی وحدت میں ڈھل جاتے ہیں اور قومی اتحاد کے باعث مشکل سے مشکل کام بھی آسانی سے کر ڈالتے ہیں - اس زبان کو بیک وقت رابطے کی زبان بھی کہہ سکتے ہیں اور قومی زبان کے نام سے بھی پکار سکتے ہیں - توریت میں ہمارے لیے یہ عبرت بھی پوشیدہ ہے کہ قومی زبان کا دامن چھوڑ دینے سے قوموں پر اس صورت میں عذاب نازل ہوتا ہے کہ قبیلوں ، گروہوں اور صوبوں میں اتحاد ختم ہو جاتا ہے ، اختلافات پیدا ہو جاتے ہیں اور پراگندگی و انتشار فروغ

پانے لگتے ہیں - پھر نہ ہم شہر بسا سکتے ہیں نہ یادگار پاکستان تعمیر کر سکتے ہیں اور نہ قوموں کی برادری میں اپنا تشخص ہی قائم کر سکتے ہیں -

ہمارے ملک میں پنجابی ، پشتو ، بلوچی اور سندھی ، چار خاص زبانیں ہیں جو پنجاب ، سرحد ، بلوچستان اور سندھ کے چار صوبوں کی زبانیں سمجھی جاتی ہیں اور اپنے اپنے علاقوں کے باشندوں کی خدمت کرتی اور انہیں باہم متحد رکھتی ہیں - لیکن جب دو صوبوں کے باشندے آپس میں بات چیت کرنا چاہتے ہیں تو انہیں ایک تیسری زبان کی ضرورت پڑتی ہے جو ان دونوں کے درمیان رابطے کا کام دے سکے - جو ایک کی بات دوسرے کو سمجھا سکے اور جس کی سطح گروہی ، قبائلی ، مقامی ، صوبائی یا علاقائی کے بجائے قومی ہو - پاکستان میں اس خدمت کے لیے اردو زبان کا وجود ناگزیر اور اس منصب کے لیے اس کی اہلیت مسلم ہے -

یوں کہنے کو تو ہمارے ملک میں دو قسم کی زبانیں رائج ہیں - قومی اور علاقائی یعنی اردو اور پنجابی، سندھی وغیرہ - لیکن اس بات کے سمجھنے کے لیے بہت بڑی بصیرت کی ضرورت نہیں ہے کہ قومی اور علاقائی دونوں زبانیں ایک ہی خدمت انجام دیتی ہیں اور وہ خدمت رابطے کی ہے - دونوں میں اگر کچھ فرق ہے تو صرف اتنا سا ہے کہ اردو یہ کام قومی سطح پر پورے ملک میں کرتی ہے اور علاقائی زبانیں صوبائی سطح پر صوبے کے اندر کرتی ہیں - چونکہ صوبے کا رقبہ ملکی رقبہ سے کم ہوتا ہے اس لیے علاقائی زبان کا کام سمجھنے کے لیے نظر کو ذرا محدود کرنا پڑتا ہے -

یہاں صرف ایک مثال صوبہ پنجاب کی لے لیجیے - اس پورے صوبے کی زبان پنجابی کہلاتی ہے - لیکن ذرا لاہور سے نکل کر دیکھیے آپ کو پنجابی کے علاوہ جھانگی ، لہندی ، دھنی ، پٹھواری ، پہاڑی ، ملتانی اور سرائکی وغیرہ کتنی ہی زبانوں سے سابقہ پڑتا ہے اور یہ چھوٹی موٹی ذیلی بولیاں نہیں مستقل بالذات آزاد زبانیں ہیں پنجابی سے ان کا ملاپ کرکے

دیکھیے تو ان میں اور پنجابی میں کہیں فرق کم ملے گا اور کہیں زیادہ یہاں تک کہ ضلع میانوالی کے باشندے کی بات لاہور کے باسی مشکل ہی سے سمجھ پائیں گے - اس کے باوجود صوبہ پنجاب کی کوئی سی دو زبانوں کے درمیان پنجابی ہی رابطے کا کام دے سکتی ہے اور دے رہی ہے چنانچہ پنجابی بولنے والا اس صوبے کے اس سرے سے اس سرے تک چلا جائے پنجابی سے اپنا کام بآسانی چلا سکتا ہے یہی کیفیت دوسرے صوبوں کی ہے کہ ان میں بولی جانے والی متعدد زبانوں کے درمیان صرف ایک زبان پشتو، بلوچی یا سندھی رابطے کا کام دے رہی ہے - غرض یہ کہ اردو اور علاقائی زبانوں کے صرف دائرہ کار میں فرق ہے - ان کے کام کی نوعیت میں کوئی فرق نہیں ہے -

زبان کا یہ قدرتی عمل ہے کہ وہ جن زبانوں میں رابطے کا کام دیتی ہے ان کے قریب بھی آ جاتی ہے - لوگوں کو اس کی جن مغائرت اور اجنبیت کو سوچ سوچ کر وحشت ہوتی ہے سچ مچ اتنی مغائرت اور اجنبیت اس میں باقی نہیں رہتی - ثبوت کے لیے رابطہ کی زبان کے لحاظ سے اردو کے وہ علاقائی محاورے چشم بصیرت کے سامنے موجود ہیں جو اس کی تاریخ کے مختلف ادوار میں جگہ جگہ ابھر آئے ہیں - اکبر آبادی اردو ، دہلوی اردو ، لکھنؤی اردو ، حیدر آبادی اردو اور لاہوری اردو، اردو کے وہ مسلمہ محاورے ہیں جو اکبر آباد ، دہلی ، لکھنؤ ، حیدرآباد، لاہور اور ان کے نواح میں آج بھی کانوں سے سنے جا سکتے ہیں - محاورے ٹکسالی اردو میں برج بھاشا ، ہریانی ، پوربی ، دکنی اور پنجابی کی آمیزش سے تیار ہوئے ہیں اور اب اپنے علاقوں کے لیے استناد کا درجہ رکھتے ہیں -

ان محاوروں میں سے کسی محاورے کی بھی عمر سو سال سے کم کی نہیں ہے اور پاکستان کے قیام کو ابھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا - لہٰذا پاکستان میں اتنی جلدی اردو کے کسی نئے محاورے کے ابھرنے کی توقع نہیں کی جا سکتی - البتہ ان مقامات کی نشان دہی ضرور ہو سکتی ہے جہاں اس کے امکانات موجود ہیں - ان میں بظاہر پہلا نمبر کراچی

کا معلوم ہوتا ہے ۔ جہاں فروغ اردو کے لیے بہت کچھ کام ہو رہا ہے ۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ وہاں بہت سی مقامی اور غیر مقامی زبانیں جمع ہوگئی ہیں اور اردو کے تمام پرانے علاقائی محاورے بھی اکٹھے ہو گئے ہیں جو ابھی تک الگ الگ پہچانے جا سکتے ہیں ۔ اس لیے بولنے والوں کو لسانی عصبیت سے چھٹکارا پانے اور تمام علاقائی محاوروں کے باہم مدغم ہو کر ایک نیا قالب اختیار کرنے میں کافی وقت لگ جائے گا ۔ اردو کا ایک اور محاورہ جس کی امید کی جا سکتی ہے اور جو اردو میں سندھی کی ملاوٹ سے تیار ہوگا ۔ حیدر آباد سے ابھرے گا لیکن اس کے وقت کا بھی ابھی تعین نہیں کیا جا سکتا ۔ البتہ پشاوری اردو کا نیا محاورہ نسبتاً جلد سامنے آ جائے گا کیونکہ وہاں اردو زبان پرانے علاقائی محاوروں کے شکنجے سے آزاد ہے ۔

یہاں اس بات کی بھی وضاحت ضروری ہے کہ لسانی عصبیت سے آزادی اور زبان کے قدرتی بہاؤ کا مطلب تاراج یا مطلق العنانی نہیں ہو سکتا ۔ نہ اس کا یہ مطلب ہے کہ ہم اپنے تساہل اور سہل انگاری کے باعث اردو سیکھنے کے بجائے نئی زبان ڈھالنے اور ایجاد کرنے لگیں اور اسے قومی ملکیت سے نکال کر شخصی ملکیت میں اس طرح لے آئیں کہ جہاں معنی ہی تلپٹ ہو جائے ۔ زبان کی دنیا میں مخصوص افراد کی پسند یا ناپسند کی جگہ عوام کے چلن کی حکمرانی ہے اور آمریت یا بادشاہی کی جگہ آئینی جمہوریت کا سکہ چلتا ہے ۔ علاقائی زبانوں کی آمیزش سے اردو کے علاقائی محاورے از خود بنتے رہے ہیں اور آئندہ بھی اپنے آپ بنتے رہیں گے ۔ لیکن علاقائی زبان اور اردو کے اجزا میں من مانا تناسب رکھ کر اس سے بزعم خود توسیع اردو کا پہلے ایک نسخہ ترتیب دینا اور پھر اس نسخہ کی مدد سے علاقائی محاورے ڈھالنے کی شعوری کوشش کرنا فعل عبث اور کار بے خبر ہوگا ۔

(مطبوعہ : ماہنامہ الشجاع، کراچی ۱۹۷۶ء)

اردو املا کے مسائل

زبان آوازوں سے بنتی ہے اور بولی جاتی ہے ۔ لپی حروف سے بنتی ہے اور پڑھی جاتی ہے چنانچہ زبان اور لپی کا رشتہ دراصل حرف و صوت کا رشتہ ہوتا ہے اور یہ رشتہ صرف اسی صورت میں مستحکم کہلا سکتا ہے جب ہر آواز کے لیے ایک جداگانہ حرف مقرر ہو ۔ اس کے برعکس جب ایک ایک آواز کے لیے کئی کئی حروف یا کئی کئی آوازوں کے لیے ایک حرف مقرر ہوگا تو جو بولا جائے گا وہ پڑھا نہیں جا سکے گا اور جو پڑھا جائے گا وہ بولا ہوا نہیں ہوگا ۔ چنانچہ میرا مشاہدہ ہے کہ لپی کی خام کاری اور غلط نگاری کی وجہ سے پڑھے لکھوں کا تلفظ بگڑ جاتا ہے ۔

کہا جاتا ہے کہ دنیا میں آج تین ہزار کے قریب زبانیں بولی جا رہی ہیں اور لپیاں بھی کم سے کم سینکڑوں ہی ہوں گی کیونکہ ایک ایک لپی میں کئی کئی زبانیں لکھی جا رہی ہیں لیکن جہاں تک مجھے علم ہے کوئی ایک لپی بھی کسی ایک زبان کی پوری آوازوں کو مکمل صحت کے ساتھ محفوظ نہیں کر پاتی ۔ اردو کی لپی بھی جو دراصل عربی لپی ہے اس سے مستثنیٰ نہیں ہے ۔ دیوناگری لپی کی بہت تعریف کی جاتی ہے کہ اس میں جیسا بولتے ہیں ویسا ہی قلم بند ہو جاتا ہے لیکن یہ بات سو فی صدی درست نہیں ہے ۔ کمزوریوں سے یہ لپی بھی خالی نہیں ہے ۔ البتہ یہ بات قابل تسلیم ہے کہ بعض لپیوں کے مقابلے میں اس میں درست نگاری کی زیادہ صلاحیت پائی جاتی ہے ۔

اردو املا کے مسائل دراصل اردو لپی کے مسائل ہیں جو اصلاً عربی زبان کے لیے ایجاد ہوئی تھی اور اردو اور عربی زبانوں کے صوتی نظام میں بہت فرق ہے ۔ جب یہ لپی ایران میں اپنائی گئی تو ایرانی زبان کے

صوتی نظام سے ہم آہنگ کرنے کے لیے اس میں کچھ اضافے کیے گئے اور ایرانی کی مخصوص آوازوں کے لیے پ چ ژ گ کے حروف بنا کر داخل کر لیے گئے - پھر جب یہ لپی ہندوستان میں آئی اور اردو زبان کے لیے اختیار کی گئی تو اس میں مزید اضافے ہوئے اور نئی آوازوں ٹ ، ڈ ، ڑ وغیرہ کے لیے حروف بنا کر شامل کیے گئے - پھر بھی اس میں بہت کچھ کمی رہ گئی ہے جس کے باعث الجھنیں اور دقتیں پیش آتی رہتی ہیں - آئندہ سطور میں ایسی ہی چند الجھنوں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے تاکہ انہیں دور کیا جا سکے -

دنیا کی ہر زبان کی طرح ہماری زبان میں بھی آواز کی دو قسمیں ہیں- ایک سر جیسے انگریزی میں واول اور عربی میں صوت علت کہتے ہیں دوسرے اُسر جیسے انگریزی میں کنسونیٹ ، عربی میں صوت صحیح اور ہندی میں وینجن کہتے ہیں - ہمیں اردو املا کے مسائل سمجھنے کے لیے اس کے صوتی اور ہجائی نظام دونوں کو کھنگالنا ہوگا - اگرچہ سروں اور اسروں کے تانے بانے باہم گتھے ہوئے ہیں تاہم اپنی آسانی کے لیے ہم اس مطالعے کی ابتدا اُسروں (اصوات صحیحہ) سے کرتے ہیں -

اردو میں ناک کی مدد سے ادا ہونے والی تین آوازیں ہیں - ان میں سے دندانی نون یعنی نون بالاعلان اور نون غنہ سے سب واقف ہیں البتہ حلقی نون سے ایک عام بے خبری پائی جاتی ہے یہی وجہ ہے کہ نون بالاعلان کی پہچان کے لیے اس کے پیٹ میں ایک نقطہ ہوتا ہے اور نون غنہ کا پیٹ خالی رہتا ہے لیکن حلقی نون کی کوئی شناخت مقرر نہیں ہو پائی ہے - لفظوں میں استعمال ہونے پر ان تینوں ہی کو شوشے پر ایک، ایک نقطہ بنا کر ظاہر کر دیا جاتا ہے اس صورت حال سے جو گڑبڑ پیدا ہوتی ہے اسے سمجھنے کے لیے پہلے ان کی انفرادی خصوصیات پر ایک نظر ڈال لینا ضروری ہے -

نون بالاعلان

(۱) مخرج کے لحاظ سے دندانی ہے -

(۲) یہ لفظ کی ابتدا ، وسط اور اخیر تینوں مقامات پر بولا لکھا جاتا ہے جیسے نگر ، دھندا ، پاز ۔

(۳) عروض میں اس کا وزن ہوتا ہے جیسے نگر ، فعو ، دھندا=فولن اور ہان=فاع ۔

(۴) یہ متحرک بھی ہوتا ہے اور ساکن بھی جیسے گھنیرا ، بنجارا ۔

نون غنہ

(۱) مخرج کے لحاظ سے انفی آواز کی ایک گونج ہے ۔

(۲) یہ لفظ کے وسط اور اخیر صرف دو مقامات پر بولا لکھا جاتا ہے جیسے گوند ، جوں ، آنکھیں ۔

(۳) جب یہ لفظ کے اخیر میں آتا ہے تو اس کے پیٹ میں نقطہ نہیں لگتا ۔

(۴) یہ متحرک نہیں ہوتا جیسے چنگیر ، منڈیر ۔

(۵) عروض میں اس کا کوئی وزن نہیں ہوتا ۔ چنانچہ گوند= گود یعنی فاع ، جوں=جو یعنی فع اور آنکھیں=آکھے یعنی فعلن ۔

حلقی نون

(۱) مخرج کے لحاظ سے حلقی ہے ۔

(۲) یہ لفظ کے صرف درمیان میں آتا ہے ۔ اس کی ابتدا یا اخیر میں نہیں بولا جاتا ۔

(۳) یہ صرف حلقی آوازوں ک ، کھ ، گ ، گھ سے پہلے بولا جاتا ہے۔

(۴) یہ ہمیشہ ساکن رہتا ہے ۔

(۵) اس کا وزن نون بالا علان کے ہی برابر ہوتا ہے جیسے جنگل =فعلن ، رنگ=فاع ۔

اب نیچے ان تینوں آوازوں کا الفاظ میں استعمال دیکھیے۔ جہاں ان کی پہچان کے لیے صرف ایک ایک نقطہ ہوتا ہے ۔ بشلاً بُھنگا (بُھن گا)، جنگل،

منگتا ۔ پہلے لفظ میں شوشے پر نقطہ دندانی نون کا ہے ، دوسرے میں حلقی نون کا اور تیسرے میں غنہ کا ۔ ملفوظی روایت سے قطع لظر یہاں کوئی ایسی رکاوٹ نہیں ہے جس کے باعث ایک کا دوسرا تلفظ نہ کیا جا سکے ۔ بُھنگا (بُھن گا) کو حلقی نون یا غنہ سے بھی پڑھا جا سکتا ہے ۔ جنگل کو بھنگا اور منگتا کی طرح دندانی نون یا غنہ سے بھی بولا جا سکتا ہے اور منگتا کا تلفظ دندانی اور حلقی نون سے بھی کیا جا سکتا ہے ۔ چنانچہ میں نے بعض پڑھے لکھوں کے منہ سے ہنستا کو ہنستا سنا ہے اور غالب کے شعر میں ہتھکنڈا کے نون بالاعلان کو نون غنہ سے باندھا دیکھا ہے جس کے باعث لفظ ہی مہمل ہو کر رہ گیا ہے ۔ آپ بھی سن لیجیے ۔

خستگی کا تم سے شکوہ کیا کہ یہ
ہتھکنڈے ہیں چرخ نیلی فام کے

ہمارے یہاں ہے (ہ) بھی تین قسم کی ہوتی ہے جیسے دو چشمی ہے ، ہائے ہوز اور ہائے مختفی کہتے ہیں ۔ ہم نے دو چشمی ہے کو عربی لپی کی بلکی آوازوں کے ترجمان حروف میں جوڑ جوڑ کر اپنی ان بھاری آوازوں کے لیے حرف بنا لیے ہیں جن سے عربی زبان خالی ہے اردو میں کچھ عرصے پہلے تک ان کو دو چشمی ہے اور ہائے ہوز دونوں ہی سے لکھا جاتا تھا جیسے بھائی اور بہائی، گھر اور گہر، کھار اور کہار، اس نے اعتدالی کی وجہ سے پڑھے لکھوں کا تلفظ بگڑا تو کھا کھمی کو کہا کہمی بولنے لگے ۔ اردو میں ہائے مختفی نہیں ہوتی ، لیکن لپی ہیں عربی فارسی سے چلی آئی تھی تو بالعموم آخری طویل سر آ اور اے کے لیے لکھی بولی جانے لگی اور ہم بھروسا کو بھروسہ ، رستا کو رستہ ، لالا (بنیا) کو لالہ ، نا (انکاری) کو نہ اور نے کو نہ ، بے کو بہ لکھنے بولنے لگے اور اب ہے کی ان مختلف قسموں سے لکھے بولے جانے والے الفاظ کی چند مثالیں نیچے درج کی جاتی ہیں جو اردو لغات کے لیے ایک ناروا بوجھ بن گئے ہیں ۔ یہ مختلف الاشکال ، ہم صوت اور ہم معنی الفاظ ہیں :

۱ ۔ موں ، موُنھ ، مونہہ ، منہ ۔

۲ - باں ، بانھہ ، باند ، بالھ -

۳ - کونی ، کوہنی ، کہنی -

۴ - پہونچ ، پہنچ ، بھونچ ، پوہنچ ، ہونچ -

اردو میں سات طویل سادہ سر ہیں جو ا ، و ، ی میں سے دو دو حرف ملا ملا کر لکھے جاتے ہیں - آ ، اے ، ۳اَے ، اِی ، اُو ، ۳او ، آو - دیوناگری لپی میں ان کے لیے ایک ایک منفرد حرف شررے - ان سات سروں کے مختصر روپوں کے لیے اردو لپی میں صرف تین علامات زبر ، زیر اور پیش ہیں جنھیں اعراب کہتے ہیں اور جو طویل سروں پر بھی لگائے جاتے ہیں لیکن ہمارے یہاں پابندی سے اعراب لگانے کا بھی دستور نہیں ہے اسی لیے یا اردو تحریر میں نہ متحرک اور ساکن حرف میں تفریق ہو پاتی ہے اور نہ ارکان کی صحیح تقسیم - نتیجتہً پڑھنے میں غلطی کا امکان اور تلفظ بگڑنے کا خدشہ لگا رہتا ہے -

ہمارے یہاں چار مختصر سروں کے لیے کوئی علامت نہیں ہے - زبر آ کا مختصر روپ ہے - زیر سے ہم اِے (کُومل) اور اِی (تیور) دوسروں کے مختصر روپوں کا کام لیتے ہیں اور پیش کو بھی کومل اور تیور اُو اور آو ، دونوں کا مختصر روپ مانتے ہیں - پہلے زیر کی مثالیں دیکھیے -

مختلف الفاظ : چرنا (چی رنا سے) اور پھرنا (پھے رنا سے) ، پٹنا (پی ٹ نا سے) اور پیلنا (پے ل نا سے) -

ہم صورت الفاظ: سیا (سے آ، انڈے پر بیٹھا) اور سیا (سی آ، سلائی کی) چٹیل (چٹے ال ، زخمی) اور چٹیل (چٹی الدصاف اور ہموار) - لیانا (لے آنا ، لانا) اور لیا (لی آ ، پایا حاصل کیا) - کھلنا (کھے ل نا یعنی زیب دینا) اور کیھلنا (کھی ل نا یعنی کھیل ہونا، کھلنا) -

اب پیش کی مثالیں دیکھیے :

مڑنا (سوڑنا سے) کا سر کومل اور اڑنا (اُوڑنا یعنی اٹھنا ، بلند ہونا

ہے) کا سر بنور ہے - کنی (کونی یا کونھری) کا سر کومل اور چھٹی (چھوٹی ، چلی) کا سر تیور ہے ، گٹھلی (گٹھولی سے) کا سُر کومل اور گلی (گولی یعنی مغز سے) کا سُر تیور ہے -

مندرجہ بالا دو دو مثالوں کے سُر واضح علامات نہ ہونے کے باعث ایک دوسرے سے بدل سکتے ہیں اور ان کی غلط خوانی سے تلفظ بگڑ سکتا ہے -

اردو میں آو اور آے کے مختصر روپوں کے لیے بھی کوئی علامت نہیں ہے - او کی طویل اور مختصر دونوں صورتیں غالب کے دو شعروں کے ایک ہی لفظ آو میں پائی جاتی ہیں - سنیے -

طویل آو :

غیر سے رات کیا بنی یہ جو کہا تو دیکھنا
سامنے آن بیٹھنا اور یہ دیکھنا کہ یوں

مختصر 'او :

گدا سمجھ کے وہ چُپ تھا مری جوشامت آئی
اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لیے

دونوں مقامات پر لفظ "اور" کو ایک ہی طرح سے لکھ کر صحیح صحیح نہیں پڑھ سکتے کیونکہ ان میں سے پہلے اور کا سُر طویل (بروزن فاع) ہے اور دوسرے میں مختصر (فع) ہو گیا ہے اور اگر مختصر شکل میں اسے "ار" لکھا جائے تو الف پر کون سی علامت لگائی جائے -

لفظ بہت کو دیوناگری لپی میں بہُت (ہائے مفتوح اور ہائے مضموم سے) لکھا جاتا ہے اور پڑھے لکھے یہی تلفظ بھی کرنے لگے ہیں- اردو میں یہ لفظ بہُت (ہائے مضموم اور ہائے مفتوح سے) لکھا جاتا ہے اور پڑھے لکھے اسی طرح بولتے بھی ہیں، لیکن اس لفظ میں ب اور ہ دونوں حروف کا سُر اے کا مختصر روپ ہے - ہمارے یہاں اس کی علامت نہ ہونے کے باعث آزادی ہے کہ پڑھنے والے جس طرح چاہیں پڑھیں بولیں -

بھی سُر چھل (مذاق ، دل لگی ، خوش طبعی) میں چ اور ہ پر اور بھی میں ب اور ہ پر بولا جاتا ہے۔

اردو کے لفظ گہرا میں گ پر اے کا مختصر سُر ہے لیکن لوگ زیادہ تر زبر لگا دیتے ہیں جو غلط ہے اور جس سے تلفظ بگڑنے کا اندیشہ رہتا ہے۔ اس کی دوسری مثالیں یہ ہیں۔ لہرا ، بہرا ، پہرا جن میں ہائے ہوز سے پہلے اے کا مختصر سُر بولا جاتا ہے۔ یہ ہمارے دیسی تلفظ کا ہی اثر ہے جو ہم عربی کے لفظ اہم کو جس کی الف اور ہ دونوں پر زبر بولا جاتا ہے اے کا مختصر روپ لگا کر (ایہم) بولتے ہیں اردو کے چھل پہل کے اسر چ اور پ پر زیادہ سے زیادہ زبر لگا دیا جاتا ہے کیونکہ اے کے مختصر روپ کی کوئی علامت ہمارے یہاں نہیں ہے لیکن صوتی اعتبار سے یہ عمل درست نہیں ہے اس سے تلفظ بگڑنے کا خدشہ رہتا ہے۔

اردو املا میں طویل سر "الف" واو اور یے کی مدد سے اور مختصر سُر زبر ، پیش اور زیر سے ظاہر کیے جاتے ہیں لیکن بعض اوقات مختصر سر کے لیے بھی ان امدادی حروف کا استعمال کیا جاتا ہے۔ اس بےاعتدالی سے لفظوں کے صحیح تلفظ میں دشواری پیش آتی ہے۔ "اور" کے طویل اور مختصر سُروں کے باوجود اس کا مکتوبی روپ ایک ہی رہتا ہے جس کی مثالیں گزر چکی ہیں۔

مندرجہ ذیل اشعار میں ایسے ہی کچھ اور الفاظ ملاحظہ فرمائیے :

اے (اے اور ے)

طویل

یوں ہی چھاتی جو دھڑکے جائے گی
ہائے کیں طرح نیند آئے گی
(جوش)

(آئے بروزن فعلن)

مختصر

ہوں کشمکشِ نزع میں ہاں جذبِ محبت
کچھ کہہ نہ سکوں پر وہ مرے پوچھنے کو آئے
(غالب)

(آئے بروزن فاع)

طویل و مختصر

در پردہ انھیں غیر سے ہے ربط نہانی
ظاہر کا یہ پردہ ہے کہ پردہ نہیں کرتے
(غالب)

اے (آئے)

طویل

جھلک دکھائی سامنے آئے چلے گئے
یادش بخیر تم بھی عجب پردہ دار ہو
(آغا شاعر)

(آئے بروزن فعلن)

مختصر

اس انجمن ناز کی کیا بات ہے غالب
ہم بھی گئے واں اور تری تقدیر کو رو آئے
(آئے بروزن فاع)

آو (تو اور سو)

طویل

بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا
بات کرتے کہ میں لب تشنۂ تقریر بھی تھا
(غالب)

مختصر

چاہتے ہیں خوبرویوں کو اسد
آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے

طویل و مختصر

الجھتے ہو تم اگر دیکھتے ہو آئینہ
جو تم سے شہر میں ہوں ایک دو تو کیونکر ہو
(غالب)

آو اور ای (کسُوئی)

آخر شب دید کے قابل تھی بسمل کی تڑپ
صبح دم کوئی اگر بالائے بام آیا تو کیا
(اقبال)

(بروزن فعلن)

غالب برا نہ مان جو واعظ برا کہے
ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے

(بروزن فاع)

صدا یہ دے رہا ہے طور سے کون
کوئی کہہ دو مجھے فرصت نہیں ہے
(جوش)

(بروزن فعو)

ہمارے یہاں ایک اور گڑبڑ ا، و، ی کے استعمال سے بھی پیدا ہو جاتی ہے - یہ عربی کے نصف علت یا نصف صحیح حروف ہیں یعنی کبھی یہ سُر کی نمائندگی کرتے ہیں اور کبھی اسر کی ترجمانی کرتے ہیں - ہمارے یہاں یہ دو رنگے حروف بھی عربی لپی کے ساتھ ہی آئے ہیں - یہ لفظ کی ابتدا میں اسر ہوتے ہیں جن کے بعد سُر آتا ہے یعنی جن پر اعراب

لگتے ہیں اور جو متحرک ہوتے ہیں جیسے اب ، وہ ، یہاں - لفظ کے بیچ یا اخیر میں یہ سروں کا کام کرتے ہیں جیسے جا ، سو ، لے وغیرہ -

"او ، آو (کومل) اور آو (تیور) کے تینوں طویل سُر واو سے لکھے جاتے ہیں جیسے کونا ، چُھوڑا اور گھوم لیکن ہم اعراب لگانے کے عادی نہیں ہیں اس لیے ان سروں کو بھی غلط پڑھنے کا خدشہ رہتا ہے - اسی طرح "اے ، اِے اور اِی کے تینوں سُر ی سے لکھے جاتے ہیں جیسے بیل ، بھیرا ، چیرا - ان میں کون ایسی امتیازی اور انفرادی خصوصیت نہیں ہے جو غلط تلفظ سے بچا سکے - عربی میں دو کومل سُر (آو اور اِے) نہیں ہوتے اس لیے وہاں تو واو سے پہلے زبر اور پیش لگا کر اور ے سے پہلے زبر اور زیر لگا کر تفریق ہو جاتی ہے لیکن اردو کے تین تین سر دو دو علامتوں سے ظاہر نہیں کیے جا سکتے - اردو میں ایسے لفظ موجود ہیں جن کا مکتوبی روپ ایک ہے لیکن جن کے ملفوظی روپ سروں کے اختلاف کی وجہ سے مختلف ہیں - اسی لیے ان کے معنی بھی مختلف ہو جاتے ہیں جیسے لور (آم کا پھول) ، بُور (پانی ، بوند) اور بور (بھوسی) بورا (پاگل) - بُورا (بڑی بوری ، تھیلا) ، بورا (شکر) ، لوٹنا (واپس ہونا) ، لوٹنا (کروٹیں بدلنا) ، لوٹنا (چھیننا) ، بیر (ایک کھٹا میٹھا پھل) ، بیر (بہادر ، بھائی ، حلال) ، بیر (دشمنی) ، چور (دزد) ، چور (خستہ) ، چور) (چار سیل (تفریح ، سیر) ، سیل (نمی ، رطوبت) ، سیل (بڑھن ، بیل) ، سیل (گندگی ، کثافت) ، میل (ملاقات ، رسم) ، میل آدھا کوس) -

یہ صحیح ہے کہ اس برصغیر کے بعض علاقوں جیسے ہریانے راجپوتانے کی کوٹا بوندی کی ریاستوں اور کشمیر وغیرہ میں او کو اُو اور اے کو اے بولنے کا عام رجحان ملتا ہے - یہاں کے لوگ فوج کو فُوج اور سیتر کو سیر بولتے ہیں - ان لوگوں کا یہ تلفظ میں نے اپنے کانوں سے سُنا ہے پاکستان ٹیلی ویژن کے بعض بعض خبر گو بھی کَرو کو کُرو اور چلّے کو چلّے بولتے ہیں - انتہا یہ ہے کہ ایک صاحب توِ ہے جیسے عام استعمال کے لفظ کو بھی ہے بولتے ہیں اس غلط تلفظ میں و اور ے ہر

مناسب اعراب نہ لگانے کو زیادہ دخل ہے ۔ شاید اسی غلط خوانی کے باعث بعض بعض نامور شعرا بھی ان دو دو سروں کو ہم قافیہ باندھ جاتے ہیں ۔

اردو میں صیغۂ جمع حاضر کے لیے فعل تمنائی ، شکی ، شرطی کا لاحقہ او ہوتا ہے جیسے تم دیکھو ، تم چلو جو فعلی مادے سے الگ ہوکر اسی جمع حاضر کے لیے فعل حال میں "ہو" بولا جاتا ہے جیسے تم دیکھتے ہو ، تم چلتے ہو ۔ ہریانی اور دکنی میں فعل تمنائی کا لاحقہ آو ہوتا ہے بلکہ ہریانی اور راجستھانی میں اس کے ساتھ ساتھ "جو" کا لاحقہ بھی ملتا ہے جیسے ہریانی کیجو ، دیجو ، جائیو، آئیو اور راجستھانی جا جو (جاؤ) اس گڑبڑ کی مثال میں شعرا کے کچھ شعر سنیے :

غالب

تم جانو تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو
مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو
(ہوئے کا مختصر روپ)

بچتے نہیں مواخذۂ روز حشر سے
قاتل اگر رقیب ہے تو تم گواہ ہو
(تم ہو ، زبر سے)

آغا شاعر

ہم سے نہ ملے آپ نے تو کہہ دیا مگر
وہ کیا کرتے غریب جو بے اختیار ہو
(ہُوئے کا مختصر روپ)

جھلکی دکھائی ، سامنے آئے ، چلے گئے
پادش بخیر تم بھی عجب پردہ دار ہو
(تم ہو ، زبر سے)

اسی طرح اردو میں صیغہ واحد حاضر اور واحد غائب کے لیے فعل تمنائی ، شرطی ، شک کا لاحقہ اے (زبر ے) ہوتا ہے جیسے تو چلے وہ سمجھے ۔ یہ فعل فارسی کا مضارع اور اردو کی دوسری پڑوسی بولیوں کا فعل حال بھی کہلاتا ہے ۔ اردو میں اے کا لاحقہ صیغہ جمع متکلم کے لیے حالیہ تمام میں لگایا جاتا ہے جیسے ہم چلے ۔ ہم سمجھے ۔ اب وہ اشعار سنیے جن میں ان دونوں سروں کو ہم قافیہ باندھا گیا ہے :

غالب

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
(واحد غائب احتمالی)

بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے
(جمع مذکر ماضی)

جوش

ہائے کیونکر نہ اختلاج رہے
(واحد غائب احتمالی)

ہم ہیں پردیس میں براج رہے
(جمع مذکر حالیہ تمام)

و اور ی کے سلسلے میں آخری بات یہ ہے کہ ہمارے یہاں دو مختلف سروں کے بیچ میں ان حروف کا حشوی اندراج ہو جاتا ہے یعنی یہ حروف تحریر میں تو نظر آتے ہیں لیکن آواز نہیں دیتے جیسے انگریزی میں خاموش (Silent) حروف ہوتے ہیں ۔ مثلاً ہوا ، گھوا ، جوا ، کلوا ، اگوا ، جواری ، پھوار ، چھوارا ، پیار ، پیاسا ، جیالا ، گیارہ ، گئیا ، سٹھیا ، بٹیا ، ٹھلیا ، پڑیا وغیرہ ۔ ان لفظوں میں سے کسی لفظ میں بھی و اور ی کی آواز سنائی نہیں دیتی لیکن اس دستور سے بعض الفاظ کا تلفظ ضرور غلط ہو گیا ہے ۔ چنانچہ لوگ بھڑوا کو بھڑ ۔ وا ، کروا (آبخورہ) کو کر ۔ وا ، کڑوا کو کڑ ۔ وا ، چکوا کو چک ۔ وا ، گڑوئی کو

گڑ - وی، اروی کو ار - وی اور انڈوی کو انڈ - وی بولنے لگے ہیں - یہ نقص دیوناگری لپی میں بھی ملتا ہے - البتہ میں نے گرو گرنتھ صاحب کی گورمکھی لپی کو اس نقص سے پاک صاف اور درست پایا ہے -

اب میں ان خامیوں کو دور کرنے کے لیے جن کا ذکر پچھلی سطور میں کیا جا چکا ہے مندرجہ ذیل اصلاحات تجویز کرتا ہوں :

۱ - دندانی نون بدستور نقطے کی مدد سے لکھا جائے ن - دنداں ، حلقی نون نقطے کے بجائے ایک چھوٹے سے دائرے سے ظاہر کیا جائے اور نون غنہ کے لیے لفظ کے بیچ میں شوشے پر نقطہ لگا کر اس کے اوپر چھوٹا سا ^ کا ہندسہ بنا دیا جائے - (چانْدْ) -

۲ - دو چشمی ہے کو اردو کی صرف بھاری آوازوں کے لیے مخصوص رکھنے پر سختی سے اصرار اور عمل کیا جائے اور ہائے مختفی کا استعمال دخیل الفاظ تک محدود رکھا جائے -

۳ - سُروں کی پہچان کے لیے زبر ، زیر ، پیش کے علاوہ مزید چار علامات مقرر کرکے ان کے استعمال پر سختی سے عمل کیا جائے - یہ چاروں علامات یوں ہو سکتی ہیں -

ای کے تیور سُر کے لیے ایک چھوٹا سا تحتانی خط حرف کے نیچے اور او کے تیورسر کے لیے صرف کے اوپر کھینچا جائے اے کے لیے حرف کے نیچے ایک چھوٹا سا آٹھ کا ہندسہ اور اَو کے لیے حرف کے اوپر آٹھ کا الٹا ہندسہ بنایا جائے - میں یہ چاروں علامات اپنی تحریروں میں برابر استعمال کرتا چلا آ رہا ہوں -

ان مختصر سُروں کے لیے حروف پر صرف علامات لگائی جائیں اور طویل سروں کے لیے ان کے ساتھ ا ، و ، ی کے حروف حسب معمول استعمال کیے جائیں -

۴ - و اور ی کا حشوی استعمال یک قلم ختم کر دیا جائے ۔ ان کی جگہ لفظ میں ان سے پہلے آنے والی حرکات ضرور ظاہر کی جایا کریں یعنی پیارا کو پارا ، بھوار کو بھار ، لٹیا کو لٹیا اور جوا کو جا لکھا جائے ۔

زبان کی طرح لپی اور املا کا چلن بھی ایک اجتماعی عمل ہے ۔ یہ کسی فرد واحد کے بس کی بات نہیں ہے اس لیے ضروری ہے کہ ہماری لپی اور املا کے نقائص دور کرنے کے لیے چند ایسے ماہرین کی خدمات حاصل کی جائیں جو اردو کے صوتی اور ہجائی نظام دونوں کو بخوبی سمجھتے ہوں ۔ پھر ان کی سفارشات کی روشنی میں محکمہ تعلیم کے تعاون سے تعلیمی مدارس کی نصابی کتب سے اصطلاحات کا آغاز کیا جائے ۔ اس اہم اور عہد آفریں کام کی سرپرستی اور نگرانی کے لیے ہمارے ملک میں مقتدرہ قومی زبان ہی موزوں ترین ادارہ ہو سکتا ہے ۔

(مطبوعہ : "املا و رموز اوقاف کے مسائل" مرتبہ : ڈاکٹر اعجاز راہی)

اردو میں و ، ی اور ہ کی حقیقت

پاک و ہند کی لسانیات میں آج تک محققین کو جتنی غلط فہمیاں ہوئی ہیں اور جتنی ناکامیوں کا سامنا کرنا پڑا ہے ان میں سے اکثر و بیشتر کا واحد سبب یہ ہے کہ انہوں نے آوازوں کو چھوڑ کر لپی (رسم الخط) پر اپنی توجہ مرکوز کر دی اور استخراج نتائج میں حروف کے مطالعے کو مقدم جانا ۔ چنانچہ لسانیات کے طالب علم کے سامنے اس وقت ان غلط فہمیوں اور الجھنوں کا اتنا بڑا انبار لگ گیا ہے کہ کوئی شخص آسانی سے انہیں دور نہیں کر سکتا ۔ میرے نزدیک مطالعۂ زبان کا پہلا اور آخری اصول یہ ہونا چاہیے کہ زبان کی بنیادی آوازوں کا سراغ لگایا جائے اور لپی پر ان کی روشنی میں غور کیا جائے کہ وہ انہیں قلم بند کرنے میں کہاں تک کامیاب ہوئی ہے اور انہیں ظاہر کرنے کے لیے اس میں کون کون سے اصول برتے گئے ہیں ۔

سب جانتے ہیں کہ ہماری موجودہ لپی عربی النسل ہے جس نے پہلے ایرانی آوازوں پر اور پھر مسلمانوں کی معیت میں ہندوستان پہنچ کر اردو زبان کی آوازوں پر اثر ڈالا ہے لیکن اس سے پیشتر بھی جس وقت آریہ ہندوستان آئے تھے وہ ایران کی قدیم لپی اپنے ساتھ لائے تھے جس میں انہوں نے نہ صرف قدیم ایرانی زبان کو قلم بند کیا بلکہ ہندوستان کی دراوڑی زبانوں کے لیے بھی اسی لپی کا استعمال کیا تھا اس لیے یہاں کی آوازوں پر قدیم ایرانی لپی کے زیر اثر بھی کچھ اثرات مرتب ہوئے تھے ۔ اس کے علاوہ جب دو زبانیں باہم ملتی اور قریب آتی ہیں تو ایک دوسرے سے ضرور متاثر ہوتی ہیں ۔ چنانچہ وہ ایرانی زبان جو ماضی قریب میں مسلمانوں کے ہمراہ دوسری بار ہندوستان پہنچی اور یہاں کی تمام زبانوں پر کسی نہ کسی حد تک اثر انداز ہوئی ورود آریہ کے وقت

ایک بار پیشتر بھی انھیں متاثر کر چکی تھی - اس طرح اگرچہ ایرانی زبان سے متاثر ہونے میں اردو بھی اپنی معاصر زبانوں کے ساتھ برابر کی شریک ہے لیکن عربی لپی کے اشتراک نے اس زبان پر ایرانی اثرات کو خصوصیت کے ساتھ زیادہ گہرا اور زیادہ وسیع بنا دیا ہے -

اس وقت جن اثرات کے متعلق میں اظہار خیال کرنا چاہتا ہوں ان میں مستعار ایرانی الفاظ سے قطعاً کوئی تعرض نہیں کروں گا کہ دو زبانوں کے میل جول ، پڑوس اور قرب کا پہلا اثر اسی شکل میں ظاہر ہوتا ہے لیکن یہ قرب زبان کی صرف بالائی سطح کو متاثر کرتا ہے اور اس لیے اس کے نقوش بھی دیر پا نہیں ہوتے - میرے پیش نظر اس وقت وہ ایرانی اثرات ہیں جو بالائی سطح سے گزر کر اردو کی بنیادوں تک اُتر چکے ہیں اور آج کل جزو زبان سمجھے جاتے ہیں اور جن میں و ، ہ اور ی کی آوازوں کا بھی شمار ہوتا ہے - چونکہ یہ اثرات محض اردو زبان تک محدود نہیں ہیں بلکہ اس کی دوسری معاصر زبانوں میں بھی پائے جاتے ہیں اس لیے اس بحث میں دوسری زبانوں کا تذکرہ نہ صرف ناگزیر بلکہ تقابلی مطالعے کے لیے مفید اور اخذ نتائج میں معاون ثابت ہوگا - چنانچہ میں اس وقت پاک و ہند کی تمام موجودہ زبانوں یعنی دراوڑی خاندان کی ان چند لسانی خصوصیات کو واضح کروں گا جو انھیں ایرانی زبان کی بدولت حاصل ہوئی ہیں اور چونکہ میرے نزدیک یہ تمام زبانیں وہی ہیں جو ورود آریہ سے اس وقت تک علی الاتصال بولی جا رہی ہیں اس لیے ویدک و سنسکرت کے مقابلے میں جن کے موجودہ مکتوبی روپوں کو عوام کی زبانوں پر کبھی بار نصیب نہیں ہوا میں ان زبانوں کے لیے بھاشا (بھاشا - بول چال کی زبان) کا لفظ اسی طرح استعمال کروں گا جس طرح قدیم زمانے میں بول چال کی زبانوں کے لیے پراکرت کا لفظ استعمال کیا گیا تھا لیکن اس سے ہرگز ہرگز وہ زبان مراد نہ ہوگی جو پراکرت کے نام سے قدیم کتابوں میں تحریر کی گئی ہے کہ وہ سنسکرت سے ترشی ہوئی زبان کا ایک مصنوعی روپ ہے -

آج تک اردو زبان کی جتنی بھی چھوٹی بڑی گرامریں لکھی گئی ہیں ان سب میں بلا استثنا جہاں عربی گرامر کی نقل کی گئی ہے اور اس

کی اصطلاحات جوں کی توں مستعار لے لی گئی ہیں وہاں یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ اردو میں تین حرکات (زیر زبر ، پیش) اور تین حروف علت و ، ا ، ی ہوتے ہیں لیکن یہ نام نہاد حروف علت ایسے ہیں کہ حرکات کی مدد کے بغیر خود بھی کام نہیں کرتے حالانکہ دنیا کی دوسری لپیوں (دیونا گری رومن وغیرہ) میں حروف علت کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ حروف صحیحہ کو آواز ادا کرنے میں سہارا دیں - ایسی صورت میں ان کے دوسرے حروف صحیحہ کو مدد دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا - حروف کی ان اقسام کے لیے سنسکرت میں جو نام 'سؤر (حروف علت) اور وینجن (حروف صحیحہ) دیے گئے ہیں یہاں ان کا ذکر مسئلہ زیر بحث پر خاطر خواہ روشنی ڈالتا ہے کہ 'سور (= فارسی خور، سورج) کا چشمہ نور اپنی تجلی سے وینجن (بے انجن بے چمک) یعنی بے رنگ آوازوں کے خد و خال کو اجا گر کرتا ہے چنانچہ اردو زبان کی تمام اصوات صحیحہ اپنے تعارف کے لیے اصوات علت کی محتاج ہیں اور انہیں کی مدد سے اپنی اصلیت پہنچنواتی ہیں اور یہ وہ پہلی دقت ہے جو ہمیں عربی لپی کے ذریعے اپنی آوازیں ظاہر کرنے میں پیش آتی ہے کیونکہ بھاشا کے تمام حروف صحیحہ ساکن بالذات ہوتے ہیں جنھیں حروف علت کی مدد سے متحرک کیا جا سکتا ہے لیکن حروف علت کو کسی خارجی تحرک کی ضرورت نہیں ہوتی -

یہاں ہندو پاک لسانیات کے جدید محققین اور سنسکرت و پراکرت کے گرامر نویسوں نے جو یہ اصول بیان کیا ہے کہ پراکرت (بھاشا) کے تمام حروف متحرک بالذات ہوتے ہیں قطعاً بے بنیاد اور حقیقت سے دور ہے اور اس کا ثبوت یہ ہے بھاشا کے تمام الفاظ ارکان میں منقسم ہیں جن میں تسلسل کے ساتھ صرف دو ابتدائی حروف متحرک ہو سکتے- چنانچہ اردو کی تمام معاصر زبانوں میں تقسیم ارکان اور حرکت و سکون کے یہ اصول عام ہیں کہ ہر رکن کا ابتدائی حرف صحیح متحرک اور آخری حرف صحیح ضرور ساکن ہوگا۔ مثلاً اردو جھرمٹ (جُھر+مُٹ) ، برسنا (بَرس+نا) ، اچھور (اَم+چور) ، چَل ، چَلَت ، چال وغیرہ -

اردو لپی کی یہی خامی جو بھاشا کے ارکان کو ظاہر کرنے میں

ہمارے سامنے آتی ہے دیوناگری لپی میں بھی پائی جاتی ہے - یہ صحیح ہے
کہ رگ وید میں بھاشا کے الفاظ کو بیشتر ارکان کی اسی تقسیم اور حرکت
و سکون کے اسی اصول کے مطابق تحریر کیا گیا ہے اور وہ اس طرح
کہ اس میں بھاشا کے رُکن کا آخری ساکن حرف اگلے رُکن کے متحرک
حرف میں جوڑ دیا جاتا ہے لیکن یہ اصول ہر جگہ قائم نہیں رہتا چنانچہ
اس میں ایسی مثالیں بھی بکثرت مل جاتی ہیں جہاں ایک طرف تو لفظ
کا آخری حرف سکون کے باوجود اگلے لفظ کے پہلے متحرک حرف سے الگ
لکھا ہوا ہے اور دوسری جانب ایک متحرک حرف دوسرے حرف میں
ملا دیا گیا ہے - ویدک تحریر کی اس آخری قسم کی گڑ بڑ کو تمام محققین
"سُور بھکتی" کے نام سے ایک مسلّم بالشان اصول کے طور پر بیان
کرتے چلے آ رہے ہیں - ویدک و سنسکرت سے آگے چل کر موجودہ
بھاشاؤں کی تحریروں میں تو ترکیب حروف کا یہ چلن سرے سے ہی اٹھ
گیا ہے اور اب یہ حال ہے کہ ان کے الفاظ کو صرف وہی لوگ صحیح
تلفظ کے ساتھ ادا کر سکتے ہیں جو بھاشاؤں کے ارکان کی تقسیم کو اچھی
طرح جانتے اور سمجھتے ہیں -

یہاں یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اردو زبان (بھاشا) کے حروف
علت پر ایک نظر ڈال لی جائے تاکہ و ، ی اور ہ کی حقیقت کو سمجھنے
میں آسانی ہو لیکن جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں ہماری موجودہ لپی میں
تین حرکات (مختصر حروف علت) اور تین حروف علت (طویل حروف علت)
بتائے جاتے ہیں اور یوں ان کی مجموعی تعداد صرف چھ تک پہنچتی ہے
حالانکہ ہماری زبان میں سات مختصر اور سات طویل اصوات علت (جو
مختصر آوازوں سے ٹھیک دگنی ہوتی ہیں) پائی جاتی ہیں ، اس طرح
آٹھ آوازوں کو ظاہر کرنے کے لیے نہ ہماری لپی میں جداگانہ حروف ہی
مقرر ہیں نہ علامات - ان آوازوں کی تشریح کی خاطر ذیل میں علامات
کا ایک نقشہ پیش کرتا ہوں جنھیں میں آئندہ اس مقالے میں استعمال کروں
گا اور الف و ہمزہ میں سے صرف ہمزہ کو ان کا مدار قرار دوں گا -

نقشہ علامات

مختصر اصوات علت		طویل اصوات علت	
علامت	تشریح	علامت	تشریح
یَ	زبر	یٰ	آ
یِ	زیر	یٖ	اِے
یُ	پیش	ی	اُو
یِ	اِی کی مختصر آواز	ی =	اِی
یَ	اُو کی مختصر آواز	= ی	اُو
یٚ	اَو کی مختصر آواز	یٗ	اَو
یٛ	اَے کی مختصر آواز	ی ::	اَے

مندرجہ بالا چودہ آوازوں میں سے دس آوازیں ایسی ہیں جن سے ہر اُردو داں واقف ہے۔ یِ ، یَ کا علم نسبتاً کم لوگوں کو ہے اور یٚ ، یٛ کا تعارف اور بھی کم ہے۔ ان آوازوں کی تشریح یہ ہے کہ یِ کی آواز بٹیا ، لُٹیا ، گھڑیا میں ی سے قبل اور یَ کی آواز کلوا ، ننھوا ، منوا میں وٗ سے قبل سنائی دیتی ہے۔ یٚ کی آواز بہت ، چھلیں میں اور یٛ کی آواز لہر ، پہر میں ہ سے پہلے پردۂ گوش سے ٹکراتی ہے۔ عربی زبان میں

ان چار مختصر آوازوں کے علاوہ ی اور یٰ کی طویل آوازیں بھی نہیں ملتیں اس لیے اس کی لپی بھی ان کی علامات و حروف سے خالی ہے یعنی اس زبان میں کل تین مختصر آوازیں ی ی ی پائی جاتی ہیں جن کے لیے لپی میں علامات مقرر ہیں اور پانچ طویل سنائی دیتے ہیں جنھیں دو دو حروف کی ترکیب سے ظاہر کیا جاتا ہے اس لیے کہ نہ ان کے لیے کوئی مخصوص حرف ہی مقرر ہے نہ کوئی علامت ۔ دیونا گری اور گور مکھی دونوں لپیوں میں اصوات علت کے لیے کل دس حروف ہیں اور دس ہی ان کی علامات بھی مقرر ہیں جو اردو لپی کی طرح حروف صحیحہ پر چپکا دی جاتی ہیں اس طرح ان میں ی ، ی ی ، ی کے لیے نہ مخصوص حروف ہیں نہ علامات ۔

رومن لپی کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں اصوات صحیحہ کی طرح اصوات علت کے لیے صرف حروف مقرر ہیں اور وہی استعمال ہوتے ہیں یعنی نسخ ، دیونا گری اور گور مکھی کی طرح ان کی علامات حروف صحیحہ کے مدار پر قائم نہیں ہوتیں لیکن سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ اس میں صرف پانچ مختصر حروف علت ہیں اور یوں یہ لپی اردو زبان کی نو آوازوں سے یکسر خالی ہے ۔

مندرجہ بالا بیان سے یہ بات اچھی طرح ظاہر ہو چکی ہے کہ اردو کی طویل آوازیں عربی لپی کے قدیم دستور کے مطابق دو دو حروف کو ملا کر قلم بند کی جاتی ہیں ۔ مثلاً آو ، اُو ، اَو ، اے ، اے ، ای حالانکہ ان میں کہیں اور کبھی و اور ی کی آواز پیدا نہیں ہوتی البتہ اس طرز تحریر کے باعث ہماری زبان کی تحریروں میں و اور ی کی جتنی کثرت اور فراوانی ہو گئی ہے اس کے پیش نظر ہمیں کبھی یہ گمان بھی نہیں ہوتا کہ اردو کا کوئی لفظ ان کے بغیر بھی بن سکتا ہے لیکن یہ حالت صرف ہماری تحریروں میں ہی نہیں ہے بلکہ ویدک و سنسکرت کی دیونا گری لپی میں بھی طویل اصوات کی مخصوص اور جدا گانہ علامات مقرر ہونے کے باوجود ان کو دو دو حروف کے مرکبات سے ظاہر کیا

گیا ہے۔اور و اور ی کے استعمال میں کم و بیش اسی فراخدلی سے کام لیا گیا ہے جس سے بآسانی یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں کے ایران میں داخل ہونے سے قبل وہاں جو لپی رائج تھی اس میں بھی ان حروف کی ایسی ہی کثرت تھی جیسی آج نظر آتی ہے اور جو قدیم ایرانی لپی کے ذریعے آریوں کے ساتھ ہندوستان پہنچ کر یہاں کی لپیوں میں بھی منتقل ہو گئی۔

مثال کے طور پر جس طرح اردو کی قدیم تحریروں میں اس کر اوس اور اُترنا کو اوترنا لکھا گیا ہے اسی طرح ان سے ہزاروں سال پہلے ویدک و سنسکرت والے بھی اُترنا کو اوترن (آترن) لکھا کرتے تھے اور اس طرز تحریر کو نہ سمجھنے سے بھاشا کی آوازوں میں بھی جا بجا سخت برہمی پیدا ہوگئی ہے۔ سنسکرت لپی کی اس خامی کو واضح کرنے کے لیے ایک ہی مثال کافی ہوگی کہ اس میں ئی اور ئی دو مختلف طویل آوازوں کو واو کے صرف ایک ہی حرف کی مدد سے لکھا گیا ہے چنانچہ بھاشا لُ ن (لُون ، نمک)=سنسکرت لَ وَن اور بھاشا ی س را (آو سرا ، باری)=سنسکرت ی وَسَ ر ز موقع)۔ اس انداز تحریر کے مطابق ایک سنسکرت لفظ لَ وَ ن کو لوَن اور لُون دونوں طرح پڑھا جا سکتا ہے اور سنسکرت یَ وَ سَ ر کو آوسرا اَور اوسرا دونوں طرح بولا جا سکتا ہے حالانکہ بھاشا کے تلفظ کے مطابق لَون اور آوسرا صحیح اور لُون اور اوسرا غلط ہیں۔ ہندو پاک لسانیات کے محققین قدیم دیوناگری تحریر کی اس کمزوری سے بے خبر بھاشا کی اصلی آوازوں کو سنسکرت سے مشتق سمجھ کر مصنوعی آوازیں پیدا کر رہے ہیں۔

اردو میں و اور ی کی کثرت کا دوسرا سبب دو مختلف حروف علت کا ادغام ہے کہ جہاں ےِ یا ےُ کے بعد ےَ یا ےُ کی آواز آ جاتی ہے تحریر میں ی اور و کے حروف داخل کر دیے جاتے ہیں حالانکہ الفاظ کے تلفظ میں و اور ی کی آوازیں مطلق نہیں نکلتیں۔ مثلاً لٹِ آ = لُٹیا ، کُٹِ آ = کُٹیا ، بھڑُ آ = بھڑوا ، گھرُ آ = گھروا ، پِ آ = پیا ، جِ آ

= جیا ، سِ آ = سیا ، مَ آ = موا ، ہَ آ = ہوا ، کَ ہ ۔ ءُ = کنّوا ، م ہِ ءُ =
مہیا وغیرہ - ادغام کے باعث و اور ی کی پیدائش نہ صرف شمالی بھارت اور پاکستان کی تمام لپیوں میں ملتی ہے بلکہ دکن کی تامل ، تلگو ، کنڑی ، ملیالم ، تو لو وغیرہ کی لپیوں میں بھی عام نظر آتی ہے - اس کا واحد سبب ویدک و سنسکرت کا اثر ہے کیونکہ ادغام کا یہی اصول ویدک و سنسکرت میں بھی پایا جاتا ہے - مثلاً بھاشا ج ن (جنی ، عورت) = ویدک جنیو (جَ نَ ی ، سوکت ١ - ١٢ - ١) ، بھاشا دِ ی (دیا ، چراغ) = ویدک د و (سوکت ١-٩ - ٣ ، ١-١١-٥) ، بھاشا پَ یِ یُ (پپیا) = ویدک پو یا (پَ و یُ) ، بھاشا ب و دِہ (بدھی ، بدھیا ، آختہ) = ویدک وَ دھر یُو (وَ دھ رِ ی ، سوکت ١-٧-٣) وغیرہ اور ویدک و سنسکرت میں یہ اصول آریوں کے ساتھ ایران سے آیا ہے - اس کا ثبوت اوستا کی تحریر سے ملتا ہے جس میں الفاظ کی سندھی (ادغام) کے وقت حروف علت کے اختلاف سے و اور ی پیدا ہو جاتے ہیں - مثلاً اوستا ہَ + اَسپم (اچھے گھوڑے والا) = ہوسپم (= سنسکرت سوشوم) ، اوستا تَن + اس (جسم کا) = تنو و (= سنسکرت تنوس) ، اوستا پَ یِ تِ + ی پَ م (پتی آپم ، دھار کے خلاف) = پَ یِ ت ی پَ م) پتیا پم) = سنسکرت پر تیا پم ، اوستا وِ + یُ ن (تعاقب کیا ہوا) = دیانو (= سنسکرت دیانس) وغیرہ -

ادغام کے باعث و اور ی کا داخلہ فارسی جدید میں بھی ملتا ہے - مثلاً شُدن (ہونا) کے مادہ "شُ" سے بننے والے مضارع "شُ یَ د" کو "شود" لکھا اور "شَ و د" پڑھا جاتا ہے - اسی طرح مادہ "زی" (زیستن جینا) کا مضارع ، "زِ یَ د" ہونا چاہیے تھا لیکن "زید" لکھا جاتا ہے اور بودن (ہونا) کے مادہ "بو" (ب) ، بُدن کے مضارع "بَ یَ د" کو "بود" لکھا اور "بَوَد" پڑھا جاتا ہے حالانکہ ان مادوں میں "و" یا "ی" کی آواز کبھی سننے میں نہیں آتی - اس کی مزید مثالیں یہ ہیں - بیار (ب + آر بمعنی لا) ، آسیاب (آس + آب بمعنی پن چکی) ، میارا (م + آرا بمعنی

نپتاد (ن + افتاد ، نیچے گر پڑا) وغیرہ - یہی کیفیت سنسکرت میں ہے چنانچہ سنسکرت بھ (=فارسی ب ، ہونا) سے "اَ بھ وَ ت" (=فارسی ابود ، ہوگیا) اور "بھ وَ یِ ت" (= اوستاب وَ یِ ت = فارسی جدید بَ وَ د ، ہوتا ہے) جیسے روپ بنتے ہیں -

ان امثلہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ہند یورپی زبانوں کی ایک اہم خصوصیت ہے لیکن جہاں تک دراوڑی بھاشا کا تعلق ہے نہ یہ بات اس کے مزاج میں داخل ہے اور نہ اس کی اُس قدیم لپی میں جو اب نابود ہو چکی ہے بجھے اس قسم کے کسی رجحان کا احساس ہوتا ہے - بھاشا کی اس مخصوص مزاجی کیفیت کو سمجھنے کے لیے گرو گرنتھ صاحب کی گور مکھی لپی آج ہمارے سامنے موجود ہے جس میں آیا ، پایا ، کھایا کو آ ئ آ ، پا ئ آ ، کھا ئ آ لکھا ہوا ہے بلکہ ویدک و سنسکرت کے ایرانی الفاظ کو بھی ی ئ اور ئ ئ سے ظاہر کیا گیا ہے اور گیان (علم) کو گ ئ ن ، میان (درمیان) کو م ئ ن ، سوامی کو س ئ م ، دوار (دروازہ) کو دُ ئ ا د اور خوار کو کھ ئ ر تحریر کیا ہے -

ویدک و سنسکرت کے دراوڑی الفاظ میں و اوری کی موجودگی کا ایک اور سبب دراوڑی تشدید بھی ہے اور تشدید ہماری بھاشاؤں کی ایک ایسی بنیادی خصوصیت ہے جو ابتدا سے آج تک علی الاتصال چلی آ رہی ہے لیکن ایرانی زبان اس سے خالی ہے - (آج اگر کسی ایرانی لفظ میں تشدید نظر آتی ہے تو اسے یا تو ہندوستانی لہجے کا اثر سمجھنا چاہیے یا عربی زبان کا) البتہ اس زبان میں حروف صحیحہ کے مرکبات کی کثرت ملتی ہے اور یہ خصوصیت ہماری بھاشاؤں کے لیے قطعی اجنبی ہے - چنانچہ ویدک و سنسکرت میں دراوڑی تشدید ظاہر کرنے کے لئے حروف صحیحہ کے مرکبات سے کام لیا گیا ہے جن میں خصوصیت کے ساتھ دیونا گری کے نصف حروف علت ی ، و ، ر ، ل کا استعمال زیادہ ہوا ہے مثلاً پنجابی کھبّا = ویدک سویا (سَ و ئ ، سوکت ۳ - ۲۷ - ۱۱ ، ۱- ۳ - ۹) ؛ بھاشا بجل (بجلی) = ویدک وِ دیُت (سوکت ۱ - ۳ - ٦ ، ۱ -)

۲ ، ۷) ، برج بھاشا آن (اَ نّ ، غیر ، دوسرا) = ویدک انیہ (اَ ن ی ، سوکت ۱ ، ۲۱ - ۱) ، بھاشا اَٹُٹ (اردو اَٹوٹ ، نہ ٹوٹنے والا) = ویدک اَچھیہ (اَ چ چ ی سوکت ۱ - ۸ ، ۲) ، بھاشا سچ (اردو سچ ، سانچ) ویدک ستیہ (سَ ت ی) وغیرہ - اس کے علاوہ ویدک و سنسکرت میں یہ حروف دوسری آوازوں کے لیے بھی استعمال ہوتے ہیں جن کے بیان کا یہاں موقع نہیں ہے -

اب میں ان حروف میں سب سے پہلے واو پر غور کرتا ہوں تو عربی زبان میں اس کی تین قسمیں نظر آتی ہیں - معدولہ ، معروف اور مجہول - ان میں سے پہلا واو وہ ہے جو صرف تحریر میں استعمال ہوتا ہے لیکن بولنے میں بالکل آواز نہیں دیتا - جیسے اولوالعزم (صاحب ارادہ) کے دونوں واو لکھے جاتے ہیں پڑھے نہیں جاتے - انگریزی میں اس قسم کے بہت سے حروف ہیں جنھیں خاموش کہا جاتا ہے - فارسی زبان میں بھی یہ واو ابتدا سے ملتا ہے - چنانچہ خوش ، خواہش ، خورش ، خورشید ، خود وغیرہ الفاظ میں و کی آواز بالکل نہیں نکلتی - وجہ یہ ہے کہ اس زبان میں "خو" ایک مستقل آواز تھی جیسے اوستا میں "ہو" اور رگ وید میں "سو" کے حروف سے تحریر کی گئی ہے - ہم فارسی "خو" کو محض ناواقفیت کی بنا پر "خ" بولتے ہیں - حالانکہ اس کی صحیح آواز زبر کے ساتھ ادا ہوتی تھی - اس کا ثبوت قدیم ایرانی شعرا کے یہاں ملتا ہے جنھوں نے "خوش" کو "خش" کے قافیے کے ساتھ اشعار میں استعمال کیا ہے - صاحب فرہنگ جہانگیری نے بھی اس کی تشریح کی ہے اور ثبوت میں فارسی شعرا کا کلام بھی پیش کیا ہے - غرض واو معدولہ عربی کے علاوہ فارسی کی اس آواز میں بھی مل جاتا ہے لیکن ہماری بھاشا میں ایسی کوئی آواز نہیں ہے جس کے لیے واو معدولہ کا استعمال ہوتا ہو اس لیے اس کو اردو زبان کا حرف بتانا درست نہیں -

واو معروف عربی کے الفاظ مقبول ، منظور وغیرہ میں ملتا ہے اور واو مجہول مولا ، دولت وغیرہ میں لیکن حقیقت میں یہاں واو کا استعمال

محض طویل حروف علت (یٓ، یٓ) کے جزو کی حیثیت سے ہوا ہے کیونکہ عربی لپی میں طویل آوازیں دو حروف کو ملا کر ہی تحریر کی جاتی ہیں - لپی کی یہی مجبوری ہے کہ ہم بھی اردو میں ان آوازوں کو اسی طرح تحریر کرتے ہیں - مثلاً ہورا ، ٹھور وغیرہ بلکہ ان دو آوازوں کے علاوہ ہم ایک اور طویل آواز ی کو بھی (جس سے عربی زبان خالی ہے) اسی واو کی مدد سے لکھتے ہیں - مثلاً لوگ ، سوچا وغیرہ لیکن لپی کی اس خصوصیت کی بنا پر کہ یہ ان طویل آوازوں کو واو کے سہارے کے بغیر ظاہر نہیں کر سکتی واو کو اردو زبان کی اصلی آواز قرار نہیں دیا جا سکتا -

دراصل واو کی اصلی آواز وہ ہے جو ورق ، وزیر ، تحویل وغیرہ میں سنائی دیتی ہے اور یہ آواز پاک و ہند کی موجودہ زبانوں میں بھی سننے کو مل جاتی ہے لیکن ان میں یہ "ب" کی آواز کا بدل ہوتی ہے - یہی وجہ ہے کہ ان تمام زبانوں میں و اور ب کی قرار واقعی تفریق نہیں ملتی نہ تلفظ میں نہ تحریر میں - مثلاً پنجابی میں ایک ہی لفظ کو کبھی و سے لکھتے پڑھتے ہیں کبھی ب سے - برج بھاشا میں واو کی بہ نسبت ب بولنے کا رجحان زیادہ ہے - چنانچہ برج والے ویدک وچن(= ایرانی اُخن) کو بچن اور عربی جواب کو جباب بولتے ہیں - سندھی ، گجراتی اور مرہٹی میں و اور ب کے الگ الگ حروف مقرر ہیں لیکن بنگالی اور اڑیا میں دونوں آوازوں کے لیے ایک ہی حرف ملتا ہے - اس کے علاوہ ایک لفظ ایک زبان میں و سے لکھا پڑھا جاتا ہے تو دوسری میں ب سے - یہی حال دکنی زبانوں کا ہے - تامل ، کنڑی اور تو لو میں علامت مستقبل واو لیکن اڑیا - اودھی اور بھوجپوری میں ب ہوتی ہے بلکہ تامل زبان میں بھی و اور ب میں کوئی تفریق نہیں ملتی - چنانچہ اس کا مستقبل و اور ب دونوں کے اضافے سے بنتا ہے اور حالیہ آغاز کلاسیکی تامل اور ملیالم دونوں میں مادے پر وان ، بان کے لاحقے اضافہ کرکے بنایا جاتا ہے - دوسری زبانوں کا ابتدائی واو کنڑی میں ب ہو جاتا ہے - غرض اس پورے برصغیر میں مشرق سے مغرب اور شمال سے جنوب تک جتنی زبانیں آج کل بولی جا رہی ہیں ان سب کی لپیاں و اور ب کے

استعمال میں غیر محتاط ہیں جس کے باعث ان کی آوازوں میں بھی گڑبڑ پیدا ہو گئی ہے اور یہ بے ضابطگی بتاتی ہے کہ واو کی آواز ان کی بنیادی آوازوں میں شامل نہیں ہے -

اردو میں دوسری زبانوں کی طرح و اور ب کا ایسا تبادل تو نہیں ملتا البتہ اس میں جہاں جہاں واو نظر آتا ہے (چاہے اس کی آواز سنائی دے چاہے نہ سنائی دے)وہ پیش کا بدل ضرور ہوتا ہے اور اس خصوصیت میں دوسری زبانیں بھی اس کی شریک ہیں - پیش کو واو سے بدل لینے کی رسم آج کی نہیں ہزاروں سال کی ہے اور ویدک زبانوں سے آج تک تسلسل کے ساتھ چلی آ رہی ہے - ہماری بھاشا میں اس رسم کی ابتدا بھی رگ وید سے ہوئی ہے جس میں قدیم ہند یورپی زبان کے دستور کے مطابق پیش اور واو کا تبادل عام ہے - چنانچہ ہند یورپی کی مثالیں یہ ہیں - اوستا ونستا (تو جانتا ہے)=یونانی آوئستھ=ویدک ویتھ ، اوستا نسانم (لاش)=ویدک تَناوم ، اوستا باُئن ، بَئن (وہ تھے)=ویدک ابھُوَن ، خود رگ وید میں بھی ایسے متبادل روپ ملتے ہیں جن میں سے ایک کا واو دوسرے روپ میں پیش سے تحریر ہے - مثلاً وش (چاہنا) اور اُش ، ورو اور اُرو (کشادہ) ، وپ اور اُپ (بُونا) وغیرہ بلکہ اس میں پیش کو یؔ سے بھی تحریر کیا گیا ہے - چنانچہ بھاشا کا ءجو ضد کے معنوں میں مستعمل ہے رگ وید کے ان روپوں میں ملتا ہے - مثلاً یؔ ی بَ ن (=بھاشا اُجوتن ، ڈھیلا کرنا ، کھولنا ، سوکت ۱۰-۶۳-۱۴) ، یَ ی ت نُ (= بھاشا اُجوتنا ، ڈھیلا کرنا ، کھولنا ، سوکت ۸-۱۸-۱۰ ، ۱۱) ، یَ ی ت (بھاشا اُجوت ، ڈھیلا کر ، کھول ، سوکت ۸-۱۸-۱۱) وغیرہ - لیکن بھاشا میں واو کا کہیں سراغ نہیں ملتا - یہی وجہ ہے کہ گرو گرنتھ صاحب میں فارسی عربی الفاظ کے اصلی واو کو بھی بھاشا کے مزاج کے مطابق پیش سے لکھا گیا ہے - مثلاً کبیر داس کہتے ہیں :

کیا اُجُو پاک کیا مُنہ دھویا کیا مسیت سر لایا

(وضو)

جو دل نہ کپٹ نواج گنجا رہ کیا ہج کا بے جایا
(نماز گزارو ، حج ، کعبے)

اب میں ذیل میں اردو کے ان الفاظ کی تشریح پیش کرتا ہوں جن میں آج کل واو اپنی اصلی آواز دے رہا ہے - ہم ضمیر واحد غائب کے لیے لفظ "وہ" استعمال کرتے ہیں - ہریانی میں واحد کے لیے "وُہ" اور جمع کے لیے "وے" استعمال ہوتا ہے اور برج بھاشا میں واحد غائب غیر فاعلی کے لیے "وا" (واکا ، اس کا) کا لفظ عام ہے لیکن یہ بھاشا کے ضمائر اشاری ہیں جس میں اشارہ قریب کے لیے ِی (زیر) اوراشارہ بعید کے لیے یُ (پیش) بولا جاتا ہے - مثلاً اردو اس (اشارہ قریب) ، اُس اشارہ (بعید) ادھر (اشارہ قریب) ، اُدھر (اشارہ بعید) - اِن (اشارہ قریب) ، اُن (اشارہ بعید) پنجابی اِہ (اشارہ قریب) ، اُہ (اشارہ بعید) ، اتھے (اشارہ قریب) اُتھے (اشارہ بعید) ، برج بھاشا اِت (اشارہ قریب) ، اُت (اشارہ بعید) ، بنگالی اے کھن (اب ، اشارہ قریب) اوکھن (تب - اشارہ بعید) وغیرہ - اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ ہماری ضمیر واحد غائب کا ابتدائی واو پیش کا بدل ہے یعنی اردو "وہ" اور ہریانی "وُہ" دونوں کی اصل "اُو" (ی) ہے اور ہریانی جمع غائب "وے" کی اصل یُ ی ہے جیسا کہ کبیر داس کہتے ہیں :

بُت پوج ہندو موئے ترک موئے سرنائی
یُ یِ لے جارے یُ یِ لے گاڑے تیری گت دھو نہ پائی

اور برج بھاشا کے "وا" کی اصل یُ ی ہے - چنانچہ کبیر داس لکھتے ہیں -

یُ ئی کو کھیے سہج متوارا
پیوت رام رس گیان بی چارا
(گرو گرنتھ ، ص ۳۲۷)

کہت کبیر لولاگ رہی ہے جہاں بسے دن راتی
تی ئی کاسم ی ہ پر جانے تی • تو سدا ابناسی

(گرو گرنتھ ، ص۳۴۴)

آخری وہ ہے میں "تی ئی" کے علاوہ ی • (اردو وہی) اور تی ، (اردو وہ) دو اور لفظ بھی دیے ہیں - پنجابی میں بھی اردو وہ کو اَو اور آواور اردو وہی کو آوئی بولتے ہیں چنانچہ اردو "وہی" کی اصل "اوئی" ہی ہے -

اردو "وہاں" جگہ کے لیے بطور اشارہ بعید کام میں آتا ہے - دہلوی (ہریانی) میں اس کے لیے "واں" کا لفظ مستعمل ہے جو دکنی ادب کے علاوہ دہلوی شعرا کے کلام میں بھی جا بجا ملتا ہے اور کسی کسی علاقے میں آہاں بھی سننے میں آتا ہے - چنانچہ روی داس کہتے ہیں -

اب موہ کھوب دتن گھہ پائی
اوہاں کھیر سدا میرے بھائی

(گرو گرنتھ ، ص ۳۴۵)

آیا دان سدا مسہور
اوہاں گنی بسہہ ماسور

(گرو گرنتھ ، ص ۳۴۵)

یہی لفظ راما نند کے کلام میں بھی آیا ہے -

بید پر ان سبھ ویکھے جُوے
اوہاں تو جائیے جو ای ہاں نہ ہوئے

(گرو گرنتھ ، ص ۱۱۹۵)

نام دیو اس کے لیے لفظ "اوبھے" استعمال کرتے ہیں جو غالباً ان کے وطن کی بولی کا اثر ہے :

ای بھَے بیٹھل اُوبھَے بیٹھول بیٹھل بن سنسار نہی
تھان‌تھنتتر‌ناما پرن وے‌بھور رہیو توں سرب سہی

غرض اردو وہاں کی اصل " یُ یٰ ن " ہے - وہ ، وہی اور وہاں کی ہ کی تشریح آگے کی جائے گی - اردو ویسا کی اصل یٰ یِ سا (اس کے مانند) ہے جو مختلف تحریروں میں میری نظر سے گزری ہے لیکن اس وقت ان کے حوالے میرے سامنے موجود نہیں ہیں -

آون ، جاون اگرچہ اردو کے مصادر نہیں ہیں لیکن دوسری زبانوں میں مستعمل ہیں جن میں معلول‌الاواخر مادوں پر لاحقے اور خاتمے جوڑنے سے قبل ایک پیش کا اضافہ کر دیا جاتا ہے - چنانچہ آون=آئُن ، جاون=جائُن - ان زبانوں میں فعل شرطیہ کے روپ آوے ، جاوے اسی اصول پر بنتے ہیں - چنانچہ آوے=یٰ و ی ، جاوے =ج یٰ ی ، پیوے =پ، یٰ ی وغیرہ اردو کا اصول یہ ہے کہ خالص مادوں پر (خواہ معلول الاواخر ہوں خواہ صحیح الاواخر) لاحقے اور خاتمے بڑھائے جاتے ہیں - مثلاً اردو آئے=یٰ یِ ، جائے=ج یِ ، پئے=پ ی ، پ ی وغیرہ اسی طرح اردو کے اس جمع حاضر میں اگرچہ واو تحریر میں " نظر آتا ہے - جیسے آو ، جاو ، پیو لیکن بولا نہیں جاتا چنانچہ آو=یٰ یٓ ، جاو= ج یٓ ، پیو=پ یٓ ، پ یٓ وغیرہ - اردو کے حاصل مصدر میں بھی جو مادے پر "آو" کے اضافے سے بنتا ہے اور کسی حالت یا کیفیت کو ظاہر کرتا ہے واو صرف لکھا جاتا ہے بولا نہیں جاتا جیسے تاو= ت یٓ، چاو=چ یٓ ، بناو=بَ نٰ یٓ وغیرہ - البتہ وہ حاصل مصدر جن کے آخر میں ٹ آتی ہے واو کی آواز دیتے ہیں جیسے سجاوٹ ، بناوٹ وغیرہ لیکن یہ روپ ان زبانوں کے ہیں جن میں مادے پر لاحقے اور خاتمے لگانے سے قبل ایک پیش بڑھا دیا جاتا ہے - چنانچہ سجاوٹ=سَ ج یُ ٹ، بناوٹ=بَ نٰ یُ ٹ - اس کا مزید ثبوت یہ ہے کہ بھاشا میں " آیُ " کی آواز " آو " (یٓ) ہو جاتی ہے جیسے کھلونا=ابتدائی کھلاون + آ/

(تسبی) ، بچھونا = بچھاون +آ وغیرہ چنانچہ اسی اصول کی رو سے سجاوٹ اور بناوٹ کے دوسرے روپ سجوٹ ، سجوٹی اور بنوٹ بنوٹی بھی دیکھنے سننے میں آتے ہیں -

اردو میں جن مشتقات میں واو کی آواز آجکل صاف سنائی دیتی ہے اور جنھیں عام طور پر حاصل مصدر کہا جاتا ہے - مثلاً چڑھاوا، دکھاوا، بہلاوا وغیرہ حقیقت میں اردو کے حالیہ آغاز ہیں جو حالیہ تمام پر ی ی کے اضافے سے بنائے جاتے ہیں اور جن پر علامت مصدری "نا" بڑھا کر متعدی بالواسطہ تیار ہوتا ہے جیسے چڑھا سے چڑھاوا - چڑھاوانا جو اردو کے لہجے کے مطابق چڑھوانا بولا جاتا ہے اور اس کا اصول یہ ہے کہ رکن ماقبل آخر سے پہلے کی تمام اصوات علت مختصر کر دی جاتی ہیں جیسے دیکھ سے دکھانا، سیکھ سے سکھانا، بھاڑو سے بھڑوا،گھوڑی سے گھڑیا وغیرہ چنانچہ دکھوانا کی تشریح یوں ہے - مادہ دیکھ ، حالیہ تمام دیکھا ، حالیہ آغاز دکھاوا (دیکھا ی ی) - مصدر متعدی بالواسطہ دکھوانا (= دیکھا ی ی نا) - مادہ جل ، حالیہ تمام جلا ، حالیہ آغاز جلاوا (جلا ی ی) - مصدر متعدی بالواسطہ جلوانا - (=جلا ی ی نا) - اس کا مزید ثبوت یہ ہے کہ دکھاوا کو عام طور پر دکھوا (بردکھوا) - بلاوا اور پلٹاوا کو پلٹوا بھی بولا جاتا ہے جن میں واو کی آواز قطعی نہیں نکلتی - ی ی ی کو "اوا" بولنے کا رجحان اردو میں عام ہے - چنانچہ ناؤ - نوّا (= نا ی ی - ن ی ی) ، کماؤ ، کمّوا (کما ی ی - ک م ی ی) وغیرہ - اس کے مزید ثبوت کے لیے کبیر داس کا ایک دوہا دیا جاتا ہے جس میں کمّوا کا صحیح تلفظ تحریر ہوا ہے -

جیوت پتر نہ مانے کو دموئے سراوہ کراہی

پتر بھی بپرے کہہ کہوں پاوہ ک ی ی کو کر کھاہی

(گرو گرنتھ ، ص ۳۳۱)

اردو ہی کی طرح مرہٹی میں بھی دکھاوا - اٹھاوا وغیرہ حالیہ آغاز ملتے ہیں جن سے مصادر متعدی بالواسطہ تیار ہوتے ہیں -

اردو میں کچھ الفاظ مثلاً جیوں یا جوں (جس طرح) ، تیوں یا توں (اُس طرح) ، یوں (اس طرح) ، کیوں (کس طرح) بطور متعلق فعل (طریقہ) استعمال ہوتے ہیں - ان کی اصل علی الترتیب ج یؔ ن ، ت یؔ ن ، ی یؔ ن ، ک یؔ ن ہے اور انہیں سے ملتے ہوئے ایک اور لفظ "دوں" (اُس طرح) کی اصل جو دوسری زبانوں مثل ہریانی وغیرہ میں مستعمل ہے ی یؔ ن ہے -

واو کے بیان میں اردو کے چار فاعلی لاحقوں و- وا- وال یا وار- والا یا وارا کی تشریح باقی ہے جو دراصل ایک ہی سلسلے کی کڑیاں ہیں اور اردو میں ان سے بکثرت اسم فاعل بنائے جاتے ہیں جیسے ناو ، کھاو ، پٹیو ، بھاڑو ، لیوا ، دیوا ، لیوال ، دیوال ، بھاڑ والا ، گاڑی والا وغیرہ - ان میں سے پہلے دو بنیادی اور دوسرے دو ایزادی ہیں جو "وا" پر حشوی ل کے اضافے سے وجود میں آئے ہیں اور حشوی لام کا استعمال زبانوں کے مہاراشٹری گروہ کا ایک عام رجحان ہے جو خود اردو زبان کے دوسرے روپوں میں بھی نظر آتا ہے - مثلاً سکھانا سکھلانا ، دکھانا دکھلانا ، بتانا بتلانا ، جِینا جلانا ، پینا پلانا ، کھانا کھلانا ، رونا رلانا ، سونا سلانا ، دھونا دھلانا ، کہنا کہلوانا ، دینا دلوانا ، بٹھانا بٹھلانا بٹھالنا ، نہانا نہلوانا وغیرہ - مرہٹی میں حشوی لام کا استعمال اردو سے بھی زیادہ ہے - چنانچہ اس میں اڑا ، اڑلا ، اڑلالا وغیرہ جیسے حالیہ تمام اور اپنا ، آپنا ، آپلا ، جسا ، جسلا ، جسلالا (جیسا) ، تسا ، تسلا ، تسلالا (تیسا) جیسے بہت سے روپ دیکھنے سننے میں آتے ہیں -

اردو کے ان چاروں لاحقوں کی اصل یؔ ، یؔ یٔ ، یؔ یٔ ل ، یؔ یٔ ل ہے لیکن یہ ہمارے یہاں واو سے تحریر ہو رہے ہیں - ان میں سے پہلے لاحقے سے جو اسم فاعل بنتا ہے اگرچہ اس کے مکتوبی روپ میں واو نظر آتا ہے لیکن تلفظ میں واو کی آواز بالکل سنائی نہیں دیتی جیسے بھاڑو ، جھاڑو ، اتارو وغیرہ - دوسری قسم کے اسما میں واو کی آواز کبھی سننے میں آ جاتی ہے جیسے لیوا (لے روا = لے یؔ یٔ) ،

دیوا (دے وا = دے ئ یٗ) اور کبھی بالکل نہیں نکلتی جیسے بھڑوا (بھ ڑ یٗ)، رنڈوا (ر ن ڈ یٗ)، بٹوا (ب ٹ یٗ) وغیرہ البتہ تیسرے اور چوتھے لاحقے میں واو کی آواز صاف سنائی دیتی ہے جیسے لیوال (لے وال = لے ئ یٗ ل)، دیوال (دے وال = دے ئ یٗ ل)۔ اگر وال، گڑھ وال، سلک وال، چکوال وغیرہ۔ گھر والا (گھ ر یٗ لٗ)، پار والا (پا ر یٗ لٗ)، دارو والا، ساہ والا (شہ بالا۔ دولھا کا ہم سر کم چھوٹا لڑکا) وغیرہ۔ اس کے علاوہ یہ لاحقے بعض الفاظ میں وار اور وارا کی شکل میں بھی نظر آتے ہیں کیونکہ بھاشا میں ل اور ر کا تبادل عام ہے۔ جیسے نسوار (سونگھنے کی ایک دوا) = ناس ئ ر، ہڑ وار (قبرستان) = ہا ڑ یٗ ر (ہاڑ = ہڈی)۔ تلوار، کلوار، ہتوار وغیرہ بلکہ ایک ہی لفظ سے مختلف لاحقوں کے ذریعے بنے ہوئے اسمائے فاعل بھی ہمارے یہاں کافی مل جاتے ہیں جیسے بھاڑ سے بھاڑو، بھڑوا، بھڑ وال، بھاڑ والا، پار سے پارو، پاروا، پار وال، پار والا وغیرہ۔

الحاصل واو کی آواز قدیم ایرانی زبان سے دراوڑی بھاشا ؤں میں منتقل ہوئی ہے۔ اس کا ہماری بنیادی آوازوں میں کہیں سراغ نہیں ملتا۔ واو کا حرف ہماری لپیوں میں پیش کی جگہ استعمال ہونے لگا ہے یا طویل حرف علت کے دوسرے جزو کی حیثیت سے لکھا جاتا ہے لیکن اس کا ہمارے تلفظ سے واسطہ نہیں۔ اس کے علاوہ یہ حرف ایرانی زبان کی طرح ہماری لپیوں میں بھی حروف کے ادغام سے پیدا ہو جاتا ہے لیکن وہاں یہ تلفظ میں اپنی آواز نہیں دیتا۔ چنانچہ جو لوگ اس مقام پر اس کی آواز نکالتے ہیں وہ مکتوبی روپ سے دھوکا کھا کر ایسا کرتے ہیں۔

اردو لپی میں طویل حروف علت 'اے، اِے، اِی کے جزو کی حیثیت سے اور سندھی (ادغام) کے باعث ی کے کثیر تعداد اندراجات کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ یہاں میں ی کے حشوی داخلے کے متعلق وہ بات کہنا چاہتا ہوں جو پراکرت کے گرامر نویسوں نے اپنی اپنی کتابوں میں بیان کی ہے۔ ہیم چندر سوتر ۱ - ۱۸۰ میں ی کے اندراج

کو یا شرقی کا نام دیتا ہے اور کہتا ہے کہ پراکرت میں ڈھالتے وقت جب سنسکرت الفاظ کے ک ، گ وغیرہ حروف ساقط ہو جاتے ہیں تو باقی ماندہ خلا یعنی یَ یا یُ کی آوازوں (بشرطیکہ ان سے قبل بھی یَ یا یُ ہو) ہلکی ی کی سی نکالتی ہے جیسے سنسکرت نگر=پراکرت نیز، سنسکرت پاتال=پراکرت پایال اور اگر ان باقی ماندہ یَ یا یُ سے قبل یَ یا یُ نہ ہو تو پھر وہی یَ ، یُ باقی رکھنے چاہئیں اور ان کی جگہ ی کی آواز نہیں نکالنی چاہیے - چنانچہ سنسکرت لوکسیہ (دنیا کا) کو پراکرت میں لُوِیسیہ کے بجائے لُوئِسیہ پڑھنا چاہیے یعنی ہیم چندر کے نزدیک صرف دو یَ یا یُ) کے درمیان ی کا اندراج کرنا چاہیے لیکن چنڈ اپنی کتاب پراکرت لکشن کے سوتر ۳ - ۳۵ میں اَوَرن (خلا) کو اس وقت ی سے پر کرنا جائز سمجھتا ہے جب کہ اس کے بعد یَ یا ی آئے یعنی اسے قبل کے حروف علت سے کوئی سروکار نہیں ہے - چنانچہ اس کے نزدیک سنسکرت کاکا=پراکرت کایا - سنسکرت ناگا=پراکرت نایا کے درست ہونے کے ساتھ ساتھ سنسکرت کاک=پراکرت کاؤ، سنسکرت ناگ=پراکرت ناؤ ہی درست ہوں گے (سوتر ۳ - ۳۴) - در روچی نے اس اندراج کا ذکر ہی نہیں کیا - البتہ مار کنڈے پراکرت سروسو میں کہتا ہے کہ درمیانی یا آخری یَ یا یِ کو ی کی طرح بولنا چاہیے (۲ - ۲) لیکن لکشمی دھر کے یہاں ہر مقام پر یَ دکھائی دیتا ہے - مثلاً سنسکرت لوک=پراکرت ل ی - سنسکرت ساگر=پراکرت سُ یَ ر - سنسکرت راجا=پراکرت را آ (سوتر ۱-۳-۸) اس کے علاوہ جین پراکرت کے مسودات میں ی ، ی ، یِ بلکہ بعض اوقات یَ کے بعد بھی ی تحریر کی گئی ہے -

ان تمام اختلافات کی وجہ یہ ہے کہ بھاشا کے الفاظ کو جب سنسکرت میں داخل کیا گیا تو اس کے حرف علت یعنی ہمزہ (یَ، یِ ، یُ) کی جگہ کوئی نہ کوئی حرف صحیح درج کر دیا گیا تھا جب پراکرت کے گرامر نویس سنسکرت سے پراکرت ڈھالنے بیٹھے اور انھوں

موازنہ کیا تو سنسکرت
نے سنسکرت روپوں کا بھاشا کے روپوں سے
میں بڑھائے ہوئے حروف کے متعلق تو یہ سمجھا اور سمجھایا کہ یہ
پراکرت میں ساقط کر دیے گئے ہیں اور اپنے اس عمل کو سقوط صحیحہ کا
نام دے دیا اور بھاشا کی ہمزہ کو یہ کہہ دیا کہ یہ حروف کے
ساقط ہونے پر باقی رہ گئی ہے لیکن وہ یہ نہیں سمجھ سکے کہ یہی
پراکرت کا اصلی اور ابتدائی حرف علت تھا جسے وہ کبھی تو ی بنا
رہے ہیں اور کبھی ہمزہ کہتے ہیں۔ چنانچہ آج بھی اردو میں پائل اور
پایل، پنچائت اور پنچایت نرائن اور ناراین جیسے جو دوہرے روپ
نظر آتے ہیں اس کی وجہ یہی ہے کہ ہزاروں سال سے لوگ اس حقیقت
کو فراموش کر چکے ہیں کہ ان روپوں میں حرف علت اصلی اور ی
حشوی ہے اور ان کے ابتدائی روپ پائل، پنچائت اور نارائن ہیں۔

واو کی طرح عربی زبان میں ی کی بھی تین قسمیں ہیں۔ ان میں
سے پہلی قسم وہ ہے جو لکھی جاتی ہے بولی نہیں جاتی چنانچہ عیسیٰ، موسیٰ،
ادنیٰ، اعلیٰ وغیرہ کو عیسا، موسا، ادنا، اعلا پڑھا بولا جاتا ہے۔
ایسی ی اردو میں صرف عربی الفاظ میں نظر آتی ہے۔ ی کی دوسری
دو قسمیں معروف و مجہول ہیں عربی میں ان کی آوازیں ی اور یٖ ہیں جو
بالترتیب تقدیر اور خیرات میں سنائی دیتی ہیں۔ اردو میں ان
کے علاوہ ایک اور آواز "یؔ" بھی ہے جس سے عربی زبان خالی ہے
لیکن اردو "میرا" "تیرا" میں سنائی دیتی ہے اور ی سے ہی لکھی
پڑھی جاتی ہے۔ اردو میں ی کا یہ استعمال حروف علت کے جزو کی حیثیت
سے ہوتا ہے جس کا ذکر بیشتر گزر چکا ہے۔ چنانچہ محض کتابت کے
اس طریقے کے باعث ہم اس ی کو اپنی بھاشا کی آواز نہیں کہہ سکتے۔

ی کی اصلی آواز عربی کے یمین (داہاں) اور یسار (بایاں) اور
فارسی کے یوغ (جوا) اور یل (پہلوان) کے تلفظ میں نکلتی ہے۔ یہ
آواز پاک و ہند کی زبانوں میں اگر کہیں سنائی بھی دیتی ہے تو جیم
کا بدل ہوتی ہے جیسے یمنا اور جمنا۔ باج اور جانچ (مانگنا) اور یہ اثر
بھی قدیم ہند یورپی زبان کا ہے جو سنسکرت کے ذریعے یہاں پہنچا ہے

کیونکہ بھاشا کی جیم ویدک و سنسکرت میں جا بجا ی سے لکھی ہوئی ملتی ہے - چنانچہ پراتی شا کھیہ میں جہاں رگ وید کی آوازوں سے بحث کی گئی ہے وہاں یہ لکھا ہے کہ ویدک ابتدائی ی کو جیم پڑھنا چاہیے - لیکن میں نے رگ وید کی تحریر میں یہ پابندی بھی نہیں پائی بلکہ بھاشا کی برج (ابتدائی ، درمیانی ، آخری) کو ی سے لکھا ہوا دیکھا ہے - مثلاً بھاشا جائن (جانا)= ویدک ی دن ، بھاشا بیج =ویدک ِدر ی ، بھاشا اَج (آج)=ویدک یَ د ی ، بھاشا یُعِل (بِعلی)=ویدک و د یَ ت وغیرہ - اب اگر اردو کی کسی معاصر زبان میں ی ملتی ہے تو اسے ویدک و سنسکرت کی تقلید سمجھنا چاہیے -

اردو میں ایسی کوئی ی نہیں بولی جاتی جو بھاشا کی ج کا بدل ہو البتہ اس کی ی کہیں کہیں ابتدائی زیر (ِی) کی نمائندگی ضرور کرتی ہے اور ایسی مثالیں دوسری بھاشاؤں میں بھی آسانی سے مل جاتی ہیں لیکن یہ رسم بھی ہمارے یہاں ویدک و سنسکرت سے آئی ہے جو ایرانی زبان کی خصوصیت ہے مثلاً ویدک آواَین=اوستا آوائن (وہ نیچے آئے) ، اوستا ر یِ (چمک)=فارسی جدید رائے ، ویدک یجّ (=فارسی یز ، قربانی کرنا) اور اشٹ (قربان کیا ہوا) ، اش (غذا) اوریش وغیرہ -

اب میں اردو کے وہ الفاظ پیش کرتا ہوں جن کی ی اپنی اصلی آواز دے رہی ہے اور ابتدائی ی کی نمائندگی کرتی ہے -

ہم لوگ اردو میں اشارہ قریب کے لیے "یہ" کا لفظ استعمال کرتے ہیں اور ہریانی میں اس کے لیے "یو" مستعمل ہے لیکن دوسری زبانوں مثل پنجابی وغیرہ میں اہ اور اے کے لفظ بھی ملتے ہیں چنانچہ جیسا کہ واو کے سلسلے میں بیان ہو چکا ہے کہ بھاشا میں جہاں اشارہ بعید کا کام پیش سے لیا جاتا ہے وہاں اشارہ قریب کےلیے زیر مستعمل ہے - اردو "یہ" کی اصل اے ، ہریانی "یو" کی اصل یِ.یَ اور برج بھاشا وغیرہ کی غیر فاعلی ضمیر اشارہ "یا" (یا کو=اردو اس کو) کی اصل ی یَ ہے - تام ویو کہتے ہیں -

وُرہا ساسئوں کرت ٹھکوری جادوں اتے پھل ہائے
کر کرہا کری جن اوپر اپنے نام دیو ہری گن گائے
گرو گرنتھ ، ص ۶۹۲)

کبیر داس کہتے ہیں :
بُھس بُھس رووے کبیر کی مائی
اے بارک کیسے جیوہ رگھو رائی
جو کچھوا ہا تہاں کچھو ناہی پنچ تت تہ ناہی
آڑا پنگلا سکھمن بندے اے اوگن کت جاہی
(گرو گرنتھ ، ص ۳۳۴

کتن کو پرش کتن کی ناری
ی ی تت لیہو سریر بچاری
(گرو گرنتھ ، ص ۳۳۱

کوچ بچارے پھوئے پھال
ی ی منڈیا سر چڑھیو کال
جب جرے تب ہوئے بھسم تن رہے کرم دل کھائی
کاچی گاگر نیرپرت ہے ی ی تن کی یہی بڑائی

روی داس کہتے ہیں :
جن روی داس رام رنگ راتا
ی ی گر پرساو نرک نہیں جاتا
(گرو گرنتھ ، ص ۴۸۶

اردو "ہی" ایک مرکب لفظ ہے جس میں تاکیدی جزو بھی شامل ہے اور تاکیدی جزو کا بیان آگے آئے گا اس لیے وہیں اس کی اصل پر بھی بحث کی جائے گی البتہ اردو میں یہاں کا لفظ قریبی مقام کی جانب

اشارہ کرنے میں استعمال ہوتا ہے اور تاکید کے لیے اسے یہیں بولا جاتا ہے لیکن ہریانی میں اسے "یاں" بولتے ہیں جو دہلوی شعرا کے کلام کے علاوہ دکنی ادب میں بھی بکثرت ملتا ہے اور بعض مقامات پر "اہاں" بھی سننے میں آتا ہے — نام دیو کے یہاں یہ لفظ ان کی مقامی زبان کے اعتبار سے "ای بھے" نظر آتا ہے -

ای بھے بیٹھل اوبھے بیٹھل بیٹھل بن سنسار نہی
تھاں تھننترناسا پرن وےبور رہیو توں سرب سہی

(گرو گرنتھ، ص ۴۸۵)

راما نند اسے ای ہاں بولتے ہیں :

بید پران سبھ دیکھے جوئے
اوہاں تو جائیے جو ای ہاں نہ ہوئے

(گرو گرنتھ، ص ۱۱۹۵)

کبیر داس بھی ای ہاں ہی کہہ رہے ہیں :

رکھو لدے کا ہوئے بناس
آگے نرک ای ہاں بھوگ بلاس

چنانچہ اردو "یہاں" کی اصل "ی ی ں" ہے لیکن "وہاں" کی طرح اس کی ہ پر بھی آگے روشنی ڈالی جائے گی -

اردو، پنجابی، دکنی، برج بھاشا وغیرہ زبانوں کے حالیہ تمام میں "یا" کا خاتمہ کثرت سے ملتا ہے لیکن اس کی تشریح سے پہلے یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ بھاشا میں مادے پر مصدر یا حالیہ تمام وغیرہ کے اضافے سے قبل کہیں پیش کا اندراج ہوتا ہے کہیں زیر کا اور کہیں خالص مادہ ہی بنیاد کا کام دیتا ہے - مثلاً

مصادر

پنجابی : چلن ، چلنا ۔ کرن ، کرنا ، سوئ ن ، سونا۔ جائن، جانا ۔

برج بھاشا : چلن ، چلنو (چ ل نٗ) ، چلبو (چ ل ب) ، سوء نو ، سوء بو ، جاء نو ، جاء بو ۔

اردو : چلنا ، کرنا ، سونا ، جانا ۔

حالیہ تمام

پنجابی : چلیا ، کریا ، کھایا ، ہویا ۔

برج بھاشا : چلو ، چلیو ، سوؤ ، سویو ، کھاؤ ، کھایو ۔

اردو : چلا ، سویا ، کھایا ۔

ان مثالوں سے واضح ہے کہ اردو میں صرف معلول الاواخر مادوں سے بننے والے حالیوں میں ی کا اندراج ہوا ہے جب کہ پنجابی اور برج بھاشا میں صحیح الاواخر مادوں کے حالیے بھی ی سے خالی نہیں ہیں ۔ وجہ یہ ہے کہ ان زبانوں کے روپوں میں حروف علت کے ادغام سے ی پیدا ہو گئی ہے جو صرف مکتوبی ہے ملفوظی نہیں ہے البتہ معلول الاواخر مادوں سے بننے والے حالیوں کی ی تمام زبانوں میں صاف سنائی دیتی ہے جس کا سبب یہ ہے کہ بولنے والوں نے ان کی کتابت کے اثر سے اپنا تلفظ بگاڑ لیا ہے کیونکہ پنجابی اور برج بھاشا کے تمام حالیوں کی ی بلا استثنا ادغام کے باعث وجود میں آئی ہے ۔ چنانچہ جس طرح چلیا کی اصل چل آ اور سنیا کی اصل سن آ ہے اسی طرح ہویا کی اصل ہو ءِ آ اور کھایا کی اصل کھا ءِ آ ہے ۔ اردو کے حالیوں میں بھی ممکن ہے کہ پنجابی اور برج بھاشا کے حالیوں کی طرح حروف علت کے ادغام سے ی کا اندراج ہوا ہو لیکن اغلب یہ ہے کہ ان میں دو حروف علت کے درمیان ی داخل کر دی گئی ہے یعنی اردو حالیہ تمام آیا= آ آ ، کھایا= کھا آ، سویا= سو آ ، رویا= رو آ وغیرہ اور اس رجحان کا بیان ہیم چندر کی "یا شرتی" کے ضمن میں ہو چکا ہے ۔ پراکرت کے

گرامر نویسوں اور سنسکرت کے ڈراما نگاروں کی تحریروں کے بموجب پراکرت میں کا آ، را آ، سو آ وغیرہ کے روپ بھی رائج تھے لیکن ایرانی اثرات کے تحت ان کے درمیان بھی ی کا اندراج کر دیا گیا غرض سوہ آ اور سو آیا کہا ء آ اورکہا آ دونوں روپوں پر ایرانی اصول کتابت کا یکساں طور پر عمل ہوا ہے اور یوں کسی زبان کے حالیہ تمام میں ی اصلی اور بنیادی حیثیت نہیں رکھتی - چنانچہ یہ حالیے اپنی اصلی شکل میں "یا" کے بجائے " یِ یٔ" سے لکھے ہوئے گروگرنتھ کے ہر صفحے پر دیکھے جا سکتے ہیں -

فعل شرطی آئے، جائے، کھائے، پیے، چلے وغیرہ میں بھی ی مکتوبی ہے ملفوظی نہیں ہے اور ان کی اصل ئی ی، ج ی، کھا ی، ب یِ یا پ ی، چ ل یا چ لِ ہے جیسا کہ پہلے بھی بیان ہو چکا ہے -

اور دوں کے سلسلے میں یوں (=ی ںَ ن) کا ذکر بھی گزر چکا ہے -

دایاں اور بایاں میں ی کی آواز ملفوظی ہے لیکن ی یہاں بھی اصلی نہیں ہے کیونکہ ان کے دو اور رشتہ دار دائیں اور بائیں بھی موجود ہیں جن میں ی کا کہیں دور دور تک پتہ نہیں ہے - انھیں دائیں بائیں پر نسبتی "آ" کے اضافے سے دایاں، بایاں وجود میں آئے ہیں جس کی تشریح یوں ہے :

دائیں=دٔ یِ ن بائیں=با یِ ن

دایاں=دٔ یِ ن+ ی(دائیں کا) بایاں=بٔ ی ن+ آ (بائیں کا)

بھاشا کے رجحان کے مطابق غنہ[۲] و آخر میں منتقل کرنے کے بعد یہ الفاظ دٔ ی یٔ ن اور بٔ یِ یٔ ن بن گئے اور پھر اسی اوغام کی بدولت جس نے ہماری بھاشا میں ہر جگہ ی کو جنم دیا ہے یہ الفاظ دایاں اور بایاں بن کر ہمارے سامنے آ گئے - اس کی مزید وضاحت کے لیے دو اور الفاظ سائیں اور سیاں پیش کرتا ہوں کہ سیاں بھی سائیں پر

"آ" کے اضافے ہی سے بنا ہے چنانچہ سائیں + ئی = سَ ی ں ئی = سَ یِ ئی ں = سَ یِ ئیں = سیّاں ۔ اس عمل میں س کے بعد کا طویل حرف علت "آ" ہمارے لہجے کے مطابق مختصر ہو کر "یَ" رہ گیا ہے اور اس قصر کا ذکر بھی بیشتر گزر چکا ہے ۔

آخر میں فاعلی لاحقوں ی ، یا ، یارا یا یالا (بھاشال = ر) کے تجزیے کے بعد میں ی کا بیان ختم کرتا ہوں ۔ یہ لاحقے بھی ان لاحقوں کی طرح ہمارے یہاں عام ہیں جن کا ذکر واو کے سلسلے میں کیا جا چکا ہے اور ان سے بھی اردو زبان میں کتنے ہی اسم فاعل بنتے ہیں ۔ مثلاً ما ی ، کنئی (چھوٹا کنواں) ، بھائی ، ڈھائی ، میّا ، کنّیا ، بھیّا ، ڈھیّا ، بھٹیارا ، اندھیارا ، دکھیارا ، ہلیارا وغیرہ ۔ ان میں مائی ، کنئی ، بھائی، ڈھائی وغیرہ کی ی ملفوظی نہیں مکتوبی ہے اور طویل حرف علت ی کے جزو کی حیثیت سے استعمال ہوتی ہے البتہ میّ ، کنیا ، بھیّا ، ڈھیّا کی "یا" تلفظ میں سنائی دیتی ہے لیکن ان الفاظ کی اصل مائی آ ، کوئی آ ، بھائی آ ، ڈھائی آ ہے یعنی یہ الفاظ پہلے الفاظ پر ایک حشوی ئی کے اضافے سے اسی طرح بنے ہیں جس طرح گھوڑی سے گھڑیا ، بیٹی سے بٹیا وجود میں آئے ہیں ۔ بھٹیارا ، اندھیارا ، دکھیارا اور ہلیارا میں ی ملفوظی نہیں ہے (کیونکہ ان کی اصل بھائی + آرا ، آندھی + آرا ، دوکھی + آرا ، ہولی + آرا ہے) اور لفظ کے آخری ی یا یِ پر لاحقہ فاعل "آرا" کے اضافے سے ادغام کے باعث پیدا ہوتی ہے ۔

ان مثالوں سے ثابت ہے کہ ی کی آواز بھی ہماری بھاشاؤں کے لیے ہے ۔ ی کا حرف دراوڑی بھاشا میں زیر کا قائم مقام ہے یا ہماری لپی میں حروف علت کے ادغام سے پیدا ہو جاتا ہے لیکن ان مقامات پر تلفّظ میں اپنی آواز نہیں دیتا ۔ جو لوگ اس وقت اس کی آواز نکالتے ہیں وہ لپی سے مغالطے میں آ کر ایسا کرتے ہیں ۔ ہمارے یہاں حرف ی کا استعمال طویل حروف علت کے دوسرے جزو کی حیثیت سے بھی ہوتا ہے لیکن اس کا بھی ہمارے تلفّظ سے نہیں حرف لپی سے تعلق ہے ۔

اردو میں ہ کی آواز بھی بکثرت ملتی ہے عربی میں اس کی دو قسمیں ہیں ایک دو چشمی ھا اور دوسری ہائے ہوز۔ ہماری قدیم تحریروں میں ان کے مابین کوئی فرق نہیں کیا جاتا تھا لیکن اب آ کر ہم نے دو چشمی ھا کو اپنی بھاری آوازوں یعنی مہاپرانوں (کھ، گھ، بھ، پھ وغیرہ) کے لکھنے کے لیے مخصوص کر لیا ہے کیونکہ ہماری لپی میں بھاشا کی ان منفرد آوازوں کے لیے الگ سے کوئی حروف نہ تھے البتہ ہائے ہوز اپنی مخصوص آواز کے ساتھ اردو میں ہی نہیں اس برصغیر کی تمام زبانوں کے الفاظ میں بولی جا رہی ہے۔ عربی میں ہائے ہوز جب لفظ کے آخر میں آتی ہے تو اسے ہم گول تے کہتے ہیں کیونکہ اس کا تبادل ت سے ہو جاتا ہے جیسے جنۃ = جنّت اور قیامہ = قیامت لیکن ہم نے عربی کا یہ اصول نہیں اپنایا اور جنہ، قیامہ کو جنت اور قیامت ہی لکھتے چلے آ رہے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عربی کا اثر عربی کے صرف انہیں الفاظ تک محدود ہے جو ہمارے یہاں مستعار لیے گئے ہیں۔ اس کا دیسی الفاظ کی ہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

عربی کے علاوہ ہ کی آواز ہمیں ہند یورپی زبانوں میں بھی ملتی ہے جن میں یونانی، لاطینی، فارسی، ویدک اور سنسکرت وغیرہ کا شمار ہوتا ہے۔ اس لیے ہ کی ماہیت جاننے کے لیے ان زبانوں پر ایک نظر ڈالنا ضروری ہے۔ اس سلسلے میں اور ان ہند یورپی زبانوں کا یہ اصول قابل توجہ ہے کہ بعض زبانوں کا س دوسری زبانوں میں ہ سے بدل جاتا ہے پھر ہ بھی ساقط ہو جاتی ہے اور اس کی جگہ محض ہمزہ (ء) رہ جاتی ہے چنانچہ ہڈسن ولیمس نے اپنی کتاب "تقابلی گرامر کے مطالعہ کا مختصر تعارف" میں ص ۲۲ پر بیان کیا ہے کہ حرف علت سے قبل آنے والا قدیم ہند یورپی زبان کا ابتدائی س، ایرانی، ارمنی، یونانی اور ویش میں ہ ہو جاتا ہے اور دو حروف علت کے درمیان کا س بھی ہ سے بدل جاتا ہے اور پھر یہ ہ ساقط ہو جاتی ہے۔ اس کے علاوہ جوزف رائٹ نے اپنی کتاب "یونانی زبان کی تقابلی گرامر" کے ص ۱۰۶ پر لکھا ہے کہ عہد تاریخ سے قبل یونانی میں، جب دوسرا رکن یا ماقبل آخر رکن

سہاران سے شروع ہوتا تھا تو ابتدائی ہ گرجایا کرتی تھی - غرض محققین کے قول کے مطابق ہند یورپی زبانوں میں ہ کا سقوط ثابت ہوتا ہے -

میں اس اصول کو جسے محققین سقوط "ہا" سے تعبیر کرتے ہیں اور اس عام اصول کو جسے سقوط صحیحہ کا نام دیا گیا ہے اور جس کی رو سے ہر حرف کو کہیں نہ کہیں اور کبھی نہ کبھی ساقط بتایا جاتا ہے حروف کا سقوط تسلیم نہیں کرتا بلکہ اس کے برعکس میرا خیال یہ ہے کہ ان قدیم تحریروں میں جنھیں آج قدیم زبانیں کہا جاتا ہے بول چال کی آوازوں کو قلم بند کرنے کے کچھ قاعدے معین تھے اور مختلف آوازوں کے لیے مختلف حروف بھی مقرر تھے لیکن مرور ایام کے ساتھ کتابت کی یہ روائت بہت کچھ کمزور پڑ گئی اور اب ہم کو پورا علم اس بات کا نہیں رہا کہ کون کون سی آواز کس کس حرف سے قلم بند کی جاتی تھی اور ان اصولوں میں سے بہت کچھ اصول بھی ہماری دسترس سے باہر ہوگئے جن کے مطابق انھیں تحریر کیا جاتا تھا - آئندہ سطور میرے اس خیال کی مزید وضاحت اور تشریح کر دیں گی کہ ان زبانوں میں ہ کا حرف اصوات علت کے لیے بھی تحریر ہوا ہے اور اس لیے کتابت کے اس عمل کو زیادہ سے زیادہ تبادل کہا جا سکتا ہے یعنی ہ کا حرف خالص اور بے رنگ ہمزہ کی جگہ داخل کر دیا گیا ہے -

ذیل میں کچھ ایسے الفاظ پیش کیے جاتے ہیں جن میں سے بعض ہ کے بغیر تحریر ہوئے ہیں اور بعض میں ہ تحریر کر دی گئی ہے اور اس آخری مکتوبی روپ نے رفتہ رفتہ تلفظ پر بھی اپنا اثر ڈالا ہے - مثلاً

ویدک سُ (اچھا) = اوستاہ = یونانی یِ یَ (eu) ، ویدک یِ رِ ن (تختہ نرد) = رومانوی ہرینا (بالو) = انگریزی ارینا (کُشتی کی ہالی - Arena) ، انگریزی ہسٹری (History) = انگریزی اسٹوری (Story = عربی اسطورہ) ، ویدک س تھ م (میں کھڑا ہوتا ہوں) = یونانی ہ س ت م = فارسی جدید استم (استام) ، لاطینی ہیریو (چھڑی Haereo) = انگریزی ایرو (تیر - Arrow) ، یونانی ی ر س، س (جھپٹنا، ہجوم کرنا)

=انگریزی ہیراس (ستانا - Harass) ، یونانی س ہ ی ر (Sphaira)= . .
فارسی سپہر ، اوستا ، ہچ=فارسی قدیم ، ہچا= پہلوی اَچ=فارسی جدید
از (سے) ، اوستا ہنجمن=فارسی جدید انجمن ، پہلوی داہشن (عطیہ)=
ویدک دیشن=فارسی جدید دگیری داشن ، اوستا ایشم (ایندھن)=
پاژند ہیزم=پہلوی ایزم ، ہیزم=فارسی جدید ہیزم، ویدک اشٹ (آٹھ)=
اوستا اشت=یونانی آکتو= لاطینی اورکٹیو=فارسی جدید ہشت ، پہلوی
چارک (تدبیر)=پاژند چار=افغانی چار=فارسی جدید چارہ اورچار جیسے
بے چارہ اور ناچار، فارسی جدید چار اور چہار، پارچہ اور پارہ، درم اور
درہم،کد اورکدہ، است اور ہست (ہے)، اور مزد اور مزد، بار (یکبار)
اور بارہ (دوبارہ) ویدک اس (توہے) بس،اوستا ی= گاتھا اوستا ی=
فارسی جدید ی یا ی وغیرہ ۔

فارسی جدید کے ایسے الفاظ کا جو آج ہائے مختفی سے لکھے جاتے ہیں آخری حرف متحرک ہوتا تھا چنانچہ چارہ=چار ی ، کدہ=کدو ، پارہ=پار وغیرہ کہا جاتا ہے کہ ابتداءً ان کے آخر میں کاف تھا جس کی جگہ ہ نے لے لی ہے ۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ قدیم لپی میں ایسے الفاظ کا آخری کاف زبر کے لیے استعمال ہوتا تھا جس کے لیے ویدک و سنسکرت میں س اور کاف دونوں کا استعمال ملتا ہے چنانچہ اسی اصول کی رو سے سنسکرت میں بہاری بھاشاؤں کے الفاظ کا آخری آ ، ک سے تعریر ہوا ہے ۔ مثلاً بھاشا بالا=سنسکرت بالک، بھاشا گھوڑا=سنسکرت گھوٹک وغیرہ ۔ یونانی میں آخری حرکت فتحہ کے لیے اوس (os) اور لاطینی میں اَس (us) کا لاحقہ لگایا جاتا تھا جسے مغربی محققین ویدک و سنسکرت کا وسرگ کہتے ہیں لیکن وسرگ کا تلفظ آچاریہ اور پنڈت "اہ" کرتے چلے آ رہے ہیں ۔ مثلاً بھیمہ (بھیم= خوفناک) ، کُچرہ (کُچر= بد راہ) وغیرہ اور اس سے بھی میرے اسی خیال کی تصدیق ہوتی ہے کہ ہند یورپی زبانوں کے یہ سب طریقے لفظ کے آخری حرف علت کو ظاہر کرنے کے لیے استعمال کیے گئے ہیں ۔

فہرست بالا کے الفاظ پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ لفظ کے

ہر علت (ابتدائی ، درمیانی اور آخری) کو ظاہر کرنے کے لیے ہ استعمال کی گئی ہے یا یوں کہیے کہ ہ کا تبادل ہوا ہے جس کی مثالیں ہمیں رگ وید سے بھی ملتی ہیں ۔ چنانچہ ویدک رُ ہ (آ گنا) == فارسی رو (روئیدن) ، ویدک ج ہ ت (جیتی ہے ۔ سوکت ۵ - ۸۳ - ۳) == فارسی زی و (زیستن سے)، ویدک دِ وَ ب ر ہ == فارسی جدید دوبارہ ، ویدک

یَ ہ م ن (سوکت ۵-۲ - ۱ - ۲) == فارسی جدید ایوان (محل) وغیرہ ۔ یہی تبادل قدیم گجراتی اور دکنی ادب میں ملتا ہے جہاں اب،ابھی کو ہب، ہبیں تحریر کیا گیا ہے اور پراکرت کا لاحقہ حصر و تخصیص "ابچ" (لکشمی دھر سوتر ۲-۱-۱) کو ہیچ بھی لکھا گیا ہے ۔ خود اردو میں رو (رونا) سے بننے والے اسم فاعل روانسا میں ہ داخل کرکے اسے روہانسا لکھنے پڑھنے لگے ہیں حالانکہ نہ اس لفظ میں اس مقام پر ہ کا وجود ہے نہ اس قسم کے دوسرے اسماء میں اس کا جواز ملتا ہے ۔ جیسے پیاسا ، متاسا ، ہگاسا وغیرہ کیونکہ یہ الفاظ مادے پر آس (خواہش) اور الف نسبتی کے اضافے سے تیار ہوئے ہیں ۔ چنانچہ پیاسا == پی + آس + آ (پینے کی خواہش رکھنے والا) ، متاسا == موت + آس + آ (موتنے کی خواہش رکھنے والا) ، ہگاسا = ہگ + آس + آ (ہگنے کی خواہش رکھنے والا) اور روہانسا = رو + آس + آ (رونے کی خواہش رکھنے والا) وغیرہ

متبادل ہا کی لے کچھ اس قدر بڑھ گئی ہے کہ گرو گرنتھ کے ہر صفحے پر اس کی بکثرت مثالیں مل جاتی ہیں ۔ مثلاً کبیر داس کہتے ہیں: ہوئیں گے :

کہت کبیر ہُنتھہ من میرے
اہی ہوال (حوال) ہوہینگے تیرے

(گرو گرنتھ ، ص ۳۳۰)

خلل :

دل کھل ہل جا کے جرو روہانی
چھوڑ کتیب کرے ستانی (شیطانی)

ہے ، ہوئے :

جو بہہ پرے س ہوہ نہ آنا
کہہ کبیر رام نام پچھانا

(گرو گرنتھ ، ص ۳۳۰

نائیں ، جائیں :

لرکی لرکن کھیبو ناہ
سنڈیا آن دن دھاپے جاہ

چالے ، گھالے :

بیٹھت آلھت کٹلتا چالیہ
آپ گئے آ ی ر ن ہو کھالیہ

(گرو گرنتھ ، ص ۳۳۱

بینی جی کہتے ہیں -

پچھتاوے گا :

بھر پچھتاوہ گا سوڑھیا توں کون کُ متی بھرم لاگا

جائے گا :

چیت رام نہی جم پر جاہ گا جن بچرے. آن رادھا

(گرو گرنتھ ، ص ۹۳

تھا کا تیج اڑیا من پنکھی گھر آنگن نہ سکھائی

ستو ، بھگتو :

بینی کہے سنھہ رتے بھگتہہ مرن لگی کن ہائی

(گرو گرنتھ ، ص ۹۳

ان تمام مثالوں سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ قدیم ہند یورپی زبان کے زیر اثر ہماری بھاشاؤں میں ہ لکھ کر ہمزہ کی آواز مراد لی گئی ہے - چنانچہ ہمیں ہر زبان سے بکثرت ایسی مثالیں مل جاتی ہیں جو بتاتی ہیں کہ قدیم کتابت کے اس اصول کو نہ سمجھ سکنے کے باعث مکتوبی روپوں کو دیکھ کر لوگوں نے جا بجا ہائے ہوّز کی آواز نکالنی شروع کر دی جس کے نتیجے میں آج ہمارا تلفظ بھی بدلا ہوا ملتا ہے - اگر یہ بات نہ ہوتی تو اس کا تلفّظ ہر زبان میں یکساں ہوتا لیکن اردو اور اس کی معاصر زبانوں میں ہ کے استعمال میں اختلاف ملتا ہے یعنی ایک ہی لفظ ایک زبان میں ہ سے اور دوسری زبان میں ہمزہ کے ساتھ نظر آتا ہے - مثلاً ادبی اردو دہی = عوامی اردو دئی = پنجابی دئی = بنگالی دوئی (مقامی لہجے کے مطابق) ، ادبی اردو وہو = عوامی اردو بئو - اردو بھی = بنگالی بوئی ، اردو ایک = پنجابی ہِک ، اردو اور = پنجابی ہور ، اردو سرہار ، جانہار وغیرہ = سرہئی سرتار ، جانار وغیرہ ، اردو آہٹ وغیرہ اور یہ بے ضابطگی اس بات کی دلیل ہے کہ بھاشاؤ میں جا بجا اس کا تبادل ہوا ہے -

برصغیر پاک و ہند کی تمام قدیم و جدید تحریروں میں ہ کو نہ صرف مختصر حرف علت کی جگہ استعمال کیا گیا ہے بلکہ طویل حرف علت ی اور یٓ کے جزو ثانی ی اور یٓ کے لیے بھی کام میں لایا گیا ہے کیونکہ ی اور یٓ کی طویل اصوات بھاشا کی دوسری طویل اصوات کی طرح مختصر اصوات سے دگنی ہوتی ہیں یعنی ی = ی ی اور یٓ = یٓ یٓ - پھر ان تحریروں میں ان کے پہلے جزو یٓ اور ی کو یٓ اور دوسرے کو بالترتیب دِ اور یَ بنا دیا گیا ہے اور اس کے جواز میں پراکرت کے گرامر نویسوں نے یہ اصول بیان کیا ہے کہ پراکرت میں ی ی اور یَ یَ کی آوازیں ی اور یٓ ہو جاتی ہیں حالانکہ ہند یورپی میں یہ دونوں آوازیں (یَ یِ اور یٓ یَ) ی اور ی میں تبدیل ہوتی ہیں مثلاً ویدک تُوکم (بیج) ، اوستا تَنخم ، اوستا رُچہ (ون) = پہلوی رُوج = فارسی جدید روز ، اوستا گُش (کان) = پہلوی و فارسی جدید گوش = ویدک

گھوش ، اوستا بختی (پکاتا ہے)= پہلوی پزے تی ، اوستا گئے تھم (جانداروں کی)= پہلوی و فارسی جدید گے ہاں وغیرہ ۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ یِ اور یُ کی مختصر آوازیں ایرانی میں نہیں تھیں اس لیے ایرانی کے اثر زدہ ذہنوں نے بھاشا کی ان آوازوں کو یِ اور یَ بنا کر تلفظ ہی بدل دیا) اور پھر ان کے مدار کے لیے ہ کا اندراج بھی کر دیا ۔ یہ بات مندرجہ ذیل مثالوں سے بخوبی واضح ہو جائے گی :

لفظ	تلفظ	مکتوبی روپ
کون	کَن	کَ یَ ن ، کَ وَ ن
اور	یَ ر	یَ یَ ر ، یَ وَ ر
لون	لَ ن	لَ یَ ن ، لَ وَ ن
جیسا	جِ س	جَ یِ س
بَیر	بِ ر	بَ یِ ر
چلو	چَ لُ	چَ لَ یَ ، چَ لَ ہ
سنو	سُ نُ	سَ نَ یَ ، سَ نَ ہ
بولو	بُ لُ	بُ لَ یِ ، بُ لَ ہ
چلے	چَ لِ	چَ لَ یِ ، چَ لَ ہ
سنے	سُ نِ	سَ نَ یِ ، سَ نَ ہ
بولے	بُ لِ	بُ لَ یِ ، بُ لَ ہ

اشعار بالا کے الفاظ پچھتا وَہ کا (پچھتاوگا) ہَ ہ (ہ) ، چالیہ (چال) کھالیہ (کھال) وغیرہ بھی اسی اصول کتابت کی زد میں آتے ہیں ۔

قدیم ہند ایرانی میں ہ کا ایک اور استعمال یہ ہے کہ ز ، غ ، ف ، خ ، س ، ش ، ی ، ج وغیرہ بہت سے حروف کی جگہ بھی لے لیتی ہے۔ مثلاً ویدک ابھ (ہم) = اوستا ازم ، اوستا ہُشک = فارسی جدید خشک ، فارسی جدید خجر = ہجر ، اوستا بغ ستان (خدا کا گھر) = فارسی جدید بہستون ، بہستان ، اوستا کُف (پہاڑ) فارسی جدید کوہ ، ویدک اُسر (دیوتا) = اوستا اہُرا ، فارسی جدید آماس = آماہ ، ویدک پشُ (مویشی) = ژند پہ ، قدیم ایرانی خشایش (بادشاہ) = پہلوی و فارسی جدید شاہ ، ویدک آہر (دن) = اوستا ایز ، فارسی جدید ناگہ = ناگاہ ، ماہ = ماج وغیرہ

ویدک میں پہنچ کر ہ کا دائرہ استعمال اور بھی وسیع ہو گیا اور اب وہ ہندوی زبانوں کے مہاپرانوں کے جزو ثانی کی جگہ بھی کام آنے لگی اس لیے کہ ایرانی زبان میں نہ اس قسم کی بھاری آوازیں ہی تھیں اور نہ ان کے لیے ان کی قدیم لپی میں کوئی مفرد حروف ہی مقرر تھے۔ چنانچہ جب ویدک میں ہمارے مہاپرانوں کو تحریر کیا گیا تو عموماً الپ پرانوں کے برابر ہ کا حرف اسی طرح تحریر کر دیا گیا جس طرح حرف علت ی کو "و" سے لکھا گیا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ویدک کی دیوناگری لپی میں آج بھاشا کے مہاپرانوں کے لیے مفرد حروف (کھ گھ چھ جھ ٹھ ڈھ تھ دھ پھ بھ) ملتے ہیں اور جھ کا حرف بھی رگ وید میں ایک مقام پر آ گیا ہے لیکن بعض بعض مقامات پر ان کو بھی الپ پرانوں کے پہلو میں ہ لکھ کر ظاہر کیا گیا ہے۔ پھر بھاشا کے دوسرے مہاپرانوں رھ ، لھ ، نھ ، مھ ، نھ کے لیے تو کوئی الگ حروف ہی مقرر نہیں ہیں اس لیے ویدک میں بالعموم ان کی اور جھ کی آواز قلم بند کرتے وقت ر ، ل ، م ، ن اور ج کے برابر ہ لکھ دی گئی ہے۔ چنانچہ

اردو گھر = ویدک گ رہ ، (۲ ، ۱ - ۳) جھوم (جھومنا) = ویدک جَ ہ م (۱ - ۲ - ۱) ، ہمیں = ویدک یَ ہ م یَ م (۱-۹-۲) ، جیبھ (زبان) = ویدک جِ ہ وَ م (۳ - ۵۰ - ۱) ، ادھر = ویدک یِ ہَ د رِ (۱-۹-۲) وغیرہ۔

اس طرز تحریر کی روایت بھی پاک و ہند کی تحریروں میں آج تک

چلی آ رہی ہے۔ میں گرو گرنتھ سے ایسے الفاظ کی مثالیں پیش کرتا ہوں جن کے مہاپرانوں کو ہائے ہوز سے لکھا گیا ہے لیکن جو اب بھی ہماری زبانوں پر اپنے اصلی تلفظ کے ساتھ جاری ہیں۔

نام دیو کہتے ہیں:

مٹھیا جبھا اور لے کام
زبان پڑا ک ہری کو ناوں (نام)

(گرو گرنتھ، ص ۱۱۶۳)

کبیر داس کہتے ہیں:

بری انگوری گدہا چرے
نت اٹھ ہاسے ہیگے مرے

(گرو گرنتھ، ص ۳۲۶)

ایسے گھر ہم بہت بسائے
جب ہم رام گربھ ہوی آئے

(گرو گرنتھ، ص ۳۲۶)

اندھکار سکھو کبہ ہی نہ سوئی ہے (سوئیے)
راجا رنک دو و مل روئی ہے (روئیے)

(گرو گرنتھ، ص ۳۲۵)

کہہ کبیر جب لہری آئی بڑی کا سہاگ ٹریو
لہری سنگ بھئی اب میرے جیٹھی اَئر دھریو

ان دوہوں میں جیبھ کو جبہا، گدھا (گ د ہ) کو گدہا، بھوت کو بہت، کبھی کو کب ہی، لہوری (راجستھانی، چھوٹی) کو لہری لکھا گیا ہے لیکن یہ الفاظ اپنے صحیح تلفظ کے ساتھ آج بھی بولے جا رہے ہیں۔ اس طرز تحریر کا نتیجہ یہ نکلا کہ آج ہم بہت سے الفاظ کے صحیح تلفظ سے بے خبر ہو کر انھیں ہ کی مدد سے بولنے لگے ہیں۔

اردو لپی میں سہاپرانوں کے لیے دو چشمی ہا کی تخصیص چونکہ ہمارے ہی زمانے میں کی گئی ہے اور قدما دو چشمی ہا اور ہائے ہوز میں کوئی امتیاز نہیں کرتے تھے - اس لیے میں دکنی ادب سے صرف انہیں الفاظ کی مثالیں پیش کرتا ہوں جو نظم میں اس اختلاف کتابت کے باوجود اپنے قدیم سہاپرانوں کی آواز دے رہے ہیں لیکن آج ہم انہیں ہائے ہوز سے بول رہے ہیں اور اس ہائے ہوز کو بنیادی سمجھ رہے ہیں -

نیر درپن از ہنر :

ہوا جب کامل اس کا نظم ہر حال
زمانے نے کیا منج بہوت خوش حال

سُک سہیلا از جانم :

لوکاں یہ مت کچ الادھی
جس بوجھہ نجتوں لادھی

من لگن از بحری :

ورنیں تو یو شعر نانے جانے
ناپہاڑ تلاؤ کوں دکہانے

گلشن عشق از نصرتی :

بھرے لال کھوڑے عرس آنے تھے یوں
چولیاں میں اگن دہک دہکتی ہے جیوں

مندرجہ بالا اشعار میں خط کشیدہ الفاظ کی آواز بہوت ، الادھی ، پہاڑ اور دہک دہکتی نکلتی ہے لیکن ہم آجکل ان کو بہت علیحدہ ، بہاڑ اور دہک (دہکنا) تحریر کرتے اور تحریر کے مطابق ہی بولتے ہیں - اردو کے ایسے الفاظ کی جن میں سہاپرانوں کو تقسیم کر دیا گیا ہے - مزید مثالیں یہ ہیں - نہانا (نھانا) ، دہائی (دھائی) ، نباہنا ، نبھانا) ، لوہا (لھوآ) ، لوہار (لھوآر) ، لہو ، لوہو (لھوو) وغیرہ -

اب میں اردو کے چند کثیر الاستعمال الفاظ ان کی اصل سمیت پیش کرتا ہوں۔

اردو کے ضمائر اشاری یہ اور وہ کی اصل اِے اور آو ہے ان کی طویل حرف علت کا آخری جزو ہے۔ پنجابی کے اہ، آہ کی اصل بھی یہی ہے اور جو، کبھ، تد کی اصل جے، کے، تے ہے اور اردو ہم کی اصل "اسے ئی" ہے اردو میں جمع متکلم کے لیے ہم بولا جاتا ہے۔ برج بھاشا اور اودھی میں بھی یہی لفظ مستعمل ہے۔ مرہٹی میں آمھی اور بنگالی میں اسے ہلکا کرکے آمی بولتے ہیں۔ اسی لفظ کو گجراتی میں امے اور راجستھانی میں مھے کہتے ہیں۔

اردو میں ظرف مکاں کے لیے یہاں، وہاں، کہاں، جہاں کے الفاظ مستعمل ہیں لیکن ہریانی میں انھیں یاں، واں، کاں، جاں بولتے ہیں۔ ہریانی کے الفاظ دکنی ادب اور دہلوی شعرا کے کلام میں بھی مل جاتے ہیں۔ ان کے ابتدائی حروف ی، و، ک اور ج اشاری (قریب و بعید)، استفہامی اور موصولی ہیں اور باقی ماندہ "آں" جسے ہم اردو میں "ہاں" (میں اپنے دوست کے ہاں گیا تھا) کہتے ہیں قدیم لفظ ہے جو مقام کے لیے مستعمل تھا بلکہ اردو کے اقراری "ہاں" کی اصل بھی "آں" ہی ہے۔ سنسکرت میں اسے "آم" لکھا گیا ہے جس کی میم ہمارے غنہ کا بدل ہے۔ اس طرح ان الفاظ کی اصل یِ یٰ ں، تِ یٰ ں، کِ یٰ ں جِ یٰ ں قرار پاتی ہے جن میں کہیں ہ داخل کر لی گئی ہے اور کہیں نہیں کی گئی۔

اردو میں تاکید کے لیے "ہی" کا لفظ الگ سے بھی مستعمل ہے اور دوسرے لفظوں کے ساتھ مل کر بھی آتا ہے۔ جیسے میں نے ہی تم سے کہا تھا۔ کبھی ہماری طرف بھی آ جایا کرو۔ ہمیں ہو گئے داستاں کہتے کہتے جب میں "کوئی" پر غور کرتا ہوں جو "کو" اور ی سے مرکب ہے اور تاکیدی لفظ بھی ہے اور جس میں آج تک کبھی اور کہیں ہائے ہوز لکھی سی نہیں گئی تو یقین ہو جاتا ہے کہ اس "ہی" کی اصل ی ہے۔

اسی تاکیدی کلمے "ای" کی تائید میں گرو گرنتھ سے مزید مثالیں
پیش کرتا ہوں -

روی داس کہتے ہیں :

جونی جونی جوریو سونی سونی بھائیو
جھوٹھے بنج آٹھ ہی گئی بائیو
(گرو گرنتھ ، ص ۱۲۹۳)

کہہ روی داس بھیو جب لیکھو
جونی جونی کینو سونی سونی دیکھیو
(گرو گرنتھ ، ص ۱۲۹۳)

کبیر داس کہتے ہیں :

مرنو مرن کہوں سبد کوئی
سہجے مرے امربوے سوئی
(گرو گرنتھ ، ص ۳۲۷)

برج بھاشا میں دوسرا تاکیدی کلمہ او (یٓ) ہے جیسے عام طور پر "ہو" سمجھا جاتا ہے - چنانچہ جس طرح "کوئی" کو کبھی "کوہی" نہیں سنا گیا اسی طرح برج بھاشا کے لفظ کو ، (کوی) کو کبھی کو ہو نہیں لکھ پڑھا گیا - یہ لاحقہ بہت سی زبانوں میں مستعمل ہے - چنانچہ کبھو = کبھ + ی، کسو = کس + ی، دوو = دو + ی (دونوں)، کاہو، کاؤ = کا + ی - اس کلمے کی بھی مزید مثالیں گرو گرنتھ سے درج ذیل کی جاتی ہیں -

کبیر داس کہتے ہیں :

ہمرا جھگڑا رہا نہ کوؤ
پنڈت ملاں چھاڈے دوؤ
کوئی - دونوں ہی

اور سوئے کیا سوگ کریجے
تنو کیجے جتو آن بیجے

تبھی - جبھی ، ص ۲۲۵

روی داس کہتے ہیں :

ہری جیت نے او جنا پدم کو لاس پتی تاس سم تُل نہیں آن کوئو
وہ بھی - کوئی
ایک ہی ایک انیک ہوئے بستھریو آن رہے آن بھربور سوؤ
(وہی ، ص ۱۲۹۳)

بھاشا کا بھی تاکیدی لاحقہ "ئی" رگ وید میں جا بجا ملتا ہے جیسے یاسک منی سے لے کر اب تک کے تمام شارحین مانتے چلے آ رہے ہیں جیسے ویدک ی دم = یہ ، ی دم = یہی وغیرہ -

بھاشا میں ایک غایتی لاحقہ "اے" بھی مستعمل ہے جیسے مجھے (مجھ + اے - مجھ کو) ، تجھے (تجھ + اے - تجھ کو) ، اسے (اس + اے - اس کو) ، کسے (کس + اے - کس کو) ، جسے (جس + اے - جس کو) چنانچہ کا (کیا - ضمیر استفہامی) کے ساتھ اردو میں غایتی "ہے" لگا کر کاہے کو (کس غرض سے - کس کے لیے) بھی بولا جاتا ہے اور دوسری زبانوں میں اس مفہوم کو محض لفظ "کاہے" یا کائے سے ہی ادا کیا جاتا ہے - چنانچہ اس کی اصل کُ ی (کائے) ہے جو قدیم تحریروں میں دیکھی جا سکتی ہے - اس لاحقے میں ہمزہ، ہ کا تبادل ہوا ہے -

اردو میں دو فاعلی لاحقے ہار اور ہارا عام طور پر مستعمل ہیں - جیسے پالن ہار ، مرن ہار ، جان ہار ، لکڑ ہارا ایسے اسما دکنی ادب میں بھی بکثرت ملتے ہیں ان کی اصل آر اور آرا ہے جو آج مرہٹی میں بھی سنی جا سکتی ہے - مثلاً اردو پالن ہار = مرہٹی پالنار ، اردو مرن ہار = مرہٹی مرنار ، اردو لکڑ ہارا = مرہٹی لاکڑارا - ایک جوڑنار آنی پناس کھانار (ایک جوڑن ہار اور پچاس کھان ہار) - کرتار منشیہ

تھوڑے بنسنار منشیہ ہھار (کرن ہار آدمی تھوڑے ہنسن ہار آدمی بھوت) - چھتنارا کا لفظ تو ہمارے یہاں بھی آج تک مستعمل ہے - اردو کے چند اور اسما یہ ہیں چھوہارا = چھوآرا، فوارہ = پھوآرا، کمھار = کمھ آر، سنار = سون آر، لوہار = لھوآر وغیرہ - اسی سے ملتا ہوا ایک اور اسمی لاحقہ "آہٹ" بھی اردو میں بولا جاتا ہے جیسے گھڑ گھڑاہٹ، بھڑ بھڑاہٹ، گھبراہٹ وغیرہ - اس کی اصل "آٹ" ہے جیسا کہ مرہٹی میں مستعمل ہے گھڑگھڑاٹ، بھڑبھڑاٹ، گھبراٹ وغیرہ لاحقوں کی یہ دونوں قسمیں زبانوں کے مہاراشٹری گروہ سے مخصوص ہیں اور دوسری زبانوں میں یہیں سے مستعار گئی ہیں -

اردو کی گنتی میں بہت سے عددوں کے آخر میں ہ پائی جاتی ہے جسے لوگ علی العموم اصلی ہ سمجھتے ہیں اور سنسکرت سے ان کا اشتقاق تلاش کرنے لگتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کی آخری ہ آخری مہاپران کا جزو ہے یعنی گیارہ = گیارھا، بارہ = بارھا، تیرہ = تے رھا، چودہ = چودھا، پندرہ = پندرھا، سولہ = شولھا (ویدک شولھا)، سترہ = ست رھا، اٹھارہ = اٹھارھا - یہاں ایک غلط فہمی کا ازالہ بھی ضروری ہے کہ لوگ اردو کے بہت سے اعداد کو سنسکرت سے مشتق سمجھتے ہیں - اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ ان میں سے کچھ الفاظ ملتے جلتے سے ہیں اور دوسری وجہ یہ ہے کہ ہم نے بعض بعض الفاظ سنسکرت یا فارسی سے جوں کے توں بھی مستعار لے لیے ہیں - مثلاً لفظ دس (اوستادس - ویدک سنسکرت دش) ایک دخیل لفظ ہے - اس کی جگہ ہماری بھاشا میں قدیم لفظ "دھا" تھا جو پنجابی میں ہلکا کر لیا گیا ہے اور عام بول چال میں "وا" بولا جاتا ہے لیکن پنجابی "دا" یا قدیم "دھا" فارسی دہ سے مختلف ہے جس کی ہ قدیم دس کے س کا بدل ہے اور بھاشا کے لفظ میں مہاپران کی آواز نکلتی ہے جس سے فارسی کا لفظ خالی ہے - بھاشا کا یہ مہاپران اردو کے پہاڑے پڑھتے ہوئے آج بھی سنا جا سکتا ہے - دودھام یا دھائیں بیس - تین دھام یا دھائیں تیس وغیرہ چنانچہ اردو دہای (د ہ ی) کی اصل دھائی (دھ ی) ہے -

اردو کے مندرجہ بالا اعداد میں آخری الف آج بھی سنا جا سکتا ہے ۔ البتہ تحریر سے اس کا چلن اٹھ گیا ہے ۔ ذیل میں دکنی ادب سے دو شعر پیش کرتا ہوں جن میں حسب دستور سہاپران کو ہلکا کر لیا گیا ہے لیکن آخری الف بدستور قائم ہے ۔

من لگن از بجری :

بجری تھی ہی کتک برس تھے
بارا آپر ایک سو سہس تھے

(اردوئے قدیم ، ص ۹۸)

گلشن حسن و دل از بجرمی :

ہو بارھویں صدی میں یو قصہ تمام
جو چودا برس میں ہوئے تھے تمام

(اردوئے قدیم ، ص ۹۹)

یہاں اب کچھ ایسے فعلی مادوں کے متعلق بیان کرنا ہے جن کے آخر میں ہ نظر آتی ہے اور بولی بھی جاتی ہے ۔ مثلاً کہ ، رہ ، بہہ وغیرہ ۔ میں اوپر کہہ آیا ہوں کہ ہ کو زمانہ قدیم سے آج تک ہماری بھاشاؤں کے حروف علت ی اور یٰ کے آخری جزو کی حیثیت سے بھی لکھا جا رہا ہے اور وہ اس طرح کہ ان کے پہلے مختصر جزو کو یٰ بنا لیا ہے اور دوسرے جزو میں ہ کا اندراج کر دیا ہے ۔ چنانچہ رہ ، بہہ ، کہہ دراصل ی کے خاتمے والے مادے ہیں اور یہ آواز ان کے موجودہ تلفظ سے بھی ثابت ہوتا ہے جو بالترتیب ر ، ب ، ک ہوتی ہے ۔ علاوہ بریں دکنی ادب میں جہاں اس کے عام "رجحان" کے مطابق محض حروف علت مختصر کر دیے جاتے ہیں اور حروف صحیحہ کو بدستور قائم رکھا جاتا ہے ان الفاظ کی ہ بیشتر روپوں میں غائب ہو جاتی ہے ۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ وہاں بھی ہ کو حروف علت کا قائم مقام سمجھا جاتا ہے ۔ مثلاً کوانا = کہوانا ، کہلوانا ، کتا = کہتا ، کتے = کہتے ، رتا = رہتا وغیرہ ۔ ان کی سند کے لیے اشعار بھی پیش کیے جاتے ہیں ۔

طوطی نامہ :

رہتا دل پوماتی کے بھی داغ ہو
بھلا جو نہ اتھا اس زمانے میں او

(اُردوئے قدیم ، ص ۲۳)

ملکہ عصر از عاجز :

سنو اب یہ قصہ سب اظہار کہ
کہتے یک شہنشاہ اتھا بخت ور

(اُردوئے قدیم ، ص ۲۳)

دیپک پتنگ از عشرتی :

ہر یک شعر کا ہر کسے فام نیں
سو دکنی کنا کچ سرا کام نیں

(اردوئے قدیم ، ص ۴۳)

ان اشعار میں جہاں کہیں یہ الفاظ اپنی موجودہ املا کے ساتھ لکھے گئے ہیں وہاں بھی ان کے تلفظ میں ہ کا گزر نہیں ہے - دکن کی نثری تعلیقات میں بھی سیج (سہج) ، پیلا (پہلا) ، پینتا (پہنتا) وغیرہ ایسے بہت سے روپ پائے جاتے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ ہمارے مروجہ روپوں کی ہ دراصل "ی" اور "ی" کا جزو ثانی ہے -

ان مثالوں سے ثابت ہوتا ہے کہ ہ کہیں تو خالص ہمزہ یعنی مختصر حروف علت کی قائم مقام ہے - کہیں "ا" ے اور "او" کے آخری جزو کی جگہ کام دیتی ہے اور کہیں ہمارے مہاپرانوں کو ظاہر کرنے کے لیے الپ پرانوں کا سہارا بنتی ہے -

ماحصل کلام یہ ہے کہ و ، ی اور ہ کی آوازیں ہماری دراوڑی بھاشاؤں کی اصلی آوازیں نہیں ہیں - ہندوستان میں سب سے پہلے ان کا داخلہ آریوں کے ساتھ ہوا جو اپنی (ایرانی) زبان اور اس کی لپی لے کر اس ملک میں وارد ہوئے تھے - عرصہ دراز تک ہندوستانی اور ایرانی

زبانوں کے پہلو بہ پہلو رہنے بسنے اور باہمی میل جول کے باعث ایرانی اثرات ہماری زبانوں میں سرائت کرتے چلے گئے - چنانچہ آج جو ہماری بھاشاؤں میں و ' ی اور ہ کی آوازیں اور ان کی لپیوں میں یہ حروف نظر آ رہے ہیں وہ دونوں زبانوں کے اسی قرب کا نتیجہ ہیں جو انھیں مدت مدید تک حاصل رہا ہے - اس کے باوجود آج بھی ان آوازوں کا ہماری بھاشاؤں میں اتنا عمل دخل نہیں ہے جتنی ہماری لپیوں میں ان کے حروف کی کثرت نظر آتی ہے - چنانچہ یہ آوازیں ہمارے یہاں صرف مختصر حروف علت کی جگہ استعمال ہوتی ہیں اور واو کی آواز دیسی زبانوں میں جا بجا ب کی نمائندگی بھی کر لیتی ہے - ان کے حروف ہماری لپیوں میں حرف علت کے اوغام سے پیدا ہو جاتے ہیں اور ہماری طویل آوازوں یا سہاہرانوں کے دوسرے جزو کی حیثیت سے بھی تحریر ہوتے ہیں لیکن ان مقامات پر ان کا ہمارے تلفظ سے کوئی تعلق نہیں ہوتا -

(مطبوعہ : نقوش لاہور ' نومبر ۱۹۶۳ء)

ہمزہ

یہ اردو کا ایک چھوٹا سا حرف ہے جو حروف تہجی میں ی سے پہلے آتا ہے کہیں اس کی شکل عین کے سر کی سی ہوتی ہے (ء) اور کہیں چڑیا کی طرح منحنی خط (ء) سے ملتی ہے - کچھ لوگ اسے حرف مانتے ہیں اور کچھ غالباً اس کی چھوٹی سی جسامت کے باعث اسے حرف ماننے سے ہی انکاری ہیں اور صرف علامت کا درجہ دیتے ہیں لیکن کچھ ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ کہیں یہ حرف ہوتا ہے اور کہیں یہ علامت بن جاتا ہے - میرے نزدیک یہ اردو کا ایک اہم حرف ہے اور ایک نہایت ہی اہم آواز کا نمائندہ ہے اور کہیں بھی علامت نہیں بنتا - سطور آئندہ میں اس کی تفصیل پیش کی جاتی ہے -

آوازوں کی دو قسمیں ہوتی ہیں - ایک سُر دوسرے اَسُر ، سُر کو انگریزی میں واول (Vowel) اور عربی میں آواز علت کہتے ہیں اور اَسُر کو انگریزی میں کانسونینٹ (Consonant) اور عربی میں آواز صحیح - اردو میں استعمال ہونے والے سُروں اور اَسُروں کی پوری گنتی اور تفصیل میں نے اپنی کتاب[1] میں دے دی ہے - اس لیے یہاں انھیں دہرانے کی ضرورت نہیں ہے - البتہ یہاں مجھے صرف اتنا ہی کہنا ہے کہ ب ، پ وغیرہ کی طرح ہمزہ بھی ایک اَسُر (آواز صحیح) ہے اور اپنی ایک مخصوص آواز رکھتا ہے - جس طرح دوسری آوازوں کو ہم ان کے مخارج کے لحاظ سے شفوی ، دندانی ، حنکی ، غنی اور حلقی کا نام دیتے ہیں - اس طرح ہم اسے کنٹھی کہہ سکتے ہیں - کیونکہ اس کی آواز ہمارے کنٹھ سے نکلتی ہے -

---

۱ - اُردو کا روپ -

دوسری اُسروں کے مقابلے میں اس کی آواز بے رنگ سی ہوتی ہے۔ اس لیے سنسکرت کا مشہور گرامر نویس ہیم چندر اسے بے رنگ (آو رن) کہتا ہے۔ سانس کی مقدار کے لحاظ سے بھی آوازوں کو دو گروہوں الپ پران (ہلکی Unaspirated) اور مہاپران (بھاری Aspirate) میں بانٹا گیا ہے۔ ہمزہ کا ان کے پہلے گروہ یعنی ہلکی آوازوں (الپ پرانوں، میں شمار ہے جب کہ اسی مخرج (کنٹھ) کی دوسری آواز یعنی چھوٹی ہے (ہ) بھاری آوازوں (مہاپرانوں) سے تعلق رکھتی ہے لیکن یہاں مجھے صرف ہمزہ کی بات کرنا ہے۔

سب جانتے ہیں کہ سُر اُسروں کو جوڑنے یا ملانے کے کام آتے ہیں۔ دو الفاظ اَب اور آب پر دھیان دینے سے اس کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ اَب میں الف کو بے سے ملانے والا ایک چھوٹا سُر (زبر) ہے جب کہ آب میں الف کو بے سے ملانے والا اسی کا لمبا سُر ہے جسے مد کہتے ہیں جو کبھی کبھی الف کے اوپر ایک دوسرا چھوٹا سا الف کھڑا کر کے بھی ظاہر کیا جاتا ہے۔ جیسے اٰب میں چنانچہ ان دونوں لفظوں میں الف اور بے تو اُسر ہیں اور زبر اور مد یا چھوٹا سا کھڑا ہوا الف سر کہلائے گا۔ عربی کی تحریروں میں یہی چھوٹا سا کھڑا ہوا الف آخری ی پر جیسے عیسیٰ موسیٰ میں اور دوسرے درمیانی حرفوں پر بھی جیسے اسمٰعیل۔ رحمٰن میں نظر آتا ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ اَب اور آب میں چھوٹے بڑے سُر (زبر اور مد) کی وجہ سے خود ابتدائی الف ہی کی دو قسمیں (الف مقصورہ اور الف ممدودہ) کر دی گئیں۔

اَب اور آب میں الف کی جگہ ہمزہ بھی رکھا جا سکتا ہے جیسے ءَب اور ءٰب کیونکہ اس سے آواز میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ دکنی ادب کی تحریروں میں بھی الفاظ کے ابتدائی الف کی جگہ کہیں کہیں ہمزہ ملتا ہے۔ جیسے ئیک (ایک) - ئے (اے - یہ) اس کی وجہ یہ ہے کہ ابتدائی الف اور ہمزہ باہم متبادل ہیں۔ خود عربی میں بھی لفظ

کو ہمزہ ہی کہتے ہیں ۔ ہمزہ کے اُسُر ہونے کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اس کی جگہ دوسرے اسر بھی بولے جا سکتے ہیں جیسے :

ءَ ب (آب) ۔ ءٰ ب (آب)

کَ ب (کب) کٰ ب (کاب)

جَ ب (جب) ۔ جٰ ب (جاب)

دَب (دَب) دٰب (داب)

الگ سے سر گننے اور ظاہر کرنے کے لیے رنگین اسروں (ب ، پ ، ت وغیرہ) کی جگہ بے رنگ اُسُر (ہمزہ) کو مدار بنانے کا چلن زبانوں میں عام ہے ۔ کیونکہ اُسُر کی مدد کے بغیر سُر ظاہر نہیں ہو سکتے ۔ دیوناگری لپی میں ہمزہ کے لیے ء یعنی د کا حرف مقرر ہے اور بیشتر اسی سے کام چلایا جاتا ہے ۔ سروں کے لیے البتہ الگ الگ علامتیں مقرر ہیں جو اسی ہمزہ پر چپکا دی جاتی ہیں اور الگ سے نظر بھی آ جاتی ہیں ۔ اردو میں بھی سروں کے مدار کے لیے ہمزہ نہ الف موجود ہے ۔ چنانچہ

آ ، آے ، اِے ، اِی ، اَو ، اَو ، اُو ، اِس ، آوں ، اوں ، اَیں ، اِیں ۔ کے بارہ طویل سروں کی ابتدا میں الف نظر آتا ہے جو ان کا مدار ہے اور جسے ہمزہ سمجھنا چاہیے ۔ سروں کی علامات میں سے یہاں صرف ایک مد ملتا ہے ۔ باقی علامات کی جگہ الف اور واؤ یا الف اور ی کا اختلاط نظر آتا ہے اور ان پر زبر ، زیر پیش بھی لگا دیتے ہیں ۔ اسی لیے اردو والوں کی سمجھ میں سروں کی بات جلدی یا آسانی سے نہیں آ پاتی ۔

ہماری پریشانی کا سبب یہ ہے کہ اردو املا میں الف واؤ اور یے کبھی سُر بن کر سامنے آتے ہیں اور کبھی اُسُر بن کر ۔ گویا یہ تینوں آوازیں آدھی تیتر اور آدھی بٹیر ہیں اور پھر ہمزہ کا کرشمہ یہ ہے کہ یہ کبھی الف بن جاتا ہے کبھی واؤ کی شکل میں نظر آتا ہے اور کبھی ی کا روپ دھار لیتا ہے ۔ سب سے پہلے ہمزہ اور الف کی آنکھ مچولی کے لیے

دو لفظوں اب اور باہر غور کیجیے - پہلے لفظ میں الف ہمزہ کی جگہ آیا ہے جو زبر کے سُر کے ذریعے دوسرے اَسُر بے سے مل جاتا ہے لیکن دوسرے لفظ میں الف کا حال نہیں کھلتا کہ یہ کیا ہے - اس لیے ان دونوں لفظوں کو میں اپنی مقرر کی ہوئی علامات کے مطابق یوں لکھتا ہوں :

ءَب - بٓا

ان شکلوں کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے لفظ کا الف ہمزہ (اسر) ہے اور دوسرے لفظ کا الف سر ہے جو بے پر قائم ہے اس سے عام اصول نکلتا ہے کہ اردو لفظ کا ابتدائی الف ہمزہ یا اسر اور آخری الف سر ہوتا ہے - چنانچہ یہ کہنا تو صحیح ہے کہ الف کبھی سر ہوتا ہے اور کبھی اَسُر لیکن یہ کہنا غلط ہے کہ ہمزہ کبھی سر ہوتا ہے اور کبھی اَسر کیونکہ ہمزہ ہمیشہ اَسُر ہی ہوتا ہے اردو املا میں درمیانی الف ہمیشہ ہمزہ سے لکھا جاتا ہے جیسے گئے - نئی ، بھائی ، کماؤ - اس سے فائدہ یہ ہوتا ہے کہ لفظ ٹکڑے ٹکڑے ہونے سے بچ جاتا ہے -

اب ہمزہ اور واؤ کے جگہ بدلنے سے متعلق اردو کے دو لفظوں وہاں اور جاؤ پر دھیان دیجیے - وہاں کا صحیح تلفظ اُہاں (ءُ ہ ں) ہے - یعنی ہمزہ اس لفظ کی ابتدا میں واؤ بن گیا ہے - "سب رس" کے بعض الفاظ میں الف مضموم یا ہمزہ مضموم کو واؤ بولا جاتا ہے - جیسے وُصول (اُصول) وُچاریگا (اُچارے گا) وُس (اُس) وغیرہ - ہریانی آمیز اردو میں بھی ایسے الفاظ سننے میں آتے ہیں جیسے وُتنا (آتنا) وُتنی (آتنی) وو (اُو - اشارہ بعید - وہ) جاؤ کا لفظ اپنے تلفظ کے لحاظ سے یوں لکھا جاتا ہے - جٓ ءُ یعنی آخری واؤ ہمزہ پر اُو کا سُر ظاہر کرنے کے لیے آیا ہے - دوسری مثالیں یہ ہیں - ہیاو ، بھاؤ ، لاؤ - وغیرہ - ان مثالوں سے یہ اصول بنتا ہے کہ اردو کے الفاظ کا ابتدائی واؤ ہمیشہ ہمزہ ہوتا ہے اور آخری واؤ صرف اس وقت ہمزہ کا بدل ہوتا ہے جب کہ اس سے پہلے الف بھی آیا ہو -

ہمزہ اور ی کے بدل کا بھی کچھ ایسا ہی اصول ہے - مثلاً لفظ "یہاں" کا اصلی تلفظ اِہاں (ء ہاں) ہے یعنی ہمزہ اس لفظ میں ابتدائی ی بن گیا ہے - "سب رس" میں بھی ابتدائی الف مکسورہ کا ی سے تبادل ملتا ہے جیسے تیا (اِتا) - یتی (اِتی) یتے (اِتے) یکیلے (اکیلے) اردو کی دوسری مثالیں یہ ہیں یہ (اِے - اشارہ قریب) یوں (اِ اوں) وغیرہ - لفظ کا آخری ی بھی ہمزہ کا بدل ہوتا ہے - لیکن صرف اس وقت جب کہ واؤ کی طرح اس سے پہلے بھی الف آ جائے جیسے گائے (گ ء) - چائے (چ ء) واؤ اور ی سے متعلق دونوں اصولوں کو ملا کر ہمزہ سے ان دونوں حروف کے تبادل کا ایک اصول اس طرح بنتا ہے کہ اردو کے لفظ کا ابتدائی واؤ ہو یا ابتدائی ی ہمزہ کا بدل ہوتا ہے اور لفظ کے آخری واو یا ی کو اس وقت ہمزہ کا بدل سمجھنا چاہیے جب کہ اس سے پہلے الف بھی آیا ہو -

ہر زبان میں ایسے قاعدے ملتے ہیں کہ ایک آواز دوسری آواز سے بدل جاتی ہے - کبھی تو یہ تبادل مشروط ہوتا ہے اور کبھی غیر مشروط- آوازوں کا یہ تبادل اردو میں بھی پایا جاتا ہے - واضح زبان نے تبادل کے لیے اردو کی آوازیں دو جتھوں میں بانٹ دی ہیں -

اَسُروں کا پہلا جتھا

ب - بھ - تھ - ٹھ - ج - چھ - ڈ ذ - ر - ژ - س - کھ - گ - ل - ابتدائی مھ - ن - درمیانی اور آخری م - نھ - و - ہ - ی - ہمزہ -

اَسُروں کا دوسرا جتھا

بھ - پ - ت - ٹ - جھ - چ - دھ -ڈھ- رھ - ژھ - سھ ک - لھ - لھ - ابتدائی م - نھ - و - ہ - ی - ہمزہ - درمیانی اور آخری مھ - ن -

ان جتھوں کی ہر آواز اپنے ہی جتھے کی دوسری آواز سے بدل جاتی ہے - ہمزہ کے لیے اصول یہ ہے کہ لفظ کا ابتدائی ہمزہ (الف) دوسرے جتھے کی آوازوں سے بدل سکتا ہے - جیسے آٹا پاٹا - اٹنا پٹنا (بھرنا) - آنت تانت - اوت پوت (بیٹا) وغیرہ اور درمیانی اور آخری

ہمزہ پہلے جتھے کی آوازوں سے بدل سکتا ہے جیسے ڈھئی دھری (دھرنا ۔ ایک جگہ جم کر بیٹھنا) ۔ ہئی ہڑی (گیہوں میں پڑ جانے والا ایک کیڑا) سئی سری (وصول) چکئی چکری ۔ کٹو کڑو (سخت لکڑی کا ایک پیڑ) ۔ جھاؤ جھاڑو یا جھالو (جھاڑیا جھال والا ایک قسم کا درخت) ۔

ہمزہ کے لیے ایک دوسرا اصول یہ ہے کہ یہ مختلف جتھوں کے سروں کا وزن برابر کرنے میں پاسنگ کا کام دیتا ہے اور وہ دو جتھے یہ ہیں ۔

سروں کا پہلا جتھا

آ ۔ اِے ۔ اُو ۔ آو ۔ آیں ۔ اِیں ۔

سروں کا دوسرا جتھا

آو ۔ اے ۔ اِی ۔ آن ۔ آوں ۔ اوں ۔

ان جتھوں کا ہر سُر اپنے ہی جتھے کے دوسرے سُر سے بلا کسی رکاوٹ کے بدل جاتا ہے لیکن جب پہلے جتھے کے کسی سر کو دوسرے جتھے کے کسی سُر کے برابر کرنا ہوتا ہے تو کسی ایک سُر میں ہمزہ بڑھا دیتے ہیں ۔ اس اصول کی تشریح مندرجہ ذیل مثالوں سے کی جاتی ہے :

آ=آو ، جیسے کالا کوئلہ

او=اِیو جیسے اُولیو ۔ دُو دیو ۔ ریوڑی رُوڑی ۔ چیوڑا ۔ چُوڑا چُڑا (بھگو کر سکھائے ہوئے چاول)

ای=اِیو جیسے سیورا سیرا سیلا (سیلنے یانم ہونے والا) ۔ کھیوڑا کھیلا ۔ کِھلا (شگاف یا شگافتہ) ۔ گھی گھیو (پنجابی اور برج بھاشا) ۔ دھی دھوتا (برج بھاشا ۔ نواسہ)

ہمزہ کے متعلق مجھے آخری بات یہ کہنا ہے کہ یہ حرف فارسی کے ایسے بہت سے اضافی اور توصیفی مرکبوں کی ہائے مختفی پر نظر آتا ہے ۔

جو اردو میں کثرت سے استعمال ہوتے ہیں اس لیے اردو املا میں اس کے استعمال سے متعلق کوئی نہ کوئی اصول ضرور ہونا چاہیے - فارسی الفاظ کی ہائے مختفی دراصل پہلے آنے والے حرف کی حرکت ہوتی ہے جیسے گدہ سے کدہ جسے پہلوی میں کاف سے لکھا جاتا ہے - جیسے فارسی بندہ پہلوی بندک - فارسی مژہ پہلوی مژک - جب ایسے لفظ کی جمع بنانے کے لیے اس پر علامت جمع "آن" کا اضافہ کرتے ہیں تو اسی آخری کاف کو گاف سے بدل دیتے ہیں کیونکہ آریائی زبانوں میں کاف اور گاف کا تبادل عام ہے - چنانچہ فارسی بندہ (پہلوی بندک) سے بندگاں مژہ (پہلوی مژک) سے مژگاں - فارسی سوختہ (پہلوی سوختک) سے سوختگاں - فارسی افتادہ (پہلوی افتادک) سے افتادگاں وغیرہ بلکہ حاصل مصدر بنانے میں بھی اسی تبادل سے کام لیتے ہیں جیسے خستہ (پہلوی خستک) سے خستگی — تشنہ (پہلوی تشنک) سے تشنگی - بندہ (پہلوی بندک) سے بندگی اور جب ایسے لفظ کو کسی دوسرے لفظ سے ترکیب دیتے ہیں تو ہائے مختفی پر ہمزہ بنا دیتے ہیں اور اس کے نیچے زیر لگا کر بولتے ہیں - مثلاً تختۂ مشق (تختہ ئے مشق) - بندۂ خدا (بندہ ئے خدا) - دوسرے لفظوں کو ترکیب دیتے وقت آخری حرف کے نیچے صرف زیر لکھ دیتے ہیں - ہمزہ نہیں بناتے جیسے نان گرم (نانے گرم) - آب خنک (آبے خنک) -

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ فارسی کی ایرانی لپی میں جو عربوں کی فتح ایران کے وقت عہد ساسانیاں میں رائج تھی دو لفظوں کے درمیان میں عطف کے لیے اُو (ءُ - ہمزہ مضموم) اور اضافت کے لیے اِے (ءِ - ہمزہ مکسور) کے سر لکھے جاتے تھے اور حرف ماقبل سے ملا کر بولے پڑھے جاتے تھے جیسے گل و بلبل (گلو بلبل) - آب و نان (آبو نان) اور گل نسترن (گلے نسترن) - رنگ بہار — (رنگے بہار) وغیرہ کیونکہ سر جب کسی اسر کے بعد آتا ہے تو اس کے مدار (ہمزہ) کا ادغام ہو جاتا ہے یعنی ہمزہ کی جگہ جو ایک سُر ہی سے لفظ کا آخری اَسُر آ جاتا ہے اور ہمزہ ساقط ہو جاتا ہے - جیسا کہ اوپر کی مثالوں سے ظاہر ہے - یعنی گل و بُلبل = گُل + اُو (ئُ) + بلبل = گلو بلبل - آب و نان = آب + او

(یِ) نان=آبو نان اور گل نسترن =گل + اے (یِ)+نسترن=گلے نسترن رنگ‌بہار=رنگ+اے (یِ)+بہار=رنگے بہار لیکن سر کے بعد سر کا اضافہ کرنے میں ہمزہ بدستور موجود رہتا ہے - چاہے لکھا چاہے چاہے نہ لکھا جائے بولا ضرور جاتا ہے - جیسے نغمہ و رقص=نغمہ آو (ء) رقص - تشنہ و گرسنہ=تشنہ (اَو (ء) گرسنہ - گزشتہ و آئندہ=گزشتہ اُو (ء) آئندہ رواج یہ ہے کہ عطف میں خالی واؤ لکھا جاتا ہے - جیسے ہمزہ مضموم کا بدل سمجھتے ہیں - اسی طرح جوئے آب (جُوے آب)۔ موے میاں (موئے میاں) - دانائے راز (دانائے راز) میں جو لوگ خالی ے لکھتے ہیں وہ اسے بول چال کے ہمزہ مکسور کا بدل سمجھتے ہیں اور جو لوگ ہمزہ مع ے لکھتے ہیں وہ گویا ے کو صرف کسرہ کا بدل قرار دے کر اضافت کا اسر (ہمزہ) اور سر (کسرہ) دونوں ظاہر کر دیتے ہیں -

"زندگی" جیسے لفظوں کو ترکیب دیتے وقت بھی اس اصول میں کوئی فرق نہیں آتا کیونکہ اس لفظ کے آخر میں بھی سر ہے - اس لیے ترکیب میں زندگی کا تلفظ پورا پورا ادا کرنے کے بعد ہمزہ مکسور بولا جائے گا اور ہمزہ کا ادغام نہیں ہوگا جیسے زندگی جاوداں=زندگی ئے جاوداں - سرخیٔ بہار=سرخئے بہار - چونکہ یہ ترکیب الفاظ آخری طویل سر (اِی) کے باعث ذرا رک کر ادا ہوتی ہے لوگ غلطی سے یہ سمجھ بیٹھتے ہیں کہ ی پر تشدید آ گئی ہے اور وہ تحریر میں بھی سچ مچ ی پر تشدید کی علامت بنا دیتے ہیں حالانکہ فارسی زبان میں تشدید کا سرے سے وجود ہی نہیں ہے - کچھ لوگ ایسے لفظوں کے آخری سر (ی) کو مختصر کرکے ہمزہ مکسور بول دیتے ہیں جیسے زندگی حیات (زندگئے حیات) سرخیٔ بہار (سرخئے بہار) - تلفظ کے ان دونوں طریقوں میں اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ اضافت سے پہلے ایک شخص طویل سر بولتا ہے اور دوسرا مختصر - اس آخری یائے معروف پر بھی بعض لوگ ہمزہ بنا دیتے ہیں -

فارسی الفاظ کی ہائے مختفی بھی سُر (اَ یا آ) کی نمائندگی کرتی ہے -

جیسے تختہ (تختا) - پیمانہ (پیمانا) - زمانہ (زمانا) - افتادہ (افتادا) اس لیے اس کے بعد ہمزہ اور کسرہ دونوں بولے جائیں گے - ہمزہ ساقط نہیں ہوگا جیسے تختۂ گل (تختہ ئے گل) - پیمانۂ دل (پیمانہ ئے دل) - دیدۂ حیراں (دیدہ ئے حیراں) -

غرض ہمزہ اردو زبان کی ایک مستقل بالذات اور اہم آواز کا نمائندہ اور اردو کے حروف تہجی کا ایک ممتاز رکن ہے - یہ سر نہیں بلکہ اسر (حرف صحیح) ہے اور سروں کے مدار کا کام دیتا ہے - مخرج کے لحاظ سے اسے کنٹھی کہتے ہیں اور سانس کی مقدار کے لحاظ سے یہ الپ پران (ہلکی آواز) ہے - دوسرے اسروں مثلاً ب ، پ وغیرہ کے مقابلے میں اسے بے رنگ کہتے ہیں - حرف کی حیثیت سے اردو کے لفظ کی ابتدا میں علی العموم الف کی شکل میں نظر آتا ہے اور لفظ کے شروع میں پیش کے ساتھ (واؤ اور زیر کے ساتھ ے کی شکل اختیار کر لیتا ہے - البتہ لفظ کے بیچ میں اپنی اصلی شکل (ء) میں ملتا ہے اور لفظ کو ٹکڑے ٹکڑے ہونے سے بچا لیتا ہے - جب یہ لفظ کی ابتدا میں آتا ہے تو دوسرے جتھے کے اسروں سے اس کا تبادل ہو سکتا ہے درمیانی یا آخری ہونے کی صورت میں پہلے جتھے کے اسروں سے بدل سکتا ہے : مختلف جتھوں کے سروں کا وزن برابر کرنے میں پاسنگ کا کام دیتا ہے اور فارسی ترکیب کی صورت میں لفظ کی ہائے مختفی کے اوپر نظر آتا ہے جہاں املا میں اس کا کسرہ محذوف کر دیا جاتا ہے - مختصر یہ کہ ہمزہ اردو کے حروف تہجی کا نہایت دلچسپ رکن ہے -

(مطبوعہ : اوراق ، لاہور ۱۹۷۰ء)

"و" اور "ی" کے حروف

مندرجہ بالا دونوں حروف اردو کی تحریروں میں اس کثرت سے استعمال ہوتے ہیں کہ لوگ انہیں اردو کی بنیادی آوازیں سمجھنے لگے ہیں - چنانچہ میں خود بھی ایک عرصے تک اسی غلط فہمی میں مبتلا رہا لیکن اب آ کر اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ دونوں حروف اردو زبان کے بنیادی اسروں (اصوات صحیحہ) کے نمائندے نہیں ہیں بلکہ عربی کے ساتھ ساتھ چلے آئے ہیں - عربی زبان میں یہ کبھی سروں (اصوات علت) اور کبھی اسروں (اصوات صحیحہ) کے نمائندے بن کر آتے ہیں - اس لیے انہیں عربی کے نصف علت (Semi Vowel) اور نصف صحیح (Semi Consonent) کہتے ہیں - البتہ اردو میں یہ صرف سروں (اصوات علت) کی نمائندگی کرتے ہیں جس کی تشریح سطور ذیل میں کی جا رہی ہے -

اردو الفاظ کی ابتدا میں ان کی اصلی آوازیں یوں ہیں :

ابتدائی واو : وہ=اُو (ء) وہاں = اُہاں (ء ہ ں) - وون=اُاوں (ء ء ں) -

ابتدائی یا: یہ=اے (ء) - یہاں - اِہاں (ء ہ ں) یوں=اِ اوں(ء ء ں)

مندرجہ بالا الفاظ کی اس تشریح سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ واو کا حرف ہمزہ مضموم کی او یا کا حرف ہمزہ مکسور کی نمائندگی کرتا ہے -

چنانچہ بعض بعض علاقوں میں اردو اُس کو وُس اور اردو اتنا کو وُتنا بولتے ہیں بلکہ بعض بعض لوگ تو ان الفاظ کو مزید بگاڑ کر وِس اور وِتنا بھی بولتے ہیں -

واؤ کو صورت صحیح کے نمائندے کی حیثیت سے عربی میں باعتبار مخرج لب ودندانی (Labis Dental) اور یا کو حرف صحیح کے نمائندے

کی حیثیت سے سنسکرت زبان میں باعتبار مخرج حنکی شمار کرتے ہیں کیونکہ سنسکرت میں یہ ج کا بدل ہوتا ہے جو حنکی آواز ہے جیسے بات=جات ، یاترا=جاترا ، یاتری=جاتری ، یمنا=جمنا ندی -

عربی میں واو اور یا کی مدد سے دو دو سر (اصوات علت) بولے جاتے ہیں - یعنی

واو=آو (ُ) اور او (ؤ)

اور ان سروں سے بننے والے الفاظ یہ ہیں :

عَون ، غَور ، طَور میں اَو (ُ) کا سُر بولا جاتا ہے -

اور حور ، خوک ، سرور میں او (ؤ) کا سُر بولا جاتا ہے -

مندرجہ بالا دونوں سروں میں واو کی دو قسمیں کرلی گئی ہیں لیکن ان دونوں واووں کی شکل ایک ہی رہتی ہے :

اسی طرح یا=اَے (ے) اور ای (ی)

ان سروں سے بننے والے الفاظ یہ ہیں :

عَین ، فَیض ، سَیر میں اَے (ے) کا سُر بولا جاتا ہے اور طِین ، سِین ، لین میں ای (ی) کا سر بولا جاتا ہے -

مندرجہ بالا دونوں سروں میں یا کی دو قسمیں کر لی گئی ہیں اور دونوں کی شکلیں بھی الگ الگ (ے) اور (ی) مقرر کر دی گئی ہیں جو لفظ کے آخر میں صاف نظر آتی ہیں -

اردو میں ان دونوں حروف کی مدد سے تین تین سر بولنے کا کام لیا جاتا ہے - یعنی

واو=آو (ُ) ، آو (ُ) اور او (ؤ)

ہمارے یہاں ان سروں سے بننے والے الفاظ یہ ہیں :

کَون ، اَور ، چوڑا میں آو (ُ) کا سر بولا جاتا ہے -

کُورا ، لُولی ، بھُوار میں اُو (ع) کا سر بولا جاتا ہے -

جونا ، چونا ، بھورا میں او (ٓع) کا سُر بولا جاتا ہے -

ان میں سے ہمارے یہاں آو (ع) کے واو کو تو کوئی نام ہی نہیں دیا گیا - صرف کومل سُر آو (ع) کے واو کو واو مجہول اور تیور سُر او (ع) کے واؤ کو واو معروف کے نام سے موسوم کر دیا گیا ہے اور یوں واو کی تین کی بجائے صرف دو قسمیں کی گئی ہیں لیکن ان تینوں واوون کی شکل ایک ہی رہتی ہے -

اسی طرح یا = اے (ع) ، اے (ع) اور ای (ع)

ان سروں سے بننے والے الفاظ یہ ہیں :

تَیل ، تَھیلا ، چَھنے میں اے (ع) کا سُر بولا جاتا ہے -

پیڑا ، لڑکے ، میرا میں اِے (ع) کا سر بولا جاتا ہے -

چیرا ، لکیر ، گھوڑی میں ای (ع) کا سر بولا جاتا ہے -

ان میں سے ہماری یہاں اے (ع) کی یا کو تو کوئی نام ہی نہیں دیا گیا - صرف کومل سراے (ع) کی یا کو یائے مجہول یا بڑی یے اور تیور سرای (ع) کی یا کو یے معروف یا چھوٹی یے کے نام سے موسوم کیا گیا ہے اور یوں یا کی تین کے بجائے صرف دو قسمیں کی گئی ہیں اور لفظ کے آخر میں بھی ان کی دو ہی شکلیں (ے) اور (ی) نظر آتی ہیں -

کہا یہ جاتا ہے کہ پیش طویل ہو کر واو اور زیر طویل ہو کر یا بن جاتا ہے - جیسے مڑنا سے موڑنا ، کٹنا سے کوٹنا - پھرنا سے پھیرنا اور چرنا سے چیرنا - ہماری اس عربی لپی میں پیش اور زیر کے یہ اعراب تنہا ہی آتے ہیں اور بالترتیب واو اور یا کے ساتھ ان سے پہلے کے حروف صحیحہ پر بھی لگائے جاتے ہیں لیکن واؤ اور یا کے پیش اور زیر کے بغیر تنہا نہیں آتے -

(۲) آخری واو معروف پر لاحقہ بڑھانے سے وہ واو مجہول سے بدل جاتا ہے اور بیچ لگوا بن جاتا ہے ۔ جیسے جوا سے جواری ، چونا سے چوانا ، چھونا سے چھوانا ۔ اس طرح آخری یائے معروف پر لاحقہ بڑھانے سے وہ یائے مجہول میں بدل کر بیچ لگوا بن جاتی ہے ۔ جیسے بھٹی سے بھٹیارا .... (بھٹ + ے + آرا) ، جی سے جیالا ، گھی سے گھیار ، بی سے بیار ، سی (سیت بمعنی پانی) سے سیاری (فصل خریف) دھی (بیٹی) سے دھیانی (سمدھی) ۔

(۳) مخلول الاواخر مادوں پر اسم مذکر یا حالیہ تمام کا لاحقہ بڑھانے سے قبل واو وی کا اضافہ کر دیا جاتا ہے جو پیش مجہول اور یائے مجہول کا بدل ہوتے ہیں ۔ لیکن لوگ غلطی سے انھیں حروف صحیحہ کی طرح ادا کر بیٹھتے ہیں ۔

ان الفاظ کے مکتوبی اور صحیح صحیح ملفوظی روپ نیچے درج کیے جاتے ہیں :

اسمائے مذکر ۔ کھیوا = کھ + ہُ + ہٰ ۔

دیوا = د + ہُ + ہٰ

لہوا = ل + ہُ + ہٰ

حالیہ تمام : کھویا = کھُ + ہِ + ہٰ

سویا = س + ہِ + ہٰ

لایا = لٰ + ہِ + ہٰ

پایا = پ + ہِ + ہٰ

کھایا = کھٰ + ہِ + ہٰ

یعنی وا کا اصل تلفظ ہُ ہٰ ، وال یا وار کا اصل تلفظ ہُ ہٰ ل یا ہُ ہٰ ر

(۲) آخری واو معروف پر لاحقہ بڑھانے سے وہ واو مجہول سے بدل جاتا ہے اور بیچ لگوا بن جاتا ہے - جیسے جوا سے جواری ، چونا سے چوانا ، چھونا سے چھوانا - اس طرح آخری یائے معروف پر لاحقہ بڑھانے سے وہ یائے مجہول میں بدل کر بیچ لگوا بن جاتی ہے - جیسے بھٹی سے بھٹیارا .... (بھٹ + ءِ + آرا) ، جی سے جیالا ، گھی سے گھیار ، پی سے پیار ، سی (سیت بمعنی پانی) سے سیاری (فصل خریف) دھی (بیٹی) سے دھیانی (سمدھی) -

(۳) معلول الاواخر مادوں پر اسم مذکر یا حالیہ تمام کا لاحقہ بڑھانے سے قبل واو وی کا اضافہ کر دیا جاتا ہے جو پیش مجہول اور یائے مجہول کا بدل ہوتے ہیں - لیکن لوگ غلطی سے انھیں حروف صحیحہ کی طرح ادا کر بیٹھتے ہیں -

ان الفاظ کے مکتوبی اور صحیح صحیح ملفوظی روپ نیچے درج کیے جاتے ہیں :

اسمائے مذکر - کھیوا = کھ + ءِ + ءُ -

دیوا = د + ءِ + ءُ

لیوا = ل + ءِ + ءُ

حالیہ تمام : کھویا = کھُ + ءِ + ءَ

سویا = س + ءِ + ءَ

لایا = لَ + ءِ + ءَ

پایا = پ + ءِ + ءَ

کھایا = کھَ + ءِ + ءَ

یعنی وا کا اصل تلفظ ءُ ءَ ، وال یا وار کا اصل تلفظ ءُ ءَ ل یا ءُ ءَ ر

اور والا یا وارا کا اصل تلفظ ءُ ءُ لْ یا ءُ ءُ زْ ہے۔

اس طرح یا کا اصل تلفظ ءِ ءُ یا ل یا یارا کا اصل تلفظ ءِ ءُ ل یا ءِ ءُ ر اور یالا یا یارا کا اصل تلفظ ءَ ءُ لْ یا ءِ ءُ را ہے۔

یہاں اس بات کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ بعض اوقات او اور ای کے آخری سروں پر ایک حشوی "آ" کا اضافہ بھی ہوتا ہے جس سے ان کی شکلیں مندرجہ بالا روپوں سے تو مل جاتی ہیں لیکن ان کی آوازیں واو معروف اور یائے معروف ہی کی نکلتی ہیں۔ مثلاً کلو اور کلیا میں ان کے خاتمے وا اور یا ملفوظی نہیں صرف مکتوبی ہوتے ہیں اور ان کی اصل او (ء) + ءُ اور ای (ء) + ءُ ہوتی ہے۔ چنانچہ کلوا = کالو + آ اور کلیا = کالی + آ۔

و اور ی کا یہ حشوی اندراج جس کا مفصل بیان اوپر گزرا اوستا کی تحریر میں بھی ملتا ہے اور دیوناگری لپی میں بھی نظر آتا ہے۔ لیکن میں نے گرو گرنتھ صاحب کی گورمکھی لپی کو و اور ی کے اس حشوی اضافے یا اندراج سے پاک صاف پایا۔ اس لپی میں حروف کی جگہ صرف پیش اور زیر کی صوتی علامات سے ہی کام لیا گیا ہے اور تحریر کو بول چال کے مطابق ہی رکھا گیا ہے۔ چنانچہ اس میں بھوار کو بھ آر اور پیار کو پ آر لکھا گیا ہے اور کھایا اور سویا کو کھا + ءِ + آ اور سو + ء آ، تحریر کیا گیا ہے۔

غرض یہ ہے کہ اردو کی تحریروں میں لپی کی ریت کے باعث و اور ی کا حشوی اندراج اس کثرت سے ہوتا ہے کہ پڑھنے والوں کو ان پر اردو کے بنیادی حروف صحیحہ (اسر) ہونے کا گمان گزرنے لگتا ہے اور وہ تحریروں میں ان کے مکتوبی روپ دیکھ دیکھ کر انہیں حروف صحیحہ کی طرح ادا بھی کرنے لگتے ہیں اور اپنا تلفظ بگاڑ لیتے ہیں۔

(مطبوعہ : قومی زبان، جون ۱۹۸۷ء)